مدیر
عظیمہ فردوسی

مدیر اعزازی
خورشید اکبر

دائیں سے: ملک زادہ منظور احمد، یٰسین مومن [ایڈوکیٹ] اور گلزار دہلوی۔ ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۷ء کو بھیونڈی، مہاراشٹر میں منعقدہ ایک آل انڈیا مشاعرے کے موقع سے لی گئی تصویر۔

۲۱ر نومبر ۱۹۹۹ء کو ساہتیہ اکادمی، دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار کے شرکاء:
دائیں سے: پرتپال سنگھ بیتاب، عالم خورشید، شاہد کلیم، خورشید اکبر، عبدالاحد ساز اور راشد انور راشد

ISSN 2279 0403

ادب کے زندہ لہو کی گردش

آمد

کتابی سلسلہ : ۱۵ تا ۱۹

[سالانہ مشترکہ شمارہ]

نظریاتی اڈعائیت کے خلاف

کشادہ ذہنی رویّوں [نجات پسندی] کی دستاویز

جلد : ۴-۵ [اپریل ۲۰۱۵ء تا جون ۲۰۱۶ء ، شمارہ:۱۱ تا ۱۵]

مدیر
عظیمہ فردوسی

مدیر اعزازی
خورشید اکبر

e-mail: khursheidakbar@gmail.com
Contact:09631629952 / 07677266932

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ:
آرزو منزل، شیش محل کالونی، پوسٹ آفس: گلزار باغ، عالم گنج، پٹنہ -۸۰۰۰۰۷

☆ از راہِ کرم بینک ڈرافٹ پر صرف Azeema Firdausi لکھیں۔
Canara Bank A/c No. 1967101009012,Boring Rd,Patna
IFSC Code : CNRB0001967(For Money Transfer within India)
SWIFT Code: CNRBINBBPER(For Internatioal Banking)

Title Code : BIHBIL 00337/04/1/2012-TC
[Approved by RNI]

SEHMAAHI

AAMAD

April' 2015 to June' 2016

Volume : 4-5 Issues : 11 To 15

Editor
Azeema Firdausi

Honorary Editor
Khursheid Akbar

اشاعت : اپریل/ ۲۰۱۵ء تا جون/ ۲۰۱۶ء [سالانہ مشترکہ شمارہ]

تعداد اشاعت : پانچ سو [۵۰۰]

زر تعاون فی شمارہ : ایک سو پچاس روپے [150/=] / ۲۰/ امریکی ڈالر

مشترکہ شمارہ کی قیمت : دوسو روپے [200/=] / ۳۵/ امریکی ڈالر

زر تعاون سالانہ : ۶۰۰/ چھ سو روپے [بشمول رجسٹرڈ ڈاک، ہندستان میں]

برطانیہ : ۶۰/ پاؤنڈ / امریکہ [ودیگر یوروپی ممالک]: ۸۰/ امریکی ڈالر

خلیجی ودیگر ایشیائی ممالک [بیرون ہند]: ۶۰/ امریکی ڈالر

خصوصی معاونین / ادارہ جات سے: ۲۰۰۰/ [دو ہزار] روپے [سالانہ]

کمپوزنگ : آئیڈیل کمپیوٹرز، کھتری مارکٹ، مہندرو، پٹنہ۔۶

طباعت : پاکیزہ آفسٹ، شاہ گنج، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۶

سرورق : ذوالفقار حیدر، سبزی باغ، پٹنہ۔۴

قانونی مشیر : سیّد محمد کمال الدین، ایڈوکیٹ [پٹنہ ہائی کورٹ]

- ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، پروپرائٹر عظیمہ فردوسی نے پاکیزہ آفسٹ پریس، شاہ گنج، پٹنہ سے چھپوا کر آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پٹنہ۔۷ سے شائع کیا۔

کائناتِ آمد

☆☆☆

شہرِ رحمت

• اختر کاظمی

حمد

کسی مسجد میں کیوں ڈھونڈیں کسی مندر میں کیوں ڈھونڈیں
وجودِ لامکاں کو ہم کسی بھی گھر میں کیوں ڈھونڈیں

اُسے ہم لَم یَلِدْ کہہ لیں، وَلَم یُوْلَدْ اُسے کہہ لیں
نہیں ہے رُوپ اُس کا تو کسی پیکر میں کیوں ڈھونڈیں

زبانِ قال میں اور حال میں اذکار ہیں اُس کے
وسیع لفظ کو مجھیں کہیں مختصر میں کیوں ڈھونڈیں

ازل سے پیشتر وہ تھا فنا کے بعد بھی ہوگا
اُسے اِدراک کے کوتاہ سے محور میں کیوں ڈھونڈیں

اُسی کی ذاتِ واحد پہ عدم طاری نہیں ہوتا
وہ جب داورِ حقیقی ہے تو لاداور میں کیوں ڈھونڈیں

اُسی کی قُدرت و حِکمت کا ہر ذرّہ مظاہر ہے
تو پسِ منظر میں کیوں جھانکیں اُسے منظر میں کیوں ڈھونڈیں

اُسی کی سلطنت ہے آسمانوں میں زمینوں میں
تو سُلطانوں کے سُلطاں کو محض امبر میں کیوں ڈھونڈیں

بہ شکلِ نُور اُس کی ذات لامحدود ہے اختر
گماں سے بھی کُجا ہستی کو بحروبر میں کیوں ڈھونڈیں

• ظفر اقبال ظفؔر

حمد

اپنے بندوں کی زبوں حالی کو کم کرتا ہے وہ
بھولنے والوں پہ بھی لطف و کرم کرتا ہے وہ
دل شکستہ زندگی کو دیتا ہے جوش و نمو
سخت بنجر سی زمینوں کو بھی نم کرتا ہے وہ
عاجزی کے ساتھ اس سے مانگتا ہے جو دعا
سرفرازی دے کے اُن کو محترم کرتا ہے وہ
نیک بندوں کو عطا کرتا ہے امن و عافیت
سرکشوں کا ، ظالموں کا سر قلم کرتا ہے وہ
درگزر سب کی خطاؤں کو وہ کرتا ہے ظفؔر
نیکیاں کرنے سے پہلے ہی رقم کرتا ہے وہ

نعت پاک

منسوب جن کے نام سے یہ کون و مکاں ہے
اُنؐ جیسا جہاں میں کوئی انسان کہاں ہے
اِدراک کے نقطے تو محمدؐ پہ ہیں قرباں
ہر بات میں آقاؐ کی ، معانی کا جہاں ہے
وجدان و تصوف ہیں فدا جس کے شرف پر
اس کا ہی یقیں سب کو ہے اس کا ہی گماں ہے
جس نور کے جلووں سے منور ہے دو عالم
اِدراک اُسی کا مری فکروں میں نہاں ہے
قرآن کا ہر لفظ سراپا ہے نبیؐ کا
آیات میں والّیل کی زلفوں کا بیاں ہے
دندانِ مبارک میں تجلّی ہے ظفؔر جو
یاقوت میں اور لعل میں وہ بات کہاں ہے

• قوس صدیقی

حمد پاک

تو ذاتِ بے پناہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
بخشش تری اتھاہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
حشراتِ سنگ ہو کہ ہو غارِ سیہ کا رقص
سب پر تری نگاہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
تو ایسا لایزال کہ خود اپنا ماسوا
تو ہی تو لاالہٰ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
ہم کو بھی کر عطا کہ ہم مل جائیں اصل سے
جو تیری سیدھی راہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
تیرا ظہور میں ہوں تو میری پناہ تو
تو ہی پناہ گاہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
تجھ کو زباں نہیں ہے مگر بولتا ہے سب
تو ایسا گونگا شاہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
بن دیکھے جس نے چاہا، ہوئیں رویتیں نصیب
چاہت کی خانقاہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
جھٹلا سکے گا کون محبت کے نقش کو
جس کا بڑا گواہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر
روزِ ازل سے ملنے کی خواہش ہے قوس کو
پر سانس سدِ راہ ہے کُلِ شئیٍ قدیر

نعت شریف

احسانِ ذوالجلال سراپا ہے ''نقشتاب''
وہ صاحبِ جمال کہ یکتا ہے ''نقشتاب''
جس حُسن کے طفیل ہے دنیا ہے رنگ رنگ
وہ حسنِ بے مثال ہے زیبا ہے ''نقشتاب''
بے نقش ہو کے جس نے کیا آشنائے خاص
اس سے زیادہ کون شناسا ہے ''نقشتاب''
آدمؑ کی آبرو یہاں محفوظ ہو گئی
وہ زندگی تمیز، تماشا ہے ''نقشتاب''
اوصافِ خیر گرد پہ نازاں البیات
رحمت نواز، فطرتِ دارا ہے ''نقشتاب''
اک لمسِ اعتبار سے وہ آشنا ہوئی
چوما جبینِ عرش نے جب پا ہے ''نقشتاب''
اب دیکھنا ہے مذہبِ مقبولیت کو قوس
سب کچھ سوال آئے ہیں ہم جا ہے ''نقشتاب''

میری آواز ہے کہ شمع کوئی
جھلملاتی ہے دور جنگل میں

[فراق گورکھپوری]

FEEDOM

"...... In truth that which you call freedom is the strongest of these chains, though its links glitter in the sun and dazzle your eyes.

And what is it but fragments of your own self you would discard that you may become free ?

If it is an unjust law you would abolish, that law was written with your own hand upon your own forehead.

You can not erase it by burning your law books nor by washing the foreheads of your judges through you pour the sea upon them.

And if it is a despot you would dethrome, see first that his throne erected within you is destroyed.

For how can a tyrant rule the free and the proud, but for a tyranny in their own freedom and a shame in their own pride ?

And if it is a care you would cast off, that care has been chosen by you rather than imposed upon you.

And if it is a fear you would dispel, the seat of that fear is in your heart and not in the hand of the feared.

Verily all things move within your being in constant half embrace, the desired and the dreaded, the repugnant and the cherished, the pursued and that which you would escape.

These things move within you being you as lights and shadows in pairs that cling.

And when the shadow fades and is no more, the light that lingers become a shadow to another light.

And thus your freedom when it loses its fetters becomes itself the fetter of a greater freedom."

['The Prophet': By Khalil Gibran, Page: 29-30]

نجات شعریات : معنویت اور جواز؟؟

● خورشید اکبر

خاکسار نے جب 'آمد' کتابی سلسلہ: ۶ کا اداریہ "ادب کا فلسفۂ نجات رنجات پسندی" کے عنوان سے قلمبند کیا تھا تو اس کی حمایت اور تردید میں ادب کے متعدد لکھاریوں نے اپنے اپنے طور پر تاثرات وردِ عمل کا اظہار کیا، جنھیں 'شہرِ نجات' کے تحت مختلف ذیلی عنوانات کی سُرخیوں کے ساتھ شائع کیا جاتا رہا اور یہ سلسلہ تا ہنوز جاری ہے۔ اس کے بعد کتابی سلسلہ: ۸ میں بھی ایک اداریہ 'ادب برائے نجات؟ نجات برائے ادب؟' کے موضوع پر تحریر کیا گیا تا کہ 'نجات' کے تعلق سے بعض ذہنی اشکال کا تصفیہ ہو سکے۔ اس پر بھی محبانِ آمد نے کھُل کر اظہارِ خیال فرمایا اور چند سوالات بھی کھڑے کیے جن کے تناظر میں راقم الحروف کا تحریر کردہ اداریہ 'ادب: زندگی، عام آدمی، نئی نسل اور نعرۂ نجات؟' کا حوالہ بھی پیشِ نگاہ رہنا چاہیے ['آمد' کتابی سلسلہ: ۱۰، ملاحظہ فرمائیں]۔

مذکورہ وضاحتی مواد کے ہوتے ہوئے بھی جب ہمارے چند احباب پوچھتے ہیں کہ 'نجات ر نجات پسندی کیا ہے؟ یا یہ کون سی بلا ہے؟' تو بہ ظاہر اس کے تین اسباب سمجھ میں آتے ہیں: پہلا سبب تو یہ کہ ہمارے وقت کے یہ دانشور حضرات دانستہ چشم پوشی یا تجاہلِ عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ دوسرا، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شعر و ادب کی حد درجہ سنجیدہ فہم رکھنے والے بالغ نظر اصحاب واقعی نہایت معصوم اور بے نیاز واقع ہوئے ہوں۔ یا تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ 'نجات رنجات پسندی' جیسے موضوع کی پیش کش یا تعبیر و تشریح میں خاکسار کی سطح سے کچھ کھوٹ رہ گیا ہو یا لاحق خلطِ مبحث سے ترسیل کی ناکامی دَر آئی ہو [جیسا کہ ہر نوزائیدہ یا نو اختیار کردہ طرزِ فکر و نظر کا شاید یہی حشر ہوتا ہے!]

چونکہ 'نجات' ایک ایسا لفظ ہے جو کثیر المعانی اور کثرتِ جہات کا حامل ہے اس لیے اس سے وابستہ کسی بھی تصور یا طرزِ فکر کا ابہام اور عدمِ ترسیل کے طلسم خانے میں گرفتار ہونا عین فطری معاملہ ہے،

ورنہ نجات ہر کسی کے لیے سہل الحصول نہ ہو جاتی۔ دراصل بغیر مسلسل جدّ وجہد اور سعی پیہم کے نجات کا حصول شاید ناممکن ہے اور ہر گام اور ہر سطح پر جبر کی نفی یا جبری بندشوں سے آزادی اس کی یافت کے لیے لازمی تصور کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نجات کثرتِ ابعاد کی صفت سے مملو ہے تو لامحالہ اس سے منسلک افکار ونظریات بھی یک رُخے اور یک رنگے نہیں ہوں گے۔ اور بالخصوص جب اس کا اطلاق ادب یا فن وثقافت کے شعبے پر کیا جائے گا تو اس کے نتائج بھی دو اور دو جوڑ چار جیسے نہیں ہو سکتے۔ یہی سبب ہے کہ 'نجات رنجات پسندی' کو یا تو کسی نے محض فلسفیانہ موشگافی سے تعبیر کیا یا کسی نے موکھش یا آواگون سے، یا کسی نے مکتی یا تصوف کی اصطلاح سمجھنے کی بھول کی۔ حالانکہ 'نجات پسندی' ایک ایسا تصور رفکر ہے، جس کا الگ الگ طور اور طریقے سے ہر شعبۂ حیات پر اطلاق ممکن ہے، ہر چند کہ ادب کے شعبے میں اس کے تقاضے جداگانہ ہوں گے۔ مگر یہ بھی ملحوظ رہے کہ ادب، سیاست ومعیشت اور مذہب وسائنس وغیرہ سے اتنا بھی بیگانہ نہیں ہے کہ ادب کا کوئی علاحدہ اور آزادانہ مطالعہ معلق طور پر کیا جا سکے۔ ادب اپنی تمام تر خود مختاریوں پر اصرار واعلان کے باوجود دیگر شعبہ ہائے کائنات وحیات سے تادیر بے اعتنائی نہیں برت سکتا اور نہ انھیں متاثر کیے بغیر اور نہ ان سے اثرات قبول کیے بنا زندہ رہ سکتا ہے۔

اب اگر آسان لفظوں میں بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ 'نجات' کا سیدھا اور سادہ سا مفہوم ہے: 'آزادی'۔ یہ آزادی مختلف سطحوں کی ہو سکتی ہے اور اس کی نوعیتیں بھی کیف وکم کے لحاظ سے جداگانہ ہو سکتی ہیں مگر اس کی اصل ماہیت یا روح اپنی فطری نجات آمادگی کی سمت مائل پرواز ہوتی ہے۔ آزادی کی سطحیں: شخصی رانفرادی یا اجتماعی رسماجی اور سیاسی، معاشی یا مذہبی، ادبی وثقافتی وغیرہ ہو سکتی ہیں۔ اگر لفظ 'آزادی' کا انگریزی متبادل دیکھیں تو اس کی بوقلمونیت کا اندازہ ہوگا جیسے: "Freedom','Emancipation',Liberty' وغیرہ۔ یہ الفاظ ایک دوسرے کا بدل تو ہو سکتے ہیں مگر ان کے درمیان کیفیت وکمیت کے لحاظ سے جو افتراق ہے وہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے۔ اسی طرح 'نجات' کے ہم معنی الفاظ کے بہ طور انگریزی زبان میں 'Liberation', 'Enlightenment', 'Self-realization', 'Salvation' وغیرہ مستعمل ہیں مگر ادب میں 'نجات' کا بنیادی سروکار یا واسطہ لفظ 'Liberation' سے ہے کیونکہ ادب کا بنیادی کام انسانی ذہن رفکر رنفسیات رشعو [ردل ودماغ] ربلکہ انفرادی طور پر پورے وجود یا مجموعی اعتبار سے انسانی سماج کے ہر شعبے کو براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مختلف اقسام کی جکڑ بندیوں رغیر ضروری اور غیر فطری بندشوں رذہنی غلامیوں سے آزاد یا نجات آشنا کرنا یا Liberate کرنا ہوتا ہے اور اس نقطۂ نظر سے 'نجات پسندی' آزادی کو پسند کرنے کا کوئی خاص عمل ہو سکتا ہے یا اس سے متعلق محض کوئی سی بھی کیفیت یا صورتِ حال ہو سکتی ہے۔ تو کیا 'نجات' محض آزادی ہے یا عین آزادی ہے؟ نہیں، یہ محض

آزادی نہیں بلکہ ہمہ جہت آزادی ہے اوراس سے بھی کہیں فزوں تر اور عروج یافتہ حقیقت کا نام ہے جسے بیش تر علما' آدرش' یا' آئیڈیل' یا' مثال پسندی' کی حد تک ناقابلِ یافت سمجھ بیٹھے ہیں۔ مگر عام سطح پر دیکھا جائے تو آزادی کا حصول ہی نجات کا حصول سمجھ لیا جاتا ہے جواس کے امکانات و وسعت کی تحدید کے مترادف ہے۔ حالانکہ نجات کی پہلی منزل ' آزادی ' ہے جو ابھی تک ڈھنگ سے انسانوں کو میسر نہیں ہے ورنہ ساری دنیا میں اس کے لیے اتنی مارکاٹ کیوں مچتی؟

آج اگر ہم آزادی کے تناظر میں ساری دنیا کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی صورتِ حالات پر نظر ڈالیں تو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ جو جہاں جس حد تک اقتدار میں ہے اس نے کسی نہ کسی کی آزادی کو سلب کر کے اپنے اردگرد چہار طرفہ جبر و استبداد کا ماحول قائم کر رکھا ہے اور اس کے جواز کی نئی نئی منطقیں بھی وضع کی ہوئی ہیں جن سے کسی کو یک سرِ مو انحراف کی اجازت نہیں ہے۔ گویا جہاں جہاں جبر ہے وہاں وہاں اس کی نفی یا اس سے آزادی کے طریقے اور جائز و ناجائز حربے بھی اپنی اپنی بساط بھر ایجاد اور اختیار کیے جا رہے ہیں۔ یعنی جہاں جہاں جبر ہے وہاں وہاں آزادی رنجات کی صورتیں پیدا ہوتی رہی ہیں اور آیندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ گذشتہ دنوں ہمارے ملک میں وقوع پذیر چند واقعات و سانحات اس کی تازہ مثالیں ہیں۔ دیس دنیا کی موجودہ صورتِ حال بھی اگر آزادی رنجات کے سچے مفہوم کے حصول کی راہ پر ہمیں گامزن نہیں کر پاتی ہے تو یہ سراسر ہماری بے حسی اور بدتوفیقی کہی جائے گی اور بعید نہیں کہ یہی رویہ ہماری ثقافتی راجتماعی خودکشی کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو! اس طرح موجودہ ملکی اور بین الاقوامی تناظر میں آزادی رنجات کی معنویت اور اس کا جواز از خود روشن ہیں۔

جس طرح نجات کی پہلی منزل ' آزادی ' ہے اسی طرح اس کی دوسری منزل ' کشادگی ' ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کسی پرندے کو پنجرے سے نکال کر آزادی تو دے دی جائے لیکن اسے ایک کمرے میں محبوس و محدود کر دیا جائے تو یہ آزادی، کشادگی کے بغیر ہوگی کیونکہ جب تک اسے اڑنے کے لیے پورا آسمان نہیں ملتا تب تک اس کی آزادی رنجات بے معنی ہوگی۔ اس لیے نجات کے لیے آزادی کے ساتھ کشادگی بھی لازمی ہوگی۔ اور اب آگے تیسری منزل ' خودمختاری ' کی ہے جو نجات کے حصول کی واقعی شناخت ہے۔ جیسے کسی پرندے کو پرواز کے لیے سارا آکاش تو مل جائے مگر اسے اپنا آشیانہ یا ٹھکانہ یا قیام مقرر کرنے کا اختیار نہ ہو گویا وہ موسم کی سردی، گرمی اور بارش سے اپنی حفاظت نہ کر سکے یا قدرت اور فطرت کی ناسازگاریوں سے خود کو بچانے کے حق سے بھی محروم کر دیا جائے تو پھر یہ خود مختاری اپنا اثبات ہی کر پائے گی نہ کسی بھی طرح کے ظاہری یا باطنی جبر کی نفی۔ اس کے بعد نجات کی چوتھی اور آخری منزل خود نجات [عدم جبریت سرا اور ہمہ جہت آزادی] ہے جو اپنا مقصود آپ ہے!

اس طرح ' نجات ' کے عناصرِ اربعہ یا اجزائے ترکیبی کے طور پر حسبِ ترتیب: آزادی، کشادگی،

خودمختاری اورنجات [عدم جبریّت یا ہمہ جہت آزادی] کونشان زد کیا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی معاشرہ یا اس کی ادبی رثقافتی رسیاسی صورتِ حال کس حد تک نجات آشنا یا نجات یافتہ ہے اس کی کسوٹی کے طور پر مذکورہ عناصر اربعہ میں سے کسی خاص عنصر کی موجودگی یا عدم موجودگی کے مقدار، معیار اور اس کی شدت سے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ گویا نجات ایک تدریجی اور ارتقائی سفر اور متعدد طرح کے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور باطنی جبر کی زنجیروں کو توڑنے کا صبر آزما مرحلہ ہے۔ یہاں تک کہ یہ کسی بھی طرح کے نظریاتی جبر کی غلامی پر بھی آمادہ نہیں ہوسکتی۔ کسی بھی ادبی فن پارے کا آزادانہ تخلیقی عمل اس کی بہترین مثال ہے۔ فن کار اپنی تخلیقی سرشاری میں ہر طرح کے غیر فطری جبر کو کبھی بالواسطہ اور کبھی براہِ راست طور پر بھی منہا کرتا رہتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نجات رنجات پسندی ادب بالخصوص تخلیقی کارگزاریوں کا بنیادی وظیفہ قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی فن پارے پر کسی بھی طرح کا نظریاتی جبر تا دیر حاوی نہیں رہ پاتا ہے۔ اس کے برعکس، جس ادب پارے میں نظریاتی جبر کی کارفرمائی زیادہ اور شدید ہوتی ہے وہ زمان ومکاں کی حد بندیوں میں مقید ہوکر عصریّت کی چوکھٹ پر جلد ہی دم توڑ دیتا ہے اور عارضی پن یا ہنگامیت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے بھی ہم اپنے پرانے اور نئے ہر طرح کے ادب پارے کا محاسبہ کرسکتے ہیں جس کے لیے نجات رنجات پسندی کے عدم جبریّت کی شناخت، نشانِ راہ کا فریضہ انجام دے سکتی ہے۔

دنیا میں ہر زمانے کا ادب جبریّت کا شکار رہا ہے، صرف عقاید ونظریات کے عنوانات ہی بدلتے رہے ہیں۔ اور انھی کے درمیان ہر دور میں ادبی شہ پارے بھی وجود میں آتے رہے ہیں کیونکہ کوئی بھی بڑا ادبی شہ پارہ فطری طور پر جبر شکن واقع ہوتا ہے اس لیے دست وبُردِ زمان ومکاں کے ہاتھوں میں بھی وہ سلامت رہ پاتا ہے۔ اردو ادب کا سرمایہ بھی اس جبریّت کی زد سے کبھی محفوظ نہیں رہا ہے لیکن اس کے ادبی شاہکاروں نے بھی اپنی جبر شکنی کی بدولت خود کو منوایا ہے اور آج بھی ان کی معنویت برقرار ہے بلکہ روز افزوں اس کے نئے نئے گوشوں کے انکشافات ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اسی کے برعکس جو ادب پارہ خود کو جبریّت یا عارضی عصریّت سے نہیں بچاسکا وہ رفتہ رفتہ از کار رفتہ اور کالعدم بھی ٹھہرا۔ اس نجاتی نقطۂ نظر سے ہم چاہیں تو اردو کے روایتی کلاسیکی سرمایے سے لے کر ترقی پسند، جدید، مابعد جدید اور موجودہ یا بالکل تازہ بہ تازہ ادب کا بھی احتساب کرسکتے ہیں۔

جب راقم الحروف نے 'آمد' کے اداریے کے توسط سے پہلی بار نجات رنجات پسندی پر مکالمے کا آغاز کیا تو بعض اصحاب دانش نے مابعد جدیدیت سے زبردستی اس کے ڈانڈے ملائے۔ بعض لوگوں نے اسے 'ترقی پسندی' کا نیا روپ، تو کسی نے 'جدیدیت' کی توسیع اور کچھ نے تو اسے 'فنائیت' سے بھی تعبیر کیا، تو کسی نے اس میں 'فراریت' کی جھلک پائی یا کسی نے اسے 'عدمیت' تصور کیا اور کسی کو یہ 'موت' اور کسی کو

'لایعنیت' کا فلسفہ نظر آیا۔ جب کہ خاکسار یہ پہلے ہی واضح کر چکا تھا کہ 'نجات ہر طرح کے غیر فطری اور غیر انسانی جبر کی نفی یا اس سے آزادی کا نام ہے۔ گویا 'نجات رنجات پسندی' جبر شکنی پر آمادہ ایک ایسا ادبی اصول ر رویہ ہے جس میں کسی سیاسی یا مذہبی پروپیگنڈے یا نعرے یا اشتہار کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یہ ایک خالص ادبی طرز فکر ہے جو ہر قسم کی جبریت کو منہا کرتی ہے اور اسی فکری بنیاد پر اپنا ادبی اصول مرتب کرنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ 'نجات پسندی' خود افکاریت رخود جوازیت رخود اختیاریت جیسے نظریے کو بھی ادب کے لیے ادھورا اور یک رُخا بلکہ 'خود مرکزیت' کا شکار تصور کرتی ہے۔ اس ضمن میں یہ سوال بھی بعض ذہنوں میں اٹھ سکتا ہے کہ: 'کیا 'نجات پسندی'، 'نجات مرکزیت' کی شکار نہیں ہے؟' تو اس کا سیدھا سا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ 'نجات رنجات پسندی' چونکہ جبریت کی نفی، عدم مرکزیت اور ہمہ جہت آزادی کے انسانی تصور پر قائم و استوار ہے اس لیے اس میں کسی بھی طرح کی مرکزیت کے لیے کوئی جگہ ہے نہ کوئی جواز! یعنی، 'نجات' میں کسی بھی طرح کی مرکزیت کے لیے کوئی گنجایش ہی کہاں ہے! اور اگر ایسا ہے تو اسے نجات کی جگہ کسی اور نام یا نئی غلامی سے کیوں نہ تعبیر کیا جائے؟

کوئی بھی ادبی تخلیق، بہ ظاہر یا بہ باطن، کسی نہ کسی نوعیت کے جبر یا بہ یک وقت کئی طرح کے جبر کی نفی کی ترجمانی کر رہی ہوتی ہے۔ لیکن اظہار کی سطح پر کبھی یہ وقوعہ براہ راست تو کبھی بالکل غیر شعوری یا لاشعوری طور پر انجام پذیر ہوتا ہے، بلکہ اعلیٰ پایے کے فن پاروں میں تو اس کی سطح اس قدر تجیدی رنگ [sublime colour] لیے ہوئے ہوتی ہے کہ اسے آسانی سے شناخت کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آیا اس میں کسی جبر کی نفی ہے بھی یا نہیں؟ مگر غور و خوض سے، جبر کی نفی کا شائبہ یا کم سے کم خفیف سا اشارہ تو ضرور مل جاتا ہے یا اس کا باریک سا کوئی سرا ہاتھ آ جاتا ہے۔ یہ غالباً تخلیقی پروسس کی اپنی نجات پسندانہ طلسم سازی بھی ہو سکتی ہے۔ جیسے یہ دو مشہور شعر:

(۱) تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا [مومن]

(۲) سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے [غالب]

ان دونوں شعروں میں بہ ظاہر جبر کی نفی کا شائبہ نہیں ملتا لیکن یہاں بھی جبر کی نفی کی کارفرمائی ہے۔ مومن کے شعر کو دیکھیں: اس کے دوسرے مصرع میں جس 'دوسرا' کی نفی کی گئی ہے دراصل وہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے اس لیے اس کا ہونا بھی کیا اور نہیں ہونا بھی کیا۔ مگر جس معشوق کے پاس ہونے یا قریب ہونے کی گواہی دی گئی ہے وہ بھی تصور کا جبر ہے جو اس کی قیاسی موجودگی کا احساس کراتا ہے ورنہ یہ انسانی ذات کی انتہائی کرب ناک تنہائی کا احوال ہے جس کے دکھ کا مداوا یا تصفیہ کسی اور کے پاس نہیں۔ گویا کہنے کی مراد یہ ہے کہ 'دوسرا' تو کہیں نہیں ہے اور واقعتاً معشوق مخاطب بھی پاس نہیں مگر اس

کے ہونے کا مغالطہ ہے جو صورتِ واقعہ کے جبر کی شدّت کو کسی طور منہا کرنے کی خاطر تصورِ جاناں کی آغوش میں چند لمحوں کی پناہ چاہتا ہے اور بس تنہائی کی کرب ناکی کا ایک سلسلہ دراز ہے جو لذّتِ آزار سے قدرے تسکین کا طالب ہے۔ یہ صورتِ حال کی آئرنی بھی کہی جا سکتی ہے۔ از یں قبیل اس کے اندر اور بھی معنوی امکانات تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

اسی طرح غالبؔ کے شعر میں پہلی سطح تو قدرت رفطرت کی کرشمہ سازی کے اعتراف کی ہے مگر درپردہ اس پر سوالات بھی کھڑے کیے گئے ہیں کہ 'کہاں سے آئے ہیں؟' اور 'کیا ہے؟' دراصل یہ معصومانہ اور فنکارانہ سوالات ہی قدرت کے جبر کی نفی ہیں۔ یہاں بہ یک وقت قدرت کی بوقلمونی سے زیادہ انسان کے تحیر اور تشکیک کی ترجمانی کا گمان گزرتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بھی سبزہ و گل اور ابر و باد باطنی وجود اور ظاہری انسان کے ارادوں اور دیرینہ آرزوؤں کا نتیجہ ہوں یا قدرت کی نئی جبر سامانیوں کی آگہی یا پیش خیمہ؟؟ اس طرح اس شعر میں موجود لفظی رمعنوی رفکری راستفہامی اور کیفیاتی جبر کو منہا کرتے ہوئے شعر سے حسبِ تناظر مفاہیم و اثرات برآمد کیے جا سکتے ہیں۔ یعنی کوئی بھی اہم اور بڑی تخلیق جبر کی حد بندیوں کو توڑنے پر ہمہ وقت آمادہ رہتی ہے اور کسی بھی طرح اسے جبراً محدود و محبوس نہیں کیا جا سکتا جب کہ کمزور اور عارضی تخلیق فطرتاً جبر شکن واقع نہیں ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ نام نہاد ہم عصر تنقید کی بیساکھی زیادہ دنوں تک بُری تخلیق کو شہکار اور بڑی تخلیق کو ادنیٰ ثابت نہیں کر سکتی کیونکہ ہر بڑا ادبی کارنامہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اپنی معنویت اور جواز کا دفاع اپنے توانا متن کی بنیاد پر کر لیتا ہے، اس لیے جھوٹی تنقید اپنی ادبی عاقبت اپنے ہی ہاتھوں تباہ کرتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نجات اگر واقعی جبر کی نفی کی شعریات ہے تو کیا ماقبل کا ادب: یعنی کلاسیکیت، ترقی پسندی، جدیدیت، مابعد جدیدیت یا اس کے بعد کا ادب 'جبر کے اثبات' کا ادب رہا ہے؟ غالباً اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ ادب نے آدھے ادھورے طور پر جبر کی نفی سے کام لیا ہے اور بالعموم عقاید و نظریات کی جبریت نیز تبلیغ و تشہیر کا شکار بنتا رہا ہے۔ یہاں اس سے متصل ایک اور سوال سر اُٹھا سکتا ہے کہ کیا جبر کی نفی کے بغیر ہی ماضی میں ہمارے اکابرین ادبا و شعرا اور فکشن نگاروں نے بڑا اور قابلِ رشک ادب پیش کیا ہے؟ نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔ ہمارے جتنے اہم اور بڑے لکھاری گزرے ہیں تقریباً سب نے کم و بیش اپنے تخلیقی عمل میں، شعوری یا لاشعوری طور پر، جبر کی نفی کا فریضہ احسن طریقے پر انجام دیا ہے ورنہ ان کا تخلیق کردہ ادب بھی جبریت اور عصریت کی بھول بلیاں میں کہیں گم ہو گیا ہوتا اور وقت ان کا کھلے دل سے اعتراف نہیں کر رہا ہوتا۔ یہاں پر ایک مسئلہ یہ بھی اُٹھ سکتا ہے جبریت اور عصریت یا عارضی پن سے ادب کو کیسے بچایا جا سکتا ہے؟ کیا ایسا کر پانا ممکن ہے؟ شاید یہ کام اتنا آسان

نہیں ہے لیکن ہر سچا اور جینوئن تخلیق کار اس چیلنج کو بصد شوق قبول کرتا ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی اپنی بساط اور صلاحیت بھر کاوش بھی کرتا رہتا ہے۔ واقعتاً جو تخلیقی فن پارہ خود کو وقت کی جبریت سے محفوظ رکھ پانے میں کامیاب ہوتا ہے وہی آیندہ نسلوں کے لیے بامعنی اور زندہ وراثت و روایت کا اٹوٹ حصہ بن پاتا ہے۔ اور اس کا فیصلہ بیس پچیس برسوں میں نہیں ہوتا کیونکہ معاصر تنقید اپنی تمام تر غیر جانبداریوں کے اشتہار و اعلان کے باوجود شخصی اور عصری تعصبات و تحفظات سے شاذ و نادر ہی اپنا دامن بچا پاتی ہے۔ اس لیے عموماً بعد کی نسلیں ہی معروضی نقطۂ نظر سے، غیر جانب دار ہو کر، اپنے پیش روؤں کے فن پاروں کے ساتھ معقول افہام و تفہیم کا معاملہ کر سکتی ہیں، ایسا عام خیال ہے۔ حالانکہ کبھی کبھی قدر شناسی کی یہ مدت نصف صدی سے بھی طویل ہو سکتی ہے۔ اس معاملے میں قبل از وقت کوئی پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی۔

یہ چند باتیں تھیں جو ادب میں 'جبر کی نفی' کے مفروضے پر مبتدیانہ مباحث سے عبارت ہیں اور نجات شعریات کے اجزائے ترکیبی: آزادی، کشادگی، خود مختاری اور نجات [عدم جبریت اور ہمہ جہت آزادی] کی شناخت پر مبنی ہیں۔ تو کیا 'نجات پسندی' کی کل کائنات بس اتنی سی ہے؟ یا اس کے دیگر لوازمات بھی ہیں جو زیرِ بحث آ سکتے ہیں یا مکالمے کا ناگزیر حصہ بن سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی۔ اور یہ خاکسار چاہتا ہے کہ اردو ادب کے سنجیدہ طبع اصحاب فکر و دانش اس 'نجات / نجات پسندی' کے موضوع پر کھلے دل اور دماغ سے مکالمہ قائم کریں تاکہ ادب کا کہر آلود مطلع صاف ہو سکے۔ اس ضمن میں نجات کے دیگر متعلقات کے زمرے میں 'جبر کی جدلیات؟'، 'جدلیاتی نجات'، 'جبر کی ناگزیریت؟'، 'لسانی طلسم تماشا؟'، 'تخیل کی جدلیات'، 'ادعائیت شکنی؟' 'نظام کا جبر پرور مزاج؟'، 'ادبی خود مختاری: ایک واہمہ؟'، 'ثقافتی سروکار: ارتقائی پس منظر؟'، 'ہیئت و مواد کی دوئی کا خاتمہ'، 'فن پارے کی تہذیبی اور جمالیاتی شناخت؟'، 'جبر کا نفسیاتی تناظر'، 'نجات کی تحلیلِ نفسی'، 'لسانی جبر کی رومان خیزی' وغیرہ ایسے اہم اور بامعنی سوالات و موضوعات ہیں جو زیرِ بحث آ سکتے ہیں۔ اور بعض شریکِ مکالمہ احباب ان میں مدلل طور پر ترمیم و اضافہ کرنے کے بھی مجاز ہوں گے! ع:

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

۲۳ رمئی، ۲۰۱۶ء
عظیم آباد [پٹنہ]

خورشید اکبر
مدیرِ اعزازی سہ ماہی 'آمد'

☆☆☆

شہرِ نجات

سلسلۂ مکالمات

(۱)

'اذکار' کا اداریہ اور اسّی ۸۰ء کے بعد کے قلمکار؟

[نجات پسندی کے تناظر میں]

● ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی

کرناٹک اردو اکادمی کا سہ ماہی رسالہ "اذکار" ان دنوں جواں سال شاعر اکرم نقاش کی ادارت میں عمدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے کا انتیسواں شمارہ حال ہی میں منظرِ عام پر آیا ہے اور اپنے جواب طلب اداریہ کی وجہ سے موضوعِ بحث بن گیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر غیر مناسب نہیں ہوگا کہ اکرم نقاش خود کو اسّی کے بعد کے شعرا میں شمار کرتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے عاجلانہ انتخاب میں اسّی کے بعد کے جو اہم شعرا نظر انداز ہو گئے تھے انھیں اسّی کے بعد کے مرکزی تخلیقی دھارے میں شامل کیا جائے۔ غالباً اسی مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے اسّی کے بعد کے شاعروں کا ایک عمدہ انتخاب "غزل کے رنگ" کے نام سے بھی شائع کیا۔ مگر اس انتخاب پر لوگوں نے کھلے ذہن و دل سے گفتگو نہیں کی۔ حالاں کہ اسّی کے بعد کے قلمکار ایک لمبی تخلیقی عمر گزار چکے ہیں اور بھلی بری اپنی ادبی پہچان بھی بنا چکے ہیں۔ اس کے باوجود ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ جس طرح "جواز و انتخاب" [مرتب: کوثر مظہری] میں شمولیت کی وجہ سے کئی شعرا اپنی شاعری کے مطالعے کی مرکزیت کا حصہ بننے میں کامیاب ہوئے اسی طرح "غزل کے رنگ" میں شامل کئی شعرا نے از سرِ نو اپنی تخلیقی انفرادیت کا احساس دلایا اور ہمعصر ادبی منظر نامے پر اپنی موجودگی درج کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ مگر ہمعصر ادبی منظر نامے سے متعلق باضابطہ طور پر کوئی سنجیدہ مکالمہ قائم نہیں ہو سکا۔ غالباً اسی صورتِ حال کے ردِ عمل کے طور پر اکرم نقاش نے

"اذکار" کے اس شمارے کے اداریہ کو اسی کے بعد کی ادبی صورت حال سے متعلق سلگتے سوالات کے لیے وقف کر دیا ہے تا کہ گفتگو کا ماحول بن سکے۔ مگر اکرم نقاش کا المیہ یہ ہے کہ وہ فاروقی صاحب سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنے میں بھی کسی قسم کے تکلف سے کام نہیں لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمعصر ادبی منظرنامے سے متعلق اٹھائے گئے ان کے مخلصانہ سوالات کو بھی بعض لوگ ان کی فاروقی صاحب سے اندھی عقیدت پر محمول کرتے ہیں۔ اور بات کچھ یوں ہے کہ ہم انھیں غلط بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کیوں کہ اکرم نقاش نے تقریباً انھی سوالوں کا اپنے اداریہ میں اعادہ کیا ہے، جن بنیادوں پر فاروقی صاحب بہت پہلے نئی نسل کو رد کرنے کی کوشش کر چکے تھے۔ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ اسی کے قلمکاروں کو نارنگ صاحب اور فاروقی صاحب نے اس لیے بھی نظرانداز کیا تھا کہ انھوں نے ان دونوں بزرگ ہستیوں کے زیر سرپرستی تخلیق ادب کا فریضہ انجام دینے سے انکار کر دیا تھا۔

بعد ازاں ایسی فضا بن گئی تھی کہ بزرگ ناقدوں کی مشفقانہ مسکراہٹ نئی نسل کے فنکاروں کو زہر لگنے لگی تھی اور جو لوگ قلبی طور پر ان دونوں بزرگوار سے عقیدت رکھتے تھے وہ بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ باتیں عام ہوں۔ پھر فضا کچھ بدلی اور بعض لوگوں نے بزرگ ناقدوں اور رجحانات کے اماموں سے کھل کر بیعت کرنے میں کوئی برائی نہیں سمجھی، بدلے میں ایسے لوگوں کو اپنی کتابوں کے لیے ان بزرگوں کی متبرکانہ تحریریں بھی ملیں مگر بات کچھ بنی نہیں۔ کیوں کہ اسی کے بعد کے بیشتر قلمکاروں نے اپنی 'خود افکاریت' والی روش ترک نہیں کی اور نہ بزرگ ناقدوں کی سند پانے والے اپنے ہمعصروں پر کوئی خاص توجہ دی۔ ماحول اندر ہی اندر کچھ کشیدہ رہا مگر تخلیقی وفور سے سرشار اسی کے بعد کے قلمکار اپنی دھن میں مگن اور سرگرم رہے اور ادبی بساط پر حتی المقدور اپنے نقوش بھی ثبت کیے، جس کا بعد میں لوگوں نے کھلے دل سے اعتراف بھی کیا۔ مگر اپنے مزاج اور تربیت کی ناپختگی کی وجہ سے بہت سارے لوگوں کو اس نسل کے پاس کسی قسم کا تخلیقی وفور و شعور نظر نہ آیا۔ اور وہ موقع بہ موقع اس نسل کے قلمکاروں کے بارے میں اپنے تعصبات کا اظہار کرتے رہے۔ غالباً اسی صورت حال سے بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر اکرم نقاش متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنے دل کا حال 'اداریہ' کے توسط سے بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

جس طرح کے حالات سے جدیدیت والے فنکار کو سابقہ پڑا کم و بیش اسی طرح کے حالات سے نئی نسل کو بھی گزرنا پڑا، اس کے باوجود پچھلے تیس پینتیس سالوں میں کوئی بھی فنکار نئی فکر اور نئے طرز احساس کے ساتھ نمایاں نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد انھوں نے اس بات پر ایک طرح سے افسوس کا اظہار کیا ہے اور چند سوالات قائم کیے ہیں کہ ایسا کیوں لگتا ہے کہ:

- یہ نسل سمت نما کے بغیر محو سفر ہے۔
- یہ نسل اپنے تخلیقی وفور کا ثبوت کیوں نہیں دیتی؟
- یہ ادبی عرصہ کسی ادبی ہلچل کا احساس کیوں نہیں دلاتا؟
- آج کا ادیب اپنی انفرادیت کے اثبات پر اصرار کیوں نہیں کرتا؟
- اور اسے اپنی شناخت کے استحکام میں اور کتنا وقت درکار ہے؟

آیئے ہم ان سوالات پر غور کرنے کی کوشش کریں کہ کیا واقعی یہ سارے سوالات ٹھوس اور حقیقت پسندانہ ہیں؟

☆پہلے سوال کے جواب میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سمت نما سے کیا مراد ہے؟ اور یہ بھی کہ کیا واقعی کسی بھی تخلیقی نسل کے لیے یا تخلیقی عمل کے لیے سمت نما لازمی ہے؟ اگر ہاں تو سب سے پہلے یہ بتانا پڑے گا کہ ولی، میر، اور غالب کا سمت نما کیا تھا؟ یا کون تھا؟ اور یہ بھی کہ اگر واقعی ان کا کوئی سمت نما تھا تو کیا وہ اب تک تبدیل نہیں ہوا ہے؟ اور اگر وہ سمت نما تبدیل ہو چکا ہے تو یہ لوگ اب تک از کار رفتہ کیوں قرار نہیں دیے گئے؟ جب کہ سمت نما کے تحت ادب تخلیق کرنے والے بہت سارے ترقی پسندوں کو لوگ از کار رفتہ قرار دے چکے ہیں۔ اور اگر وہ بزرگ اور قطب نما شعرا کسی سمت نما کے شاعر نہ تھے تو پھر کسی مخصوص جماعت یا نسل کے لیے سمت نما کا پابند ہونے کی وکالت کرنا کہاں تک مناسب ہے؟ کیا سوال کنندہ یہ چاہتے ہیں کہ اسی کے بعد کے قلمکار فاروقی صاحب یا نارنگ صاحب کو قبلہ و کعبہ مان لیں یا کسی ازم یا نظریہ، یا رجحان کا جھنڈا اٹھا لیں اور اسی کی تائید و تردید میں ادب لکھنے کی سزا کاٹیں؟ کیا سوال کنندہ اس بات سے اتفاق نہیں رکھتے ہیں کہ تخلیقی مزاجی کسی بھی نظریاتی حد بندی کو قبول نہیں کرتی ہے۔ اور نہ کسی ازم اور آئیڈیالوجی کے کیچڑ میں لت پت ہونے تک محدود رہتی ہے!

کہا جاتا ہے کہ تخلیقیت خیزی ایک طرح کی مزاجی ہوتی ہے۔ ایک پر لطف، پرشور، پر ہول مزاجی جس کی گونج زندگی میں امنگ پیدا کرتی ہے اور انسانی زندگی ایک نئے اور تازہ کار نشاط سے روشناس ہوتی ہے۔ تو پھر سمت نما کے ہونے نہ ہونے کا کیا مطلب رہ جاتا ہے؟ یوں بھی سمت نما کی ضرورت غیر تربیت یافتہ قلمکاروں اور تخلیقی سرشاری کی مسرت سے عاری فنکاروں کو پڑتی ہے نہ کہ تخلیقی مزاجی کے حامل قلمکاروں کو؟ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ آئیڈیالوجی کا پروردہ ادب عام طور پر یک رخا ہوتا ہے، جس میں فنکار کا نجی تجربہ کم اور اس کے سمت نما کا نظریہ زیادہ شدت سے بولتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس طرح کے ادب کو آئیڈیالوجی پر ایمان رکھنے والے خوب بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں مگر نتیجہ صفر ہی نکلتا ہے۔ جب کہ بے سمتی یعنی ہزار سمت والا ادب دیر سے ہی سہی اپنی جگہ بنا لیتا ہے اور پھر اپنی بلند تقدیر سے کبھی محروم نہیں ہوتا ہے۔

ایک اور بات قابل توجہ ہے وہ یہ کہ اپنے آپ کو سمت نما کا حامل وہی لوگ قرار دیتے ہیں جو اس خوش فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ واقعی انھوں نے کوئی بہت ہی نئی چیز دریافت کر لی ہے جب کہ ادب میں بالکل نیا کچھ بھی نہیں ہوتا ہے جیسا کہ محمد سلیم الرحمان نے لکھا ہے کہ:

> کوئی شخص اس وہم میں مبتلا ہو جائے کہ جو کام اس نے کر دیا وہ پہلے کسی سے بن نہ پڑا تو پھر کچھ نہ پوچھیے خوشی کے مارے اپنی پیٹھ آپ ٹھونکنے لگتا ہے۔ اچھلا پڑتا ہے۔ جی ہی جی میں کہتا ہے واہ رے میں آخر دوسروں کو بالکل اچھوتی راہ دکھانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ افسوس کہ ادب کی حد تک ابداعت محض سراب ہے اس کا درجہ خیالی لذت سے بڑھ کر نہیں ادب کی اقلیم میں جو راستہ شہرت کی منزل کی طرف جاتا ہے اس پر جا بجا ابداعت پسندوں کے ڈھانچے پڑے نظر آتے ہیں، یہ لوگ تھے جو سمجھتے رہے کہ نئی منزل پر سب سے پہلے ہم پہنچیں گے اور رستے میں مر کھپ گئے۔

ادب میں تمام تر نظریات و رجحانات کے اماموں اور سمت نما کے حامل لوگوں کا یہی رویہ ہوتا ہے اور ان کا انجام بھی وہی ہوتا ہے جس کا ذکر محمد سلیم الرحمان نے کیا ہے۔ اور اس بات کو نئی نسل کے قلم کاروں نے بہت پہلے جان لیا تھا اس لیے اس نے کسی سمت نما کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

☆ اب رہا دوسرا سوال کہ یہ نسل اپنے تخلیقی وفور کا ثبوت کیوں نہیں دیتی؟

اس سوال کے جواب میں بھی سوال ہی سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ یعنی تخلیقی وفور سے کیا مراد ہے؟ دوسرا سوال یہ کہ یہ نسل اپنے تخلیقی وفور کا ثبوت فائل کر کے کیسے پیش کرے؟ ویسے اس سوال کا جواب پہلے سوال میں واضح طور پر نظر آرہا ہے۔ یعنی یہ نسل جو سمت نما کے بغیر محو سفر ہے تو آخر کس قوت کی بنا پر؟ جواب بالکل صاف ہے کہ اپنے تخلیقی وفور کی بنا پر۔ اگر اس نسل کے پاس تخلیقی وفور و شعور نہ ہوتا تو وہ سمت نما کے بغیر اتنا لمبا سفر کیوں کر طے کر پاتی؟ اس کے باوجود اگر کسی کو اس نسل کے یہاں تخلیقی وفور نظر نہیں آتا ہے تو یہ اس نسل کا نہیں بلکہ دیکھنے والوں کی نظروں کا قصور ہے، اس سے بھی زیادہ غالباً ان کے ذہنوں کا فتور ہے۔ اب تو منظر بالکل صاف ہے، کیوں کہ کل تک جو لوگ اس نسل کے وجود کے ہی منکر تھے آج اسے التفات کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اور اس کے تخلیقی وفور اور فنی شعور اور خود اعتمادی کی داد بھی دے رہے ہیں۔

☆ تیسرا سوال یہ ہے کہ یہ ادبی عرصہ کسی ہلچل کا احساس کیوں نہیں دلاتا؟

یہاں بھی سوال کے جواب میں سوال ہی ذہن میں ابھرتا ہے۔ یعنی ہلچل سے کیا مراد ہے؟ کسی ایسی تخلیق کا منصۂ شہود پر آنا جو نظروں کو خیرہ کر دے یا کسی ایسے جارح رویہ کو فروغ دینا جس کی وجہ سے بزرگوں کو اپنی پگڑی سنبھالنی پڑے۔ یا کسی ایسے نظریہ، یا رجحان کو متعارف کرانا جو اپنے سے قبل کے قلم کاروں کی خدمات اور ادب پر پانی پھیر دے؟ ادب کا معمولی قاری بھی اس بات سے واقف ہے کہ ادبی تاریخ میں محض کسی تخلیقی وقوعے کی وجہ سے کبھی ایسی ہلچل پیدا نہیں ہوئی کہ قدموں کے نیچے زمین ہلنے لگے۔ ادب میں پہلے پہل تب ہلچل کا احساس پیدا ہوا تھا جب میر نے یہ کہا تھا کہ اردو میں صرف ڈھائی شاعر ہیں، دوسری بار ادب میں تب ہلچل پیدا ہوا جب خواجہ الطاف حسین حالی نے اردو شاعری کے دفتر کو تعفن میں سنڈاس سے بدتر قرار دیا۔ اور تیسری بار ادب میں تب کہرام برپا ہوا جب کلیم الدین احمد نے کئی بت توڑ ڈالے اور تنقید کو محبوب کی موہوم کمر اور غزل کو نیم وحشی صنف سخن قرار دے دیا۔ اور چوتھی بار ادب میں تب ہلچل مچ گیا جب ترقی پسندوں نے ترقی پسند ادب کے علاوہ بقیہ ادب کو رجعت پسند قرار دے دیا۔ اور پانچویں بار ادب میں تب بھونچال آیا جب جدیدیت نے ترقی پسندی اور ترقی پسندوں کو از کار رفتہ قرار دے دیا۔ چھٹی بار ہلچل کا احساس تب پیدا ہوا جب نارنگ صاحب نے مابعد جدیدیت کا بگل بجایا اور ساتویں بار ادب میں تبدیلی کی لہر کا احساس تب پیدا ہوا جب اسّی کے بعد کے فنکاروں نے تخلیق ادب کے لیے ہر طرح کے نظریات کی پابندی کو غیر ضروری قرار دے دیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ ادب میں جو بھی ہلچل پیدا ہوئی وہ تخلیقی ادب کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئی بلکہ مختلف قسم کے نظریات و رجحانات کو غلط اور درست ثابت کرنے کی کوشش کے نتیجہ میں پیدا ہوئی یا پھر امامت کے حصول کے لیے پیدا ہوئی۔ چنانچہ جن لوگوں کو اپنی امامت کی جتنی زیادہ خواہش تھی ان لوگوں نے اسی شد و مد سے ہنگامہ برپا کیا اور اپنے نظریات و رجحانات کو فروغ دینے کے لیے نت نئے ادبی ہتھیاروں کے

ساتھ ساتھ غیر ادبی ہتھیاروں کا بھی استعمال کیا اور اپنے اختیار کی حد تک اپنے مخالفوں کا ناطقہ بھی بند کرنے کی کوشش کی، تو اگر آپ نئی نسل سے اس طرح کی ہلچل یا ہنگامے کی توقع رکھتے ہیں تو یہ آپ کی معصومیت ہے کیوں کہ یہ نسل کسی پر کچھ بھی تھوپنا نہیں چاہتی ہے۔ اور نہ یہ نسل اضطراب پیدا کرنے کے لیے ادب کی موت، خدا کی موت، انسان کی موت اور وجود کی گمشدگی کا رونا رو کر لوگوں کو گمراہ کرنا چاہتی ہے۔ تو پھر ہنگامہ یا ہلچل کیوں کر پیدا ہوگا۔ ہلچل اور اضطراب تو تب پیدا ہوتا ہے جب کسی بسی بسائی بستی کو اجاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن جب اجڑی ہوئی بستی کو کوئی خاموشی سے آباد کرنے میں جٹ جاتا ہے تو کوئی ہنگامہ نہیں ہوتا ہے۔ کہیں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوتی ہے۔ اور اگر ہلچل سے آپ کی مراد کچھ اور ہے تو آپ ہی وضاحت سے کام لیں۔ ویسے نئی نسل کے لوگوں نے جب نظریات و رجحانات کے حامل لوگوں کی نظروں کے سامنے اپنے آپ کو ہر طرح کی ذہنی مشروطیت سے آزاد قرار دے دیا تھا تو ایک شدید لہر اٹھی تھی ان لوگوں کے سینوں میں جو کسی نہ کسی طرح ادب میں امامت کی مسند پر براجمان رہنا چاہتے تھے۔ مگر یہ لہر، یہ ہلچل آپ نے پتہ نہیں کیوں محسوس نہیں کی۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے کہ ادب میں آٹھویں بار تب ہلچل پیدا ہوگئی تھی جب بھنڈر اپنے متنازع مضمون اور بعد ازاں متنازع کتاب کے ساتھ منصۂ شہود پر آئے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ لوگوں کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ بھنڈر نام کے اس غبارے کی ہوا بہت کثیف اور آلودہ ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو آج امامت اور سمت نما کا فریضہ وہی انجام دے رہے ہوتے اور سنجیدگی سے تخلیق ادب میں لگے لوگ حاشیہ پر نظر آتے۔ اگر آپ اس طرح کی ہلچل کے خواہاں ہیں تو فی الوقت ایک رسالہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ بڑی آسانی سے ہلچل پیدا کر سکتے ہیں۔

☆ چوتھا سوال غیر ضروری ہے کیوں کہ ہر طرح کے نظریات و رجحانات سے برأت کا اعلان اور بزرگ ناقدوں کی قدم بوسی سے گریز واضح کرتی ہے کہ یہ نسل گذشتہ نسل کے فنکاروں سے یکسر منفرد ہے اور وہ اپنے اس انفراد و امتیاز سے مسرور و مطمئن بھی ہے۔ ویسے ان باتوں کو تھوڑی دیر کے لیے نظر انداز کر دیا جائے اور خود آپ سے سوال کیا جائے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کے تناظر میں آپ خود کو منفرد محسوس کرتے ہیں یا نہیں؟ اگر آپ خود کو منفرد محسوس کرتے ہیں، کرتے ہی ہوں گے کہ مکھی پر مکھی بٹھانے کا کام تو آپ کر نہیں رہے ہیں تو پھر آپ خود اپنے منفرد ہونے پر اصرار کیوں نہیں کرتے ہیں؟ اور فاروقی صاحب کی شفقت پر کیوں مسرور ہوتے ہیں؟ بہر حال رہی بات انفرادیت پر اصرار کی تو کوئی بھی فنکار شخصی طور پر اس پر ضرور اصرار کرے گا اور وہ کرتا بھی ہے۔ مگر یہ انفرادیت خالص اور روایت سے منقطع نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً حضرت امیر خسرو اور کبیر اور ولی اور نظیر کی شعری روایت کی توسیع میں جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو اس واسطے سے ہم میراجی، ندا فاضلی، اور عنبر بہرائچی اور کسی حد تک سید شکیل دسنوی اور عالم خورشید اور شکیل اعظمی وغیرہ تک پہنچتے ہیں۔ مگر اس میں سے ہر شاعر منفرد ہے۔ اور اپنا اپنا انفراد اور امتیاز رکھتا ہے۔ اور چوں کہ حضرت امیر خسرو اور ولی دکنی ہزار سمت کے شاعر ہیں تو اس سلسلے کے دوسرے تسلسل پر نظر ڈالیں اور میر و غالب کے توسط سے ظفر اقبال، احمد مشتاق، اسعد بدایونی، عین تابش اور خالد عبادی تک نظر دوڑائیں تو یہاں بھی ہر شاعر اپنے اپنے امتیاز و انفراد کے ساتھ نظر آئے گا۔ ظاہر ہے کہ ظفر اقبال، بانی، زیب غوری، شہریار اور عرفان صدیقی ایک طرح کے شاعر نہیں ہیں۔ بالکل اسی طرح جمال اویسی، احمد محفوظ، خالد عبادی،

ارشد عبدالحمید، راشد طراز، نعمان شوق ایک جیسے شاعر نہیں ہیں۔ خورشید اکبر، ساجد حمید، منظور ہاشمی، ارشد کمال، شہپر رسول، ارمان نجمی، فرید پربتی، فرحت احساس، مہتاب حیدر نقوی، اور شاہد اختر ایک جیسے شاعر نہیں ہیں۔ حد یہ کہ خورشید اکبر، ثروت حسین، محمد اظہار الحق، خالد اقبال یاسر، راشد انور راشد، مشتاق صدف، طارق متین، عاصم شہنواز شبلی، رونق شہری، حنیف کیفی، سہیل اختر، اور اکرم نقاش بھی ایک جیسے شاعر نہیں ہیں، اور نہ قمر صدیقی، قاسم ندیم، ریاض لطیف، شاہد لطیف، کوثر مظہری، شہاب الدین ثاقب، جاوید ندیم اور عادل حیات ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ نئی نسل کے یہاں تخلیقی سطح پر جو رنگارنگی نظر آتی ہے ظاہر ہے کہ وہ تنوع اور رنگارنگی کسی بھی نظریات کے حامل فنکاروں کے یہاں نظر نہیں آتی ہے۔ اس کے باوجود اگر یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ نسل اپنی انفرادیت پر اصرار کیوں نہیں کرتی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ سوال کنندہ ہی سے سوال کیا جائے گا کہ آخر نئی نسل اپنی انفرادیت پر کس طرح اصرار کرے؟ کیا آپ کے پاس اپنی انفرادیت پر اصرار کرنے کا کوئی فارمولا ہے؟ اگر ہاں تو کم از کم اس فارمولے کے مطابق آپ تو اپنی انفرادیت پر اصرار کریں اور اپنا امتیاز واضح کریں۔ ممکن ہے کہ آپ کو دیکھ کر کچھ اور لوگ آپ کی ہمنوائی میں سامنے آجائیں۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ نئی نسل کا فنکار تخلیقی سطح پر یا طرز احساس اور اسلوب کی سطح پر اپنے پیش روؤں سے منفرد نہیں ہے، یا نئی نسل موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے دوسروں سے الگ نہیں دکھ رہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم تمام لوگ اپنے ہمعصروں کی عزت کرنے اور ان کے کلام کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے کی عادت اور خوبی سے محروم ہیں اسی لیے ہمیں ان کی انفرادیت نظر نہیں آتی ہے۔

ایک اور بات جس کا ذکر ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسّی کے بعد کے قلمکاروں میں آپس میں وہ تعلق خاطر نہیں ہے جو مثلاً ترقی پسندوں، جدیدیوں، یا مابعد جدیدیت والوں میں پایا جاتا تھا۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ آپ خود کو اسّی کے بعد کے شعرا میں شامل کرتے ہیں۔ اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ اسّی کے بعد کے فنکاروں کی تخلیقی ثروت مندی پر کھل کر گفتگو ہو۔ ان کی خدمات کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے تا کہ ان کا انفراد و امتیاز واضح ہو سکے۔ مگر جب آپ کے ہمعصروں میں سے کسی فنکار کی فنکارانہ خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی جینوین قلمکار مضمون لکھتا ہے اور اسے اشاعت کے لیے آپ کو یا آپ ہی کی قبیل کے کسی دوسرے مدیر یا مدیروں کو برائے اشاعت بھیجتا ہے تو اسے بڑی آسانی سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مگر کوئی شخص نہایت ناقص زبان میں میر، غالب، اقبال، خالد جاوید، کرشن چندر، ظفر اقبال، بانی اور سریندر پرکاش وغیرہ پر کوئی مضمون لکھ بھیجتا ہے تو اسے شائع کرنے میں بڑی خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ قول و فعل کے اس تضاد کے ساتھ کیا کوئی اسّی کے بعد کے قلمکاروں کی تخلیقی خدمات کا مقدمہ خود اعتمادی سے لڑ سکتا ہے؟

اکرم نقاش کا پورا اداریہ ہی مختلف قسم کے سوالوں کا پلندہ ہے۔ چنانچہ وہ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ: "یہ نسل منٹو، بیدی، کرشن چندر پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے۔ سریندر پرکاش اور قرۃ العین حیدر ان کے یہاں نہیں ملیں گے۔ محمد حسن عسکری، کلیم الدین احمد فاروقی، نارنگ اور وارث علوی جیسے نقادوں سے اس کا دامن خالی ہے، اس نسل کے منظرنامے میں راشد ہیں نہ میراجی۔ اختر الایمان ہیں نہ قاضی سلیم ہیں نہ علوی۔ ندا فاضلی، بانی، شہریار، زیب غوری نہ عرفان صدیقی اور نہ ہی محمود ایاز، سلیمان اریب اور فاروقی صاحب جیسے مدیران۔"

اکرم نقاش کا یہ اقتباس اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ نئی نسل ان تمام لوگوں سے منفرد ہے، اگر منفرد نہ ہوتی تو اس کے پاس بھی ایسے ہی شاعر وادیب اور ناقد و مدیران ہوتے۔ یہاں ذرا ایک منٹ رک کر غور کیجیے کہ جن قلمکاروں کا ذکر کیا گیا ہے اگر وہ اپنے قبل کے قلمکاروں جیسے ہوتے تو کیا وہ منفرد کہے جاتے؟ جواب یقیناً نفی میں ہوگا، تو بھائی نئی نسل ان لوگوں جیسی نہیں ہے تو یقیناً منفرد ہے۔

ویسے اکرم نقاش کو یہ سوالات تو جدیدیت والوں سے کرنے چاہئیں تھے کہ آپ نے تو بہت ہنگامہ کیا اور آپ کار، جہاں بھی بہت کامیاب رہا تو پھر آپ کے یہاں منٹو، بیدی کرشن چندر کیوں پیدا نہیں ہوئے؟ تب غالباً انھیں جواب ملتا کہ اگر ہمیں یہی لوگ پیدا کرنے ہوتے تو ہمیں جدیدیت کا راگ الاپنے کی ضرورت ہی کیوں پڑتی؟ غالباً اکرم نقاش یہ بات بھول گئے کہ ایک بار کسی نے بلراج منیرا سے پوچھا کہ :آپ کے خیال سے کرشن چندر کے افسانوں کی کیا اہمیت ہے؟ تو انھوں نے کرشن چندر کے افسانے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے کہا کہ یہی اہمیت ہے کرشن چندر کے افسانوں کی میری نظر میں۔ تو آپ ایسے لوگوں سے کیوں کر اصرار کر سکتے ہیں کہ آپ کے یہاں منٹو، بیدی، کرشن چندر کیوں نہیں ہیں؟ ظاہر ہے کہ نئی نسل کے قلمکار بہت مہذب اور شریف ہیں اس لیے، آپ کے پسندیدہ شاعروں میں سے کسی شاعر کی شاعری کی دھجی اڑا کر آپ کو یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ یہی حیثیت ہے فلاں شاعر کی ہماری نظروں میں۔ دوسری بات یہ کہ ہر زبان میں کچھ نابغہ فنکار اور قلمکار ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی دوسری مثال نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً: ولی، میر، انیس، غالب، اقبال، منٹو، بیدی، یا پھر حالی، کلیم الدین احمد، عسکری وغیرہ لیکن دیکھنے کی بات تو یہ بھی ہے کہ جب ولی، میر، غالب، اقبال اور حالی وکلیم الدین احمد اور عسکری، اور منٹو و بیدی اور قرۃ العین حیدر اور فاروقی و نارنگ صاحبان اردو میں نہ تھے تو پیدا ہوئے۔ تو پھر آپ ایسا کیوں سمجھتے ہیں کہ کل کوئی دوسرا نابغہ پیدا نہیں ہوگا؟ یا پھر یہ بھی تو آپ دیکھیں کہ غالب کو غالب بننے میں کتنے برس لگ گئے؟ اور خود منٹو کو منٹو بننے میں کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا، تو پھر آپ نئی نسل کو اس حوالے سے گھیرنے میں خود کو کیوں کر حق بجانب ٹھہراتے ہیں جبکہ ابھی اس نسل کے فنکاروں کا تخلیقی سفر جاری ہے۔ ویسے آپ کی جانکاری کے لیے عرض ہے کہ اس طرح کے سوالوں کے جوابات بہت پہلے دیے جا چکے ہیں۔ ''پہچان'' شمارہ ۲ میں خالد عبادی کا ایک مضمون ''تخلِ گریزاں'' کے عنوان سے تیرہ چودہ سال پہلے چھپا تھا اس کا ایک اقتباس دیکھیے:

> تخلیقات ہی تخلیقی ماڈل کی تشکیل کرتی ہیں، آج کی تخلیقات سے رفاقت کا معاملہ کرنے والے تنقیدی ماڈل کی عدم یابی کے پیچھے یہی منطق کام کر رہی ہے، اس صورت حال کو گمراہ کن انداز میں پیش کرنے کی کوشش ایک ایسی معصومیت ہے جواب سے پہلے عدیم النظیر رہی ہے۔
> سریندر پرکاش کو جس تنقیدی ماڈل نے سریندر پرکاش بنایا کیا اسی تنقیدی ماڈل نے عصمت کو عصمت، یا قاضی عبد الستار کو قاضی عبد الستار بنایا ہے۔
> ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ تو پھر اگر آج ادب ساجد رشید کو ساجد رشید یا ذوقی کو ذوقی بنانا چاہتا ہے تو کیا کرنا ہوگا۔ اس بات کو اس

طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ساجد رشید یا مشرف عالم ذوقی میں اگر نقاد کو
جس نے آج سے پچیس تیس سال پہلے کے کسی افسانہ نگار کی زبردست
پذیرائی کی ہو (جیسے کہ سریندر پرکاش کی) خامیاں ہی خامیاں نظر آئیں تو
کیا انھیں رد کر دینا چاہیے؟ کیا یہاں اس اعتراف کی ضرورت نہیں ہے کہ
جن خامیوں سے سابقہ سریندر پرکاش یا اسی قبیل کے کسی دوسرے یا
تیسرے افسانہ نگار کے یہاں پڑا تھا وہی خامیاں یا اسی نوع کی خامیاں
ان دونوں کے یہاں موجود ہیں۔ یعنی وہی روایتی فنی اسقام جو سریندر
پرکاش یا ان سے پہلے بھی بعض افسانہ نگاروں کے یہاں موجود تھیں آپ کو
نظر آئیں تو فوراً پہچان لی گئیں لیکن تعین قدر کا معاملہ تو خامیوں یا نقائص کی
بنیاد پر طے نہیں پاتا۔ اسی لیے جب خوبیوں کی تلاش کا معاملہ سامنے آیا تو
آپ کی پالکی دھرا گئی۔ آپ تو صرف انھی اوصاف اور خوبیوں سے واقف
ہیں جو سریندر پرکاش یا اسی قبیل کے کسی دوسرے افسانہ نگار کی افسانہ
نگاری کا حصہ ہیں۔ وقت حالات یا اپنے مزاج و افتاد سے مجبور ہو کر آج
کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کو جن اوصاف اور خوبیوں سے
مالا مال کیا آپ انھیں شناخت کرنے میں ناکام رہے اس لیے کبھی بھی نئے
ادب کو کمزوریوں یا نقائص کی پوٹلی بتاتے وقت اسے ماقبل کے ادب سے
ہیچ اور کمتر گردانتے وقت ستم ظریفی کی روایت قائم کرنے کے بجائے اپنی
کوتاہی اور کم ہمتی پر لعنت بھیجنی چاہیے۔"

اس اقتباس سے آپ کے کئی سوالوں کے جوابات مل جاتے ہیں۔ آیئے ایک اور اقتباس دیکھیے:

"میراجی اور فیض کی پذیرائی کرنے والوں سے بھی یہی کوتاہی سرزد
ہو رہی ہے۔ آج کے شاعر کو سمجھنے کے لیے اس تنقیدی ماڈل کا استعمال جو
فیض اور میراجی کے لیے کیا گیا کس طرح بارآور ہو سکتا ہے۔ آپ اس
تنقیدی ماڈل کو سامنے رکھ کر نئے شاعروں کو بے شک رد کر سکتے ہیں، لیکن
آپ کو یہ کہنے کا حق نہیں ہوگا کہ آپ نے انھیں سمجھنے کی کوشش کی یا اس
کوشش میں کامیاب رہے۔"

اب رہی یہ بات کہ نئی نسل کے پاس کلیم الدین احمد، محمد حسن عسکری، پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی اور وارث علوی نہیں ہیں، تو اس کی بھی کئی وجہیں ہیں۔ اول تو یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ سرسید تحریک کے زیر اثر جس طرح کے شعر و ادب کی تخلیق کا رواج عام ہوا اس کی تائید کے لیے قدیم تنقیدی ماڈل ناکافی تھا اس لیے حالی کو "مقدمہ شعر و شاعری" لکھنا پڑا تا کہ قلمکاروں کو گائیڈ لائن فراہم کیا جاسکے اس طرح

قلمکاروں کے لیے رہنمائی کی ایک وبا عام ہوگئی، جسے ترقی پسندوں نے اور بھی شدت سے ادب پر نافذ کیا اور ایک الگ ہی نوعیت کی تخلیق کا سلسلہ چل پڑا، جو محمد حسن عسکری صاحب کو راس نہیں آیا اور انھوں نے اسے رد کرنے کے لیے اسلامی ادب اور پاکستانی ادب جیسے نظریہ کو ہوا دی اور جہاں تک ممکن ہوا اس طرح کے تنقیدی رویے کو فروغ دیا کہ ترقی پسندی ہر محاذ پر کمزور نظر آنے لگے اس طرح ایک نئے طرز کا احساس پیدا ہوا مگر کلیم الدین احمد صاحب نے متذکرہ تمام تنقیدی رویوں پر ٹھوس قسم کے سوالات قائم کر دیے جس کی وجہ سے ترقی پسند تحریک جیسی دم دار تحریک پر لوگوں کو منہ کھولنے کی آزادی مل گئی اور وہ ایک خاص قسم کے ناقد کی حیثیت سے پہچانے گئے بعد ازاں فاروقی صاحب اور نارنگ صاحب نے مشترکہ طور پر اس عہد کی تخلیقی فضا سے انحراف کی راہ نکالی جسے بہت سارے قلمکاروں نے حرزِ جان بنالیا اور ان حضرات کی منشا کے مطابق تخلیق ادب میں جٹ گئے۔ اب ظاہر ہے کہ ان حضرات گرامی کی امامت میں جو ادب تخلیق کیا گیا تھا اس کے تعین قدر کے لیے پرانے تنقیدی ماڈل کسی بھی طرح معاون ثابت نہیں ہوتے اس لیے ان لوگوں نے تنقید کا نیا ماڈل پیش کیا اور اس کے تناظر میں اپنے حامیوں کا مقام متعین کیا اور بقول شخصے فاروقی صاحب نے کلیم الدین احمد اور محمد حسن عسکری اور اپنی علمیت کے امتزاج سے ایک ایسے ادبی رویے کو فروغ دیا جس نے ادب کے منظر نامہ کو پوری طرح بدل دیا اس صورت حال میں فاروقی صاحب اپنے رسالہ ''شب خون'' کی وجہ سے، بہت نمایاں ہوگئے اور نارنگ صاحب کی شخصیت کچھ دبنے لگی، چنانچہ انھوں نے مابعد جدید نظریے کے تحت جدیدیت میں پائی جانے والی خامیوں کو نشان زد کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور طرح کی فکر کی تبلیغ شروع کر دی، جس کی وجہ سے وہ بھی بہت نمایاں ناقد اور دانشور کی حیثیت سے پہچانے گئے اور چوں کہ وارث علوی صاحب بھی وسیع المطالعہ انسان تھے اس لیے جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا انھوں نے فاروقی صاحب، کلیم الدین احمد صاحب اور نارنگ صاحب کی تنقیدی خامیوں کی نشاندہی کی۔ اور ان لوگوں نے جس طرح کے ادب کو اعلیٰ اور معیاری قرار دیا تھا اس کی خامیاں بھی واضح کیں۔ سو وہ بھی اپنے ہمعصروں میں منفرد اور قد آور نظر آنے لگے۔ اور وہ اپنے مزاج کی تختی کے سبب دوسری طرح کے ادب پر توجہ نہیں کر سکے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جانے انجانے انھوں نے بھی قلمکاروں اور فنکاروں کے لیے گائیڈ لائن فراہم کرنے کا فریضہ انجام دیا۔ اس طرح وہ پورا عہد فنکاروں کی بہ نسبت رجحان ساز حضرات کے نام منسوب ہوگیا۔ اس صورت حال نے نئی نسل کے قلمکاروں اور فنکاروں کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے ہر طرح کی گائیڈ لائن، اور رہنمائی سے بغیر کسی جارحیت کے انحراف کا اعلان کر دیا اور ایک کھلا اور کشادہ ماحول بنانے کی کوشش کی تاکہ فنکار آزادی کی سانس لے سکیں اور وہ اپنے تجربات و احساسات کو اپنے ہی اسلوب و انداز میں پیش کر سکیں سو اس عہد کے ناقدوں نے بھی ان کا ساتھ دیا تاکہ پھر سے گائیڈ لائن والی وبا عام نہ ہو اس لیے نئی نسل کے یہاں آپ کو اس طرح کے جارح ناقد نظر نہیں آتے ہیں۔ اور ہاں اس طرح کے سوالوں کے جوابات بھی بہت پہلے کئی لوگوں نے فراہم کر دیے تھے جو غالباً آپ کی نظروں سے نہیں گزرے ہیں، بہر حال ناصر عباس نیر کے مضمون ''معاصر اردو تنقید اور ہم عصر اردو ادب'' کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''معاصر اردو تنقید کی پیش رو اردو تنقید میں CANNONIZATION

غالب رجحان تھا ترقی پسند، ہیئتی تنقید (جسے جدیدیت نے اختیار کیا) اور نئی
شاعری کی لسانی تشکیلات CANNON تھیں۔ نیز ترقی پسندوں میں فیض،
جدیدیت پسندوں میں راشد اور نئی شاعری کی تحریک میں ظفر اقبال کینن ہیں۔
چوں کہ کینن ہیں اس لیے ان کی اختیار کردہ شعریات نہ صرف قابل تقلید ہے
بلکہ دوسری وضع کی شعریات کو جانچنے اور اس کے متعلق قدری فیصلے جاری
کرنے کا پیمانہ بھی ہے معاصر تنقید CANNONIZATION کی ناقد ہے اس
کی دلیل ہے کہ کینن بنانے کا مطلب ایک قسم کے جمالیاتی اور شعریاتی جبر کو راہ
دینا ہے۔ جبر کی فضا میں ان آوازوں کی پہچان تک نہیں ہو سکتی جو کسی خاص
جمالیاتی و شعریاتی کینن کے اثر و عمل کے دائرے سے باہر کہیں برپا ہوتی ہیں۔
یہی نہیں اگر آپ فیض کو کینن بناتے ہیں تو راشد اور مجید امجد کی پہچان محال ہے
اور اگر راشد کو کینن قرار دیتے ہیں تو منیر نیازی اور وزیر آغا کی نظم کی جمالیاتی قدر
کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے اس طرح ظفر اقبال کی غزل کو کینن سمجھ لیا جائے تو
شاہین عباس ضیاء الحسن، اور شنا ور اسحاق جیسے نئے غزل گوؤں کی تفہیم و تحسین
میں دقت پیش آتی ہے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا ہے اگر ہم مغربی شعریات
کو کینن بنالیں تو کلاسکی مشرقی شعریات بے معنی یا نا قابل فہم ہو جاتی ہیں۔"

ناصر عباس نیر نے جانے انجانے میں خالد عبادی کے خیالات کی تائید کی ہے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا ہے کہ عبادی کا مضمون ان کی نظروں سے گزرا تھا یا نہیں لیکن وہ بھی اسی نتیجہ تک پہنچے ہیں جس کا ذکر عبادی نے کیا ہے، یہ بات تو صاف ہو ہی جاتی ہے کہ نئی نسل کے پاس آپ کو جو قطب نما ناقدین کی کمی کا شکوہ ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس نسل کے قلمکاروں نے کوئی کینن نہیں بنایا ہے اور نہ کسی کینن کو جز و جان وایمان بنایا ہے۔ ہاں جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اس نسل کے قلمکاروں نے ادب کو کینن کلچر سے آزاد کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک طرح سے تازہ ہوا میں کھل کر سانس لی ہے اور دوسروں کو بھی تازہ ہوا میں سانس لینے کے لطف و انبساط سے آگاہ کیا ہے۔ جو اپنے آپ میں بڑی بات ہے۔ آپ اگر کینن سے باہر نکل کر دیکھیں گے تو آپ کو بھی اپنی نسل کے پاس اہم اور معتبر ناقدوں کی اچھی خاصی تعداد نظر آئے گی۔

☆ سوالوں کے آخری حصے پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے۔ یعنی نئی نسل کے پاس فاروقی، محمود ایاز اور سلیمان اریب جیسے مدیران گرامی کیوں نہیں ہیں؟ محمود ایاز صاحب اور فاروقی صاحب کی حد تک تو بات قابل قبول ہے۔ مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا محمود ایاز صاحب کا 'سوغات' اور فاروقی صاحب کا 'شب خون' کسی خاص مشن کے لیے نہیں نکالا گیا تھا؟ اگر ہاں تو بات بالکل صاف ہے کہ نئی نسل کے پاس بجز تخلیقی وفور کے کوئی مشن ہی نہیں ہے۔ اس لیے ان کے یہاں کوئی آرگن ٹائپ رسالہ بھی نہیں ہے۔ اور اگر معیار کے تناظر میں یہ سوال کیا گیا ہے تو یاد رہے کہ سوغات اور "شب خون"، "نقوش"، سویرا، ساقی اور ادب لطیف وغیرہ ہی کی توسیع تھے۔ آپ جب سلیمان اریب

صاحب کا نام بھی محمود ایاز صاحب اور فاروقی صاحب کے تسلسل میں لیتے ہیں تو پھر بلراج مینرا کے ''شعور'' اور باقر مہدی کے ''اظہار'' کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یا پھر زبیر رضوی کے ''ذہن جدید''، اور مغنی تبسم کے ''شعر و حکمت'' کو کس کھاتے میں ڈالتے ہیں۔ یا پھر اشعر نجمی کے ''اثبات'' کا ذکر کیوں نہیں کرتے ہیں۔ اب اگر آپ اسی تسلسل اور تناظر میں آگے دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ نئی نسل کے ایک شاعر عاصم شہنواز شبلی کا ''اثبات و نفی'' بھی معیاری رسالہ تھا۔ ساجد رشید کا ''نیا ورق'' بھی بہت اہم رسالہ ہے۔ خورشید اکبر کا ''آمد'' اور عارف ہندی اور ساتھیوں کا ''نئی صدی'' بھی بہت معیاری رسالے ہیں۔ نوشاد مومن کا ''مژگاں'' بھی نظر انداز کرنے والا رسالہ نہیں ہے، جبکہ سب سے اہم رسالہ وہ بھی نئی نسل کی تخلیقی خوبیوں کا اعتراف کرنے والا رسالہ پروفیسر وہاب اشرفی کا ''مباحثہ'' تھا آپ نے اس کا بھی نام نہیں لیا۔ اور نئی نسل کے اہم شاعر قمر صدیقی کے رسالہ ''اردو چینل'' کو بھی آپ نے نظر انداز کر دیا، جب کہ یہ سب کے سب اہم اور بہت معیاری رسائل ہیں یا تھے۔ تو آپ بہر حال نئی نسل کے پاس اچھا رسالہ نہ ہونے کا مقدمہ جیت نہیں سکتے ہیں جب کہ آجکل چودھری ابن النصیر کا رسالہ ''پہچان'' بھی نئی نسل ہی کی تخلیقی فراست کا آئینہ نظر آتا ہے۔ اجتماعی طور پر ان تمام لوگوں کا جو دل سے کسی نہ کسی رجحان ساز حضرات سے عقیدت رکھتے ہیں المیہ یہ ہے کہ وہ ڈھلتے سورج کی یرقانی روشنی پر نظریں جمائے ہوئے ہیں اس لیے انھیں سر پہ چمکتا چاند نظر نہیں آتا ہے۔

ادبی رسالہ کے غیر معیاری ہونے کا رونا رونے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ خود اپنے رسالے کو معیاری بنائیں۔ نئی نسل کی عمدہ تحریروں کو جگہ دیں اور مدیرانہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تمام چیزوں کی شمولیت اور اشاعت سے گریز کریں جو بڑے ناموں سے منسوب ہونے کے باوجود غیر معیاری اور از کار رفتہ یا اُگلے ہوئے لقمے کی جگالی ہوں۔ جب آپ کے لیے 'سوغات' اور 'شب خون' جیسا سمت نما ہے تو آپ بے سمتی کا شکار کیوں ہو رہے ہیں آپ کے اس شمارے میں کئی ایسے مضامین ہیں جو بے وقت کی راگنی معلوم ہوتے ہیں۔ اور چند ایک تو اپنی زبان کی ناہمواری اور نقص کی وجہ سے کسی تیسرے درجہ کے ادبی رسائل میں ہی شامل ہونے کے لائق ہیں۔ پھر بھی آپ نے انھیں اہتمام سے شائع کیا ہے اور چند اچھے مضامین پر اولیت بھی دی ہے۔ تو بھائی جس ادبی حلقے کے پاس آپ جیسے مروت کے حامل مدیران ہوں گے تو ان کے یہاں بہت معیاری رسائل کہاں سے آئیں گے۔ لیکن ہم آپ کی مدیرانہ صلاحیت اور ادب شناسی سے مایوس نہیں ہیں۔ آپ نے جس طرح راہی فدائی جیسے جدید شاعر پر عبدالاحد ساز، راشد جمال فاروقی اور بالخصوص نعمان شوق کو اولیت دی ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ آئندہ آپ دوسرے مشمولات کے انتخاب اور ترتیب میں بھی اسی جرأت سے کام لیں گے۔

☆☆☆

(۲)

انسانی زندگی کی مقصدیت و معنویت ؟؟

[آزادی رجحانات اور اخلاقی اقدار کے حوالے سے]

● شرجیل احمد خاں

انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ زندگی کی کوئی غرض وغایت ہے بھی یا نہیں؟ ہمارا مطمحِ نظر کیا ہے؟ آخر وہ کون سی اعلیٰ قدریں ہیں جن کے حصول کے لئے ہم کوشاں ہوں۔ قدریں موضوعی ہیں یا معروضی؟ کیا قدریں انسانی اعمال سے ماورا اپنا وجود رکھتی ہیں؟ کیا ہمیں اشیا کی طلب ہے کیوں کہ وہ قیمتی ہیں، یا اس کے برعکس وہ قیمتی ہیں اسی لیے ہمیں اُن کی طلب ہے؟ انسانی زندگی میں اخلاقیات کا کیا رول ہے؟ اخلاقیات اپنی ماہیت میں اضافی ہیں یا مطلق؟ ہمیں کہا جاتا ہے کہ اخلاقی قوانین کے اُصولوں پر کامیاب زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کامیاب زندگی کیا ہے؟ اخلاقی قوانین کیا ہیں؟ ہماری زندگی کے مقاصد کیا ہیں؟ مفکرین نے کچھ ایسے اُصولوں کی نشان دہی کی ہے جن کی پیروی کر کے ہم کامیاب اور نیک زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں کچھ مکاتبِ فکر کا جائزہ لیں گے:

(ا) نظریہء وجدانیت [Intuitonism]: مفکر کانٹ اس نظریہ اخلاق کا شارح تھا۔ کانٹ کے مطابق ہر شخص میں یہ صلاحیت موجود ہے۔ جس کی مدد سے وہ اچھے، برے، خیر و شر میں تمیز کر سکے۔ اگر کہیں کوئی شبہ ہو تو انسان کو اپنا ضمیر ٹٹولنا چاہیے، ضمیر خدا کی طرف سے ایک عطیہ ہے۔ یہ ہر شخص کے پاس ہے۔ ہر شخص اس قابل ہے کہ اپنے ضمیر کے ذریعہ، خیر و شر کی تمیز کر سکے۔ اس کے لیے اس کو کسی علم یا

تجربہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم پر اخلاقی قوانین کی تعمیل ہر حالت میں لازم ہے۔ اس کے لئے کوئی شرط مقرر نہیں۔ ایسے اعمال کے لیے کانٹ 'Cotegorical Imperative' کی اصلاح استعمال کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ فرض کی ادائگی اُسی وقت لازم ہے جب ہم خوش ہوں یا جب ہمارا مقصد سماجی بہبود ہو۔ ضمیر کی آواز ہے: "نیک کام کرو۔" اخلاقی قانون کے وقار کا تحفظ ہی اخلاقی عمل کا محرک ہے۔ کانٹ [Kant] کے مطابق: آزادی کی پاسداری، ایمان داری، عدل وانصاف پر مبنی اعمال ہی اعلیٰ خیر ہیں۔

لیکن صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ اپنا فرض ادا کرو۔ میرا فرض کیا ہے؟ ہم اپنے فرض سے کس طرح نپٹیں؟ کانٹ [kant] نے فرض کی ادائیگی کے ضمن میں ایک اصول کی نشان دہی کی ہے۔ اصول یہ ہے کہ: تم اپنا کام اس طرح انجام دو کہ اُس کی پشت پہ جو عزم ہے اس کا اطلاق ایک اصول کی طرح سبھوں پر یکساں ہو۔ یہ بات ایک مثال سے سمجھائی جاسکتی ہے: فرض کرو کسی بچّے کی پرورش کی خاطر میرے پاس کچھ رقم محفوظ ہے۔ اچانک میری مالی حالت بگڑ جاتی ہے اور میں سخت مجبوری کی حالت میں اس رقم کو اپنے ذاتی کام میں خرچ کردینا چاہتا ہوں یہ خیال کرتے ہوئے کہ ایک دو ہفتہ میں رقم واپس کردوں گا۔ کیا یہ عمل صائب ہوگا، ایسی صورت میں ہمیں کانٹ کے بتائے ہوئے اصول پر کاربند ہونا چاہئے۔ کیا میں چاہوں گا کہ میرا یہ فعل ایک عمومی اصول کی جگہ لے لے جس کا اطلاق ہر فرد پر یکساں ہو۔

اس بہترین اصول کے علاوہ کانٹ نے ایک اور اصول کی نشان دہی کی ہے: کوئی کام کرنے سے پہلے یہ خیال رکھو کہ انسانیت جو تمھاری ذات یا دوسرے افراد کی ذات میں ایک مقصد کی طرح ہے، یہ ذریعہ نہیں ہے۔ کسی بچّے، کسی عورت، کسی مزدور کو اپنے ذاتی مفاد کا ذریعہ مت بناؤ۔ انسانی شخصیت نہایت ہی مقدس ہے۔ تو یہ ہے کانٹ (Kant) کا بلند نظریہ اخلاق جو "وجدانیت" سے موسوم ہے: تم اپنا فرض ادا کرو کیوں کہ یہ تم پر فرض ہے۔

(۲) نظریہ وتفاعلیت [Functionalism] : ارسطو اور افلاطون ایسی مقتدر ہستیاں اس نظریہ کی شارح ہیں۔ افلاطون کا موقف ہے کہ انسان کا اعلیٰ ترین وصف، اس کی ہم آہنگ شخصیت ہے۔ ایک کامل انسان وہ ہے جس کی ہر صلاحیت، دوسری تمام صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہوکر کام کرتی ہو۔ ارسطو کا موقف ہے کہ انسانی بہبودی ایک نظا علی شعور ہے۔ ایک افضل گھوڑا وہ ہے جو گھوڑے کا فعل اپنے معیار کے مطابق سرانجام دے۔ کسی بھی شے کی خوبی اس کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں کی معیاری کارگردگی میں مضمر ہے۔ لاسطور کے مطابق انسان کی اعلیٰ ترین صلاحیت اس کی فراست [Intellect] ہے۔ انسان ایک مفکر ہے۔ ارسطو انسان کی فکری صلاحیت کو سب سے اعلیٰ درجہ دیتا ہے۔ عقلی سرگرمی ہی ارسطو کے نزدیک اعلیٰ ترین خیر ہے، جو سائنسی دریافت، فلسفیانہ تفکر اور حقیقت کی تلاش میں منکشف ہوتی ہے۔ ارسطو کے نزدیک خدا بھی ایک مفکر ہے جو خیال کا خیال ہے۔ یعنی خیال مطلق۔

موجودہ دور میں نظریہ تفاعلیت نے ایک نئی شکل اختیار کرلی ہے۔ وہ عقل اور فراست ہی کو سب کچھ نہیں مانتا، انسان کی اور بھی سرگرمیاں ہیں جو قدر و منزلت کی حامل ہیں: مثلاً تخلیق، سیاحت، ایجادات، مہم جوئی۔ ہم صرف ذہن اور عقل نہیں ہیں۔ ہمیں روحانی سرگرمیاں بھی اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ کھیل تماشا، تفریح بھی ہماری دلچسپیاں ہیں۔ اُن سے ہماری شخصیت کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ ہم ناممکن کو ممکن بنانے والے خوابوں کی تعبیر ہیں۔

اس خیال کے مطابق کامیاب زندگی سرگرمیوں کا نام ہے۔ ہم کچھ گزرنا چاہتے ہیں، ہم کارہائے نمایاں انجام دینا چاہتے ہیں۔ کام ہی سے ہم کامیاب ہیں اور یہی ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کی منزل ہے۔ حواسِ خمسہ کی تسکین اصل زندگی نہیں ہے۔ زندگی اندیشۂ سود و زیاں سے برتر ہے۔ ہمیں ان تمام سرگرمیوں سے دلچسپی ہے جو ہنر، پیش قدمی، جاں نثاری اور لگن کھوجتی ہیں۔ ہم موت سے بھی نہیں گھبراتے۔ ہمارے جوشِ حیات کے آگے موت اپنا سپر رکھ دیتی ہے۔ انسانی ارتقا کی کہانی اس کی شاعری، سنگ تراشی، مصوری، تاریخی وقائع میں بکھری پڑی ہیں۔ انھیں دیکھے جایئے۔ کون سی آگ، کون سی تپش زندگی کی آگ کو روشن کیے ہوئے ہے۔ وہ اس کا جوشِ حیات ہی ہے جو اس کو جان لیوا مہموں، خطرناک کاموں میں سرگرم رکھتا ہے اور یہی ان کی زندگی کا ماحصل ہے۔ ہم اسے کہیں جنگ، کہیں کسی کے تعاقب، کسی کی زلفِ گرہ گیر میں گرفتار، کہیں فن کی باریکیوں میں مگن، کہیں سیاسی گٹھ جوڑ، کہیں نغمہ و سرود، پوجا، عبادت، کہیں مطالعہ اور دھیان میں غرق دیکھتے ہیں۔ یہ سب اس کی تسکین کے سامان ہیں اور انھی میں بے پایاں خوشی و مسرت کا احساس پنہاں ہے۔

آج کا انسان خالق ہے۔ وہ تخلیق میں مصروف ہے۔ وہ اپنے فن اور ہنر سے حُسن و زیبائش سے پُرنور ایک نئی دنیا کی تشکیل کا خواہاں ہے۔ وہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ وہ نئے تجربے کرتا ہے۔ وہ اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر سمندر کی تہوں سے موتی نکال لاتا ہے۔ وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ پالینے کی آرزو میں بے چین ہے۔ وہ دنیا کی ساری دولت، سارا حُسن اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ اُس کی نظریں کوئی خوبصورت چہرہ، دائرہ، خم، فطرت کے دلکش مناظر کی متلاشی ہیں۔ اس کی آنکھیں نالۂ نیم شبی سے تر ہیں۔ وہ خدا اور فطرت کے جمال اور جلال پہ حیراں ہے۔ وہ عالمِ محویت میں ہے۔ ایسے ہی امان، آہنگ، اور عفو کا متمنی ہے۔ وہ خواب دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ ایسی دنیا کا خواب دیکھتا ہے، جہاں جنگ و جدل کا گزر نہ ہو، جہاں اَمن چین اور عدل کا راج ہو، خوشی اور لذّت اس کا مقصود نہیں۔ اصل خوشی اس کی آرزوؤں کی تکمیل میں مضمر ہے۔

(۳) نظریہ لذّتیت [Hedonism] : Hedonism یونانی زبان سے مشتق ہے۔ اپنی سادہ شکل میں اس نظریہ کے مطابق لذّت ہی اعلیٰ خیر [Highest goo] ہے۔ یونانی مفکر

ارسٹیپس Aristippus، جو سقراط کا شاگرد تھا، نے سب سے پہلے یہ خیال پیش کیا کہ لذت ہی خیرِ اعلیٰ ہے۔ اس نظریے کے تصور ہی وہ فرد کی لذت کو شامل کرتا ہے۔ وہ سماجی بہبودی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ لذت سے اس کی مراد صرف جسمانی اور مادّی لذّت ہے۔ بعد میں اس نظریہ میں بالیدگی آئی۔ اپی کورین [Epicurian] نے کہا کہ جسمانی نہیں، ذہنی خوشی انسانی زندگی کا اعلیٰ مقصد ہے۔ اُس کے خیال میں رنج والم سے نجات ہی مسرّت کی انتہا ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دانشمندی اور منصفانہ روی کے بغیر پُر مسرّت زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ Bentham نے اس نظریہ کو نئی شکل دی جسے Utilitarianism کہا جاتا ہے۔ Bentham کے مطابق لذت و مسرّت اعلیٰ مقاصد تو ہیں، لیکن لمحاتی نہیں پائدار۔ ایک فرد کے لیے نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے۔ 'The greatest happiness for the greatest numbers' اس کا مشہور مقولہ ہے۔

جے۔ ایس۔ مل [J.S. Mill] نے اس نظریہ کو مزید ارتقا بخشا۔ وہ 'زیادہ خوشی زیادہ لوگوں کے لیے' کے مقولے کی تائید تو کرتا ہے، لیکن خوشی میں صفت کی تفریق بھی کرتا ہے۔ جب کہ بین تھم کا کہنا تھا کہ خوشی میں جنگ کی تفریق نہیں ہوتی۔ ہمارا مقصد زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل کرنا ہے۔ چاہے وہ جسمانی ہو یا ذہنی ہو یا دوسرے ذرائع سے۔ J.S. Mill اس نظریے کی تردید کرتا ہے۔ اُس نے کہا: ''ایک غیر مطمئن انسان ایک مطمئن سور [Pig] سے بہتر ہے۔ اسی طرح ایک غیر مطمئن سقراط ایک مطمئن احمق سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔''

یہ تو تھے نیک زندگی گزارنے کے اصول۔ لیکن پھر بھی زندگی کی معنویت کے ضمن میں کچھ سوالات تشنہ رہ گئے مثلاً زندگی کیا ہے؟ ہم کہاں سے آئے ہیں؟ ہم کہاں جائیں گے؟ ہم ہیں کون؟ زمانہ قدیم سے مختلف مکاتب نے ان سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ ہم یہاں اُن میں سے کچھ نظریوں کا جائزہ لیں گے:

(ا) فنائیت / لاوجودیت / نیستی / [Nihilism] : اس نظریے کے مطابق زندگی کی کوئی معنویت نہیں ہے۔ فلسفہء وجودیت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ وجودیت کی طرح Nihilism بھی انسانی زندگی کی معنویت اور اقدار کا منکر ہے۔ اخلاقیات کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں ہے۔ علم ممکن نہیں ہے اور نہ سچائی کا کوئی وجود ہے۔ جب ہمیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد نہیں ہے، اور زندگی گزارنے کا کوئی فائدہ ہے نہ اصول تو ہم پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ لسانیات میں ردِ تشکیل اور مابعد جدیدیت کے تصورات Nihilism ہی کی پیداوار ہیں۔ Nihilism کی تین شکلیں ہیں: Metaphysical، Moral اور Epistomological۔

Metaphysical : اس نظریہ کا موقف ہے کہ اشیا کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔

ایسی دنیا ممکن ہے جہاں ٹھوس معروضی اشیا کا وجود نہیں ہے، اُن کے Abstractions بھلے مل جائیں۔ چوں کہ سچائی اعلیٰ سطح سے عاری ہے اسی لئے یہ معنویت سے بھی عاری ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی شے موجود نہیں ہے جو حقیقی اور قدر کی حامل ہو۔ Nihilism کا موازنہ Solopism سے کیا جا سکتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اوّل خودی کی نفی کرتا ہے تو دوئم خودی کا اثبات۔

Epistomological Nihilism: کی یہ شکل تمام علوم کا انکار کرتی ہے۔ یہ گویا Skepticism تشکیک کی انتہائی صورت ہے۔

Moral Nihilism : اس کے مطابق اخلاقیات کا کوئی وجود نہیں ہے۔ نظامِ قدرت میں اخلاقیات کا وجود فرضی ہے۔ ایک عمل کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیا جا سکتا۔ اس معیار کے پیشِ نظر Nihilism کا خیال ہے کہ انسان کا قتل چاہے اس کی کوئی وجہ ہو، نہ ہو ہی صحیح ہے نہ غلط۔ کچھ Nihilist اخلاقیات کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے لیکن ان کا خیال ہے کہ اگر اخلاقیات کا وجو ہے تو یہ فقط انسانی دماغ کا اختراع ہے۔ اسی لیے اس کی ماہیت نقلی ہے۔ مختلف حالات میں اخلاقیات کے مختلف معنی ہوتے ہیں۔ اخلاقیات اپنی ماہیت میں مطلق [absolute] نہیں ہے۔ مثال کے طور پر کسی انسان کا قتل Nihilist کی نظر میں غیر اخلاقی فعل نہیں ہے۔ یہ عمل صرف اس لیے برا ہے کہ وہ انسان کو زندگی سے محروم کر دیتا ہے جو مقتول کے لیے مثبت قدر تھا۔

(۲) Cynicism : یہ اصطلاح دیرینہ یونانی مفکروں Cynics سے مشتق ہے، جنھوں نے اپنے زمانے میں رائج مذہبی، تہذیبی روایت کو یکسر رد کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے زندگی گزارنے کے طور طریقے، پوشاک اور عادات سے بھی کنارہ کشی کر لی۔ اُن کا کہنا تھا کہ انسان کو سادہ زندگی اختیار کرنی چاہیے، جہاں جھوٹی نمائش، جھوٹی شان وشوکت کا گزر نہ ہو بلکہ اعلیٰ خیال اعلیٰ نصب العین کی جلوہ گری ہو۔ دراصل Cynicism ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان فطری طور سے خود غرض واقع ہوا ہے۔ اُن پر بھروسہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ آج کے انسان کے جذبات اوّلین انسان کے جذبات کے مماثل ہیں۔ اوّلین انسان اپنی بقا کے لیے اپنے جذبات سے کام لیتا تھا۔ ان کی زندگی جبلی تھی، عقلی نہیں۔ آج بھی وہی صورت حال قائم ہے۔ Cynic نسلِ انسان سے ہی بدظن ہیں۔ اُن کے خیال میں عام انسان کو خواہش، الذت، لالچ، مادیت رعونت سے اجتناب کرنا چاہیے۔ یہ جذبات جھوٹے اور ہیچ ہیں جس سے انسان ذلیل وخوار ہو جاتا ہے۔ یہ زندگی میں معنویت نہیں پروتے ہیں۔ ان جھوٹے جذبات سے اجتناب کرنا چاہیے۔

(۳) لایعنیت / مہملیت [Absurdism] : انسان زندگی میں معنویت

اور اقدار کا متلاشی رہا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے۔ لیکن وہ ان کو کھوج نکالنے میں اپنے کو نااہل پاتا ہے۔ فلسفہ میں اس تضاد کو بہملیت کا نام دیا گیا ہے۔ اس تناظر میں مہملات [Absurds] کو ہم منطقی طور سے ناممکن نہیں کہیں گے گو کہ انسانی طور سے یہ ناممکن ضرور ہے۔ کائنات اور انسانی ذہن دونوں اپنے تئیں مہمل نہیں ہیں بلکہ بہملیت ان دونوں کے بیچ تضاد کی پیداوار ہے۔ چنانچہ بہملیت ایک مکتب فکر ہے جس کا موقف یہ ہے کہ زندگی کی معنویت اور مقصدیت جاننے کی ہماری خواہش آخر آخر تک ناکامیاب ہی رہے گی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہماری محض تھوڑی سی عقل، وسعتِ کائنات کو سمجھنے اور جاننے سے قاصر ہے۔ اقبال کا شعر ہے:

یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک
ستم ہے یا کہ کرم تیری لذتِ ایجاد

پھر بھی کچھ اہل بہملیت کا موقف ہے کہ مہمل صورتِ حال کو قبول کر لینا چاہیے، اور ساتھ ساتھ زندگی کی مقصدیت اور معنویت کو آشکار کرنے کی سعی جاری رکھنی چاہیے۔

(۳) **Solopism** : یہ اصطلاح لاطینی لفظ Solus سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی اکیلا ذات سے ہے۔ Solopism کا موقف ہے کہ دنیا میں صرف اپنے ذہن کا وجود ہے۔ میرے ذہن کے خارج میں کوئی بھی شے یقینی نہیں ہے۔ خارج کی دنیا ایک سراب ہے۔ کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ یہ نظریہ Nihilism سے مماثلت رکھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ Nihilism ذات کی نفی کرتا ہے جبکہ solopism ذات کا اقرار۔ دونوں کے نزدیک انسانی زندگی، معنویت اور مقصدیت سے عاری ہے۔

(۴) **Stoicism** : اس مکتبِ فکر کا بنیاد گزار یونانی مفکر زینو [Zeno] تھا۔ اس فکر کی بنیاد تیسری صدی قبل مسیح کے اوائل میں رکھی گئی۔ اس مکتبِ فکر کا موقف یہ ہے کہ تخریبی جذبات، خیالات کی کج روی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ایک درویش Sage یا اخلاقی طور سے ایک مکمل انسان اس طرح کے تخریبی جذبات سے ہمیشہ اپنے کو پاک رکھتا ہے۔ Stoics کے مطابق ہمیں فطرت اور فطری قوانین سے مطابقت رکھنی چاہئے۔ فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔ ہم جبریت determinism کے شکار ہیں۔ ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتے۔ ہم قفس میں مقید ہیں۔ میر کا شعر ہے:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

ہم میں قوتِ تحمل لازم ہے تا کہ ہم آفاتِ ناگہانی کا سامنا کر سکیں، ورنہ ہم ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ Stoicism کے اقوال درج ذیل ہیں:

(۱) خواہشات کی تسکین سے نہیں بلکہ خواہشات کے تدارک سے ہم نجات حاصل کر سکتے ہیں۔
(۲) انسان اشیا سے اذیت نہیں پاتا بلکہ اشیا کے متعلق اپنے تصور سے اذیت پاتا ہے۔

(۳) اگر وہ ناخوش ہے تو اسے سمجھنا چاہیے کہ ناخوشی کا وہ خود ذمے دار ہے۔

(۴) فطرت نے میری تشکیل میری بھلائی کے لیے کی ہے نہ کہ میری بُرائی کے لیے۔

(۵) ''مجھے تکلیف ہے'' ایسا احساس دل میں مت لاؤ۔

(۶) ہر صورت میں ضبط و تحمل سے کام لو۔

(۷) جو کچھ تمھارے ساتھ ہو رہا ہے، اسے ہونا ہی تھا۔ فطرت کا قانون اٹل ہے۔ خود کو فطرت سے ہم آہنگ رکھو، اسی میں عافیت ہے۔

(۶) Epicureanism : اپی کورین ازم کا موقف ہے کہ غم سے نجات ہی مسرّت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ غم کو پاس بھٹکنے نہ دیں۔ جو خوش آئند ہے وہی خیر ہے۔ ہمیں موت سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جب ہم ہیں، موت نہیں ہے اور جب موت ہے، ہم نہیں ہیں۔ موت میں احساس نہیں ہوتا۔ اپی کورین نے بے دریغ خوشی منانے کی تلقین کی۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہر لمحہ دکھ درد سے دور رہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اپی کورین کا قول محال ہے کہ : 'کیا خدا شر کو مسدود کرنے کا خواہاں ہے، لیکن ایسا نہیں کرنے میں اس کی کیا مصلحت ہے؟ کیا اس حالت میں وہ خود مختار [Omnipotent] نہیں ہے؟ اور وہ ایسا کرنے کی قدرت رکھتا ہے لیکن خواہاں نہیں ہے تو ایسی حالت میں اسے کیا سمجھا جائے۔ اور اگر وہ قدرت رکھتا ہے اور خواہاں بھی ہے، تو شر کہاں سے آ گیا؟ ....؟؟'

(۷) عملیت Pragmatism : یہ ایک فلسفیانہ روایت ہے جو 1860ء کے آس پاس امریکہ میں فروغ پایا۔ عملیت اس نظریہ کو رد کرتا ہے کہ فلسفہ کا تفاعل حقیقت کی نمائندگی یا عکاسی سے ہے۔ اس کے برعکس اس کا موقف یہ ہے کہ زیادہ تر فلسفیانہ مسائل مثلاً علم، زبان، ادراک، معنی آفرینی اور سائنس کو اس کی افادیت کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے نہ کہ سچائی کی عکاسی میں۔

(۸) کارواک Carvat : کارواک ہندو فلسفہ میں تقریباً ۶۰۴ ق م میں منظر عام پر آیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندو دھرم کی صحائف Scriptures میں درج تمام باتیں جھوٹ ہیں۔ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ موجودہ زندگی ہی سب کچھ ہے۔ اس لیے ہم اس زندگی میں خوب خوشی منائیں۔ کارواک روح سے انکار کرتا ہے۔ ادراک ہی علم کا واحد ذریعہ ہے۔ ہم حواس خمسہ کے ذریعہ ہی کسی شے کو جان سکتے ہیں۔ لذت سے ہم کیوں اجتناب کریں۔ لذت میں کوئی برائی نہیں ہے۔ ہم پُرلطف زندگی گزارنے سے کیوں پرہیز کریں۔

☆☆☆

شہر علم و آگہی

یاد نگاری

' 'The Moveable Feast '

[ارنسٹ ہمنگوے کی بعد از مرگ شائع کی گئی تحریروں کے حوالے سے]

● ارنسٹ ہمنگوے

● تلخیص: سیّد خالد قادری

جدید امریکن فکشن کے معماروں میں شمار کیے جانے والے نوبل انعام یافتہ ارنسٹ ہمنگوے [Earnest Hemingway] نے اپنی زندگی کے کئی اہم سال پیرس میں گزارے۔ یہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کا پیرس تھا جو ایک غیر معمولی تخلیقی توانائی اور آرٹ و ادب کے تئیں جوش و جذبے سے معمور تھا۔ شاید اس لیے کہ موت اور تباہی و بربادی کے بھیانک ترین مرحلے سے گزر چکنے کے بعد یورپ کو زندگی اور زندگی کے لطیف و اعلیٰ مظاہر کی تخلیق یا تعمیر نو کی اشد ضرورت آن پڑی تھی۔ ہمنگوے بھی اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا تھا اور اس نے وہاں اپنے قیام کے دوران پہلی بیوی ہیڈلی اور بیٹے کے ساتھ پریشان کن تعلقات کی نوعیت سے وہاں ان دنوں موجود دوسرے ادیب دوستوں جیسے کہ ایذرا پاؤنڈ، اسکاٹ فیٹز یرالڈ، میڈیسن فورڈ اور مس اسٹین وغیرہ کے ساتھ گزارے دنوں کی چونکا دینے والی تفصیلات کے علاوہ تخلیقیت کو جلا دینے والے اس مخصوص ماحول میں خود اس کے فن کے ارتقا سے متعلق تفصیلات اپنی ڈائریوں میں درج کی تھیں۔ انھیں ۱۹۵۱ء میں اس نے "Paris Sketches" کے عنوان سے ترتیب دینا شروع کیا تھا مگر اس کی ناگہانی موت [خودکشی] کے باعث یہ تحریریں شائع نہ ہو سکیں۔ عرصہ بعد ۱۹۶۹ء میں اس کے بیٹے پیٹرک

ہمنگوے نے انھیں "The Moveable Feast" کے عنوان سے شائع کیا جسے اُس نے ہمنگوے کی زندگی کے ایک اہم دَور کا ٹائم کیپسول کہا ہے۔ اس کتاب کے منتخب ابواب سے اخذ کی گئی کچھ ایسی باتیں یہاں پیش کی جارہی ہیں جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوسکتی ہیں۔

[پہلی جنگ عظیم کے دوران اطالوی فرنٹ پر زخمی ہو جانے کے بعد ہمنگوے ۱۹۱۹ء میں امریکہ واپس چلا گیا تھا۔ ۱۹۲۲ء میں آخری بار Greco-Turkish کی رپورٹنگ کرنے کے بعد اس نے صحافت کو بھی خیرباد کہہ دیا اور خود کو پوری طرح فکشن لکھنے کے لیے وقف کردیا۔ اس کے لیے اُس نے یورپ اور امریکہ کے کئی دوسرے ادیبوں جیسے کے ایذرا پاؤنڈ Ezra Pound، Getrude stein اور Scott Fitzerald وغیرہ کی طرح وقتی طور پر پیرس میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔]

اس کتاب کا پہلا باب پیرس کے ایک کیفے اور وہاں آنے جانے والوں سے متعلق ہے۔ یہ 'Cafe de Amateurs' ہے جو شہر کے عادی شرابیوں کی آماجگاہ تھا۔ اس کی کھڑکیوں کے شیشے بارش، دھند اور دھویں سے کالے پڑ گئے تھے اور یہ ایک بوسیدہ اور واہیات قسم کی عمارت میں واقع تھا۔ ہمنگوے اس کے اندر سے نکلتی سستے ٹھرّے کی بو اور شرابیوں کے جسم سے خارج ہونے والے پسینے کی گندھ کے باعث وہاں جانے سے اُکتاتا تھا۔ یہاں سے نکلنے والے ہمیشہ نشے میں دُھت ہوتے تھے۔ اس میں عورتوں کی بھی خاصی تعداد ہوتی تھی جنھیں وہاں کی مقامی بولی میں Poivrottes کہا جاتا تھا۔ اس کیفے کے اطراف بنی چوڑی چوڑی نالیوں میں اُس علاقے کے مکانوں کے بیت الخلا کے فضلات بہا کرتے تھے جسے دیر رات صفائی گاڑیاں ویگنوں میں بھر بھر کر لے جاتی تھیں۔ مگر کیفے ڈی امیچورس اپنی تمام تر کدورتوں کے ساتھ رات بھر آباد رہتا تھا دروازے پر لٹکائے گئے اس میلے زرد بورڈ کے ساتھ جس پر کھلے میں شراب نوشی کی سزا اور جرمانے کے قوانین بمشکل پڑھے جاسکتے تھے۔ پیرس کا یہ کیفے ایک عرصے تک ہمنگوے کے لیے ایک ایسی جگہ کی طرح تھا جو اپنی ساری کثافت، گندگی اور بدبودار ماحول کے باوجود کسی کی توجہ کا مرکز ہو۔ کچھ اس طرح جیسے کچھ مخصوص قماش کے لوگوں کو ان کے پیشے سے کراہیت و نفرت ہونے کے باوجود طوائفوں اور ان کے کوٹھوں سے لگاؤ یا دلچسپی ہوتی ہے۔

یہاں پیرس کے اس لاج کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس کی اوپری منزل پر ہمنگوے رہا کرتا تھا اور جس کے آتشدان سردیوں میں جلانے کے لیے اُسے خود پائن ووڈ خرید کر لانا ہوتا تھا۔ پیرس کی بھیگی کالی سڑکوں پر لگاتار برستی بارش میں 'Lycoaffenry Quarter' 'Eteine du Mont' اور 'Place du Pantheon' سے ہوتے ہوئے کسی طرح اُسے 'Saint Micheal Boulevard' تک آنا ہوتا تھا اور پھر وہیں Saint Micheal Place کے اُس پسندیدہ کیفے تک جہاں وہ اپنا خاصا وقت گزارا کرتا تھا، وہاں پہنچ کر اپنا واٹر پروف کوٹ اور فیلٹ ہیٹ کھونٹی پر لٹکا کر وہ کافی کا آرڈر دیتا تھا اور جتنی دیر میں بیرا آئے وہ

اپنی نوٹ بک اور پنسل نکال کر لکھنا شروع کر دیتا تھا۔ یاد تھا، وہ اُس دن مِشی گن کے لوکل میں تصور کی گئی ایک کہانی لکھ رہا تھا اور چونکہ وہاں کیفے کے باہر بارش اور طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے تو وہ کہانی میں بھی موسم کا ویسا ہی موڈ دکھا رہا تھا اور چونکہ کہانی میں کچھ نوجوان کہیں بیٹھ کر پی رہے تھے تو اس کی خود بھی پینے کی خواہش جاگ اٹھی تھی اور اس نے بھی رَم کا ایک بڑا پیگ نکال لیا تھا۔ اِس طرح اس سرد ٹھٹھرتے دن میں اس کا مزا دوبالا ہو گیا تھا اور اس نے لکھنا جاری رکھا تھا —— پھر تھوڑے وقفے کے بعد اس نے نظر اٹھائی تو دیکھا کہ سامنے کھڑکی کے قریب ایک لڑکی آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ کسی تازہ ڈھلے ہوئے سکّے کی طرح پُرکشش، سڈول اور چمکیلا تھا اور اس کے رخساروں کو حلقے میں لیے اس کے بال کوّے کے پروں کی طرح کالے تھے۔ وہ اسے دیکھتا رہا تھا گو کہ اس کی موجودگی اُسے ڈسٹرب کر رہی تھی اور اس کا وجود اسے مضطرب کر رہا تھا۔ وہ اُسے اپنی کہانی میں لے آنا چاہتا تھا مگر اُسے احساس تھا کہ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں رُکے گی —— وہ کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس لیے وہ دوبارہ لکھنے میں مشغول ہو گیا۔

اب دراصل کہانی اپنے آپ کو لکھ رہی تھی اور اُسے اس کے ساتھ چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے رَم کا ایک اور پیگ منگا لیا اور لڑکی کو دیکھنے کی غرض سے پنسل کی نوک تیز کرنے لگا۔ شارپر سے چھلا گول کنگورے دار تراشا نیچے ،گر گر کر ساسر میں جمع ہو رہا تھا۔ چند لمحوں کے لیے لکھنا ملتوی کر کے لڑکی کو دیکھتے ہوئے وہ جو سوچ رہا تھا اسے اس نے اس طرح بیان کیا ہے:

"I have seen you, beauty, and you belong to me now. Whoever you are waiting for; and if I never see you again! I thought you belong to me and all Paris belongs to me and I belong to this note-book and this pencil."

وہ پھر لکھنے لگا تھا اور کہانی کے اندر دور تک پہنچ کر وہ اس کی تہوں میں گم ہو گیا تھا —— اب وہ اسے لکھ رہا تھا وہ اپنے آپ کو نہیں اور وہ اس سے باہر نہیں نکل رہا تھا ادھر ادھر نظریں دوڑانے کے لیے یا وقت کا اندازہ لگانے کے لیے یا اپنے محلِ وقوع کو جاننے کے لیے اور نہ ہی مزید رَم منگوانے کے لیے اُسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ کب رَم سے اس کا جی بھر گیا، کہانی اختتام کو پہنچ گئی اور وہ بری طرح تھک گیا۔ اس نے کہانی کا آخری پیراگراف پڑھ کر نظریں اُٹھائیں۔ لڑکی جا چکی تھی —— شاید اُسے کوئی اچھا انسان مل گیا ہو۔ مگر اُسے ہنوز تھکن کے ساتھ ایک عجیب قسم کی اداسی نے گھیر رکھا تھا۔

نوٹ بک کے ساتھ کہانی کو اندرونی جیب میں رکھ کر اس نے بیرے سے وھائٹ وائن کا ایک ادھا منگوایا۔ اکثر وہ کہانی لکھ کر اسی طرح خالی خالی ہو جاتا تھا اور بہ یک وقت اداس اور مطمئن بھی —— جیسے اس نے کسی عورت کے ساتھ مباشرت کی ہو —— مگر اسے یہ بھی احساس تھا کہ اس نے ایک عمدہ کہانی لکھی

ہے— کتنی! یہ اندازہ وہ کل اُسے دوبارہ پڑھنے پر ہی کر سکے گا—

وھائٹ وائن اور تلے ہوئے جھینگے کھانے کے بعد وہ دھیرے دھیرے نارمل ہو گیا اور مستقبل کے منصوبے بنانے لگا تھا— خراب موسم کے اُن دنوں کو اُسے پیرس سے باہر گزارنا چاہئے کسی نسبتاً گرم مقام پر۔ کل بیوی سے مشورہ کرکے وہ ہوٹل چھوڑ دے گا— وہ سوچ رہا تھا—

دوسرا باب موسم بہتر ہونے پر پیرس واپسی سے متعلق ہے۔ اب پیرس کا موسم صاف، سرد اور خوشگوار تھا اور سڑکوں پر سر شام جل اٹھنے والی روشنیاں دلکش معلوم ہوتی تھیں۔ زیادہ تر پتیاں گر چکنے کے بعد بھی درختوں کی خوبصورتی باقی تھی۔ اب وہ ایک آرام دہ ہوٹل میں مقیم تھے جس میں لکھنے پڑھنے کی پوری سہولت تھی۔ لکھنے کے دوران کہانی کے کسی فیصلہ کن موڑ پر وہ رک جاتا تھا اور چند بھنے ہوئے اخروٹ یا سنترے کی کچھ قاشیں کھا کر ایک دو گھونٹ وائن پی لیتا تھا۔ اور پھر وہ کہانی میں اس جگہ رکتا تھا جہاں اُسے معلوم ہوتا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے— مگر جب کبھی وہ نئی کہانی لکھنا شروع کرتا اور وہ آگے بڑھتے ہوئے نہ معلوم ہوں تو وہ سنترے کے چھلکے چھیل کر آتشدان میں پھینکتا رہتا یا باہر بالکنی میں آکر پیرس کے کھلے آسمان پر نظر دوڑاتا اور اپنے اندر کے کہانی کار کو تسلی دیتا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اس نے پہلے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور اب بھی لکھے گا صرف کہانی کا پہلا سچا جملہ ہی سوچ کر لکھنے کی ضرورت ہے اس کے بعد کہانی خود بخود آگے بڑھ جائے گی— اور پھر کہانی واقعی لکھی جانے لگتی کیوں کہ وہ سچا جملہ کہیں نہ کہیں تو ہوتا ہی تھا— خود اپنے دماغ میں اچانک آجانے والا، کسی کا کہا ہوا یا کسی سے سنا ہوا— اس نے طے کر رکھا تھا کہ وہ کم از ایک کہانی ضرور لکھے گا ہر اس چیز کے بارے میں جسے وہ جانتا ہے یا ہر اس بات سے متعلق جسے وہ سمجھتا ہے— مگر اس کے لیے ایک سخت ڈسپلن کا پابند ہو کر رہنا تھا— اپنے اسی لکھنے کے کمرے میں اس نے یہ بھی سیکھا کہ لکھنا موقوف کرنے اور دوبارہ شروع کرنے کے وقفے میں اُسے اپنا ذہن موضوع سے دور رکھنا چاہیے تاکہ اس دوران اُس کا تحت الشعور اس موضوع سے معاملہ کرتا رہے اور وہ اپنے اطراف کی دنیا پر توجہ دے سکے۔ چنانچہ ان وقفوں میں وہ پڑھا کرتا تھا یا پھر پیرس کی سڑکوں پر آوارہ گردی—

اس دوران وہ اکثر دوپہر بعد مختلف راستوں سے گزرتا ہوا 'Jardin du luxembourg' پہنچ جاتا تھا وہاں کے میوزیم میں جہاں دنیا بھر کی مشہور پینٹنگز رکھی گئی تھیں اور جن میں سے زیادہ تر بعد میں 'Louvre' اور 'Jen de Paume' منتقل کر دی گئیں۔ وہ وہاں تقریباً ہر روز پہنچ جاتا تھا 'Cezannes' اور 'Monet' اور دوسرے Inpressionist کے شاہکاروں کو دیکھنے کے لیے جن سے وہ پہلی بار شکاگو کے آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں متعارف ہوا تھا۔ Cezannes کی بنائی ہوئی تصویروں نے اسے یہ سکھایا تھا کہ کسی تصویر کے مختلف Dimensions کی طرح ایک کہانی بھی صرف سیدھے سچے جملوں سے نہیں بنتی۔ اس کے لیے مصنف کو اپنے بیانیہ میں معنی کی ایک سے زیادہ تہیں خلق کرنی ہوتی ہیں۔ شام ڈھلنے پر وہ باغوں سے گزرتا ہوا

قریب ہی Rue de Flaurus پر واقع Getrude Stein کے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ پر چلا جاتا تھا۔ جب وہ اور اس کی بیوی مِس اسٹین سے ملے تھے تو وہ اور اس کے دوست جو ساتھ ہی رہتے تھے اسے بہت خلیق اور ملنسار لگتے تھے۔ اس کا وسیع و کشادہ اسٹوڈیو بھی جو کسی میوزیم کے ہال سے کم نہ تھا اس مزید سہولت کے ساتھ کہ یہاں ایک فائر پلیس بھی تھا اور کھانے پینے کے تمام لوازمات۔ مِس اسٹین کٹ گلاسوں میں مختلف پھلوں سے تیار کی گئی نفیس شرابوں سے مہمانوں کی تواضع کرتی تھیں جو چسکیاں لے کر پینے والوں کے ذہن سے آگ کی لپٹوں سی گزر کر ان کی زبانیں کھول دیتی تھیں۔ وہ کسی دہقان عورت کی مانند بھاری بھر کم وضع کی تھیں مگر ان کی آنکھیں پُرکشش اور بال گھنے اور جنھیں وہ کسی کالج گرل کی طرز پر باندھ کر رکھتی تھیں۔ وہ مسلسل بولتی رہتی تھیں لوگوں کے بارے میں جگہوں کے بارے میں دیگر موضوعات پر۔ ان کی ایک پُراسرار سہیلی بھی تھی جس کا رنگ کم اور قد چھوٹا تھا۔ وہ صرف وزیٹرز کی بیویوں سے بات کرتی تھی۔

بہر حال ہمنگوے کو مِس اسٹین اور ان کی کم عمر سہیلی پسند تھے اور ایسا لگتا تھا کہ وہ دونوں بھی اُس کی شادی شدہ حیثیت پر معترض نہ تھے۔ بعد میں اس نے انھیں اپنے فلیٹ پر بھی مدعو کیا تھا جو بہت چھوٹا تھا اور انھیں اس کے زمین پر بچھے ہوئے بستر پر بیٹھنا پڑا تھا۔ اس نے انھیں اپنی کچھ کہانیاں سنائی تھیں جن میں سے ایک 'Up In Michegan' اُن کی تنقید کا نشانہ بنی تھی —

"It is good", she said, "that is not the question at all; but it is inaccrochable that means it is like a picture that a painter paints and then he can not hang it when he has a show and no body will buy it because they can not hang it either."

وہ مِس اسٹین کے اسٹوڈیو اکثر جایا کرتا تھا جہاں وہ اُسے اپنی پینٹنگز دکھاتیں اور دوسرے آرٹسٹوں کے کاموں سے واقف کرواتیں۔ ویسے وہ ان کی شخصیت کے ہی بارے میں زیادہ گفتگو کرتیں۔ انھوں نے ایک صحیح آرٹ companion بھی مرتب کی تھی جو خاصا وقت طلب کام رہا ہوگا۔ وہ ہمنگوے سے سیکس کے موضوع پر بھی بے تکلف گفتگو کرتی تھیں جس کا مقصد اُسے سیکس کے معاملات سے بہتر طور پر آگاہ کرنا ہوتا تھا — شاید انھیں اُس کی جنسی صلاحیتوں کے بارے میں شبہات تھے۔ وہ خصوصی طور پر جاننے میں بڑی دلچسپی رکھتی تھیں کہ نوعمری میں وہ Homosexuals کا شکار بنا رہا یا اپنے آپ کو بچائے رکھا۔ ہمنگوے نے انھیں اپنے کچھ تجربات غیر جذباتی انداز میں بتائے بھی تھے بغیر کسی وضاحت کے کہ وہ اچھے تھے یا بُرے۔ مِس اسٹین کی ہم جنسی کے موضوع پر اپنی ایک باقاعدہ سوچ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مرد Homo ایک گندے اور مکروہ فعل کا مرتکب ہوتا ہے اور وہ خود اپنی نظروں میں گرا ہوا اور اپنے آپ سے متنفر رہتا ہے۔ شاید اسی نفسیاتی تناؤ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے وہ پارٹنر بدلتا رہتا ہے یا پھر الکوحل اور ڈرگس کا سہارا

لیتا ہے۔''اچھا یہ بات ہے'' ہمنگوے نے ان کی طرف معنی خیز انداز سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اسے اُن کے ساتھ رہنے والی اس کم عمر لڑکی کا خیال آ گیا تھا۔

''عورتوں کی ہم جنسی کس قسم کی ہوتی ہے؟'' اُس نے انھیں مشکل میں ڈالنے کے خیال سے پوچھا تھا۔

''عورتوں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔''مِس اسٹین نے بغیر کسی جھجک کے کہا تھا: ''ان کی ہم جنسی کے عمل میں ایسا کچھ نہیں ہوتا جو گندا اور کراہیت آمیز لگے یا اس کے لیے وہ احساسِ جُرم کا شکار ہوں۔ وہ اس کے ساتھ خوش اور مطمئن رہتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مستقلاً رہنا پسند کرتی ہیں۔ پتا نہیں تم یہ بات سمجھ سکو گے یا نہیں۔'' انھیں یقین نہیں تھا کہ وہ اُس پر اپنا موقف واضح کر سکی ہیں۔ وہاں ان دنوں پیرس میں قیام کے دوران سمجھنے کے لیے اتنی باتیں تھیں کہ اُسے فی الحال موضوع بدلنے میں ہی عافیت محسوس ہوئی تھی۔ اُسے اب جلد اپنے فلیٹ پر واپس جا کر لکھنا شروع کر دینا چاہیے۔ وہ سوچنے لگا تھا۔ اپنا کام کرتے رہنے میں ہی ہر مشکل صورت حال کا حل چھپا ہوتا ہے۔

تیسرے باب میں '12, rue de L' O deon' پر واقع سلویہ بیچ نامی خاتون کی لائبریری اور بک اسٹور کا ذکر ہے جس کا نام 'Shakespeare & Company' رکھا گیا تھا۔ یہ کوزی گرم اور آرام دہ جگہ تھی۔ یہاں ...ف میں ہمہ اقسام کی کتابوں کے علاوہ دیواروں پر معروف ادیبوں کے پورٹریٹ یوں لگائے گئے تھے کہ اندر داخل ہونے پر لگتا تھا کہ وہ آپ کا استقبال کر رہے ہیں۔ سلویہ ایک نہایت مہذب، مہربان اور نفیس خاتون تھیں۔ اب پیرس میں کسی ایسی شفیق ہستی سے ہمنگوے کی ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ انہوں نے اُسے اپنی لائبریری اور بک اسٹور میں ہر طرح کی رعایت دے رکھی تھی۔ ان کی ہی لائبریری سے لے کر ہمنگوے نے Turgnev کی 'A Sports' Man's Sketches' کی دو جلدیں پڑھیں۔ اس کی علاوہ ڈی ایچ لارنس کی 'Sons And Lovers' ٹالسٹائے کی 'War And Peace' اور دوستووفسکی کی 'The Gambler and The Stories' وغیرہ بھی۔

''جیمس جوائس یہاں کیا آتا ہے؟'' اُس نے سلویہ سے دریافت کیا تھا۔ ہمنگوے کو اُس سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

''وہ عموماً دوپہر بعد آتا ہے۔ شاید تم اس سے اب تک نہیں ملے!

''اُسے 'Michand's' میں فیملی کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر اس وقت ملنا مناسب نہ تھا اور ویسے بھی میرے لئے وہ بڑی مہنگی جگہ تھی۔''

چوتھا باب Seine ندی اور اس کے اطراف کی جگہوں سے متعلق ہے۔ وہاں کتابوں کی متعدد دکانیں ہوا کرتی تھیں جن میں سے چند میں امریکی ادیبوں کی تخلیقات کے سستے ایڈیشن ملتے تھے۔ ویسے ان

دنوں فرانس میں امریکی ادب کی کوئی وقعت نہ تھی۔ انگریزی میں لکھی دوسری کتابیں بھی سستی ہوتی تھیں۔ ایسے ہی ایک بک اسٹور کی مالکہ نے جس سے ہمنگوے کچھ امریکی اور برٹش مصنفین کی کتابیں خریدنی چاہی تھیں اُس سے دریافت کیا تھا کہ کیا واقعی وہ کتابیں کسی قابل تھیں اور کیا وہ گھاٹے کا سودا نہیں کر رہا ہے۔ ایک فرانسیسی ہونے کے ناطے ان کا خیال تھا کہ وہاں انگریزی جاننے اور انگریزی ادب پڑھنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ اس علاقے میں اس نے کتابیں سڑکوں پر پڑی دیکھیں جنھیں کوئی نہیں اُٹھاتا تھا — یعنی کہ وہ دوبارہ دیکھے جانے کے قابل نہ سمجھی گئی تھیں۔

ان دنوں Seine ندی کے پُل کے آس پاس مچھلی پکڑنے کے شائقین کا بھی جمگھٹا ہوا کرتا تھا۔ اس ندی میں پائی جانے والی ایک مخصوص قسم کی مچھلی جسے 'gonjon' کہا جاتا تھا ان لوگوں کے لیے ایک 'Prizecatch' ہوتی تھی جسے وہ بھون کر کانٹوں سمیت کھا جاتے تھے۔ وہیں ندی کے کنارے ایک اوپن ایئر ریسٹوراں 'La Peche Mera cecleun' بھی تھا بالکل ویسا ہی جیسا موپاساں کی کہانیوں میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ہمنگوے بھی وہاں وھائٹ وائن کی ایک بوتل، بریڈ اور بھنی مچھلی کے قتلے میز پر جما کر اپنی پسند کی کوئی کتاب پڑھا کرتا تھا — وہ ایک ایسا پُر فضا مقام تھا جہاں پہنچنے پر کسی کے تنہائی محسوس کرنے کا سوال ہی نہ تھا — صرف Fall کے دنوں میں یہاں ویرانی اور سناٹے کا راج ہوا کرتا تھا جب سارے درخت ننگے ہو جاتے تھے۔ اور ندی کا پانی پوری طرح جم جاتا تھا۔ شدید برف باری کے دوران ایسا لگتا تھا جیسے کہ وہ سارا کا سارا منظر نامہ کفن میں لپیٹ دیا گیا ہو — حالانکہ یہ یقین پھر بھی باقی رہتا تھا کہ جلد ہی بہار آئے گی اور Seine ندی پھر سے بہہ نکلے گی — پھر بہار آجاتی کبھی آدھی ادھوری کبھی بھرپور جس کے بعد اس کے سوا کوئی مسئلہ نہ رہ جاتا کہ کب کم خوش ہوا جائے اور کب زیادہ — ان دنوں خوشیوں میں کوئی چیز مخل ہو سکتی تھی تو بس ایسے لوگوں سے ملنے کی مجبوری جو آپ کو پسند نہ آئیں۔ یوں اگر ایک طرف خوشیوں میں تخفیف کرنے والے تھے تو دوسری طرح وہ چند لوگ بھی تھے جو مجسم بہار تھے —

باب پانچ میں پیرس میں منعقد کی جانے والی گھوڑوں کی ریس کا ذکر ہے۔ جس کے ہمنگوے اور اس کی پہلی بیوی دونوں شوقین تھے اور اکثر اس میں اپنی محنت کی کمائی گنوا بیٹھتے تھے۔ یہاں ایک مخصوص ریس کا ذکر ہے جس میں ' Cheure de Or ' نامی گھوڑے پر جو ایک پر سو کے بھاؤ کا تھا اس کی بیوی نے کافی پیسہ لگا دیا تھا اور وہ شروع میں دوسروں سے بیس لنتھ آگے تھا مگر بدقسمتی سے پوسٹ کے قریب آ کر گر گیا تھا۔ ویسے انھی ریس ٹریکس پر کبھی کسی بااثر دوست کی ٹپس مل جانے پر انھیں توقع سے کہیں زیادہ پیسے بھی مل جاتے تھے جس کو وہ بے دردی سے خرچ کر دیا کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر انھوں نے پیرس کے اس مشہور ریستوراں میں ڈنر کرنے کی خواہش بھی پوری کی تھی جہاں انھوں نے پہلی بار جیمس جوائس کو اس کی فیملی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہاں اپنی پسند کا پیٹ بھر کھانا کھانے کے بعد بھی ایسا لگا تھا کہ بھوک ابھی باقی ہے۔

''موسم بہار میں جیبیں بھری ہوں تو بھوک بھی کئی قسم کی ہوسکتی ہے۔'' اس کی بیوی نے کہا تھا۔
اس کی اس بات کی سچائی کی تصدیق فلیٹ پر واپس پہنچنے پر بیڈ روم میں ہوئی تھی۔ دیر گئے آنکھ کھلنے پر اس نے دیکھا تھا کہ اس کی بیوی کا چہرہ کھڑکی سے آتی ہوئی چاندنی میں نہایا ہوا تھا — اسے یاد تھا۔ اگلی صبح زندگی انتہائی ہلکی پھلکی اور خوبصورت لگی تھی — مگر شاید اصل بات یہ تھی کہ پیرس ایک بڑا اور قدیم شہر تھا مگر وہ دونوں جوان اور کم عمر — وہاں کوئی بھی چیز ادنیٰ یا معمول زدہ نہ تھی حتیٰ کہ غریبی یا امیری یا اچھائی اور بُرائی بھی اور نہ سرد راتوں کی چاندنی اور نہ ہی پہلو میں دراز کسی جوان جسم کی گرم سانسیں۔
چھٹے باب میں ہمنگوے نے اپنے ریس کے شوق سے متعلق مزید گفتگو کی ہے اور پھر آخر میں اس شوق سے دستبردار ہونے کی وجوہات — جسے ریسنگ کہتے ہیں وہ دراصل گھوڑ دوڑ پر پیسہ لگانے کا کھیل ہے — ایک قسم کا جُوا جو لت بن جائے تو اچھے خاصے باصلاحیت انسان کو ناکارہ بنا سکتی ہے۔ وہ پیرس میں برسوں اپنی پہلی بیوی کے ساتھ ریس جاتا رہا تھا جہاں اس نے کئی جاکی اور ٹرینرز دوست بنالیے تھے۔ گو کہ اس میں اس کا کافی پیسہ اور وقت برباد ہوا مگر یہ ایک نشہ تھا جس کا کوئی متبادل نہ تھا۔ پھر جب اس نے ریس کھیلنا ترک کر دیا تو لگا کہ وقت گزارنا مشکل ہوگا مگر جلد ہی اُسے اس بات کا احساس ہوگیا کہ کوئی بھی شغل اچھا یا بُرا ترک کر دیا جائے تو وہ ایک خالی پن چھوڑ جاتا ہے صرف اس فرق کے ساتھ کہ بُری چیز چھوڑ دینے سے پیدا ہوا خالی پن اپنے آپ بھر جاتا ہے جب کہ اچھی چیز چھوڑنے سے پیدا ہوا خالی پن جبھی بھرتا ہے جب پہلے سے کچھ بہتر کرنے کو مل جائے۔
باب سات میں مِس اسٹین اور اُن کے اسٹوڈیو کا دوبارہ تفصیل سے ذکر ہے۔ ریس چھوڑ دینے کے بعد جو ہفتے میں تقریباً پانچ دن ہوتے تھے ہمنگوے کا زیادہ تر وقت مِس اسٹین کے اسٹوڈیو میں گزرنے لگا جہاں کئی اور آرٹسٹ اور ادیب موجود ہوتے تھے۔ وہ خود بھی مختلف موضوعات پر طویل گفتگو کرنے کی عادی تھیں اور دوسروں کی باتیں بھی دلچسپی سے سنا کرتی تھیں سوائے اس کے کہ وہ ناخوشگوار یا افسوس ناک ہوں۔ یعنی کہ وہ ایک خوشگوار، دلچسپ اور دلپذیر دنیا کا ہی تصور قائم رکھنا چاہتی تھیں بھدی بدصورت اور حقیقی دنیا کا نہیں۔ وہ خود اپنے لکھنے کے درمیانی وقفوں میں مِس اسٹین سے ان کتابوں کے بارے میں تاثرات دریافت کیا کرتا تھا جو انھوں نے پڑھی تھیں۔ یا پھر خود کچھ نہ کچھ پڑھا کرتا تھا تاکہ اس کا ذہن اپنی کہانی سے آگے کہیں دور نہ نکل جائے — یعنی کہ اس کے ساتھ وہیں رُکا رہے جہاں سے اُسے آگے لے جانا ہے۔ ایسے میں کسی قدر جنسی ورزش بھی تخلیقیت کو جلا دینے والی ثابت ہوتی تھی۔ اس کے بعد محسوس ہونے والی پُرطمانیت تھکن رگ و پے میں اتر کر ایک نئے تخلیقی جوش و ولولے کا پیش خیمہ بن جاتی تھی — ہاں کبھی کبھی بالکل خالی خالی محسوس ہونے پر کچھ پڑھنے میں لگ جانا ضروری ہو جاتا تھا خود کو کچھ نہ لکھ پانے کی تشویش سے بچانے کے لیے۔ ویسے اب تک اس پر یہ رمز آشکار ہو چکا تھا کہ اسے اپنی تخلیقات کے ذخائر میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ بچا

کر رکھنا ہے اُسے کبھی پوری طرح خالی نہ ہونے دینا ہے — چنانچہ خود کو تخلیقی طور پر Recharge کرنے کی غرض سے وہ ہمعصر ادیبوں کو پڑھا کرتا تھا جیسے کہ Aldous Huxley اور D. H.Lawrence وغیرہ جن کی کتابیں سلویہ بیچ کے بک اسٹور یا لائبریری میں مل جاتی تھیں۔

''ہکسلے ایک مردہ آدمی ہے۔تم اسے کیوں پڑھنا چاہتے ہو؟ کیا تمھیں دکھائی نہیں دیتا کہ وہ بے جان ہے؟''مس اسٹین نے اس سے پوچھا تھا۔ ہمنگوے کو ایسا کچھ نہیں لگا تھا اس لیے اس نے کہا تھا کہ اُس کی کتابیں اسے دلچسپ لگتی ہیں اور اس کے ذہن کو بھٹکتے رہنے سے روکتی ہیں۔

''تمھیں صرف عمدہ تحریریں پڑھنی چاہئیں یا پھر وہ جو حقیقی معنوں میں بُری ہوں''۔ اُسے قیمت حقیقی معنوں میں بُری کتابیں پسند نہ تھیں اس لیے اچھی کتابیں ہی پڑھتا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آیا مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''تم یہ سب Trash پڑھنے میں اپنا وقت کیوں برباد کرتے ہو؟'' شاید مس اسٹین کے نزدیک انگریزی ادب کی کوئی وقعت نہ تھی۔

''ہمنگوے! یہ سب کا سب Inflated Trash ہے۔'' وہ زور دے کر کہتیں۔

''انھیں پڑھنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ یہ میرے ذہن کو مصروف رکھتے ہیں۔ اسے منتشر نہیں ہونے دیتے۔'' وہ اپنی بات کہتا —

''ہکسلے کے علاوہ اور کسے پڑھ رہے ہو۔'' وہ پوچھیں۔

''ڈی ایچ لارنس کو۔ اس نے کچھ بہت اچھی کہانیاں لکھی ہیں جیسے کہ 'The Prussian officer'

''میں نے اس کی ناولیں پڑھنے کی کوشش کی تھی مگر اسے زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکی — "He writes like a Sick man, Prepostrous, Pathetic, He is impossible" وہ پھٹ پڑی تھی —

''میں نے لارنس کی 'The white Peacock' اور 'Sons and Lovers' پڑھی ہیں۔ بہت اچھی ہیں البتہ 'Women in Love' نہیں پڑھ سکا۔'' ہمنگوے نے ان کی جھنجھلاہٹ نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات کہی تھی۔

غرض کہ تین چار سال کے عرصے میں جب وہ ان کے اسٹوڈیو جاتا رہا تھا اس نے مس گرٹروڈ اسٹین سے چند کرائم تھرلر لکھنے والے رائیٹرز کے سوا شاید ہی کسی ادیب کی تعریف سنی ہو۔ یہاں تک کہ جوائس جیسے اہم اور بڑے ادیب سے تو انھیں چڑ تھی اور ہمنگوے کو انتباہ دیا گیا تھا کہ اگر اس نے فکشن پر گفتگو کرنا ہے تو وہ ان کے اسٹوڈیو نہ آئے۔ ویسے یہ بھی ان کی خود پسند اور سخت گیر طبیعت کا ہی ایک حصہ تھا کہ اگر کوئی آرٹسٹ یا ادیب ابتدائی شہرت کے بعد گمنامی میں چلا جائے تو وہ اُس کی طرفدار بن جاتی تھیں جیسے کہ 'Sherwood Anderson' یا 'Christopher Isherwoo' کے معاملے میں بعض اوقات کسی بڑے

ادیب سے ان کی ناراضگی کی وجہ بالکل معمول ہوا کرتی تھی جیسے کہ ایذرا پاؤنڈ سے وہ اس لیے خفا ہو گئیں تھیں کہ ان کے اسٹوڈیو آنے پر وہ جلد بازی میں دیکھے بھالے بنا ایک ایسی کرسی پر بیٹھ گیا تھا جو ناقص اور ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایذرا پاؤنڈ کی ادبی حیثیت کو دور کنار کر کے اِس ایک کرسی کے توڑنے کے جرم میں انھوں نے اُس پر اپنے اسٹوڈیو کے دروازے بند کر دیئے تھے۔

آٹھویں باب میں کوئی قابل ذکر بات نہیں سوائے ہمنگوے کی کچھ کہانیوں کے دوران سفر کھو جانے کے جنھیں اس کی بیوی Hadley اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر لا رہی تھی یا پھر اس صورت حال پر مایوسی اور افسوس کا اظہار کہ اس کی کئی کہانیاں پبلشرس کے پاس سے واپس آ گئیں تھیں اور انھیں مناسب معاضہ نہ مل سکا تھا — اب وہ ناول لکھنا چاہتا تھا جن کے لیے اُسے پہلے ایک دو طویل کہانیاں لکھنی تھیں جیسے کہ Marathon دوڑنے کے پہلے چند لمبی ریسیں دوڑنی چاہئیں۔

نویں باب میں 'Ford Madax Ford' اور 'Lilas' کا ذکر ہے۔ 'Lilas' ان دنوں کے پیرس کا ایک نفیس، کشادہ اور ہوادار ہوٹل تھا جس کے سبزہ زاروں پر اور باہر درختوں کے سائے میں کرسیاں اور میزیں پڑی رہتی تھیں جن پر وہاں آنے والے گھنٹوں وقت گزارتے تھے۔ ان میں دولت مند اور متوسط طبقے کے لوگ بھی ہوتے تھے، ادیب شاعر اور آرٹسٹ بھی۔ مگر یہ جگہ خصوصی طور پر جانی جاتی تھی سابق فوجیوں کے لیے جو کچھ عرصہ پہلے ہی ختم ہوئی جنگ عظیم میں حصہ لے چکے تھے۔ ان کی شناخت ان کے جسم پر زخموں کے نشانات یا کپڑوں پیر ٹنگے میڈلس وغیرہ سے آسانی سے کی جا سکتی تھی۔ کچھ بیساکھیوں کے سہارے چلتے ہوئے آتے تھے جن کے جسم کے ایک دو اعضا غائب ہوتے تھے۔ یہیں ہمنگوے کی ملاقات معروف منگنے باز شاعر Blaise Ceudrals سے ہوئی تھی جس کا چہرہ کٹا پھٹا اور ایک ہاتھ غائب تھا۔ وہ اُس وقت تک اچھا ساتھی ثابت ہوتا تھا جب تک کہ اس نے زیادہ نہ پی لی ہو۔ ہمنگوے کے مطابق Blaise کے بولے ہوئے جھوٹ کسی کی سچی کہانی کے بیان سے کہیں زیادہ دلپذیر ہوا کرتے تھے۔ اس کی طرح کے وہاں آ کر بیٹھنے والے دیگر سابق فوجیوں کو دیکھ کر ہمنگوے حیرت میں پڑ جاتا تھا کہ انھوں نے جنگ کے بھیانک تجربوں پر اتنی جلدی کیسے قابو پایا۔ کوئی ہاتھ سے محروم تھا تو کوئی پاؤں یا آنکھ سے یا کسی کا چہرہ جراحی کے عمل سے دوبارہ تشکیل دیا گیا تھا — مگر وہ سبھی وہاں یوں ہنستے بولتے اور خوش گپیاں کرتے دکھائی دیتے تھے جیسے کہ کبھی کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

وہیں 'Lilas' کے سبزہ زار پر ہمنگوے کی ملاقات اس دور کی مشہور ادبی شخصیت 'Ford Madax Ford' سے بھی ہوئی تھی جو ایک نہایت ذہین و باصلاحیت مگر متعصب اور سنکی انسان تھا — ہمنگوے عموماً اس کی صحبت سے گریز کرتا تھا مگر کبھی کبھار اس سے بچنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہاں ایک ایسی ہی ناخوشگوار ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے:

''تم مجھے دیکھ کر خوش نہیں ہوئے؟''

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''یہی بات ہے۔ تم ذرا اور زیادہ باہر نکلا کرو اور لوگوں سے ملا جلا کرو — میں تمہیں ایسی ہی ایک پارٹی میں آنے کی دعوت دینے آیا تھا۔ پتہ یہ ہے۔''

''یہ جگہ مجھے معلوم ہے۔ میں اس کی بالائی منزل پر ایک عرصے تک قیام کر چکا ہوں۔''

''تو پھر تم آ رہے ہو۔ واہ! تم تو عجیب و غریب آدمی ہو۔''

''دیکھو وہ جو فربہ اندام آدمی اُدھر بیٹھا ہے میں اُسے کبھی منہ نہیں لگاتا۔''

''کیوں؟''

''میرے پاس اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مگر تم برانڈی کیوں پی رہے ہو۔'' ''تمھیں پتا نہیں یہ نوعمر ادیبوں کے لیے مضر ہے۔''

''میں یہ کبھی کبھار ہی پیتا ہوں''

''آپ کے دوست ایذرا پاونڈ کو میں نے ہمیشہ ایک جنٹلمین پایا۔ یہ بات صحیح ہے نہ !''

''بالکل نہیں۔ وہ تو امریکن ہے۔''

کیا کوئی امریکن جنٹلمین نہیں ہو سکتا؟''

''شاید ہی کوئی جیسے کہ وہاں کا موجودہ سفیر John Quinn''

''کیا ناول نگار ہنری جیمس جنٹلمین تھا؟''

''تقریباً''

''کیا آپ خود ایک جنٹلمین ہیں؟''

''فطری طور پر کہ میں ہز میجسٹی کنگ آف انگلنڈ کے کمیشن میں رہ چکا ہوں''

''یہ معاملہ تو بڑا پیچیدہ ہے۔ ویسے آپ مجھے کیا کہیں گے جنٹلمین یا نہیں!''

''بالکل نہیں۔''

''تو پھر آپ یہاں میری چیئر پر میرے ساتھ بیٹھ کر پی کیوں رہے ہیں؟''

''میں ایسا تمھارے ساتھ اس لیے کر رہا ہوں کہ تم ایک نوجوان اور باصلاحیت ادیب ہو۔''

''آپ کی عنایت ہے''

''ماضی کے اور دوسرے بڑے ادیبوں میں کون جنٹلمین تھا؟ ناولسٹ ہنری فیلڈنگ!''

''وہ تو جج تھا۔''

''ڈرامہ نگار مارلو!''

''قطعی نہیں۔''

''شاعرونقاد John Donne!''

''وہ تو مذہبی مبلغ تھا۔ ایک پادری۔''

''یہ تو بڑا دلچسپ معاملہ معلوم ہوتا ہے۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تمھیں میرے خیالات دلچسپ معلوم ہوئے۔ ایسا میں سوچتا ہوں ایک پیگ برانڈی منگا کر تمھارے ساتھ مزید کچھ وقت گزاروں۔''

دسویں باب میں پیرس میں گزاری ایک خوبصورت شام کا بیان ہے جب ہمنگوے کی ملاقات Dome نامی جگہ پر فرانس کے مشہور پینٹر 'Pascin' سے ہوئی تھی۔ وہ اس وقت اپنی دو ماڈل لڑکیوں کے ہمراہ تھا— اس جگہ بھی صبح سے شام تک آرٹسٹوں، ادیبوں، فلسفیوں اور فنکاروں کا جمگھٹا ہوا کرتا تھا جو اپنے اپنے کام کے بیچ کے وقفوں میں یا کام ختم ہونے پر یہاں آکر اپنی تھکن مٹایا کرتے تھے۔ اس شام ہمنگوے وہاں پہنچا تو 'Pascin' اپنی دو ماڈلوں کے ساتھ جو غالباً آپس میں بہنیں تھیں میز پر موجود تھا۔ وہ ان دنوں غیر معمولی شہرت کا مالک تھا اور شاید اس وقت نشے میں تھا گو کہ اتنا بھی نہیں کہ دوسروں کے لیے تکلیف دہ بن جائے۔ دونوں لڑکیاں نوعمر اور خوبصورت تھیں۔ ان میں سے ایک خود کا اپنے بیان کے مطابق: بچپنا ابھی تک گیا نہ تھا۔

''اچھی اور بُری بہنو!'' 'Pascin' نے انھیں مخاطب کر کے کہا: ''میرے پاس کافی پیسہ ہے۔ کیا پیوگی؟ تم بھی کوئی وِھسکی منگالو۔'' اس نے ہمنگوے سے کہا تھا۔ اس کے بعد کی گفتگو کچھ یوں تھی:

''تمھاری عمر کیا ہے؟''

''۲۵ سال۔''

''تم اس سے شوق کر سکتے ہو۔ اسے ضرورت محسوس ہو رہی ہوگی''۔ اس نے چھوٹی بہن کی طرف شرارت سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ تو اپنے اسٹوڈیو میں پہلے ہی اس کی ضرورت پوری کر چکے ہوں گے۔ کیا وہ کافی نہیں؟''

''یہ بڑے بدمعاش ہیں۔ مگر مہربان بھی۔''

''تم اسے میرے اسٹوڈیو بھی لے جا سکتے ہو۔''

''سُور پنے کی بات مت کرو۔ بڑی بہن نے تنبیہ کی۔''

''تم سے کون بات کر رہا ہے۔''

''کوئی نہیں۔ پھر بھی میں بول رہی ہوں۔''

''اچھا اب چلو ہم سنجیدہ ہو جائیں۔ یہاں ایک نوجوان ادیب موجود ہے۔ ایک عمر رسیدہ پینٹر

اور دو نو خیز حسینائیں اور اُن کے سامنے پڑی ہے ساری زندگی۔"

لڑکیاں وائین پیتی رہیں، Pascin وہسکی اور ہمنگوے بیئر مگر Pascin کے سوا اپنے نشے میں کوئی بھی پُر سکون نہ تھا۔ بڑی بہن بے چین تھی مختلف زاویوں سے اپنے چہرے کو گھما گھما کر نو وارد کو دکھانے کے لیے یا اپنی سویٹر کے نیچے پھنسی بڑی بڑی گول چھاتیوں کو۔

"تم نے دن بھر میرے لیے پوز کیا۔ کیا اب بھی تمھیں اپنا جسم دکھانے کی ضرورت ہے؟"

"مجھے اچھا لگ رہا ہے۔" وہ شوخی سے بولی

"میرے پوز کرنے کے وقت انھیں میرے جسم سے زیادہ اپنے Canvas کی فکر رہتی ہے اس میں زیادہ سے زیادہ عریانیت بھرنے کی۔" وہ ہمنگوے سے مخاطب تھی۔

"تم چاہتی ہو میں تمھیں پینٹ کروں اور اس کا معاوضہ دوں تمھاری جسمانی راحت کا بھی سامان کروں اور ساتھ ہی تم سے عشق بھی کروں۔"

"تم مجھے پسند کرتے ہو نہ مونشیر!" اس نے ہمنگوے سے پوچھا تھا۔

"ہاں بہت"

"لیکن میری بہ نسبت تم بہت لمبے چوڑے ہو۔" اس نے اُداس ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"بستر میں سب کا سائز ایک سا ہو جاتا ہے۔" ہمنگوے نے اس کی تشویش دور کرنے کی غرض سے کہا تھا۔

"ایسا نہیں ہوتا" اس کی بہن نے اختلاف کیا۔ "ویسے مجھے تو اب بھوک لگ رہی ہے۔"

"ٹھیک ہے مجھے بھی گھر جانا ہے۔ میں لنچ عموماً 'Legitime' [ان دنوں یہ لفظ بیوی کے لیے استعمال ہوتا تھا جس کا متبادل بعد میں 'Regulier' بن گیا] کے ساتھ کرتا ہوں۔" اس نے بات ختم کرنی چاہی تھی۔

یہ ان کی آخری ملاقات تھی۔ پھر ایک عرصہ بعد ہمنگوے کو Pascin کی خودکشی کی اطلاع ملی تھی — [بعد میں ہمنگوے کی زندگی کا خاتمہ بھی اسی طور پر ہوا]

گیارہویں باب میں زیادہ ایذرا پاونڈ اور اس کے دوست 'Windha... Levis 'Windham' کا ذکر ہے جو ان دنوں پیرس میں مقیم تھا۔ ایذرا پاونڈ اپنی بیوی Dorothy کے ساتھ جو ایک پینٹر تھی اس کے اسٹوڈیو میں ہی رہتا تھا۔ یہ 'Notre-Dame-des-champs' پر واقع تھا۔ ایذرا پاونڈ ایک دوست نواز انسان تھا جو آرٹسٹوں اور ادیبوں میں خصوصی طور پر مقبول تھا۔ مگر مس اسٹین کا اسٹوڈیو جتنا شاندار تھا Dorothy کا اتنا ہی معمولی اور واجبی سا۔ یہاں ان جاپانی پینٹروں کی تصویریں لگی تھیں جو اس کے اور اس کے شوہر کے دوست تھے۔ ہمنگوے صرف ان کے ظاہری سراپا سے متاثر ہوا تھا ان کی تصویروں

سے نہیں گو کہ ایذرا پاونڈ کو ان میں بڑی خوبیاں نظر آئی تھیں۔

البتہ ڈوروتھی کی پینٹنگز اسے پسند آئی تھیں جو خود بھی کافی دلکش شخصیت کی مالک تھی۔ مجسمہ ساز 'Gandier Brzeka' کا ڈھالا ہوا ایذرا پاونڈ کا Head اسے پسند آیا تھا اور اس کی دوسری تخلیقات بھی جن کا ذکر پانڈ نے اس پر لکھی اپنی کتاب میں تفصیل سے کیا ہے۔ ہمنگوے کو ایذرا پاونڈ کے دوست Windham Levis کی پینٹنگ بھی پسند نہیں آئی تھیں گو کہ خود پاونڈ ان کا بڑا مداح تھا۔ دراصل پاونڈ دوستوں کی تخلیقات میں خوبیاں ڈھونڈ لینے کی اپنی فطرت سے مجبور تھا جسے وفاداری کے نقطۂ نظر سے تو قابل تعریف کہا جا سکتا ہے مگر ایک معروضی تنقیدی عمل کے طور پر تباہ کن۔ ہمنگوے کو دوستوں کی فنکارانہ کاوشوں کی غیر مشروط تعریف ایسی ہی لگتی تھی جیسے کسی کا خود اپنے افرادِ خاندان میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں دکھائی دینا — شاید پاونڈ اُس کے مقابلے میں دوسروں کے تئیں کہیں زیادہ سخی، بامروّت اور مہربان تھا — بالکل کسی Saint کی طرح۔

ایذرا پاونڈ ہمنگوے کے ساتھ باکسنگ کی مشق کرتا تھا۔ اس کے لیے ہمنگوے کو اس کے یہاں پابندی سے جانا ہوتا تھا۔ وہیں اس کی ملاقات پینٹر Windham Levis سے ہوئی جس کا چہرہ دیکھ کر ہمنگوے کو کسی ایسے چھوٹے سے مینڈک کا خیال آ جاتا تھا جو پیرس جیسے شہر کے بڑے سے تالاب میں آ کر پڑا رہا ہو۔ وہ آرٹسٹوں کے مخصوص یونیفارم میں رہا کرتا تھا جو اُن دنوں پہنے جاتے تھے۔ ہمنگوے کا تاثر تھا کہ اُس نے اس کے جیسا بُرا انسان اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی بُرائی اس کی شخصیت سے ویسے ہی عیاں ہوتی تھی جیسے ریس کے گھوڑے سے اس کی نسل [Breeding]۔ اس کے خیال میں اُسے صرف بُرا یا بد نہیں بُرائی کی تجسیم مانا جانا چاہیے تھا۔ کالی ٹوپی کے نیچے چمکتی ہوئی اس کی آنکھیں کسی ایسے زانی کی لگتی تھیں جو بدفعلی میں ناکام رہا ہو۔ مگر ایذرا پاونڈ جیسا نفیس انسان نہ صرف اس کا جگری دوست تھا بلکہ اس کا مداح بھی۔

بارہویں باب میں Getrude Steine سے ہمنگوے کی دوستی کے خاتمے کا بیان ہے جو عجیب و غریب حالات میں ہوئی جن دنوں وہ مس اسٹین کی ایک آرٹ ہسٹری پر کتاب کے پروف دیکھنے پابندی سے جایا کرتا تھا، اتفاقاً وہ ایک ایسے وقت ان کے یہاں پہنچ گیا جب وہ غالباً اپنی Live in دوست کی منت سماجت کر رہی تھیں کہ وہ انھیں چھوڑ کر نہ جائے۔ وہ اُس کے پیروں پر گر کر گڑگڑا رہی تھیں — پیرس کی ایک معروف اور بارسوخ شخصیت اور اعلیٰ سوسائٹی کی رکن ہونے کے ناطے یہ ان کی زندگی کا ایک نہایت کمزور، لجلجا اور Vulnerable پہلو تھا جو ہمنگوے جیسے باہر سے آئے نووارد کے سامنے آ گیا تھا — شاید یہ اُن کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ہمنگوے بھی مس اسٹین کی زندگی کا یہ رُخ دیکھ کر دوبارہ ان کے یہاں جانے کی ہمت نہ کر سکا — اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ سماج میں بلند مقام حاصل کر لینے والی عورتوں کے

ساتھ خصوصاً اگر وہ آرٹسٹ یا ادیب ہوں مردوں کا دوستانہ رشتہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا چاہے اس کی ابتدا جتنے ہی خوشگوار ڈھنگ سے ہوئی ہو۔

تیرہویں باب میں پاونڈ کے اسٹوڈیو میں آیرش شاعر ارنسٹ والش سے ملاقات کا ذکر ہے جو ایک ادبی رسالہ بھی ایڈیٹ کرتا تھا۔ اس میں شائع ہونے والی بہترین تخلیق پر بڑے بڑے انعامات کا اعلان ہوا کرتا تھا جو شاید ہی کبھی کسی کو دیئے گئے ہوں۔ والش جن دنوں جس ادیب کے ساتھ زیادہ اُٹھتا بیٹھتا اُس کی خوب تعریف کرتا اور اسے انعام دلانے کا وعدہ کر لیتا۔ ہمنگوے کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کے بعد اُس نے اُس سے ایسا ہی وعدہ کیا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اس نے ایسے وعدے پاونڈ، جوائس اور کئی دیگر ادیبوں سے بھی کر رکھے تھے جو کبھی وفا نہیں ہوئے۔ پھر چند برسوں بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کتاب کے چودھویں باب میں ان ادیبوں کی تخلیقات کا ذکر ہے جنھیں ہمنگوے نے پیرس آنے پر سلویہ بیچ کی لائبریری اور بک اسٹور "Shakespeare And Company" سے لے کر پڑھا تھا۔ اور کچھ ایسے ادیبوں کا بھی جنھیں وہ یہاں آنے سے پہلے پڑھ چکا تھا — ساتھ ہی ان پر اس کے اور دوستوں کے تبصرے بھی — یہاں اُس نے Turgnev کا سارا فکشن اور Gogol کا بھی پڑھ ڈالا تھا جس کا انگریزی ترجمہ ہو چکا تھا۔ اس طرح Chekhov اور Tolstoy کو بھی۔ دوستوئفسکی نے تو اُسے پڑھنے کے دوران اس کی سوچ ہی بدل ڈالی تھی۔

اُس کے کرداروں کی لغزشیں، ان کی خود غرضیاں یا نیکیاں اور اُن کا پاگل پن۔ انسانی نفسیات کا ایسا گہرا اور ہمہ جہت مطالعہ اس نے تب تک ادب میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے علاوہ کہیں نہ دیکھا تھا۔ بہر حال اس طرح وہ پیرس میں رہ کر نئی دنیا کی بیشتر اہم ادبی تخلیقات سے واقف ہوا جا رہا تھا — یہ ایک ایسا شہر تھا جہاں آرٹ اور ادب کے خزانوں سے مستفید ہونے کے معاملے میں امیر و غریب کے درمیان کوئی تفریق نہ تھی۔

ہمنگوے ان دنوں پیرس میں رہ کر شروع کی گئی اپنی ادبی مہم کا حاصل روسی ادیبوں کی شاہکار تخلیقات سے واقفیت کو مانتا تھا مگر وہ اس وقت سخت حیرت میں پڑ گیا تھا جب ایذرا پاونڈ نے جسے اُس نے ایک دانشور، ادیب اور نقاد کی حیثیت سے ایک بلند مقام پر بٹھا رکھا تھا اسے بتایا تھا کہ اُس نے ان روسی ادیبوں میں سے کسی کو نہیں پڑھا —

"To tell you the truth, I have never read the 'Rooshians'." ہمنگوے کے لیے پاونڈ کا یہ کورا جواب نہ صرف حیرت میں ڈال دینے والا بلکہ Shocking بھی تھا۔ وہ سمجھ نہ سکا تھا کہ Turgnev دوستوئفسکی یا چیخوف اور ٹالسٹائی کو پڑھے بغیر پاونڈ جدید دنیا کے فکشن کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہے۔ "Keep to the French, you have plenty to learn there." پاونڈ نے اپنے طور پر اُسے

مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

پندرھویں باب میں اس زمانے کے معروف شاعر Ralph Chauver Dunning اور اس کے بارے میں پاؤنڈ کی فکر مندی کا ذکر ہے۔ پیرس کے اپنے پرانے ٹھکانے کو چھوڑنے سے پہلے پاؤنڈ نے ہمنگوے کو شیشے کا ایک مرتبان ---- دے کر تاکید کی تھی کہ اس میں جو دوا ہے وہ Dunining کو ضرورت پڑنے پر دے دیا کرنا۔ اسے کھول کر سونگھنے پر پتہ چلا کہ اس میں افیم تھی۔ بعد میں کسی نے بتایا تھا کہ وہ بہت مہنگی تھی اور پاؤنڈ اسے کسی ہندوستانی تاجر سے Dunning کے لیے خریدا کرتا تھا۔ Dunning کو افیم لینے کی لت تھی اور وہ اس کے نشے کے دوران کئی کئی دن صرف دودھ پر گزارہ کرتا تھا۔ وہ پاؤنڈ کا پڑوسی تھا اور پاؤنڈ اس کی شاعری کا مداح۔ ایک دن اس نے ہمنگوے کو جلد آنے کو کہا : '' Dunning چٹائی پر لیٹا تھر تھرا رہا ہے۔ جلد آؤ۔'' Dunning واقعی اس وقت ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ پھر پاؤنڈ نے دوستوں سے چندہ کر کے اس کا علاج کروایا اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو سکا تھا۔ ابھی بھی اسے افیم فراہم کرنے کی ذمہ داری ہمنگوے کی ہی تھی۔ ایک دن پاؤنڈ کے کسی دوست کا پیغام آیا کہ افیم لے کر جلدی پہنچو Durning اسٹوڈیو کی چھت پر چڑھ گیا ہے اور چیخ رہا ہے کہ اُسے افیم نہ دی گئی تو نیچے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلے گا۔ ہمنگوے وہاں پہنچا تو وہ نیچے اُتر کر فلیٹ کے اندر جا چکا تھا شاید کسی نے اسے بھروسہ دلا دیا تھا کہ افیم منگائی جا چکی ہے۔ ہمنگوے نے دروازہ کھٹکھٹایا تو وہ کسی وحشی کی طرح باہر نکلا اور ہمنگوے کے ہاتھ سے شیشے کا مرتبان لے کر ہوا میں اُچھال دیا۔ "You bastard !you son of a bitech! Why did you take so long?" شاید تب تک اس کی طلب کسی اور ذریعے سے پوری ہو چکی تھی اسے پاؤنڈ کی بھیجی ہوئی رسد کی ضرورت نہ تھی۔

ہمنگوے کا بیان ہے کہ اس نے ایذرا پاؤنڈ سے زیادہ مہربان، کشادہ دل اور بے غرض ادیب نہیں دیکھا۔ وہ ہر اس شاعر، پینٹر یا مجسمہ ساز کی مدد کو آگے آجاتا تھا جسے وہ جانتا تھا اور جو نا ساز گار حالات کا شکار ہوتا تھا۔ جب اس سے ہمنگوے کی ملاقات ہوئی تھی تو وہ T.S. Eliot کی مدد کرنے کے مشن پر تھا جو ان دنوں لندن کے ایک بینک میں ملازم تھا۔ پاؤنڈ چاہتا تھا کہ ایلٹ کو بینک کی ملازمت سے چھٹکارہ دلا کر کسی ادبی جرنل کا ایڈیٹر بنایا جائے تا کہ اسے اپنی شاعرانہ اور تنقیدی صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے زیادہ وقت اور موقع مل سکے۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک دولت مند امریکی خاتون 'Miss Natalie Barney' کے ساتھ مل کر جو آرٹ پیٹرن کے طور بھی جانی جاتی تھیں "Bel Spirit" نام کا ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے ممبران پاؤنڈ کے بے شمار دوست تھے جن میں سے ہر ایک کی ذمہ داری تھی کہ وہ اپنی آمدنی کا کچھ حصہ ادارے کو دیں جس سے ایلٹ کو مالی طور پر مستحکم کر کے بینک کی ملازمت سے چھٹکارہ دلایا جائے اور وہ اپنے ادبی مشاغل پر پوری توجہ دے سکے۔ چنانچہ پاؤنڈ نے یہ کام پورا کر کے ہی چھوڑا۔ "Belspirit" کی اس تنظیم

کی ایلیٹ کی نظم 'ویسٹ لینڈ' کے منظر عام پر آئے اور اسے 'Dial award' وغیرہ ملنے کے بعد یوں ضرورت نہ رہی کہ اس سب سے متاثر ہو کر ایک دوسری صاحبِ ثروت خاتون نے 'The Criterion' نامی ایک ادبی جرنل شروع کر کے ایلیٹ کو اس کا ایڈیٹر بنا دیا۔ ہمنگوے پاونڈ کو ہفتوں ایلیٹ کی نظم 'ویسٹ لینڈ' کو، جو پہلے بہت طویل تھی، ایڈٹ کرتے اور اس کے پروف چیک کرنے میں مشغول دیکھ چکا تھا۔

سولھویں باب میں Fall کے دنوں میں پیرس چھوڑ کر ہمنگوے خاندان کے Anstria کے Alpine پہاڑی سلسلے میں Shruns نامی قصبے میں جا کر رہنے کا ذکر ہے جہاں وہ کئی بار Skiing کے لیے جا چکے تھے۔ اب ان کے ساتھ ان کا تین مہینے کا بچہ بھی تھا جسے وہ مسٹر بمی [Mr. Bumby] کہتے تھے۔ یہاں آسٹریا کے پہاڑی سلسلے کی قدرتی خوبصورتی، وہاں کے قصبوں اور گاؤں میں بسے عوام کی خانہ بدوشوں [Nomads] جیسی طرزِ زندگی وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے۔ گو کہ وہ اور اس کی بیوی Hadley دونوں ہی Skiing کے شوقین تھے جس میں ان کا زیادہ تر وقت چلا جاتا تھا مگر ہمنگوے کا لکھنا وہاں بھی جاری تھا۔ اس بار ۲۶-۱۹۲۵ء کے Fall میں یہاں اس نے چھ ہفتوں میں چند کہانیوں کے ساتھ اپنا مشہور ناول "The Sun Also Rises" مکمل کیا تھا — مگر شاید وہاں کا اس بار کا یہ Fall اس کے لیے نہ صرف آخری ثابت ہوا بلکہ اس نے اس کی زندگی کو بھی ویسا نہ رہنے دیا جیسی وہ تب تک رہی تھی۔ بدقسمتی سے حالات نے کچھ ایسا موڑ لیا کہ اس کی بیوی Hadley نے اس سے ترکِ تعلق کر کے کسی دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ ہمنگوے نے اس سے متعلق تفصیلات اس باب میں اختتاماً شامل کیے تھے مگر بعد میں اسے حذف کر دینا ہی مناسب سمجھا:

"The last year, in the mountains, new people came into our lives and nothing was ever the same again .... Hadley and I had become too confident in each other and careless in our confidence and pride. In the mechanics of how this was peneterated, I have never tried to apposition the blame, except my own part.... The bulldozing of three people's hearts, to destroy one happiness and build another and the love and the good work and all that came out of it, is not part of this book, I wrote it and left it out. It is a complicated, valuable and instructive story. How it all ended finally, has nothing to do with this either— The only one Hadley, who had no possible blame ever, came well out of it finally and married a much finer man than I never was or could hope to be and is happy and deserves it."

سترھواں باب زیادہ تر مشہور امریکی فکشن نگار اور مترجم [فارسی شاعری اور خیام کی رباعیوں کے] Scott Fitzgerald کی شخصی زندگی سے متعلق ہے جو ہمنگوے کا قریبی دوست تھا اور ان دنوں پیرس

میں رہ رہا تھا۔ ہمنگوے کے مطابق فٹز یرالڈ کا چہرہ کسی بچے کا سا تھا اور نچلا دھڑ نمایاں طور پر چھوٹا۔ اس سے پیرس میں پہلی ملاقات ناخوش گوار۔ اس کی گفتگو کا انداز اور اس کی دلچسپی کے موضوع ایسے تھے کہ اس میں واضح طور پر پرسنل Ethics کا فقدان محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ شروع میں تو ہمنگوے کے ادبی کارناموں کی ستائش کرتا رہا جس میں سنجیدگی یا خلوص کم اور لن ترانی زیادہ تھی مگر بعد میں لچر قسم کے سوالات کرنے پر اتر آیا:

''کیا تم اور تمھاری بیوی میں شادی سے پہلے بھی جنسی قربت رہ چکی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ مجھے یاد نہیں۔''

''تمھیں اتنی اہم بات کیسے یاد نہیں رہی؟''

''ٹھیک ہے بھائی۔ میں مختلف آدمی ہوں مجھے معاف کرو۔''

''کسی احمق کی طرح بات مت کرو۔ یاد کرنے کی کوشش کرو۔ تمھیں بتانا ہوگا۔'' ہمنگوے نے دیکھا اس دوران اس کا چہرہ سُرخ ہو کر کھینچنے لگا تھا اور اسے پسینہ آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شیمپین کا گلاس تھا اور وہ بار کے سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی سی سمٹ آئی تھی اور ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ اس کا چہرہ سفید پڑنے لگا تھا جیسے وہ کسی تیزی سے جلتی ہوئی موم بتی کی طرح پگھل کر ختم ہو جائے گا۔ یا جیسے اس کے چہرے پر موت کا ماسک لگا دیا گیا ہو۔

''یہ تو مر رہا ہے۔'' ہمنگوے نے وہاں موجود اس کے ایک دوست سے کہا تھا۔ ''اسے کسی کلینک لے جانا چاہیے۔'' ''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ کچھ بھی جنس سے متعلق ہو تو اس کا یہی حال ہو جاتا ہے۔ بس ہمیں اس کو اس کے فلیٹ تک پہنچانا ہوگا۔'' اگلی ملاقات میں اسے اس کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں تھا اور وہ ہمنگوے سے اپنی نئی ناول 'The Great Gatsby' پڑھنے پر اصرار کر رہا تھا جو ان دنوں تو زیادہ نہ بک سکی تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ امریکن فکشن کا شناخت نامہ سمجھی گئی۔

فٹز یرالڈ پیرس میں رہ رہا تھا مگر اسے وہاں کے لوگوں سے نفرت تھی اور چونکہ روزمرہ کی زندگی میں اس کا سابقہ عموماً ہوٹل کے بیروں، ٹیکسی والوں اور وہاں کے فلیٹ مالکین وغیرہ سے ہی پڑتا تھا اس لیے اسے ان کی تذلیل کے مواقع اکثر ملتے رہتے تھے۔ ویسے وہ اطالوی لوگوں کو بھی ناپسند کرتا تھا اور انگریزوں کو بس برداشت کر لیا کرتا تھا۔ وہ اگر کسی سے وفاداری اور محبت کا دم بھرتا تھا تو وہ اس کی بیوی Zelda تھی جس کے بارے میں وہ کہا کرتا تھا کہ شادی کے بعد سے ایک رات بھی اس سے الگ بستر پر نہیں سویا۔ چونکہ فٹز یرالڈ ایک بہترین قصہ گو تھا اس لیے خود اپنی زندگی کی حکایت کا اس کا بیان بھی اتنا ہی افسانوی ہوا کرتا تھا۔ ہمنگوے کی تب تک زیلڈا سے ملاقات نہ ہو سکی تھی اور اسے معلوم نہ ہو سکا تھا کہ فٹز یرالڈ نے اس سے متعلق اپنی ازدواجی زندگی کی کہانی میں کس قدر سچ اور کتنے جھوٹ سے کام لیا ہے۔

اٹھارواں باب بھی زیادہ تر فٹز یرالڈ اور زیلڈا سے ہی متعلق ہے۔ یہ لوگ اکثر ملنے لگے تھے اور

ایک دوسرے کے بارے میں کافی کچھ جان چکے تھے۔ ہمنگوے پہلی بار فٹز جیرالڈ اور اس کی بیوی کے بلاوے پران کے یہاں لنچ پر گیا تو اسے اس کا فلیٹ دیکھ کر مایوسی ہوئی جو گھٹن بھرا، تاریک اور بے حد معمولی سا تھا اور وہاں کوئی بھی چیز قابل توجہ نہ تھی سوائے فیٹز جیرالڈ کی چند ناولوں اور کہانیوں کے مجموعوں کے جنھیں بڑی نفاست سے الماری میں سجا کر رکھا گیا تھا۔ یہ بڑے اہتمام سے شائع کیے گئے تھے۔ ان کی بائنڈنگ چرمی تھی اور عنوانات سُنہرے حروف میں لکھے گئے تھے۔ اس نے ہمنگوے کو ایک بڑا سا رجسٹر بھی دکھایا جس میں اُس کی ہر کہانی اور ناول کا اندراج تھا ان تفصیلات کے ساتھ کہ وہ کس سال کہاں شائع ہوئیں اور ان سے اُسے کتنا معاوضہ ملا تھا۔ اپنے اس ادبی سرمائے کے تئیں اس کا رویہ ہمنگوے کو کسی میوزیم کے Curator کا سا لگا تھا۔

زیلڈا نے شاید پچھلی رات کچھ زیادہ پی لی تھی جس کا Hangover ابھی تک تھا۔ وہ تھکی تھکی اور نڈھال سی لگ رہی تھی اور اس کا خوبصورت چہرہ کھینچا ہوا سا تھا۔ بعد میں فٹز جیرالڈ نے بتایا کہ رات میں ان کا جھگڑا ہوا تھا۔ دراصل زیلڈا پارٹیوں کی دلدادہ تھی اور ان میں کھُل کھیلنے پر مائل رہتی تھی جب کہ فٹز جیرالڈ کا خیال تھا کہ ان سب میں ان کا بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے جسے وہ اپنے تخلیقی کاموں میں لگا سکتا تھا۔ شاید شوہر کے تخلیقی کاموں میں حصہ دار نہ بن پانے کا شدید احساس ہی زیلڈا کے erotic رویے کی وجہ تھا۔ دوسری طرف فٹز جیرالڈ اُس سے بے پناہ محبت کرتا تھا اور دوسرے مردوں کی جانب اس کی تھوڑی سی توجہ بھی برداشت نہ کر پاتا تھا۔ ایک بار تو نیوی کے ایک پائلٹ سے اس کا باقائدہ عشق شروع ہو جانے پر ان کی شادی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی تھی۔

روزانہ کی لیٹ نائٹ پارٹیاں اور زیلڈا کی بے اعتدلیوں سے بچنے کی غرض سے وہ کچھ عرصے کے لیے پیرس سے باہر ایک چھوٹے سے قصبے میں رہا تھا۔

مگر بیوی کی ضد کے آگے اُسے ہتھیار ڈالنا پڑا۔ اور اب پیرس میں زندگی کا وہی طور تھا۔ رات رات بھر پینا اور پارٹیوں میں ڈانس کرنا اور دن بھر سونا۔

ہمنگوے کچھ عرصے کے لیے اسپین جا کر واپس آیا تو فٹز جیرالڈ کا بُرا حال دیکھا۔ وہ صبح سے ہی پینا شروع کر دیتا تھا اور رات دیر گئے تک شراب میں غرق رہتا تھا۔ اس عالم میں وہ دوستوں اور شناساؤں کے یہاں پہنچ جاتا تھا اور ان سے لڑنا جھگڑنا شروع کر دیتا تھا۔ مگر ایسے میں بھی وہ جب بھی ہوش میں ہوتا تو بہترین دوست ثابت ہوتا تھا۔ انھی دنوں زیلڈا کا پہلا نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ فٹز جیرالڈ کی عجیب حالت تھی۔ وہ ہمنگوے کو ہاسپٹل کی کینٹین میں لے گیا۔

''تمھیں پتا ہے میں زیلڈا کے علاوہ کسی اور عورت کے ساتھ نہیں سویا۔'' فٹز جیرالڈ نے اُسے بتایا۔

''نہیں مجھے اندازہ نہیں''

''شاید میں نے تمھیں بتایا تھا۔ خیر اسی سلسلے میں مجھے تم سے کچھ اور بھی باتیں کرنی ہیں۔''
''بتاؤ''
''زیلڈا نے شادی کے فوراً بعد مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری ساخت ایسی ہے کہ تم کسی عورت کی تشفی کا باعث نہیں ہو سکتے اور یہ کہ وہ مجھ سے بے حد مایوس ہے۔ اُس نے کہا تھا کہ اس بات کا تعلق سائز سے ہے۔ بس اُس دن کے بعد سے میں کبھی پہلے جیسا مرد نہیں رہا۔''
ہمنگوے نے اُسے تسلی دینے کی غرض سے کہا تھا کہ وہ بالکل نارمل معلوم ہوتا ہے۔ اگر اسے شبہ ہے تو وہ Louvre کے آرٹ میوزیم میں جا کر Male Nudes کو دیکھے اور پھر گھر واپس جا کر آئینے کے سامنے خود کو۔ شائد وہ ان کے اور اپنے سائز میں زیادہ فرق نہ پائے گا۔
''شاید سائز کے معاملے میں مجسمہ سازوں سے غلطی ہوئی ہو!''
''ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اساطیری ہیروز اور دیوتاؤں کے مجسمے ہیں جن کے جمالی خطوط مثالی ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان کی ساخت اور سائز کے تعلق سے مطمئن ہیں اور اسے معیاری مانتے ہیں۔''
''پھر زیلڈا نے ایسا کیوں کہا؟''
''یہ مرد کی برتری پر ضرب لگانے کا عورت کا اچوک ہتھیار ہے۔ اس کا استعمال کر کے وہ اُسے ہمیشہ کے لیے زیر کر سکتی ہے۔ تمھارے ساتھ وہی ہوا ہے۔ زیلڈا نے اس طرح تمھاری زندگی معطل کر کے تمھیں اپنی مرضی کے مطابق جینے پر مجبور کر رکھا ہے۔ ویسے تم اپنی طمانیت کے لیے کسی ڈاکٹر سے بھی رجوع ہو سکتے ہو۔'' ہمنگوے نے اُس پر اپنی سوچ پوری طرح واضح کر دی تھی۔
''میں ڈاکٹر کے پاس جانا نہیں چاہتا۔ تم میرے ساتھ 'Louvre' چلو۔''
پھر وہ 'Louvre' گئے تھے مگر فٹز یرالڈ کے شبہات کا ازالہ نہ ہو سکا تھا۔ ہمنگوے نے وہاں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اُن کے سائز چھوٹے اس لیے ہیں کہ وہ Repose میں بنائے گئے ہیں۔ حقیقی زندگی کی عملی صورت میں وہ بڑے دکھائے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی خاص Angle بھی فرق پیدا کر دیتا ہے یا کمر کے نیچے تکیے وغیرہ کا استعمال۔
''پہلے ایک لڑکی میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتی تھی اور میں خوش اور مطمئن تھا۔ مگر زیلڈا سے ملاقات کے بعد مجھ کو لگ کہ میں پوری طرح ختم ہو گیا ہوں۔'' فٹز یرالڈ کا لہجہ اب بھی اتنا ہی مایوس کن تھا۔
''زیلڈا کی بات بھول جاؤ۔ وہ سفاک اور خود غرض ہے۔ شاید وہ واقعی تمھاری ذہنی و تخلیقی صلاحیتوں سے حسد رکھتی ہے اور وہ تمھاری مردانگی پر سوال قائم کر کے تمھاری خود اعتمادی کو ختم کر دینا چاہتی ہے تاکہ تم ہمیشہ اُس کے تابع دار بنے رہو۔ تم اُس دوسری لڑکی سے رشتہ کیوں نہیں جوڑ لیتے جو تمھیں پسند

کرتی ہے؟''

''تم زیلڈا کو نہیں جانتے کیا یہ سب اتنا آسان ہوگا۔'' فیٹز یرالڈ کے لیے جیسے اپنی انا کی بازیافت کے لیے کوئی راستہ نہ تھا۔

پھر برسوں بعد دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر اسی Ritz بار میں Georges نامی بیرے نے جو پہلے کی طرح اب بھی وہاں موجود تھا ہمنگوے سے پوچھا تھا کہ اس بار میں برسوں پہلے آنے والا مونیشر فٹزیرالڈ کون تھا جس کے بارے میں لوگ اس سے اکثر دریافت کیا کرتے ہیں۔

''تم انھیں نہیں جانتے!''

''نہیں میں بہت لوگوں کو جانتا ہوں سوائے اُن کے مگر لوگ انھی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔''

''پھر تم انھیں کیا بتاتے ہو؟''

''بس وہی جو وہ سُننا چاہتے ہیں کہ وہ اب سے ۲۰۔۲۵ سال پہلے کے ایک امریکی ادیب تھے جو پیرس اور آس پاس کے قصبوں میں کئی سال رہے تھے۔ مگر مجھے تعجب ہے کہ اسی بار میں طویل عرصے تک کام کرتے ہوئے بھی میں انھیں کیوں نہیں یاد رکھ سکا۔''

''مگر اب ویسے زیادہ تر لوگ مر چکے ہیں''۔ ہمنگوے نے ایک سرد آہ کھینچی تھی۔

''اس سے کیا ہوا۔ کیا کوئی صرف اس لیے بھلا دیا جاتا ہے کہ وہ مر چکا ہے۔ لوگ تو اب بھی انھی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ آپ ان کے بارے میں بتایئے۔ میری خواہش ہے کہ میں اپنی یادداشت لکھوں جن میں ان کا ذکر ہو۔''

''خوب''! ہمنگوے نے Georges سے اتفاق کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ وہ خود بھی پیرس میں گزارے ہوئے ایام سے متعلق ایک کتاب مرتب کرنا چاہتا ہے جس میں وہ اپنے عزیز دوست اسکاٹ فٹزیرالڈ کا ذکر خاصی تفصیل سے کرے گا۔

☆ **نوٹ** : [اس مضمون میں ایسا بہت کچھ ہے جس سے ہمنگوے پر کام کرنے والے انگریزی یا امریکی ادب کے اسکالرز شاید پہلی بار متعارف ہوں گے چنانچہ مصنف نے اِس کا انگلش version ساہتیہ اکادمی، دہلی کے جرنل 'Indian Literature' کو بھی اشاعت کے لیے بھیجا ہے۔]

☆☆☆

شہرِ تحقیق

یادگارِ غالب

[غالب آشنائی سے غالب شناسائی تک حالؔی کا ذہنی ارتقا]

اسیم کاویانی

مولانا حالی، اردو زبان کی عہد جدید کی تاریخ میں تنقید اور سوانح نگاری کے بنیاد گزار کی حیثیت سے ایک دائمی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ جدید نظم کے پیش رو بھی ہیں۔ قلم روئے ادب کی محفلِ سخن میں وہ اپنے مسدس اور ارتدادِ شعری کے باعث اور بزمِ نثر میں کم از کم اپنی تین تصانیف (مقدمہ شعروشاعری، یادگارِ غالب، اور حیاتِ جاوید) کی شہرت و مقبولیت کے سبب سے وہ اُن کی اشاعت کی ایک صدی کے بعد بھی بحث و فکر کا موضوع بنتے رہے ہیں اور ہمارے ادبی رویّوں پر بھی کسی نہ کسی پہلو سے اثرانداز ہوتے رہے ہیں۔ میرے اس مضمون کا مقصد 'یادگارِ غالب' کی تشکیل و تکمیل کے پس منظر میں حالی کے فکری ارتقا کا مطالعہ کرنا ہے۔

حالی نے مرزا غالب کی وفات کے اٹھائیس برس بعد 'یادگارِ غالب' مکمل کی تھی۔ درمیان میں اُنھوں نے ایک بار اسے لکھنا شروع تو کیا تھا، لیکن دوسرے کاموں میں پڑ کر ادھورا چھوڑ دیا تھا(1)۔ آخر برسوں بعد اپنی یادداشتوں کے اُن پلندوں کو کھول کر اُنھوں نے از سرِ نو محنت کی اور 1897ء میں اسے پیش کیا۔ اگر چہ 'یادگارِ غالب' اردو کی مقبول کتابوں میں سے ایک ہے، لیکن محققینِ غالب کا یہ اعتراض بے جا نہیں کہ حالی نے جو زمانہ پایا تھا اور اُنھیں مرزا غالب کے معاصرین تک جو رسائی حاصل تھی، اُسے دیکھتے ہوئے اُنھوں نے خاطر خواہ تحقیق و تفحص سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالب کے سوانحی حالات میں جہاں تشنگی کا

احساس پایا جاتا ہے وہیں کچھ تحقیقی لغزشیں بھی در آئی ہیں، جن کی طرف مولانا غلام رسول مہر، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر سید عبداللہ، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ توجہ دلا چکے ہیں۔ اس کے باوجود مرزا غالب کے حالاتِ زندگی اور اُن کی شخصیت کے تعلق سے جو بنیادی معلومات حالی نے جمع کر دی ہیں اُن کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص 'یادگارِ غالب' کے دو تہائی سے زیادہ حصے میں جہاں حالی نکتہ داں نے غالب کے اردو اور فارسی کلام کی تشریح کے ذریعے غالب فہمی کی مشعل روشن کر رکھی ہے، ایک زمانے سے شارحینِ غالب اپنی فکر و نظر کے چراغ جلاتے آئے ہیں۔ بلاشبہ آج غالبیات کی تحقیق و تشریح نے حالی کی 'یادگارِ غالب' سے لے کر نارنگ کی 'غالب، معنی آفرینی...' (2) تک ایک بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے اور اب یہ راہ پُر خار نہیں رہی۔ یہ تو پہلا قدم ہے جس کا اُٹھانا دشوار ہوا کرتا ہے اور وہ بلا حالی نے سر کر لی تھی۔

نہ جانے کیوں محققینِ غالب نے حالی اور غالب کے تعلقات پر زیادہ توجہ نہیں کی۔ ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ 1854ء میں بعمر سترہ سال اپنی شادی کے بعد اس اطمینان پر کہ بیوی کا میکہ آسودہ حال ہے، حالی حصولِ علم کی غرض سے دلّی چلے آئے تھے۔ یہاں 55-1854ء میں اُن کا کوئی ڈیڑھ سال قیام رہا تھا۔ اُسی دور میں اُنھوں نے قلعہ معلّٰی کے مشاعرے میں غالب کو اپنا اردو اور فارسی کلام پڑھتے ہوئے سنا تھا، لیکن اُن سے حالی کی ملاقات کے شواہد نہیں ملتے۔ یہ بات بھی قیاس میں نہیں آتی کہ ان کی اس عمر کی شعر گوئی نے غالب سے داد پائی ہو۔ جن محققوں نے حالی کے اُسی دورے میں اُن کی غالب سے ملاقات کرادی ہے، انھوں نے عجلت پسندی سے کام لیا ہے۔ دراصل حالی کے خود نوشتہ 'ترجمہ حالی' میں ان کے طرزِ بیاں کے ابہام سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ غدر کے بعد پانی پت میں بیکاری کے چار سال گزار کر بعمر چوبیس سال دوبارہ دلّی آئے تھے۔ (3) اس بار وہ 1861ء تا 1863ء کے درمیان دو برس تک غالب سے اُن کی اردو اور فارسی غزلوں اور قصیدوں کا درس لیتے رہے تھے اور اپنے کلام پر اصلاح بھی۔ قرائن کہتے ہیں کہ اسی زمانے میں غالب نے حالی کی شاعری کے تعلق سے اپنی یہ مشہور رائے ظاہر کی تھی کہ 'اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا، لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔'

۱۸۶۳ء میں حالی کی شناسائی نواب مصطفٰی خان بہادر شیفتہ سے ہوئی، جو دلّی کے ایک رئیس اور جہانگیر آباد کے تعلقہ دار تھے۔ حالی اُن سے بطور مصاحب وابستہ ہو گئے، پھر اُن کے بچوں کے اتالیق بھی مقرر ہوئے۔ حالی کا یہ تعلق تقریباً سات برس، دوسرے لفظوں میں 1869ء میں نواب شیفتہ کے دمِ آخر تک برقرار رہا۔ (4) اس دور میں نواب شیفتہ مرزا غالب کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ حالی نے لکھا ہے کہ نواب شیفتہ کے ساتھ وہ بھی اپنا کلام جہانگیر آباد سے دلّی بھیجا کرتے تھے۔ شیفتہ جب کبھی دلّی جاتے ہوں گے تو غالباً حالی بھی اُن کے ساتھ رہا کرتے ہوں گے لیکن 'یادگارِ غالب' میں ہمیں غالب کی زندگی کے صرف آخری

دو برسوں میں نواب شیفتہ کے ساتھ ان کے دلّی میں موجود ہونے اور اُن کی مرزا غالب سے ملاقاتوں کا حال ملتا ہے۔ 1868ء میں اُس وقت جب کہ غالب 'قاطع القاطع' کے مقدمے کے عدالتی فیصلے سے دل شکستہ تھے(5) اور فروری 1869ء میں اُس وقت جب مرزا غالب کی کشتیِ عمر کنارے پر آ لگی تھی۔ حالی نے اُن کے آخری دنوں اور وداعی سفر کا حال بھی لکھا ہے۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ 1861ء تا 1869ء کی آٹھ برسوں کی شناسائی میں حالی کو زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال کی غالب کی صحبت حاصل رہی ہوگی۔ حالی نے 'یادگار غالب' میں لکھا ہے کہ انھیں اپنے کلام پر غالب کی اصلاح سے چنداں فائدہ نہیں ہوا تھا البتہ نواب شیفتہ سے مشورۂ سخن کرنا اُن کے لیے سود مند رہا تھا۔ وہ نواب شیفتہ کے صوفیانہ مزاج اور ان کے کلام کی سادگی اور اصلیت سے بھی متاثر تھے۔ حالی کے نام ہمیں غالب کا کوئی خط نہیں ملتا۔ خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ اُن سے دلّی میں اصلاح و درس لیا کرتے تھے، اس لیے مراسلت کی نوبت نہ آئی ہوگی، لیکن غالب کے کوئی نو سو اردو خطوط میں کہیں حالی کا ذکر تک نہیں ملتا۔ صرف منشی سیل چند کے نام لکھے ایک خط میں ضمنی طور پر لکھے چند ناموں میں ایک جگہ اُن کا نام 'سن پت کے رئیس، عالم، شاعر اور نواب شیفتہ کے رفیق' کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔(6) حالی کی جہانگیر آباد سے دلّی کی بغرض اصلاح کی گئی مراسلت بھی ہماری دست رس میں نہیں۔ نواب شیفتہ کے نام غالب کے جو مراسلات دستیاب ہیں اُن میں بھی حالی کا ذکر نہیں ملتا۔(7) لگتا نہیں کہ حالی، غالب کے کوئی محبوب شاگرد رہے ہوں گے۔ جن ناقدوں نے یہ لکھا ہے کہ مرزا غالب نے حالی کے کردار کی تشکیل میں نمایاں رول ادا کیا تھا یا یہ کہ حالی غالب کے مقلد تھے، آنے والی تفصیلات کی روشنی میں ممکن ہے کہ اُن کی رائے ترمیم کی محتاج نظر آئے۔

حالی نے اگر مرزا غالب کی وفات کے فوراً بعد یا اس کے کچھ ہی مدت بعد 'یادگار غالب' لکھی ہوتی تو اُس کی صورت کچھ اور ہوتی۔ یہ تو اٹھائیس برسوں پر محیط قلزمِ زمانہ ہے، جس میں اس اثنا میں کافی پانی بہ چکا تھا۔ حالی 'حیاتِ سعدی' لکھ چکے تھے اور 'مقدمۂ شعر و شاعری' بھی۔ وہ قوم کو اپنا مسدس بھی سونپ چکے تھے اور سر سید کی تعلیمی تحریک اور 'تہذیب الاخلاق' کی اصلاحی تحریک سے اپنا پیمانِ وفا بھی باندھ چکے تھے۔ وہ ملّت کے درد و درماندگی کا درماں اکبر و شبلی کی طرح ماضی کی طرف مڑ مڑ کے دیکھنے کی بجائے سر سید کی طرح مستقبل کی تیاری اور پیرویِ مغربی میں دیکھ رہے تھے۔

'حالی، اب آؤ پیرویِ مغربی کریں' کے پیام رساں حالی نے تقلید و روایت پرستی سے بیزار اور 'آئینِ اکبری' کی تقریظ میں انگلستان کی تہذیبِ نوی کی برکتوں کے ستایش گر مرزا غالب کی بائیوگرافی کی تکمیل کو مناسب جانا۔ وہی غالب، جنھیں اُن کے ماضی کا زربفت کے تورہ پوش سے ڈھکا چاندی کا تشت میٹھی روٹی، مونگ کی دال اور سیم کے بیج ہی پروس سکا تھا اور جن کی بیوہ مرحوم کا آٹھ سو روپیوں کا قرض چکانے کے لیے نواب خُلد آشیاں کو مدد کے لیے درخواستیں بھیجتی رہی تھی۔ ستم ظریفی یہ کہ غالب کو اس دال، روٹی اور

بیجوں کی سوغات کی شکر گزاری میں قطعات لکھنے پڑے تھے اور اُن کی بیوہ کی درخواست تحقیق اور سفارش کی منزلوں سے گزر کر بھی اُسے پوری رقم نہ دلا سکی تھی!(8)

حقیقت یہ ہے کہ ان اٹھائیس برسوں کی مدت میں لاہور کے نظم جدید کے مشاعروں، مسدس، مقدمے اور سب سے بڑھ کر سر سیّد کی رفاقت کے انقلابات نے حالی کو حالی بنایا تھا۔ ورنہ اپنے دلّی کے ابتدائی قیام میں تو انھوں نے دلّی کالج تک کو نظر اُٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ وہ اور لوگوں کی طرح اسے 'مچلیے' سمجھتے تھے۔(9) وہ اس دور میں ایک تقلید پسند اور تنگ نظر مولوی سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ حیرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ غالب کی حیات وصحبت میں بھی حالی نے اُن کا کوئی اثر قبول نہ کیا تھا اور اُن کی پروازِ فکر 'مولود شریف' (1864)، 'تریاق مسموم' (1867ء) اور 'طبقات الارض' (1868ء) جیسی کتابوں تک محدود تھی۔(10)

'مولود شریف' ایک قدیم طرز کا میلاد کی محفلوں میں پڑھا جانے والا انتہائی جلی خط میں اٹھانوے صفحات کا کتابچہ تھا۔ 'تریاق مسموم' ایک عیسائی پادری عماد الدین کی 'ہدایت المسلمین' کے جواب میں لکھی گئی روایتی قسم کی مناظرے کی کتاب تھی۔ 'طبقات الارض' جیالوجی کے ابتدائی علم کی فرنچ سے عربی میں ترجمہ شدہ کتاب کا اردو ترجمہ تھا، جو کہ 138 صفحات پر مشتمل تھا۔ بقول حالی 'اصل وترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔'

ہمیں حیرانی ہے کہ مرزا غالب سے شناسائی کے ساڑھے سات برس بعد اور اُن کی موت سے چھے ماہ قبل تک حالی نے اپنی مدرسانہ ذہنیت کی بنا پر غالب کے مزاج اور طرزِ زیست سے کوئی ہم دردانہ رشتہ تک استوار نہ کیا تھا۔ اس کے برعکس ان دنوں وہ مذاہب کو 'سرابستان' قرار دینے والے (11) اور ناکردہ گناہوں کی حسرت کے دادخواہ غالب کو اپنے مولویانہ جوش میں نماز پنج گانہ کی تاکید کر رہے تھے۔ اُن کی ضعیفی اور بیماریوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھیں کھڑے ہو کر نہیں تو بیٹھ کر، یہ بھی ممکن نہ ہو تو اشاروں میں، وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سے سہی نماز کی لازمی ادائیگی پر حالی نے انھیں ایک طویل پند نامہ تک لکھ مارا تھا۔ اُن دنوں غالب کے جذبات 'قاطع القاطع' کے مقدمے کے ناموافق فیصلے سے مجروح تھے اور وہ اپنے عقائد و نظریات پر مخالفوں کے گالیوں بھرے خطوط کا الگ سامنا کر رہے تھے۔ ایسے میں حالی کی پرجوش مذہبیت نے انھیں کس ذہنی اذیت میں مبتلا کیا ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان ہی دنوں ایک موقع پر جب حالی غالب کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو قاصد ایک گم نام لفافہ دے گیا۔ غالب نے انھیں پڑھنے کے لیے دیا۔ حالی نے مکتوب کھول کر دیکھا تو ہچکچا کر رہ گئے اس لیے کہ وہ فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ غالب نے اُن کے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا: ''شاید آپ کے کسی شاگردِ معنوی کا لکھا ہوا ہے۔''(12) اس کے بعد غالب نے اُس 'قرم ساق' (مکتوب نگار) کی گالیوں پر جو تبصرہ کیا وہ قارئین جانتے ہی ہیں، اُن کا جواب اُن کی ذکاوتِ طبع اور شگفتگیِ مزاج کا آئینہ دار ہے۔ یہاں میں قارئین کی توجہ حالی کی طرف 'آپ کے شاگردِ معنوی' کے طنزیہ

طرزِ تخاطب پر مبذول کرانا چاہتا ہوں، جس کے پسِ پشت حالی کے پندنامے اور اس پر ہوئی اُستاد و شاگرد کی بیت کشی کی تلخی کا اثر صاف دیکھا جاسکتا ہے۔ لیکن بہتر ہوگا کہ اُس کی تفصیل پیش کردی جائے۔
حالی کا پند نامہ پاکر دوسرے ہی دن غالب نے اُنھیں 13 اشعار کی ایک فارسی غزل لکھ کر بھیجی تھی، جس میں اُنھیں طنز کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ غزل کا مطلع ہے ۔

بہ مقصدے کہ مرآں را رہِ خدا گویند
بروبرو کہ ازاں سو بیا بیا گویند

اس غزل کے مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان راہِ خدا کی باتیں کرنے والوں کی بے مزا اور بیکار کی گفتگو دل پر کوئی اثر نہیں کرتی، جو نہ تو کتابوں میں پڑھیں نہ ہی فقہا سے سُنیں۔ یہ 'حق پرست' خدا کی بات کرتے ہیں، لیکن خود انا کے گرفتار ہیں۔ غالب صوفیا کا یہ قول یاد دلاتے ہیں کہ وجودِ انسانی ایک عطیۂ الہٰی ہے پھر اسے ہمارا گناہ کیوں کر کہا جاسکتا ہے! البتہ دعوائے وجود ایک گناہ ہے، اس بات کو اُن جیسے اہلِ نظر تسلیم کرسکتے ہیں۔ کہیں پر غالب نے عذرِ لنگ سے بھی کام لیا ہے کہ 'جو پاؤں ہی نہ رکھتا ہو وہ کس طرح چلے!' (کسے کہ پائے ندارد چگونہ راہ رود!) اُن کا کہنا ہے کہ جو لوگ نیکوکاری کے مدعی ہیں، وہ اگر مجھے نیک نہیں سمجھتے تو بُرا بھی نہ کہیں۔ ایک جگہ انھوں نے طعنہ دیا ہے کہ جو لوگ اپنے تانبے کو سونا نہیں بنا پائے وہ اپنے فریب کے مال کے لیے لوگوں کے سامنے کیمیا کی کہانی بیان کررہے ہیں۔

نہ کردہ زرمسِ خود را وبہرِ عرضِ فریب
بہ پیشِ خلق حکایت ز کیمیا گویند

غزل کے آخری شعر میں اُنھوں نے حالی پر یوں چوٹ کی ہے ۔

طمع مدار کہ یابی خطاب مولانا
بس است ہم چو توئی را کہ پارسا گویند

یعنی تُو مولانا کا خطاب پانے کا لالچ نہ کر، یہ کافی ہے کہ تجھ ایسے کو لوگ پارسا کہتے ہیں۔
حالی نے غالب کی ناراضی کو محسوس کیا اور اُن کی مدح میں انیس اشعار کا ایک قطعہ بزبان فارسی لکھ کر اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی ۔

تُو اے رونقِ پیشینیاں بہم شکست
زنظم ونثرتو کاندر زبانِ ما گفتی

حالی کے قطعے کے چیدہ چیدہ اشعار کا ترجمہ یہ ہے کہ تو نے ہماری زبان میں اپنی نظم ونثر میں وہ باتیں کہیں کہ اگلے باکمالوں کی رونق ماند پڑگئی۔ تُو نے اپنے سازِ موزوں سے کیسے (اچھے) نغمے چھیڑے اور

کیا ہی پُر لطف باتیں دل رُبا انداز سے کہیں۔ جب تو نے شراب کا ذکر کیا تو لوگوں کو نشۂ عرفاں کا سرور پہنچا۔ صبا کی بات کی تو یاروں کے دل کھِل اُٹھے۔ تیرے ذکرِ وفا سے نخلِ تمنا سرسبز ہو گیا۔

تُو نے ہزار عقدۂ سربستہ منکشف اور ہزار نکتۂ پوشیدہ ظاہر کر دیے۔ تُو نے (دنیا کے) تمام قصّوں کے اختلاف کا راز بیان کیا اور انفس و آفاق کی سیر سے بھیدوں کو کھول دیا۔ وہ لطیف نکات جو لفظ و بیاں میں نہیں سماتے تھے، تو نے فرشتۂ غیبی کی طرح آ کر انھیں برملا کہہ دیا۔

تیری ہر انوکھی بات دل میں سمانے والی ہے، سوائے اس کے جو تو حالی کے بارے میں کنایے میں کہتا ہے۔ اگر میری حرف گیری کو تو غلط سمجھتا ہے تو میں خطا کار ہوں، لیکن اگر میں نے چند باتیں حجت و تکرار کی اپنی طرف سے نہ کہی ہوتیں تو یہ سب باتیں تُو کہاں کہتا!

حیرت ہے کہ تو حالیِ نیاز مند کو کم عقل، عجیب، خود بین و خود نُما کہتا ہے۔ اُس خاکسار کو تُو انا پسند بتاتا ہے! تعجب ہے کہ اپنے کھوٹے سکّے پر جو منفعل ہے، اُسے تو فریب سے کیمیا کے مال کا رہن کرنے والا بتاتا ہے ؎

عجب کہ منفعلی راز نقدِ ناسرہ اش
بہ زرق در گروِ عرضِ کیمیا گفتی!

آخری شعر میں حالی نے یُوں معذرت خواہی کی ہے ؎

ولیک شرطِ ادب نیست بر تو خوردہ گرفت
ہر آں چہ در حقِ من گفتۂ بجا گفتی

لیکن یہ بات تقاضائے ادب کے خلاف ہے کہ میں تجھ پر اعتراض کروں۔ تُو نے جو کچھ بھی میرے بارے میں کہا، صحیح کہا۔

غالب نے حالی کی رنجیدگی کو محسوس کر کے چار اشعار لکھ کر نواب شیفتہ کے پاس بھجوائے، جن کے ساتھ حالی رہا کرتے تھے:

تُو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری
ہمی بہ لطفِ تُو خود را اُمیدوار کنم

چو حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید
تُو گر شفیع نہ گردی، بگو چہ کار کنم

دو بارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال
بر آں سرم کہ در آں عمر ایں دو کار کنم

یکے ادائے عبادات عمر پیشینہ
دگر بہ پیش گہ حالی اعتذار کنم

غالب نے نواب شیفتہ سے اپنے تعلقات کا واسطہ دے کر لکھا ہے کہ حالی اُن سے بلاوجہ ناراض ہوگئے ہیں۔ وہ اُن کی ناراضی دور کرنے میں مدد کریں۔ اگرچہ یہ بات محال ہے، پر انھیں دوبارہ زندگی دے دی جائے تو وہ اُس زندگی میں دو کام کریں گے۔ ایک تو اپنے پچھلے جنم کی عبادتوں کی ادائگی اور دوسرے حالی کے سامنے اعتذار۔

حالی کی طبیعت کی روانی تو دیکھیے، انھوں نے پھر ایک نو اشعار کا قطعہ لکھ بھیجا:

تُو اے کہ عذر فرستادہ بسوی رہی
سزد کہ جانِ گرامی بر آں نثار کنم

اس قطعے کا خلاصہ بزبان حالی یوں ہوگا کہ "تُو جو کہ اس غلام سے عذر خواہ ہو رہا ہے، مناسب ہے کہ میں اس بات پر اپنی جان نثار کردوں۔ جو شکایت کی گئی ہے وہ عین اُس کے اخلاص پر مبنی ہے۔ اگر تُو مجھے اپنا دوست سمجھتا ہے تو ہزار بار کروں گا۔ میں پاک طینت اور صاف دل ہوں اور حرفِ تلخ بغیر کسی کدورت کے کہتا ہوں۔ حالی نے کسی حد تک چھیڑ چھاڑ جاری رکھنے کی کوشش کی تھی، مثلاً اُن کا ایک شعر ہے ۔

خوش آں کہ ساز کنم از تُو شکوۂ بے جا
تو اعتذار کنی و من افتخار کنم

حالی نے بھی غالب کی طرح آخر میں صلح کا پیغام دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر انھیں ایک اور زندگی ملے تو وہ دنیا کے کاموں میں یہ تین کام خاص طور پر کریں گے کہ وہ اپنی کرنی پر توبہ اور کہنی پر استغفار کریں گے اور غالب کی تحسین پنہاں بھی کریں گے اور آشکار بھی۔

زکردہ توبہ نمایم ز گفتہ استغفار
دگر سپاسِ تو پنہاں و آشکار کنم

اس قطعے کے بعد غالب نے انھیں لکھ بھیجا کہ 'بس اب یہ بیت بجٹی موقوف کرو۔' تب جا کر یہ نوک جھونک ختم ہوئی۔ بہر کیف اس بیت بجٹی سے حالی کی پختگی کلام ظاہر ہے، حالاں کہ اُس وقت اُن کی عمر کوئی اکتیس برس رہی ہوگی۔

یہ حالی کی شریف النفسی اور عالی ظرفی ہے کہ انھوں نے نہ صرف یہ سارا ماجرا 'یادگار غالب' (ص: 48-47) میں محفوظ کر دیا ہے بلکہ اُس زمانے کی اپنی ذہنی کیفیت کے بارے میں اعتراف کیا ہے کہ 'وہ مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے۔ وہ خدا کی تمام مخلوق میں صرف مسلمانوں کو، مسلمانوں میں

صرف اہلِ سنت کو اور اہلِ سنت میں سے صرف حنفیہ کو، اُن میں سے بھی صرف صوم و صلات اور دیگر احکامِ ظاہری کے سختی سے پابند لوگوں ہی کو نجات و مغفرت کے لائق سمجھتے تھے۔ حالی نے لکھا ہے کہ اُس دور میں اُن کا دائرۂ رحمتِ الٰہی کوئن وکٹوریا کی سلطنت سے بھی محدود تھا۔ کوئن وکٹوریا کی سلطنت میں کم از کم ہر مذہب و ملت کے آدمی امن و امان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ حالی کو یہ فکر بھی لاحق تھی کہ روضۂ رضواں میں اُن کا غالب سے ساتھ چھوٹ جائے گا، اس لیے کہ غالب کے اعمال میں جنت میں جانے کے لائق کوئی کام انھیں نظر نہ آتا تھا۔ مختصر یہ کہ غالب کی حیات میں حالی کی ذہنی بساط کا یہ عالم تھا۔

غالب کے انتقال کے تین برس بعد حالی نے اپنی سابقہ کتابوں 'تریاق مسموم' اور 'مولود شریف' کی طرز پر 1872ء میں دو کتابچے اور لکھے تھے۔ ایک 'شواہد الالہام' جو الہام اور وحی کی ضرورت و اہمیت پر کل بائیس صفحات پر مشتمل تھا اور دوسرا سابق مُناظر پادری عماد الدین کی کتاب 'تاریخِ محمدی' پر منصفانہ رائے کا کتابچہ پچیس صفحات پر مشتمل تھا۔ اگرچہ یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ حالی 1867ء یا 1868ء میں سرسید سے مل چکے تھے (13) جیسا کہ 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' میں 1871ء میں چھپے اُن کے مضمون 'سید احمد خاں اور اُن کے کام' سے بھی جھلکتا ہے، جس میں اُنھوں نے اعتراف کیا ہے کہ سرسید کے سلسلے میں لوگوں کی عام بدگمانیوں کے پسِ منظر میں وہ بھی تذبذب اور اُلجھن میں مبتلا تھے، لیکن اب اس تذبذب اور تر ذوبے جا سے نکل چکے ہیں۔ اُنھوں نے سرسید کی کتاب 'خطباتِ احمدیہ' کی ستائش کی تھی اور نو آمدہ جریدے 'تہذیب الاخلاق' (پہلا شمارہ: 24/دسمبر 1870ء) اور کمیٹی 'خوستگارانِ ترقیِ تعلیم' کے مقاصد کو بھی سراہا تھا۔ بہ ایں ہمہ اُن کی روایت پرست اور تقلید پسند فطرت میں ابھی کسی بڑی تبدیلی کے امکانات ظاہر نہ ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ اُن کے مذہبی رجحان میں اتنی کشادگی پیدا ہو گئی کہ اُنھوں نے مناظرے، عقائد اور دیگر مذہبی مباحث کی بجائے اپنی تحریروں کو اخلاقیات مرتکز رکھنا بہتر سمجھا۔ اس کی شاہد نہ صرف اُن کی اگلی تصنیفات 'سوانحِ عمری حکیم ناصر خسرو' (1872ء) اور 'مجالس النساء' (1874ء) ہیں، بلکہ اُن کی مستقبل کی تصنیفی زندگی کا سارا سفر ہی شاہراہِ اخلاقیات پر رواں دواں نظر آتا ہے۔ جس طرح اسٹیفن تسویگ نے کہا تھا کہ گورکی کی تصنیفات میں رچے اس کے ذہن کی بنیادی خصوصیت کو کسی ایک لفظ سے تعبیر کرنا ہو تو وہ 'سچائی' ہوگا، اُسی طرح ادبیاتِ حالی کی ترجمانی کسی ایک لفظ میں سمونی پڑے تو وہ ہوگا 'اخلاق'۔

لاہور میں 'پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو' کی 1870ء تا 1874ء کی ملازمت کے چار برسوں میں وہ انگریزی سے اُردو میں کیے گئے ترجموں کی اصلاحِ زبان پر مامور تھے۔ وہیں وہ مغربی افکار و اسالیب سے آشنا ہوئے۔ پھر کرنل ہالرائڈ اور مولانا محمد حسین آزاد کے اشتراک سے منعقدہ نئی طرز کے مشاعروں میں موضوعاتی شاعری میں طبع آزمائی نے اُن کے ذہن و فکر کو مزید صیقل کیا۔ 1875ء میں حالی اینگلو عربک کالج دلّی میں عربی و فارسی کے مدرس کے طور پر متعین ہوئے۔ یہاں اپنی ملازمت کے تقریباً چودہ برس کے سب

سے پائیدار عہد میں وہ ذہنی، فکری اور عملی ہر اعتبار سے سرسید کی تحریک سے قریب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے اپنے دمِ آخر تک سرسید کے مشن سے وفاداری نبھائی۔ اپنی تصنیفی زندگی کے اسی حصے میں اُنھوں نے وہ کارنامے انجام دیے جنھوں نے حالی کو حالی بنایا، یعنی 1879ء میں 'مسدس حالی' (مدوجزرِ اسلام)، 1886ء 'حیاتِ سعدی'، 1893ء میں 'مقدمہء شعروشاعری'، 1897ء میں 'یادگارِ غالب' اور 1901ء میں 'حیاتِ جاوید' کے ساتھ اُن کے سلسلہء تصانیف کا خاتمہ بالخیر ہوا۔

ان تصانیف میں سے خاص طور پر دو کے تعلق سے حالی کے فکری انقلاب کا اظہار یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اول 'مسدس' جس میں انھوں نے اسلام کی عظمتِ ماضی کے حوالے سے موجودہ پستی و زوال اور اُمت کی غفلت و بے حسی کو آئینہ دکھایا تھا۔ دوم 'مقدمہ' جس میں انھوں نے روایتی اردو شاعری کے فرسودہ مضامین، دروغ، مبالغے، اور تصنع کے فاسد مادوں پر اصلاحی و افادی تنقید کا نشتر چلایا تھا۔ اگرچہ آج ان دونوں حوالوں سے وہ ہماری تاریخ ادب میں ایک ریفارمر کی حیثیت سے سربلند ہیں، لیکن اس زمانے میں انھیں روایت پرستوں اور تقلید پسندوں کی مخالفت کے بڑے طوفانوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ 'مسدس' کے سلسلے میں کوئی پچیس برس اور 'مقدمہ' کے سلسلے میں تقریباً تین سال تک انھیں طعن و ملامت اور طنز و تنقید کے وار جھیلنے پڑے تھے۔ تصانیفِ حالی کے اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے لیے 'یادگارِ غالب' میں حالی کے ذہنی رویے کو سمجھنا زیادہ آسان ہوگا۔

حالی نے 'یادگارِ غالب' کے دیباچے میں غالب کے کلام میں ترجیحی طور پر ظرافت و بذلہ سنجی، پھر عشق بازی و رند مشربی اور اس کے بعد تصوف اور حبِ اہلِ بیت کے موضوعات کو اہم گردانا ہے۔ نوٹ کرنے کے قابل بات یہ ہے کہ سنجیدہ مزاج و خشک طبع حالی نے غالب کے محاسن نظم و نثر میں ظرافت و بذلہ سنجی کو سب سے اہم مقام دیا ہے (اگرچہ شاعری کے تجزیے میں یہ ترتیب بدل گئی ہے)۔ غالب کے کلام پر ریویو کے ضمن میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ غالب کی طبیعت میں شوخی ایسی بھری ہوئی تھی جیسے ستار کے تار میں سُر۔ عشق بازی اور رند مشربی کے مضامین میں غالب کی نکتہ پردازیوں کو سراہتے ہوئے حالی نے لکھا ہے کہ شراب کی مدح میں وہ کسی طرح حافظ و خیام سے کم نہیں ہیں اور معاملاتِ عشق میں بھی اُن کی نازک خیالیوں نے اچھوتے مضامین نکالے ہیں اور متاخرین سے الگ راہ اختیار کی ہے۔

حالی نے کلامِ غالب میں استعارے و تمثیل کی نادرہ کاری، تخیل کی رعنائی اور اسلوبِ بیان کی پہلوداری کو متعدد مثالوں کے ذریعے 'یادگارِ غالب' کے تشریحی حصے میں ایسی خوبی اور تفصیل سے پیش کیا ہے جو کہ 'مقدمہء شعروشاعری' کے نکتہ سنج مصنف ہی کے بس کا کام تھا۔ غالب کے یہاں تصوف، صلح کل اور ہمہ مشربی کے خیالات کو اُن کی نظم و نثر کا بنیادی جوہر کہا جاسکتا ہے۔ اُن کی فکر و فہم کے اس وصفِ خاص کو نمایاں کرنا 'حیاتِ سعدی' کے مصنف کے خاص اپنے ذوق کا معاملہ تھا، سو اس میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی

اور یہ سرسید کی صحبت کا کتنا بڑا اثر ہے کہ غالب کے توحیدِ باری کے عقیدے اور اُن کی نبی و اہلِ بیت سے عقیدت کو حالی نے کافی جانا اور دیگر مذہبی فرائض و عقائد سے اُن کی بیزاری اور حشر و نشر، جنت و دوزخ اور عذاب و ثواب کی مادّی حیثیت سے اُن کے انکار سے وہ بے نیازانہ گزر گئے!

سرسید کے نظریات سے حالی کی وابستگی کا اثر کلامِ غالب کی تشریحات میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک واضح مثال ملاحظہ ہو:

دولت بغلط نبود، از سعی پشیماں شو

کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو

حالی نے لکھا ہے کہ غالباً کفر سے مُراد وہ کُفر ہے جو صوفیائے کرام کے نزدیک ایک بڑا مرتبہ فقر و درویشی میں شمار کیا جاتا ہے۔ پھر وہ اس شعر کا دوسرا حسبِ زمانہ مفہوم سرسید کے کارناموں پر منطبق کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سرسید نے قوم کی خیر خواہی اور بہتری کی تدبیر میں کافر، ملحد، نیچری اور دجال کہلانا گوارا کر لیا، لیکن قوم کی بھلائی کے خیال سے دست بردار نہ ہوئے۔ شاعر کہتا ہے کہ دولت (سعادت) کبھی غلطی نہیں کرتی۔ اُسی کو ملتی ہے جو اس کے لائق ہوتا ہے۔ ایسا کافر ہونے کی سعادت تُو نہ پا سکا تو اپنی سعی پر پشیمان ہو اور ناچاری میں مسلمان ہونے پر اکتفا کر لے۔ (14)

ایک زمانے کے تقلید پسند حالی کے انقلابِ ذہنی کا اب یہ عالم تھا کہ اُن کی وسعتِ فکر و نظر میں رسوم و عقائد کی اہمیت ثانوی رہ گئی تھی اور نظریۂ اخلاق کی وسعت میں ساری انسانیت کا درد سمایا ہوا تھا۔

ہیں نمازیں اور روزے اور حج بیکار سب

سوزِ اُمت کی نہ چنگاری ہو گر دل میں نہاں

[حالیؔ]

حالی نے ایک فن کار غالب کے ساتھ ساتھ اُس کے بشری وجود کے ہفت رنگ پہلوؤں کو روشناس کراتے ہوئے ہمیں بتایا کہ غالب اپنے آپ کو آدھا مسلمان کہنے والا، ہر رات فرنچ (شراب) کا عادی، چوسر و قمار کا شوقین، قرض داری اور قصیدہ گوئی پر مجبور شخص ہی نہیں بلکہ ایک احباب نواز، صاف گو، صلح پسند، مرنجاں مرنج، حیوانِ ظریف اور خوش خلق انسان بھی ہے۔ نوکروں پر ایسا مہربان کہ قرض سے گراں باری کے عالم میں بھی انھیں اپنے سے جدا نہ کرے اور اقربا کا ایسا مخلص کہ دیکھ لو، عارف اور اُس کے بچوں کے ذکر میں لفظ لفظ سے اُس کی محبت پھوٹی پڑتی ہے۔

تہذیب اور سماجی روابط کی پاس داری میں حالی نے بیان کیا ہے کہ ایک بار غالب کسی سے مل کر میں نواب شیفتہ کے یہاں پہنچے۔ شیفتہ نے اُن سے پوچھا کہ وہ مکان سے سیدھے تشریف لائے ہیں یا ر میں کہیں ہو کر آئے ہیں۔ غالب نے کسی کا نام لے کر بتایا کہ اُن کا ایک آنا دینا تھا (15) اس لیے اوّل

وہاں گیا تھا پھر یہاں آیا ہوں'۔

وضع داری کی مثال یہ کہ اُن کی موت سے ایک دن قبل بھی حالی نے اُنھیں نواب علاء الدین خاں کے خط کا جواب لکھواتے ہوئے پایا تھا۔ تقلید و روایت سے بیر اور آزادہ مزاجی ایسی کہ ایک بار غالب کے خسر مرزا الٰہی بخش نے اُن سے اپنے مریدوں کے لیے سلسلہ مشائخ کے شجروں کی نقلیں بنانے کے لیے کہا تو اُنھوں نے نقل نویسی کرتے ہوئے ہر نام کے بعد ایک نام غائب کر دیا تھا۔ پوچھنے پر جواب دیا تھا کہ جب شجرے کو خدا تک پہنچنے کا زینہ باور کر لیا گیا ہے تو کیا حرج ہے اگر درمیان کی ایک ایک سیڑھی نکال دی گئی۔ آدمی ذرا اُچک اُچک کر چڑھ لے گا۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے مرزا غالب کے شاگرد و معتقد ہونے کے باوجود اُن کی سوانح عمری میں حتی المقدور غیر جانب داری ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ پنشن کے مقدمے میں غالب کی صحیح یا غلط اُمیدوں کا مایوسی میں بدلنا ہو یا اُن کی ازالۂ حیثیت عرفی کی نالش میں صلح و صفائی کی مجبوری ہو یا بازی بد کر چوسر کھیلنے کی پاداش میں گرفتاری ہو۔ اُنھوں نے کہیں بھی عیب پوشی کی کوشش نہیں کی۔ غالب کے فارسی نژاد استاد کے وجود پر شک کا اظہار، غالب ہی کے خطوط کے تضادات سے 'یادگار غالب' میں حالی نے کیا ہے۔ اُن کا ان باتوں کو زیادہ مفصلاً اور محاسبانہ طریقے سے نہ پیش کرنا، اس لیے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ اُنھوں نے کتاب کے دیباچے ہی میں واضح کر دیا تھا کہ اُن کا بنیادی مقصد غالب کے کلام اور انشا کے محاسن کو متعارف کرانا ہے۔

اُنھوں نے کچھ لفظوں کے املے کے سلسلے میں غالب سے اپنے اختلاف کا اظہار کیا ہے اور اس بات کی نکتہ چینی کی ہے کہ غالب عوام الناس کی زبان پر جاری الفاظ و محاورات سے تا بمقدور گریز کرتے تھے۔ حالی کے نقطۂ نظر سے یہ طرزِ عمل زبان کا دائرہ تنگ کرنے کے مترادف تھا۔

اسی طرح غالب کے درونِ خانہ کی سچی تصویر بھی حالی نے بغیر کسی آرایش کے کھینچ کر رکھ دی ہے۔ چوں کہ غالب کا خرچ اُجلا تھا اور آمدنی کم، اس لیے تنگ دستی میں بسر ہوتی تھی۔ وہ خاص مواقع پر حاصل ہونے والی خلعت و رقوم جواہر گھر پہنچتے ہی فروخت کرنے کے لیے بازار بھیج دیتے تھے۔ ایک بار خود حالی کے سامنے غالب نے بخشش کے لیے آئے ہوئے چپراسیوں کو اتنی دیر ٹھیرائے رکھا تھا، جب تک کہ خادم خلعت فروخت کر کے نقد نہیں لے آیا۔ جب نقد رقم آئی تو چپراسی بخشش لے کر گئے۔

مختصر یہ کہ غالب آشنائی سے لے کر غالب شناسائی تک کے سفر میں حالی کو شیفتہ کے صوفیانہ تصورات، کرنل ہالرائڈ کے شعری تجربات اور سر سید جیسے مجدد، عقلیت پسند اور پیکرِ عمل کے فیض صحبت نے زندگی اور زمانے کو سمجھنے کا ایک وسیع افق فراہم کیا، ایک نیا اندازِ فکر دیا اور یہ وہ عوامل ہیں جنھوں نے حالی کے ذہنی ارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا۔

حالی نے مرزا غالب کے کمالِ فن اور اُن کی عصری قدر دانی کی مثال زالِ مصر کے ذریعے سوت کی انٹی کے عوض یوسف کی خریداری پر قائم کی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ غالب کے کمالِ فن کی گراں قدری کا کسی نے اس سے بہتر لفظوں میں اظہار کیا ہوگا۔

حواشی::

(1) بحوالہ دیباچہ 'یادگارِ غالب' (مولانا حالی)، ص: 3,4۔ راقم کے پاس 'یادگارِ غالب' کا جو قدیم اڈیشن موجود ہے، اُس پر 'مطبع مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ' اور 'بہ اہتمام محمد مقتدیٰ خاں شروانی' طبع ہے، سالِ طباعت نہیں ہے۔ محترمی گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر وحید قریشی کے یہاں بیشتر اسی اڈیشن کے حوالے آئے ہیں۔

(2) کتاب کا پورا نام ہے، 'غالب: معنی آفرینی، جدلیاتی وضع، شونیتا اور شعریات'

(3) بقول شیخ محمد اسماعیل پانی پتی 'مولانا حالی نے اپنی مختصر سوانح عمری نواب عماد الملک بہادر کی فرمائش پر لکھ کر حیدر آباد بھیجی تھی اور اس کی ایک نقل اپنے مستعملہ 'دیوانِ حالی' کے ابتدائی اوراق پر لکھ لی تھی۔' جو کہ اب 'مقالاتِ حالی' جلد اول میں شامل ہے۔ یہ خود نوشت مجمل ہے اور بہت سی تفصیلات سے خالی ہے۔

(4) تقریباً تمام محققینِ اردو اور تذکرہ نگار اس بارے میں ایک رائے ہیں کہ شیفتہ کا انتقال 1869ء میں ہوا تھا۔ معین احسن جذبی نے اپنی کتاب 'حالی کا سیاسی شعور' میں غلطی سے شیفتہ کا سالِ وفات 1872ء لکھ دیا ہے (ص: 62) اور اسی بنا پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ شیفتہ کی صحبت میں حالی آٹھ نو سال (1863 تا 1872ء) رہے۔ (ص: 60)

(5) 'قاطع القاطع' پٹیالہ کے ایک مدرس امین الدین امین دہلوی نے 'قاطع برہان' کے جواب میں لکھی تھی اور یہ مطبع مصطفائی سے 1283ھ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب فحش و دشنام سے بھری ہوئی تھی اسی لیے غالب نے ازالۂ حیثیتِ عرفی کی نالش کی تھی۔ جب کامیابی کی اُمید نظر نہ آئی تو مجبور ہو کر اُنھوں نے راضی نامہ داخل کر دیا تھا۔ [بحوالہ: 'یادگارِ غالب' (مولانا حالی)، 'ذکرِ غالب' (مالک رام)]

(6) 'غالب کے خطوط' جلد چہارم، ص: 1540، (مرتبہ خلیق انجم) 'پانی پت' کی بجائے 'سون پت' غالب کا سہوِ قلم ہے۔

(7) کلیاتِ مکتوباتِ فارسی، غالب، (مرتبہ پرتو روہیلہ) مطبوعہ 2010ء غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) میں نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے نام غالب کے سترہ خطوط شامل ہیں اور اغلباً یہ جہانگیر آباد کے پتے پر بھیجے گئے ہیں۔ ان میں حالی کا ذکر کہیں نہیں ہے۔

(8) اُمراؤ بیگم نے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں غالب پر واجب ادا آٹھ سو روپیوں کے قرض کی ادائیگی کے لیے یکم اگست 1869ء کو درخواست بھیجی تھی۔ کوئی جواب نہ ملنے پر 2 ستمبر 1869ء کو دوبارہ لکھا تھا۔ اس پر 9 ستمبر 1869ء کو نواب مرزا خاں داغ کو تحقیق کر کے رپورٹ کرنے کا حکم ہوا۔ آخر میں نواب خلد آشیاں نے 30 اکتوبر 1869ء کو حکم دیا کہ امراؤ بیگم کو چھ سو روپیوں کی ہنڈی بھیج دی جائے۔ (بحوالہ 'ذکرِ غالب'

(مالک رام)، چوتھا اڈیشن، ص: 176، 177۔ اس واقعے کی مزید تفصیلات سے مترشح ہوتا ہے کہ قرض کی کچھ رقم کا معاف کرالینا فرض کرلیا گیا تھا، اس لیے آٹھ سو روپیوں کی بجائے چھے سو روپے ہی بھیجے گئے تھے۔

(9) بحوالہ 'ترجمۂ حالی' مشمولہ 'مقالاتِ حالی'، (ص: 264) جلد اول، (مرتبہ مولوی عبدالحق) مطبوعہ: 1957ء

(10) ڈاکٹر عبدالقیوم نے اپنی کتاب 'حالی کی اردو نثر نگاری' (مطبوعہ: مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور۔ پہلا اڈیشن 1964ء) میں حالی کی کتابوں کی تفصیل بہم پہنچانے میں کافی تحقیق و تدقیق سے کام لیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حالی کے ادبی اثاثے اور مسودات کے کسٹوڈین شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے یہاں حالی کی ابتدائی کتابوں کے مسودے بھی ملاحظہ کیے تھے۔ 'مولود شریف' کے مسودے پر 1864 کی مہر ثبت تھی جب کہ اس کی اشاعت کئی برس بعد میں عمل میں آئی۔ 'طبقات الارض' یا 'مبادی علم جیولوجی' کا سنِ اشاعت متنازعہ فیہ ہے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی اور حامد حسن قادری نے اس کا سنِ اشاعت 1868 لکھا ہے، جب کہ چند محققین نے اسے مولانا حالی کے قیام لاہور کا ترجمہ قرار دے کر اس کا سنِ اشاعت 1972ء لکھا ہے۔ 'تریاقِ مسموم' جسے 'تحقیق الایمان' کے رد میں لکھی گئی کتاب سمجھا جاتا رہا ہے، ڈاکٹر عبدالقیوم نے حاشیہ و کتاب میں بڑی تحقیق سے تفصیلات فراہم کرکے ثابت کیا ہے کہ وہ دراصل 'ہدایت المسلمین' کے جواب میں لکھی گئی تھی لیکن سوئے اتفاق سے وہ متن میں اسے 'تحقیق الایمان' کے جواب میں لکھی گئی کتاب بیان کر گئے ہیں۔

(11) ع بہ لب خشکی چہ میری در سرابستانِ مذہبا! (غالب)

(12) بحوالہ 'یادگارِ غالب' ایضاً، ص: 49

(13) مالک رام کا یہ قیاس کہ حالی جب 1875ء کے شروع میں اینگلو عربک کالج دلّی میں فارسی اور عربی کے مدرس مقرر ہوئے تب سرسید احمد خاں سے ان کی یہیں ملاقات ہوئی، (بحوالہ 'تلامذۂ غالب'، ص: 86) قابلِ اعتبار نہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ نتیجۂ تحقیق تسلیم کیا ہے کہ سرسید سے حالی کی ملاقات شیفتہ کی وساطت سے علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کی مجلس میں ہوئی تھی۔ بقول قریشی یہ ملاقات 1864ء سے 1869ء درمیان کسی زمانے میں ہوئی ہوگی۔ (بحوالہ 'مقدمہ شعر و شاعری' مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی) اس کے علاوہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں نے رسالہ 'اردو' (کراچی) کے جولائی 1952ء کے شمارے میں چھپے اپنے ایک مقالے 'مولانا حالی کا ذہنی ارتقا' میں لکھا تھا کہ 'غالباً 1868ء میں حالی کو خود بھی شیفتہ کے یہاں سرسید سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا'۔

(14) 'یادگارِ غالب'، ایضاً، ص: 232,233 کا خلاصہ

(15) 'ان کا ایک آنا دینا تھا' سے مراد یہ ہے کہ کسی کی ایک آمد کی پاس داری میں غالب بھی اُن کے یہاں ہو کر آئے ہیں۔

☆☆☆

شہرِ نقد و نظر

اردو میں فارسی روایات کی تفہیم و تعبیر اور پروفیسر محمد حسن

[''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی و فکری پس منظر'' کے حوالے سے]

● اخلاق احمد آہن

پروفیسر محمد حسن اپنے عہد کے ان معدودے چند اردو محققین و ناقدین میں سے ایک ہیں، جن کی تحریروں میں فارسی کے ادبی و لسانی مآخذ کے ساتھ ساتھ تاریخی منابع اور نظریاتی و فکری مباحث سے متعلق مصادر سے گہری آشنائی اور واقفیت ملتی ہے، جو بلاشبہ اس نوع کے مضامین کی تفہیم و تعبیر کے لیے بنیادی شرط ہے۔ چنانچہ ان کا یہی امتیاز ان کی تحریروں کو موضوعاتی اور معنوی وسعت و بسط بخشتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ محمد حسن کی تحریریں ہمیں اس حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتی ہیں کہ اردو کی ادبی روایات، اس کے پس منظر کے علاوہ عمومی طور پر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی تفہیم کی خاطر فارسی منابع تک رسائی یا فارسی زبان سے آشنائی کس قدر اہم ہے۔

برصغیر میں محمود غزنوی کی شخصیت اور اس کی مہم جوئی کے حوالے سے بڑے اختلافات دیکھنے میں

آتے ہیں اور اس شدت پسندی میں معاصر سیاسی اغراض کا دخل زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ انتہا پسندانہ تنگ نظری ہندوستان کے مختلف گروہوں میں دکھائی دیتی ہے۔ جہاں ایک طبقہ اسے بت شکنی، منادر کی بے حرمتی، مسماری اور تبلیغ بالجبر کا مجرم مانتا ہے تو دوسرا غازی اور مجاہد۔ راقم حروف کو خود اس کا ذاتی مشاہدہ تب ہوا، جب اس نے محمد حبیب کی کتاب "محمود آف غزنین" کا فارسی ترجمہ کیا۔ بعد میں افغان دوستوں نے بتایا کہ اسے افغانستان میں شائع کرنا شیر کے منھ میں ہاتھ ڈالنے جیسا ہے، کیوں کہ وہاں محمود غزنوی کو ولی اللہ کا درجہ حاصل ہے اور خاص طور سے غزنی میں لوگ انھیں 'سلطان صاحب رحمۃ اللہ علیہ' کہہ کر ہی خطاب کرتے ہیں اور ان کا نام لینا بھی بے احترامی تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ تیس کے دہے میں معروف مورخ محمد حبیب کی مذکورہ کتاب کی اشاعت کے بعد ہندوستان میں بھی کافی ہنگامہ ہوا۔ باوجودیکہ ان کی یہ کتاب معروضی اور حقائق پر مبنی اور بے تعصب تھی۔ اس حوالے سے محمد حسن کی رائے بھی محمد حبیب سے قریب اور قابل ملاحظہ ہے:

> "جب محمود غزنوی نے مرکزی اسلامی خلافت سے سرتابی کر کے اپنی بادشاہت کا اعلان کیا تو اسے تجارتی راستوں پر قبضہ کرنے اور اس علاقے کی منڈیوں پر تسلط حاصل کرنے کے لیے ہندوستان پر حملہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور یہاں کی دولت ہی نہیں تجارت پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس حملے کی تجارتی اور مالی نوعیت کو نظر میں رکھنا ضروری ہے اور اسے سامنے رکھا جائے تو محمود غزنوی کی فوج میں 'تلک' نامی ہندو سپہ سالار کی موجودگی بھی سمجھ میں آنے لگتی ہے اور یہ حملہ مذہبی جہاد کے نام پر تجارتی مہم جوئی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔" (۱)

محمد حسن کے یہاں اس نوع کی آرا مختلف حوالوں سے مل جاتی ہیں، جو ان کی تاریخی بصیرت کی غماز ہیں۔ خاص طور سے عہد مرزا جانِ جاناں اور ان کی تحریروں کے حوالے سے مشترکہ تہذیب کی تعمیر اور سماجی رواداری کی فکری وثقافتی روایات کا ذکر ایسا سرمایہ ہے جو آج کے ہندوستان کی ضرورت بھی ہے اور اردو شعر وادب کا اصل خمیر بھی۔ (۲) ان کا یہ قیاس کہ: "ہندوستانی اور ایرانی آریا غالباً ایک زبان بولتے ہوں گے" تاریخی اعتبار سے مسلم الثبوت ہے۔ البتہ یہ فرق بتدریج زمانے کے فرق کے ساتھ بڑھتا گیا ہے اور مختلف لہجوں، بولیوں اور زبانوں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ (۳)

اس کے ساتھ ہی موصوف نے بڑی خوبی اور اجمال کے ساتھ ایران و ہند کے تہذیبی وفکری پس منظر کا بھی ذکر کیا ہے، جس میں مذہبی وسماجی تحریکات ورجحانات کے ساتھ ساتھ ان سے وابستہ شخصیات کا بھی تعارف کرایا گیا ہے۔ البتہ اس تعارف میں جو اہم بات کہنے سے رہ گئی ہیں، وہ ان دونوں خطوں میں آریوں کا سوشل کنسٹرکٹ Social Construct ہے، یعنی دونوں جگہ کس طرح آریوں نے تقریباً ایک ہی طرح کے سماجی ڈھانچہ کی بنیاد رکھی، جس نے آگے چل کر ان دونوں خطوں کے سماجی وسیاسی نظام پر بڑے گہرے اثرات مرتسم کیے۔ مثلاً یہ کہ آریوں نے ہندوستان اور ایران میں نئے سماجی اور مذہبی ڈھانچہ کی بنیاد

ڈالنے کے ساتھ ساتھ پرانے نظام حیات کے تمام نقوش کو مٹانے کی سعی کی۔ اس کے لیے سماج کو طبقات میں بانٹنا، انسانی تاریخ کی ابتدا کو اپنی تاریخ سے وابستہ کیا، مقامی لوگوں کو گوشۂ گمنامی میں ڈھکیل کر انھیں 'دروند' یا دراوڑ یعنی لامذہب قرار دے دیا۔ یہ ایران و ہند میں یکساں طور پر ہوا، جس کی تفصیل کا یہاں محل نہیں۔

پروفیسر حسن نے اس کتاب میں تصوف کے باب میں اس کی ارتقائی تاریخ کو جس اجمال و ایجاز کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ قابل توجہ ہے۔ اسے پڑھ کر علامہ اقبال کی مجوزہ کتاب ''تاریخ تصوف'' (۴) کا خاکہ ذہن میں گھوم جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر کا مقصد بغیر کسی رائے زنی یا نقد و تنقید کے تصوف کے ارتقائی خد و خال کو من و عن متعارف کرانا ہے، جب کہ موخر الذکر تصوف میں بتدریج سرایت کردہ 'غیر اسلامی' اور 'انجمادی' عناصر کی نشاندہی کرنا چاہتے تھے۔ البتہ جس جامع انداز اور واضح تصور کے ساتھ موصوف نے تصوف کے تصور اور اس کے بدلتے میلانات و تصورات کی تصویر کشی کی ہے، اس سے ان کی تاریخ فہمی اور دقیق النظری مترشح ہے۔ موصوف نے بڑی صفائی اور وضاحت کے ساتھ اس فکری و تاریخی منظر نامے کی نشاندہی کی ہے کہ کس طرح ظہور اسلام سے قبل اور اس کے بعد وہ کون سی روشیں تھیں، جو بالواسطہ طور پر مختلف ادوار میں مختلف اشخاص کے توسط سے مسلم معاشرہ اور فکر و نظریہ پر اثر انداز ہوتی رہیں۔

عموماً تصوف اور اس کے فکری و تاریخی لوازمات کے حوالے سے بڑے متخالف اور متصادم آراء دیکھنے میں آتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجوہات، اول تو معروضیت یا objectivity کا فقدان اور دوم تاریخ سے ناآشنائی یا بنیادی تاریخی منابع سے بے اعتنائی ہے، جو عموماً فارسی اور عربی میں رائج ہیں؛ لیکن اس لحاظ سے محمد حسن کی تحریریں استثنائی ہیں۔ مثلاً تصوف کے نفسیاتی اور سماجی عوامل کا ذکر کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''نفسیاتی اعتبار سے اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کسی نہ کسی منزل میں حقیقت کے داخلی اور براہ راست تجربے یا مشاہدے کے لئے بے قرار ہوتا ہے، اس کے نزدیک مذہب صرف ایک ضابطہ، ایک بے روح عقیدہ یا محض منطقی استدلال کا نام نہیں ہوتا ہے، بلکہ ایک زندہ اور رنگین جذبے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے دور میں اہل کلام اور فلاسفہ نے مذہب کو منطقی بحثوں میں الجھا دیا تھا اور اسے پیچیدہ اور ناقابل فہم بنا دیا تھا اور لوگ معتزلہ، اشاعرہ، خارجی اور مرجیہ وغیرہ فرقوں کی فلسفیانہ موشگافیوں سے عاجز آ گئے تھے۔ اصفیاء نے مذہب کی کشفی حیثیت پر زور دیا اور علم الکلام اور علم فقہ کی بحثوں سے نکال کر مذہب کا رشتہ دلی کیفیات سے جوڑ دیا۔
>
> خلافت کے بجائے شہنشاہیت کے استحکام اور جمہوریت، سادگی اور عوام دوستی کے بجائے حکومت کے ظلم و استبداد اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کی غیر معمولی شان و شوکت،

قدرت و جبروت کے ردعمل کے طور پر تصوف کا میلان بھی بڑھتا جا رہا تھا۔۔۔چونکہ حکومت محض سیاسی اقتدار کا نام نہ تھی بلکہ اسے مذہب کی پوری پشت پناہی حاصل تھی اور حکومت کے ہر فیصلہ پر فقہا اور علماء کی مہر بھی ہوتی تھی، اس لیے اس کی مخالفت یا اس سے عدم تعاون کرنے والے حکومت کے ساتھ ساتھ اہل شریعت سے بھی ذہنی اور جذباتی طور پر دور ہوتے گئے۔" [۵]

البتہ ایک بات قابل توجہ ہے کہ محمد حسن چونکہ مارکسیت کے راسخ العقیدہ پیرو ہیں اور اسی بنا پر وہ مختلف مسائل و واقعات، بلکہ مجموعی طور پر تاریخ و ثقافت کے بدلتے تیور کو خالصتاً مادی اصول و منطق کی بنیاد پر تعبیر و تشریح کرتے ہیں، جو ایک حد تک معروضی تو ہیں، لیکن خصوصی طور پر روحانی و عرفانی رموز اور نزاکتوں اور مادیت آلودہ ہوس پرستی و ریاکاری میں امتیاز کرنے سے معذور نظر آتے ہے۔ ان کے یہاں بار بار 'اتحاد مذاہب' اور 'وسیع المشربی' کو تصوف کی اساس، ساتھ ساتھ طبقاتی رقابت کو اس کی بنیادی وجہ اور ہر آزاد نظری کو تصوف کے دائرہ میں کھینچ کر لانے کی کوشش ملتی ہے۔ اس قسم کے نقائص دوسرے معاصر ناقدین ادب کے یہاں بھی مل جاتے ہیں، مثلاً پروفیسر نبی ہادی نے اپنی کتاب "میرزا بیدل" (۶) میں اصفیاء کی نیرنگیٔ طبع اور قلندرانہ وضع کا خالصتاً اسی نقطۂ نظر کے تحت نہایت رکیک اور مبتذل انداز میں ذکر کیا ہے۔ اس سے تصوف ایک مبہم نظریہ بن جاتا ہے اور ہر 'مو تراش' اور 'زلف دراز' یا بہروپیا تصوف کا نمائندہ بن کر اس تعریف و تفہیم کو مزید مبہم بنا دیتا ہے۔ آج کل کی 'تجارتی' اور 'سیاحتی صوفی گیری' بھی اسی کی مثالیں ہیں، جسے فلم ساز مظفر علی جیسے لوگ متعارف کرا رہے ہیں۔ محمد حسن نے بھی بجا طور پر اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں تصوف کے انحطاطی روپ کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس ضمن میں شاہ ولی اللہ جیسے عرفان پسند علماء کے اندیشے کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ بھی ایک المیہ سے کیا کم ہے کہ جس بیدل کی شاعری میں موجود جوش و جنبش اور حرکی عنصر سے اقبال اپنے فلسفۂ خودی کی غذا فراہم کرتے ہیں، اسی بیدل کا مزار تعیش پسندوں کے مجالس رنگ و عیش کی آماجگاہ بن گیا۔ ظاہر ہے اس ہنگامۂ ہوس کیشی کے درمیان بیدل کی فکر کی طرف توجہ نہیں تھی، جس کا ذکر تفصیل سے محمد حسن نے کیا ہے۔ آج 'صوفی گیری' کی نئی تحریک اس زوال شدہ اور فرسودہ شکل سے ہی اٹھتی دکھائی دے رہی ہے، جو عرفان حال و قال سے فاقد اور مادیت کے کھوکھلے پن سے آلودہ ہے۔

اردو کی ادبی روایات کے حوالے سے محمد حسن نے بجا طور پر عجمی اور ہندی عناصر کے یکساں اثرات کی نشاندہی کی ہے اور فارسی شعری روایات کے تین اہم نقوش بیان کیے ہیں، بقول موصوف:

"فارسی ادب کا یہ عام فکری اسلوب کیا ہے؟ یہ روایت جس کی ابتدا اردو کی سے ہوئی تین راستوں سے ہو کر گزری ہے۔ ایک راستہ خیام کا ہے، دوسرا تصوف کا، جس کے رہ نورد سنائی، عطار، رومی، سعدی اور عراقی ہوئے۔ تیسرا راستہ صناعی، مضمون آفرینی اور معنی آفرینی کا تھا۔" (۷)

موصوف نے اس بیان کی بخوبی توضیح بھی کی ہے، جس سے عہد بہ عہد فارسی ادب میں بدلتے ادبی رجحانات کا ایک خاکہ سامنے آجاتا ہے۔ البتہ بعض باتوں کی وضاحت نہ ہونے سے کچھ ابہام اور کہیں تضاد کی سی صورت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً عربوں کی آمد کے بعد ایرانیوں کے سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی ردعمل اور اس کے نتیجے میں فارسی کے مختلف ادبی و شعری رجحانات کا ذکر تو ہوا ہے، لیکن زبان و بیان کے حوالے سے ایرانی شاعروں اور مصنفوں کی 'تصحیح زبان و بیان' کی کوششوں کا ذکر نہیں ہوا ہے، جو مختلف ادوار میں مختلف سبک و روش سخنوری و طرز نگارش کا سبب بنیں اور عرف عام میں جس رویہ کو سبکِ خراسانی و عراقی وغیرہ کہا گیا۔

اسی طرح 'سبک ہندی' کے حوالے سے محمد حسن کی رائیں سطحی اور نقص آگیں ہیں (۸)، جن کی وضاحت تفصیل طلب ہے۔ اس اشتباہ کے لیے میں انھیں قصوروار نہیں ٹھہرانا چاہتا، کیوں کہ موصوف کی اس رائے کی اساس مولانا شبلی کی معروف زمانہ تالیف ''شعر العجم'' ہے۔ اگر چہ اسے فارسی کی پہلی باضابطہ تنقیدی کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے، لیکن اس کی تمام تر خوبیوں کے باوجود صاحب تصنیف کی ایک بڑی خامی ایران کی عینک سے تمام فارسی ادب کو دیکھنے کی روش ہے۔ اس کی ابتدا ایرانی اور ہندوستانی شاعروں کی چشمک، جس کا آغاز حزین و آرزو کے مباحثہ سے ہوا اور بعد ازاں ہندوستانی فارسی شاعری کے تعلق سے غالب کی بعض ناعاقبت اندیشانہ آراء اور کمنٹس کے سبب عروج کو پہنچا۔ غالب نے بڑی شد و مد کے ساتھ ہندوستانی فارسی شاعروں کی تذلیل و تحقیر کی اور نتیجتاً خود بھی اسی روش کا شکار ہوگئے۔ ہندوستانی فارسی شاعری کی اس ناقدری کی ایک اہم وجہ متعصبانہ ایرانی ذہنیت اور غرور بھی ہے، جس نے جدید ایران کے سیاسی و جغرافیائی حدود سے باہر کے ادب کی افادیت اور عظمت کو یکسر نظر انداز کیا، لیکن اس جغرافیائی حدود کے باہر کے عظیم مراکزِ فارسی ادب [افغانستان، مرکزی ایشیا اور برصغیر]، بذات خود کم ذمہ دار نہیں ہیں، جنھوں نے ایک دوسرے سے بے اعتنائی کی۔ اس زمرے میں خود شبلی سرفہرست ہیں۔ براؤن، ریپکا وغیرہ جیسے غیر ایرانی محققین و ناقدینِ فارسی بھی اتنے ہی ذمہ دار ہیں۔ (۹) مختصراً یہ کہ تمام ہندوستانی فارسی شاعری کو سبک ہندی کی شاعری کہنا، ہندوستان کے جغرافیائی حدود تک اسے محدود کرنا، امیر خسرو کے کلام کو خالصتاً 'سبک ہندی' کا نمونہ سمجھنا یا ان کو سبک ہندی کا نمائندہ شاعر ماننا نادرست نہیں ہے۔ یہ تصورات 'سبک ہندی' کے عناصر ترکیبی اور اس کے تاریخی اسباب سے ناواقفیت کے سبب ہے، جو عام طور سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی طرح دقیقی یا فردوسی جیسے شاعروں کو چند اخلاقی نوعیت کے اشعار یا زرتشتی نظریات کے ذکر کی بنیاد پر متصوفانہ شاعروں کے زمرے میں شامل کرنا بھی اشتباہ اور افراط ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی صوفی شاعر کے تمام کلام کو عرفانی شاعری کا نمونہ سمجھنا۔ (۱۰)

موصوف نے خیام کے حوالے سے لکھا ہے:

''رودکی کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ اس نے فارسی میں پہلی بار ایپی کیورس

کے اس فلسفے کو متعارف کرایا، جسے بعد کو عمر خیام نے ایک مستقل نظریے کی شکل میں اپنا لیا اور فارسی شاعری اور اس کے زیر اثر اردو شاعری میں اس فلسفے نے اپنا گہرا اثر چھوڑا۔" [۱۱]

مزید لکھتے ہیں:

"غزل کے رمز و ایما اور عشق و عاشقی کے پیرایے میں بھی جس قسم کے تصورات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، اس کی تدوین و ترتیب دراصل خیام ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ خیام کے سامنے زندگی کا جو نقشہ تھا، وہ یہی تھا کہ ارباب دنیا دن رات جوڑ توڑ، سازش، حیلہ انگیزی، نفاق، خوشامد، ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، پھر جو چیز حاصل ہوتی تھی، وہ بے ثبات اور سریع الزوال ہوتی تھی۔... ان مناظر سے خیام نے جو نتائج اخذ کیے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں تاثر دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی کا ہے۔" [۱۲]

موصوف کے مذکورہ بیان سے مندرجہ ذیل نکات اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ رودکی نے فارسی میں پہلی بار اپی کیورس کے فلسفے کو متعارف کرایا، جسے بعد کو عمر خیام نے ایک مستقل نظریے کی شکل میں اپنا لیا۔

۲۔ خیام کے زیر اثر فارسی شاعری اور اس کے زیر اثر اردو شاعری میں اس فلسفے نے اپنا گہرا اثر چھوڑا۔

۳۔ غزل کے رمز و ایما اور عشق و عاشقی کے پیرایے میں بھی جس قسم کے تصورات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں، اس کی تدوین و ترتیب دراصل خیام ہی نے کی۔

۴۔ اپنے زمانے کے حالات سے خیام نے جو نتائج اخذ کیے، ان میں سب سے زیادہ نمایاں تاثر دنیا کی بے ثباتی اور عبرت انگیزی کا ہے۔

حقائق کی روشنی میں آخری نکتہ کے علاوہ اول الذکر تینوں نکات مبالغہ آمیز اور بے بنیاد ہیں۔ 'دنیا کی بے ثباتی، تدبیر و عمل کی کم وقعتی اور علم و ادراک کی نارسائی' کے مضامین نہ ہی اپی کورین فلسفہ ہے اور نہ ہی اس نوع کے مضامین کے ذکر کی بنیاد پر انھیں اپی کورین کا پیروکار کہنا درست۔ دوسرے یہ کہ فٹز جیرالڈ کے ترجمہ سے پہلے اگرچہ اس کی رباعیات سے علمی طبقہ ناآشنا نہیں تھا، لیکن اس کی شاعری اتنی مقبول یا بااثر نہیں رہی کہ اس نے فارسی شاعری کے رخ کو ہی متاثر کر دیا۔ خیام سے پہلے اس کے استاد معنوی ابن سینا کے علاوہ متعدد شعراء نے اس نوع کے مضامین کو برتا ہے۔ البتہ ترجمہ فٹز جیرالڈ اور مغرب میں اس کی مقبولیت کے بعد ہند و ایران کے ادبی طبقہ نے رباعیات خیام کی طرف خاطر خواہ توجہ دی، نتیجتاً اردو ہندی شاعری میں اس کا اثر دیکھنے کو ملا۔

منابع و ماخذات:

۱۔محمد حسن، دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر، اردو اکادمی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۔۵۱۔۵۰
۲۔محمد حسن، ایضاً، ص۔۸۵۔۲۰۲
۳۔محمد حسن، ایضاً، ص۔۲۰۳
۴۔علامہ اقبال، تاریخ تصوف (صابر کلوروی)، مکتبہ الحسنات، ۱۹۹۹ء
۵۔محمد حسن، ایضاً، ص۔۲۳۹۔۲۴۰
۶۔نبی ہادی، میرزا بیدل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۹ء
۷۔محمد حسن، ایضاً، ص۔۲۷۴
۸۔محمد حسن، ایضاً، ص۔۲۸۵
۹۔عرشی، امتیاز علی خاں، آصفی رام پوری (مرتبہ۔اخلاق احمد آہن)، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص۔مقدمہ
۱۰۔محمد حسن، ایضاً، ص۔۲۳۶۔۲۶۷۔
۱۱۔محمد حسن، ایضاً، ص۔۲۷۵
۱۲۔محمد حسن، ایضاً، ص۔۲۷۷و۲۷۵

☆☆☆

کرشن چندر کے ناولٹ : انفرادو امتیاز

● ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

ترقی پسند تحریک کے دوران اردو فکشن میں جو فنکار آسمان ادب پر نمایاں ہوئے ان میں کرشن چندر کو غالباً سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ دراصل کرشن چندر ایک بڑے فنکار تھے، جنھوں نے افسانے، ناول، ڈرامے، رپورتاژ اور مضامین کی شکل میں اردو ادب کو اتنا بڑا ذخیرہ دیا کہ وہ ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ان کی تحریروں میں زندگی کا جتنا بھرپور اور رنگا رنگ تاثر ملتا ہے وہ ان کے معاصرین کے یہاں نہیں دکھائی دیتا۔ ہیئت، تکنیک اور اسلوب کی سطح پر بھی بیانیہ سے لے کر تمثیل نگاری تک جتنے تجربے انھوں نے کیے، وہ ان کی فنکاری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

فکشن میں جو کچھ کرشن چندر نے لکھا ہے اُس میں ناول، افسانے اور مختصر ناول ہیں جنھیں ناولٹ کہا جا سکتا ہے۔ جس طرح افسانوں میں کرشن چندر کے ۲۰۔۲۵ افسانوں کے حوالے سے ہی باتیں ہوتی رہیں، ایسے ہی ناول میں بھی بات 'شکست'، 'جب کھیت جاگے' اور 'ایک گدھے کی سرگزشت' وغیرہ تک ہی محدود رہی۔ اُن کے اکثر مختصر ناولوں کو کمرشیل یا نیم ادبی کہہ کر نظر انداز کیا گیا، جبکہ کرشن چندر کے دیگر طویل یا مختصر ناولوں میں بھی اُن کی انسان دوستی، موضوعات کی نیرنگی، افکار و خیالات کی وسعت اور اسلوب کی دلکشی وسیع کینوس پر مطالعے کی متقاضی رہی ہے۔

کرشن چندر نے اپنے کسی ناول کو ''ناولٹ'' کا نام نہیں دیا۔ انھوں نے جو طویل افسانے لکھے انھیں ''طویل مختصر افسانہ'' کہا اور مختصر ترین ناولوں کو بھی ناول ہی قرار دیا۔ اس لیے کرشن چندر کے ناولٹ پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلے یہی سوال اُٹھتا ہے کہ ان کے کن ناولوں کو 'ناولٹ' قرار دیا

جاسکتا ہے۔طویل مختصر افسانوں کو تو ناولٹ نہیں کہا جاسکتا، اگر چہ 'ان داتا'، 'زندگی کے موڑ پر' اور 'امرتسر' جیسے طویل افسانوں کو بعض لوگوں نے 'ناولٹ' لکھ دیا ہے۔ میرے خیال میں افسانہ خواہ کتنا ہی طویل ہو جائے وہ اپنی ہیئت اور مخصوص اوصاف کی بنا پر افسانہ ہی کہلائے گا۔ جبکہ ناول اگر محدود کینوس اور کم طوالت رکھتا ہو تو بھی اسے 'ناولٹ' کہا جاسکتا ہے۔ نیاز فتحپوری کے 'ایک شاعر کا انجام' سے سید محمد اشرف کے 'نمبر دار کا نیلا' تک تمام ناولٹوں کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ ناول اور ناولٹ کے تخلیقی مزاج میں یکسانیت اور موضوع ، اسلوب یا تکنیک میں ہم آہنگی کے باوجود ان دونوں کے درمیان بہر حال ایک خط امتیاز حائل ہے، جو اسے ناول اور افسانے دونوں سے ممتاز کرتا ہے۔ افسانے میں زندگی کا بالعموم کوئی ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے، ناول میں مکمل زندگی پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ناولٹ میں زندگی کے چند مخصوص و منتخب پہلوؤں کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس کی وضاحت ناولٹ پر کام کرنے والے ایک محقق ڈاکٹر سید مہدی نے یوں کی ہے کہ: 'مختصر افسانہ زندگی کا ایک تار ہے۲، ناول زندگی کے تاروں کا ایک جال ہے اور ناولٹ میں چند تار بٹ کر موٹے تار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔' ہیئتی طور پر ناولٹ، افسانے کے اختصار اور ناول کی طوالت کے بیچ کی کڑی ہے۔ بالعموم ایک ناولٹ کی ضخامت سو ڈیڑھ سو صفحات سے زیادہ اور پچاس ساٹھ صفحات سے کم نہیں ہوتی۔ یہاں تاثر کی وحدت اتنی واضح اور مکمل ہوتی ہے کہ قارئین انجام پر کسی تذبذب یا انتشار میں مبتلا نہیں ہوتے۔ واقعات کی تشریح و تفصیل یہاں نہیں ہوتی، ایجاز و اختصار کے ساتھ علامتوں، اشاروں اور کنایوں میں زندگی کے وہ پہلو پیش کر دیے جاتے ہیں جن کی پیش کش کو ناولٹ نگار ضروری سمجھتا ہے۔ کینوس مختصر ہونے کی وجہ سے ناولٹ میں کرداروں کی تعداد کم ہوتی ہے اور جو کردار ہوتے ہیں اُن کی سیرت و اوصاف کی پیش کش میں بھی محدودیت سی ہوتی ہے۔ ہاں ناولٹ کے پلاٹ کے لیے گٹھا ہوا اور مربوط واقعوں پر مشتمل ہونا ضروری ہے تا کہ اختتام پر اتحاد تاثر قائم رہے۔ ناولٹ کی اس شناخت کے بعد کرشن چندر کے ناولوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو 'پیار ایک خوشبو'، 'دادر پل کے بچے'، 'برف کے پھول'، 'زرگاؤں کی رانی'، 'غدار'، 'الٹا درخت' وغیرہ ہمارے سامنے ناولٹ کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ 'آسمان روشن ہے'، 'لندن کے سات رنگ'، 'پانچ لوفر' اور 'میری دنیا کے چنار' کا ذکر بھی مختلف لوگوں نے مختصر ناول یا ناولٹ کے طور پر کیا ہے۔ ان مختصر ناولوں یا ناولٹوں میں فکری اور فنی طور پر جو ناولٹ سب سے زیادہ ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے وہ ہے ''دادر پل کے بچے'' [۱۹۶۱]۔

''دادر پل کے بچے'' کے بارے میں اکثر ناقدین نے یہ اعتراف کیا ہے کہ اس میں کرشن چندر نے خدا، جنت، جہنم اور مذہب کے تصور کی بڑی بے باکی اور شدت سے شکست و ریخت کی ہے۔ ظاہر ہے یہ عمل اُن کے اشتراکی نظریات کے عین مطابق ہے۔ انھوں نے اپنے زور تخیل سے کام لے کر بھگوان کو ایک ذہین انسان کی شکل میں انسانوں کے درمیان اتارا ہے، جو بمبئی کی زندگی کے شب و روز کا جائزہ لیتا ہے اور چشم

حیرت سے معاشرے کے رستے ہوئے زخموں کو دیکھتا ہے۔ بھگوان کھولی میں رہنے والے ایک غریب شخص کے ساتھ بمبئی کے مختلف علاقوں کی سیر کرتا ہے تو اُسے عجیب وغریب تجربات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ وہ اُس غریب آدمی کے ساتھ بچے کے بھیس میں دادر پل پہ بچوں کے لیے خوبصورت اور رنگ برنگی کتابیں لے کر کھڑا ہے جبکہ غریب آدمی امرود کا ٹوکرا لے کر کھڑا ہے۔ پل پر سامان بیچنے کے لیے اُسے علاقے کے داداؤں اور پولس کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے، مگر نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ امرود بک جاتے ہیں اور کتابیں رہ جاتی ہیں۔ غریب آدمی کہتا ہے:

''جن کے پاس بچوں کے اسکول کی کتابیں خریدنے کے پیسے نہ ہوں وہ تمھاری کہانیوں کی کتابیں کیسے خریدیں گے؟'' پھر دونوں ایک فلم اسٹوڈیو کی طرف سے گزرتے ہیں۔ اسٹوڈیو میں برہما کی مورتی دیکھ کر بھگوان خوش ہوتے ہیں، مگر ان کا ہمراہی واضح کردیتا ہے کہ یہاں صرف نقد نارائن کی پوجا ہوتی ہے ۳۔ یہ مورتی صرف سیٹ کی زینت ہے جو شوٹنگ کے بعد توڑ دی جائے گی۔ بھگوان سیر کرتے ہوئے بمبئی کے مختلف مقامات سے گزرتے ہیں۔ ہر جگہ ان کا سامنا فریبیوں، دھوکہ بازوں سے ہوتا ہے۔ ایک کم عمر نظر آنے والا نوجوان انھیں فلم اسٹار بنانے کا جھکمہ دے کر روپے ٹھگ لیتا ہے، ایک معصوم نظر آنے والے بچے پر ترس کھا کر وہ موم بتیاں خریدتے ہیں تو وہ ان کی جیب کاٹ لیتا ہے۔ ایک خوش لباس لڑکا اسکول بیگ میں ٹھرے کی بوتلیں سپلائی کرتا دکھائی دیتا ہے، ایک ماڈرن اسکول کے صاف ستھرے لڑکے اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے صرف اس لیے انکار کردیتے ہیں کہ وہ غریب ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ آخر میں دونوں سیر کرتے ہوئے ایک ایسے گروہ کے پلّے پڑتے ہیں جو بچوں کو اپاہج بنا کر بھیک منگواتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں بھی معذور بنادیے جائیں وہاں سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پھر بھگوان شاید واپس چلے جاتے ہیں اور ان کے ہم سفر کا ردعمل ناول کی آخری سطروں میں سامنے آتا ہے: ''لوگ کہتے ہیں، یہ سب جھوٹ ہے۔ نہ بھگوان میرے پاس کبھی آئے، نہ میں نے ان سے باتیں کیں، نہ میں انھیں لے کر بمبئی کی گلیوں میں گھوما۔ زندگی میں آخری بار جب میں نے بھگوان کو دیکھا تو وہ چھ سال کا ایک ناتواں بچہ تھا اور اندھا تھا اور شفق کے ڈھلتے ہوئے سایوں میں دونوں ہاتھ پھیلائے روتا ہوا دادر پل پر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا۔'' [ص ۱۲۸]

اس ناولٹ میں کرشن چندر کا اشتراکی نظریۂ حیات اور اس کے سبب جذبۂ احتجاج بھرپور انداز میں اجاگر ہوا ہے۔ انھوں نے بمبئی جیسے صنعتی شہر کے ایک گھناؤنے پہلو کی تصویر کشی کی ہے جو سرمایہ دارانہ استحصال کا نتیجہ ہے، جہاں کاروباری قسم کی زندگی نے زندگی سے معصومیت چھین لی ہے۔ انھوں نے یہ بھی دکھایا ہے کہ سرمایہ دارانہ استحصال کے جال نے ادنیٰ اور اعلیٰ، بڑے اور بچے سب کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور اس کے زیر اثر ہر اچھے اور برے جائز اور ناجائز طریقے سے سب روزی روٹی کمانے میں مصروف ہیں۔ یہاں بمبئی، بھگوان اور اس کا ہم سفر سب علامتوں کی شکل میں ہیں، جس کے ذریعہ ہم اس معاشرے

کے استحصالی نظام کا کچا چٹھا گہرائی کے ساتھ جان پاتے ہیں۔ اس میں شہنز بھی علامت ہے سرمایہ دارانہ نظام کی، دادر پل علامت ہے سرمایہ داری کے اُس غلیظ مرکز کی جہاں خرید وفروخت کا عمل لگا تار جاری رہتا ہے۔ اور ''میں'' علامت ہے اُس حساس دل کی جو دنیا کی تکلیفیں، جرائم اور غلاظت دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہے۔ جبکہ 'بھگوان' علامت ہے 'رجائیت' کی جو آخر تک ہراساں اور مایوس نہیں ہوتا۔ اور اعتراف کرتا ہے کہ آدمی معصوم بھی ہے اور مجرم بھی۔ مظلوم بھی ہے اور ظالم بھی، قاتل بھی ہے اور مقتول بھی۔ اس لیے آدمی ہی در اصل خدا ہے، جس نے اپنے لیے جہنم سے زیادہ عذاب رساں بستیاں آباد کیں اور چاہے تو اس دنیا میں ہی جنت تعمیر کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ رجائی طرزِ فکر بھی اشتراکیت کی ہی دین ہے۔[۴]

کرشن چندر نے اس ناولٹ میں خدا اور بھگوان کے نام پر لوٹ کھسوٹ، مذہب کا مصنوعی تصور، تعلیم کی بے وقعتی اور حلال وحرام یا جائز اور ناجائز کے بناوٹی اصولوں پر جگہ جگہ طنز کیا ہے۔ ایک جگہ بھگوان دنیا کے انسانوں سے سوال کرتا ہے کہ: ''کانپور سے کلکتہ تک اور جموں سے جبل پور تک تم دھرم کرم کے نام پر جو کچھ کرتے ہو وہ سب مجھ پر روشن ہے۔ کیا کبھی تم نے ان زخموں کو گنا بھی ہے، جو تم نے آج تک میرا نام لے لے کر دیے ہیں۔'' [ص ۴۶] کرشن چندر کے خیال میں انسان درحقیقت اپنی نارسیدہ تمناؤں اور ناآسودہ آرزوؤں کے سامنے سرنگوں ہوتا ہے، بھگوان کے سامنے نہیں۔ وہ بھگوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''مگر اس دنیا میں کون تم سے بے غرض محبت کرتا ہے، جس کی زندگی میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے صرف اُسے مانگنے کے لیے تمھارے پاس جاتا ہے۔ ایک بیٹا، ایک گھر، ایک شوہر یا ایک روٹی۔ اور وہ جن کے پاس سب کچھ ہے وہ اس دنیا میں اپنا سورگ تعمیر کر کے اگلی دنیا کے سورگ میں اپنی جگہ تعمیر کرنے کے لیے تمھارے پاس جاتے ہیں۔ تمھیں نہیں پوجتے ،میرے بھولے بھگوان وہ اپنی آرزوؤں کو پوجتے ہیں یا اپنے ڈر کو پوجتے ہیں'' [۷۵]

اس طرح کرشن چندر مذہب اور عبادت کے بیشتر روایتی تصورات پر طنز کرتے ہوئے اشتراکیوں کے اُس مادی نقطۂ نظر کی حمایت کرتے ہیں جو سزا و جزا، جنت اور جہنم اور اس طرح کے دوسرے امور کو مہمل قرار دیتا ہے۔ وہ انسانوں کی مادی ضرورتوں کی تکمیل یعنی روزی روٹی اور تعلیم وغیرہ کا پہلے تقاضا کرتے ہیں بھگوان کا بعد میں۔ اسی لیے سٹہ لگوانے والے چھوٹے سے بچے منہر کی زبان سے یہ احتجاج کرتے ہیں:

''منہر اوپن ٹو کلوز میں نو کا بھاؤ دیتا ہے۔ تم اوپن ٹو کلوز یعنی زندگی سے موت تک کیا دیتے ہو؟ ٹکے، بھوک، بیکاری، مفلسی؟'' (۵۱)

اسی بچے سے جب بھگوان پوچھتے ہیں کہ تم اسکول کیوں نہیں جاتے تو وہ جواب دیتا ہے:

''بی اے پاس کرنے والے دادر پوسٹ آفس کے باہر خط لکھتے ہیں اور دس آنے روز کماتے ہیں۔ یہاں سٹے سے دن میں دس روپے کما لیتا ہوں، میں اسکول جا کر کیا کروں گا۔'' [۵۱]

یہ بچوں کے استحصال کے ساتھ ہمارے تعلیمی نظام پر بھی گہرا طنز ہے۔ کرشن چندر نے اس ناولٹ

میں تعلیمی نظام پر طنز کرتے ہوئے صرف لاوارث، نادار اور غریب بچوں کے تعلیمی مسائل تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ بڑی خوبصورتی سے بل اسٹیشنوں ۵ کے معیاری اسکولوں کی منظر کشی بھی کی ہے، جہاں ممتاز اور سرمایہ دار والدین کے بچے ہی داخلہ کے مستحق ہوتے ہیں۔ وہاں بچوں کے ضمیر میں مادہ پرست عناصر کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ نتیجتاً یہ بچے بھی دوسرے بچوں سے نفرت کرنا سیکھ جاتے ہیں اور تہذیب کی طبقاتی بنیادوں کو منصفانہ خیال کرتے ہیں۔

ناولٹ 'دادر پل کے بچے' کا سب سے اہم عنصر طنز ہے، جس سے کام لے کر مصنف نے معاشرے کے ہر تاریک پہلو کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ کرشن چندر کی حسِ مزاح بے حد تیز ہے جس سے وہ برمحل کام لے کر ناولٹ میں نہ صرف دلچسپی اور تبسم کی کیفیت پیدا کرتے ہیں بلکہ قاری کو غور و فکر پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ فلمی ہیروئن آشا سے بھگوان کا عشق، اس کے ساتھ قوالی سننا، فلم پریمیر دیکھنا اور گانا گنگنانا جہاں ہمیں مسکرانے اور کبھی کبھی قہقہہ لگانے پر مجبور کرتا ہے وہیں اس قسم کے جملے ہمارے ضمیر اور فکر کو جھنجھوڑ کر بھی رکھ دیتے ہیں، مثلاً: ''بھگوان کے لیے یوں کمرے سے غائب ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے بلکہ اکثر و بیشتر وہ تمام اہم موقعوں پر جو انسان کی تاریخ میں پیش آتے ہیں، غائب ہی پائے جاتے ہیں۔'' [ص ۶۷]

''شاید تم نے کبھی بمبئی کا سلائس نہیں دیکھا، اتنا مہین، پتلا اور باریک ہوتا ہے کہ تم اس کے آرپار دیکھ سکتے ہو، بلکہ تھوڑا سا مکھن لگا کر اس سے شیو بھی کر سکتے ہو'' [ص ۷]

'' یہ پلاسٹر کی مٹی کے برہما جی ہیں۔ سیٹ پر رکھے جائیں گے، اور جب ان کا کام ختم ہو جائے گا، انھیں توڑ کر اسی مٹی سے راون کا بُت بنالیا جائے گا۔ [ص ۲۳]

مختصر یہ کہ ناولٹ 'دادر پل کے بچے' میں کرشن چندر نے قصے کو علامتی اور تمثیلی انداز عطا کر کے اس سے معاشرے کی تنقید کا خوب کام لیا ہے۔ طنز، حقیقت نگاری اور ایک اچھے سماج کی شدید خواہش کے ساتھ کرشن چندر کا خوبصورت اسلوب ناولٹ کا بھرپور تاثر قائم کرتا ہے، جس کی بنا پر ہم اسے فکری اور فنی طور پر کامیاب تخلیق کہہ سکتے ہیں۔

انسان دوستی اور سماجی مساوات کے علاوہ فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم ہند کے واقعات کو بھی کرشن چندر کے موضوعات میں اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس سلسلے میں اُن کے ناولٹ ''غدار'' [۱۹۶۱] کو ایک نمائندہ تخلیق کہا جا سکتا ہے۔ یہ ناولٹ ۱۹۴۷ء کے فسادات کی براہ راست تصویر کشی پر مبنی ہے۔ اس لیے تقسیم کے فوراً بعد رونما ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور ہجرت سے متعلق واقعات اس ناولٹ کا اہم حصہ ہیں۔ مگر کہانی کا اختتام جس طرح انسان دوستی اور محبت پہ ہوتا ہے، اسے دیکھ کر پروفیسر اعجاز علی ارشد نے اس کا موضوع 'انسان دوستی' قرار دیا ہے۔ ۶

قصہ غیر منقسم پنجاب کے ایک گاؤں سے شروع ہوتا ہے، جہاں ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پڑوسی گاؤں کے مسلمان حملہ کر دیتے ہیں۔ ناولٹ کا مرکزی کردار بیج ناتھ اس حملے اور اس کے بعد پیش آنے والے سانحات سے لگاتار دوچار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ فسادیوں کے ہاتھوں وہ اپنے دادا کی موت اور بہن کے اغوا جیسے کرب سے گزرتا ہوا ہندستان پہنچ جاتا ہے۔ پاکستان سے ہندستان ہجرت کے طوفانی اور ہیجانی دور میں اس نے اپنی آنکھوں سے جو واقعات و سانحات دیکھے اور اس دوران وہ جس کرب سے گزرا، وہ پڑھنے والوں کا دل دہلا دیتے ہیں۔

ہندستان ہجرت کرنے کے بعد بھی اُس کا کرب ختم نہیں ہوتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہاں بھی امن نہیں ہے۔ ایک تو شرنارتھیوں کی دردناک کہانیاں ہیں، دوسرے ہندستان سے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی آہ و فغاں ہے۔ دریائے راوی کے پُل کے دونوں طرف قافلے لوٹے جا رہے ہیں۔ اور لوٹنے والے انسان ہی ہیں، مگر الگ الگ جماعتوں اور مذہبی عقیدوں میں منقسم ہیں۔ بیج ناتھ انسانیت کا علمبردار ہے۔ نام کے اعتبار سے اگرچہ وہ ہندو ہے مگر صفت کے اعتبار سے وہ ہندو ہے نہ مسلمان اور نہ ہی ہندستانی یا پاکستانی۔ مذہبی تعصب اور بغض و عناد اسے چھو کر نہیں گزرا۔ اس کردار کے ذریعہ کرشن چندر نے مذہب کے بے لچک کٹرپن اور بے معنی تعصبات پر کاری چوٹ کی ہے۔ اس نقطۂ نظر کی وضاحت ناولٹ میں موجود درجنوں واقعات سے ہوتی ہے۔ آپ یہاں صرف ایک منظر دیکھیے۔ فسادیوں کے ہاتھوں مارے گئے ایک مسلمان نوجوان کی قبر پر اس کا عمر رسیدہ باپ سورۂ فاتحہ پڑھتا رہا، جبکہ قافلے کے لوگ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اُس نے سورۂ فاتحہ شروع کیا:

''الحمد للہ رب العالمین'' / ''ست سری اکال، ہر ہر مہادیو''

ہوا میں برچھے چمکے اور بڈھے مسلمان کا جسم چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ مرنے والے کی زبان پر آخری نام خدا کا تھا اور مارنے والوں کی زبان پر آخری نام خدا کا تھا۔ اور اگر مرنے مارنے والوں کے اوپر۔۔۔ بہت دور کوئی خدا تھا تو بلاشبہ بے حد ستم ظریف تھا۔''

یہ اقتباس مذہب اور خدا کے نام پر ہونے والے ننگ انسانیت کردار پر گہرا طنز ہے۔ کرشن چندر ایسے کرداروں سے نفرت کرتے ہیں اور بیج ناتھ جیسے کرداروں کو امن اور انسانیت کی بقا کا ضامن سمجھتے ہیں، جو فساد اور جنگ کے میدانوں میں بھی مذہب اور ملک کے بجائے ''انسان'' کو دیکھتا ہے۔ اسی لیے ڈگی کے میدان میں لاشوں کے ڈھیر میں جب وہ مسلمان بچے کو بلکتا دیکھتا ہے تو اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ اس منظر کو کرشن چندر کے لفظوں میں دیکھیے:

''اور میں نے اس مسلمان بچے کو گلے لگا کر پرانے رسم و رواج کے غلیظ ڈھیر کو آگ لگا دی۔ ۔ میں نے بچے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھا لیا اور اس کے دونوں گالوں کو بوسہ دیا۔ اس کی پیشانی کو

چھوما اور اسے کندھے پر بٹھا کر امید کی اس وادی میں چلا گیا جہاں سورج کبھی نہیں ڈوبتا۔" [۱۱۶]

مجموعی طور پر "غدار" کرشن چندر کا ایک نمائندہ ناولٹ ہے، جس میں انھوں نے فسادات کے پس منظر میں ایک کربناک کہانی بُنی ہے اور اس کہانی کے ذریعہ انسانیت، امن اور اخوت کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ اسے بعض ناقدین کی طرح محض فسادات کی ادبی رپورٹ قرار دینا قطعی مناسب نہیں۔ اشتراکی نظریات سے وابستگی کا ایک پہلو وسیع تر انسان دوستی بھی ہے، جو مل جل کر رہنا سکھاتی ہے اور ایک دوسرے کی مدد پر اکساتی ہے۔ جو سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش اور دردمندی سے عبارت ہے۔ یہ تمنا بیج ناتھ کے دل میں بھی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ محبت بانٹنا چاہتا ہے مگر اُسے سرحد کے دونوں طرف صرف نفرتوں میں حصہ داری کے مواقع دکھائی دیتے ہیں۔ وہ حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتا تو نفرت کے بیوپاری اسے 'غدار' قرار دے دیتے ہیں۔ بیج ناتھ جیسے آئیڈیل کردار کی تخلیق اور انسان دوستی پر مبنی آئیڈیالوجی ہی اس ناولٹ کو کامیاب فن پاروں میں شامل کرتی ہے۔

۱۹۶۱ء میں ہی کرشن چندر نے ایک ناولٹ "برف کے پھول" کے نام سے لکھا، جس میں انھوں نے جاگیردارانہ نظام کی استحصال پسندی اور محبت میں ناکامی کو موضوع بنایا۔ کشمیر کی رومانی فضا میں ساجد اور زینب نام کے دو کرداروں کی محبت روایتی انداز میں پروان چڑھتی ہے، مگر جاگیردار خان زماں کی دست درازی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ساجد اپنے سپنوں کی دنیا میں رہتا ہے اور زینب کی شادی خان زماں سے ہو جاتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کی کوشش میں ساجد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، جس کے سبب قارئین کی تمام تر ہمدردیاں اس کردار کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ ہمدردی صدائے احتجاج میں تبدیل نہیں ہو پاتی، اس لیے ناول فکری طور پر کمزور ہو جاتا ہے۔ کسی کی بیوی کو موقع پا کر اڑا لے جانا کسی مہذب سوسائٹی میں درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا، شاید اس لیے بھی قارئین کو یہ ناولٹ پسند نہیں آ سکا۔ بہر حال محبت اور سرمائے کی کشمکش اور برفیلے پہاڑوں کی گود میں کشمیر کے رومانی مناظر اس ناولٹ کو پڑھوا تو گئے مگر ادبی اور فنی عظمت نہیں عطا کر سکے۔

۱۹۶۶ء میں ایک ناولٹ "زرگاؤں کی رانی" شایع ہوا جس کے بارے میں ظ۔ انصاری نے لکھا ہے کہ: "زرگاؤں کی رانی، مجھے ان کے تمام ناولوں میں زیادہ پسند ہے۔ پاکٹ بک کے سائز میں سو صفحے کا یہ مختصر ناول پڑھنے والے کو اول سے آخر تک اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور شکست کے مصنف کے ذہن اور بیان کی تازہ ترین تصویر پیش کرتا ہے، جس کے رنگ زیادہ گمبھیر، کیفیت زیادہ متحرک اور جاندار، اور کینوس کا قد و قامت نہایت موزوں ہے۔" ۸

ظ۔ انصاری کی یہ رائے ناولٹ کے تعلق سے مجموعی خوبی کا اظہار کرتی ہے۔ مگر کرداروں کے نفسیاتی تجزیے کی جو صورت اس ناولٹ میں ملتی ہے وہ اسے ممتاز بناتی ہے۔ اس میں ایک خاتون رانی صاحبہ کا نفسیاتی مطالعہ بے حد باریکی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر رانی صاحبہ نام کی ایک حاکمانہ مزاج والی

عورت کی نفسیاتی کشمکش کی کہانی ہے جو محبت جیسے لطیف جذبے کو بھی رعب، تحکم اور سازشوں کا جال بن کر حاصل کرنا چاہتی ہے۔اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنی بہن اور بیٹی تک کے قتل سے گریز نہیں کرتی۔اور بالآخر اپنے شوہر کنور کی بھی جان لے لیتی ہے۔قتل کے الزام سے وہ کرنل وائیڈ کو دو کروڑ روپے دے کر بری بھی ہو جاتی ہے، مگر اس کا احساس جرم اسے ستاتا رہتا ہے۔آخر کار وہ خود کو پر اسرار حالات کے گھیرے میں پاتی ہے۔یہ پر اسرار حالات دراصل نفسیاتی کشمکش تھی جو اسے طرح طرح کے واہموں میں مبتلا رکھتی ہے اور جس کی شدت سے مغلوب ہو کر بالآخر وہ اپنا گلا بھی گھونٹ لیتی ہے۔کرشن چندر نے رانی صاحبہ کی نفسیاتی کشمکش کے تعلق سے اس کے حرکات وسکنات اور نفسیاتی کیفیت کو بڑی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔مثلاً یہ منظر دیکھیے:

''میرا سینہ پھٹ جائے گا۔۔۔شاید میں پاگل ہو جاؤں گی، ذہنی توازن کھو دوں گی۔بیٹھے بیٹھے مجھے چکر آنے لگتے ہیں۔ساری دنیا مجھے گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور پھر چاروں طرف ایک گونج میرے چاروں طرف لگاتی ہوئی ایک بھیانک چمگادڑ کی طرح چیختی چلاتی ہوئی رات کو میرے اس قدر قریب آجاتی ہے کہ میں اپنے بستر سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔۔۔۔۔مجھے وہ کلاک عجیب سا دکھائی دیا۔اس کا ڈائل ایسا لگا جیسے کسی خوفناک چیز کا چہرہ ہے اور اس کی سوئیاں دو بڑے بڑے بازوں ہوں اور گھنٹوں کے حروف بہت ہی بڑی بڑی آنکھیں ہوں جو پٹ پٹ میری طرف سوالیہ انداز سے دیکھ رہی ہوں''۔[۱۴۶]

اس اقتباس سے رانی صاحبہ کے کرب اور نفسیاتی کشمکش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ایسی ضدی اور سرکش عورت اپنی تمام برائیوں کے باوجود ہماری نفرت کا شکار نہیں ہوتی، صرف اس لیے کہ اس کی غلط روی کی پوری ذمے داری مصنف نے محبت کے جذبے پر عائد کر دی ہے۔عشق کی یہ مختصر کہانی دوسرے تمام جذبوں پر محبت کی بالادستی کو ظاہر کرتی ہے اور رانی صاحبہ، اُرملا اور چمپا کلی کے علاوہ کنور راج بہادر سنگھ کے کردار کی وجہ سے ہمیشہ یاد رہ جاتی ہے۔یہ ناولٹ کردار نگاری، نفسیاتی تجزیہ، تکنیک اور پلاٹ کے خوبصورت استعمال کے سبب بھی کامیاب فن پارہ ہے جس کے تعلق سے ظ۔انصاری کے الفاظ ہیں:

''ایسے سبھاؤ سے، اس قدر عمدگی سے بنی ہوئی Compact کہانی کرشن چندر نے ۹ برسوں بعد کہی ہے۔۔۔بیان کی خوشگوار سادگی اور بہاؤ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ کہیں ایک پیراگراف بھی نہیں کھٹکتا''۔

رسالہ ''شاعر'' کے ناولٹ نمبر [۱۹۷۱ء] میں ایک ناولٹ ''پیار ایک خوشبو'' کے نام سے شائع ہوا جس میں کرشن چندر نے کشمیر کی گھاٹیوں میں بسنے والے بکروال قبیلے کے معاشرہ اور بود و باش کی تصویر کشی کی ہے۔خود مصنف نے بتایا ہے کہ یہ ایک ایسا قبیلہ ہے جس کے دیوی دیوتا دوسرے قبیلوں سے نرالے ہیں۔زمین، آسمان، موت، زندگی، روح اور بدروح کے متعلق ان کے معتقدات بابلیوں، ہمیر جوہ اور کہیں کہیں عبرانیوں کی مقدس کتاب ژند سے ملتے جلتے ہیں۔قصہ آتسکی کے ڈرامے سے ماخوذ ہے اور اس کی فضا

پوری طرح طلسماتی اور رومانی ہے۔ ایک حسین لڑکی آنگی اور اس کے محبوب چنن کی یہ کہانی بالآخر محبت کی عظمت کا احساس جگاتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ آنگی کے باپ نے اپنے پرانے دوست یعنی چنن کے باپ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر اس کے گھر لڑکی پیدا ہوئی تو وہ چنن کی شریک حیات بنے گی۔ وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا مگر یہ دونوں مر کر ایک ہو گئے۔ کرشن چندر نے خود لکھا ہے: "یہ دراصل توہمات میں گھری ہوئی دو روحوں کے جذبۂ صادق کی کہانی ہے"۔ زندگی کے حقائق سے 'پیار ایک خوشبو' کے پلاٹ کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کشمیر کی جو علاقائی قبائلی زندگی پیش کی گئی ہے اس میں بھی ہماری دیہی یا شہری زندگی کی کوئی جھلک نہیں ملتی۔ یہاں مفروضات اور توہمات کا پراسرار ماحول ملتا ہے اور فرسودہ اعتقادات کی حیرت انگیز وادیاں ملتی ہیں۔ ان معتقدات اور توہمات کی پیش کش میں ناولٹ نگار نے کمالِ فن ضرور دکھلایا ہے۔ آسیب و اسرار سے بھرے ہوئے مناظر قارئین کو تجسس و تحیر میں مبتلا کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہی کرشن چندر کے دلفریب اسلوب اور کامیاب تکنیک کی دلیل ہے۔

مجھے احساس ہے کہ مضمون طویل ہو گیا ہے، اس کے باوجود یہاں پر میں بچوں کے لیے لکھے گئے کرشن چندر کے ایک ناولٹ "الٹا درخت" [۱۹۵۴] کا ذکر بھی ضرور کرنا چاہوں گا جو بظاہر بچوں کا ناولٹ ہے مگر اس میں کرشن چندر کے سیاسی و سماجی نظریات و تجربات جس قدر فنی مہارت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں اس کے پیشِ نظر یہ بڑوں کو بھی دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ریوتی سرن شرما نے اس کے دیباچے میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے اس ناولٹ کا امتیاز و انفرادو واضح ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"جو چیز اس لطیف کہانی کو سنجیدہ ادب کے زمرے میں شامل کرتی ہے وہ ہے مصنف کا بالغ سیاسی اور سماجی شعور۔ اس شعور کے لمس سے یہ ساری کہانی ایک طنزیہ تمثیل بن گئی ہے اور ہر تخلیقی پیکر ایک گہری رمزیت اور ہر واقعہ ایک گہری معنویت کا حامل بن گیا ہے"

ناولٹ پڑھنے کے بعد کوئی بالغ نظر قاری اس بیان کی صداقت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس پورے ناولٹ میں کرشن چندر کی انسان دوستی ۱۰؛ سرمایہ دارانہ ذہنیت سے نفرت اور محنت کشوں سے محبت کے جذبات لہو بن کر دوڑ رہے ہیں۔ اس میں معاشرتی طنز کی کاٹ بہت شدید ہے۔ وہ معاشرے میں موجود زیادہ تر برائیوں کو نشانہ بناتے ہیں اور بچوں کے اندر ان برائیوں سے نفرت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ بچوں کے دلوں میں انسان کی عظمت کا سکہ شروع سے بیٹھ جائے۔ اس لیے اُن کا ایک کردار کہتا ہے:

"آدمی کے بغیر ان کی کوئی قیمت نہیں۔ تمام چیزوں کی قیمت آدمی سے ہے۔ کپڑے آدمیوں کے لیے ہوتے ہیں، مٹھائیاں بچوں کے کھانے کے لیے ہوتی ہیں، سڑکیں راہ گیروں کے گزرنے کے لیے ہوتی ہیں۔"

ناولٹ میں یوسف کی جائداد پر بادشاہ کے زبردستی قبضے سے لے کر سانپوں کے شہر کے تمام لوگوں کو ظالموں سے آزاد کرانے تک سینکڑوں واقعات ہیں جو بچوں کو دلچسپ اور متحیر کن لگتے ہیں اور اپنے ہی جیسے بچوں کو حیرت انگیز دنیا کا سفر کرتے ہوئے دیکھ کر انھیں مسرت سے ہمکنار کرتے ہیں۔ مگر ان واقعات کی تہہ

میں ایک انفرادیت یہ ہے کہ اس کے تمام واقعات اور کردار موجودہ معاشرے کے کسی نہ کسی پہلو کی آئینہ داری کرتے ہیں اور مفاہیم کی ایک نئی دنیا آباد کرتے ہیں۔ یہ مفاہیم بچوں کے ساتھ بڑوں کو بھی دعوت فکر دیتے ہیں۔ محنت سے محبت اور سرمایہ داری سے نفرت جیسے نظریات کی پیش کش بچوں اور بڑوں دونوں کو روشنی بخشتی ہے۔ بقول پروفیسر اعجاز علی ارشد: ''کرشن چندر کے نظریات کی اس قدر فنکارانہ لطافت کے ساتھ بچوں کے ناول میں پیش کش مصنف کے بالیدہ فنی وفکری شعور کی آئینہ دار ہے اور مختلف تعلیمی و ذہنی سطحوں پر اس ناولٹ کے مطالعہ کا تقاضا کرتی ہے۔'' [کرشن چندر کی ناول نگاری۔ ص ۶۳] گویا فکری وفنی تہہ داری اور کرشن چندر کے نظریات کی خوبصورت پیش کش کے لحاظ سے اس ناولٹ کو بھی کامیاب اور اہم قرار دیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی ذکر کیا کہ کرشن چندر نے مختصر ناول یا ناولٹ بسیار نویسی یا کمرشیلزم جس بنا پر بھی لکھے ہوں، ان کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ مذکورہ ناولوں کے علاوہ 'میری یادوں کے چنار'، 'آسمان روشن ہے'، 'لندن کے سات رنگ'، 'پانچ لوفر'، 'ستاروں کی سیر'، 'سونے کا سیب'، 'بہادر گار جنگ'، 'چاندی کے گھاؤ'، 'بہروپیا'، 'چندا کی چاندنی' اور 'آنکھ کی چوری' وغیرہ کو بھی ان کے اختصار اور محدود کینوس پر مبنی قصوں کی بنا پر ناولٹ کہا جاسکتا ہے۔ مگر ان میں زیادہ تر ناولٹ اپنے معیار و مزاج کے اعتبار سے ایسی کوئی خصوصیت نہیں رکھتے کہ ان کا تفصیلی ذکر کیا جائے۔ اُن کے مقبول و معروف ناولٹ 'دادر پل کے بچے'، 'غدار'، 'برف کے پھول'، 'زرگاؤں کی رانی' اور 'الٹا درخت' وغیرہ ہی ہیں جن کا تجزیاتی مطالعہ کرشن چندر کی ناولٹ نگاری پر دسترس کے علاوہ ان کے مشاہدات کی وسعت اور نیرنگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہ تنوع موضوعات و واقعات اور کردار نگاری کے ساتھ اسلوب اور تکنیک کی سطح پر بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ان ناولٹوں میں کرشن چندر اگر ایک طرف رومانیت کے مختلف پہلوؤں سے قریب نظر آتے ہیں تو دوسری طرف ان کی شخصیت اور فکر پر اشتراکیت کے غالب اثرات بھی بہ آسانی محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ 'برف کے پھول' اور 'پیار ایک خوشبو' کو اگر ان کی رومانی فکر کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے تو 'غدار'، 'دادر پل کے بچے' اور 'الٹا درخت' کو پوری طرح ان کے اشتراکی طرز فکر کا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے، جن میں اشتراکی فکر کے ساتھ انسانی ہمدردی اور انسان دوستی کے بے پناہ جذبے کا احساس ملتا ہے اور مصنف کا رجائی نقطۂ نظر بھی سامنے آتا ہے۔ جنگوں کی مخالفت اور امن عالم کی حمایت کے ساتھ ایک پُر امید زندگی کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کرشن چندر مایوسی کو کفر کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ 'چندا کی چاندنی' اور 'بہروپیا' جیسے کمرشیل اور فلمی انداز کے ناولٹ بھی انسانی ہمدردی کے جذبے کی ایک دستاویز اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف احتجاج کی آوازیں ہیں۔ دراصل کرشن چندر ہم عصر مسائل سے کبھی بے نیاز نہیں رہے۔ خاص طور پر استحصال کی جتنی صورتیں معاشرے میں جہاں کہیں موجود تھیں وہ ان کی نظروں میں کھٹکتی رہیں اور انسانی ہمدردی کے جذبے سے لبریز ان کا دل اُن صورتوں کے خلاف احتجاج کرتا رہا۔ وہ تمام صورتیں ان کے افسانوں، ناولوں

اور ناولٹوں میں موضوعات کی رنگارنگی کے طور پر موجود ہیں۔

موضوعات کی رنگارنگی کی طرح ان کے کردار اور تکنیک کی نیرنگی بھی ہمیں متوجہ کرتی ہے۔ کردار نگاری کے باب میں جہاں ایک طرف 'دادر پل کے بچے' کا بھگوان توجہ کھینچتا ہے تو دوسری طرف 'غدار' کا بج ناتھ بھی ہمارے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ 'برف کے پھول' میں زینب اور ساجد محبت میں جان دینے والے کردار کی صورت متاثر کرتے ہیں تو 'زرگاؤں کی رانی' کی رانی صاحبہ اپنی نفسیاتی کشمکش اور سرکش فطرت کے باوجود قاری کی محبوب بن جاتی ہے۔ اسی طرح 'پیار ایک خوشبو' کی آنگی اور 'الٹا درخت' کا یوسف بھی اپنی اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ مصنف کی کردار نگاری کا عمدہ نمونہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ غرض یہ کہ کرشن چندر کے ناولٹوں میں بھی طرح طرح کے کردار ہیں جو معاشرے کے مختلف طبقات و رجحانات کی نمائندگی ہی نہیں کرتے مصنف کی کردار نگاری کے فن پر قدرت کا ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ حالانکہ اُن کے اکثر ناولٹ کرداری نہیں ہیں یعنی ان کی کہانیاں کرداروں کے گرد نہیں گھومتیں۔ وہ بنیادی طور پر فضا آفرینی اور سحر بیانی کے قائل ہیں اور ان کے سہارے معاشرے کے کمزور اور تاریک پہلوؤں کی بہت اچھی عکاسی کرنا پسند کرتے ہیں۔ جہاں تک تکنیک کی نیرنگی کا سوال ہے 'دادر پل کے بچے' سے ہی اس کا اندازہ ہونے لگتا ہے، کہ اس میں 'بھگوان' کو جس طرح زمین پر اتار کر اُسے ایک Tool کے طور پر استعمال کیا گیا ہے[12]، اس کی داد نہ دینا بے انصافی ہوگی۔ اسی طرح 'الٹا درخت' کا تمثیلی اور فنطاسیہ انداز بیان، 'غدار' کے وضاحتی اسلوب سے قطعی مختلف ہے۔ میرا خیال ہے کہ کرشن چندر اکہرے بیانیہ انداز تک کبھی محدود نہیں رہے، اسی لیے ان کے افسانوں اور ناولوں کی طرح ناولٹوں میں بھی اسلوب اور تکنیک کا تنوع ان کے تغیر پسند اور تجرباتی ذہن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ کمرشیل ازم اور مقصدیت کے باوجود کرشن چندر کے ناولٹوں میں ماجرا بھی ہے کردار نگاری بھی، انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے اور گہرا تاثر بھی۔ کسی مصنف کی قدر و قیمت کا تعین ہمیشہ اس کے اچھے اور معیاری فن پاروں کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ 'الٹا درخت'، 'دادر پل کے بچے'، 'غدار' اور 'زرگاؤں کی رانی' وغیرہ کرشن چندر کے پانچ سات ایسے ناولٹ ہیں جو ہر اعتبار سے بہترین کہے جا سکتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سجاد ظہیر اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ اپنے ایک یا دو ناولٹوں کی وجہ سے اگر تاریخ میں زندہ ہیں تو کرشن چندر اپنے ان منفرد اور بہترین مختصر ناولوں کی وجہ سے اردو ناولٹ کی تاریخ میں اہم مقام پر کیوں نہیں فائز کیے جا سکتے؟

☆☆☆

مکتوباتِ سہیل اور سہیل عظیم آبادی

● ڈاکٹر نسیم احمد نسیم

سہیل عظیم آبادی اردو ادب کی قد آور شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ نہ تو اعلیٰ سند یافتہ تھے اور نہ ہی کسی بڑے منصب پر فائز تھے۔ وہ ایک سادہ، سہل اور ملنسار انسان تھے اس لیے ان کے تعلقات کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ایک طرف جہاں وہ سیاست دانوں، دانش وروں اور ادیبوں سے تعلق رکھتے تھے تو دوسری جانب مزدوروں، محنت کشوں اور بہت سے معصوم، سادہ لوح اور ان پڑھ لوگوں سے بھی قربت رکھتے تھے۔ ان کے دکھ درد سنتے تھے، ان میں شریک ہوتے تھے۔ وہ ایک سوشل آدمی تھے اور اپنی زمین سے پورے طور پر جڑے رہتے تھے۔ ان کا تعلق چونکہ ایک زمیندار گھرانے سے تھا، اس لیے وضع داری کا کچھ کچھ پاس بھی تھا۔ لیکن اس کے باوجود وسعت ذہنی اور وسیع القلبی ہی ان کا اصل خاصہ تھا۔ ادب ہو، صحافت ہو یا سیاست کی پر پیچ باتیں ہوں، ان کا ذہن ہر جگہ بہت صاف اور نظریہ بہت واضح تھا۔ وہ ادب میں تعمیری، افادی اور صحت مندر جحانات کے قائل تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے مکتوبات میں سادگی، صاف گوئی اور اور یگانگت ہر جگہ موجود ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ وہ ایک سوشل آدمی تھے۔ اس لیے ان کے مراسم کی حدیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے مطابق ڈاکٹر تاراچرن رستوگی انھیں بھائی جان کہا کرتے تھے۔ اور ان سے سب سے زیادہ خط وکتابت ہوا کرتی تھی۔ ڈاکٹر رستوگی کے بعد انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کا نام

لیا ہے۔ اس بابت وہ ڈاکٹر رستوگی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کے بعد جن کو خطوط لکھے وہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہیں۔ ان سے میرے تعلقات ۱۹۵۳ء سے ہوئے جب وہ طالب علم تھے۔ وہ ایک وضع دار انسان ہیں''۔

پروفیسر نارنگ سے قربت اور ذہنی ہم آہنگی کا اندازہ ان کے متعدد مکتوبات سے ہوتا ہے۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔

سہیل عظیم آبادی کہیں فکشن نگار، کہیں شاعر، کہیں صحافی، کہیں اردو تحریک کے قائد، کہیں مولوی عبدالحق کے شریک کار اور کہیں بزرگ اور جہاں دیدہ انسان کی طرح اپنے نظریات وخیالات کا دوٹوک اور برملا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ چونکہ ایک سچے اور اچھے فنکار کی طرح حساس اور دردمند دل رکھتے تھے اس لیے ان کے مکتوبات میں خود پسندی اور خود نمائی نہیں۔ وہ اپنے مخاطبین سے محبت، یگانگت اور اچھائی کا معاملہ رکھتے تھے۔ وہ جس کو چاہتے تھے ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ تادیر نباہ کرتے تھے۔ وہ کبھی بعض ادبی رویوں سے نالاں ہو کر سخت اور ترش لہجہ اپناتے تھے اور بعضوں کی سرزنش بھی کرتے تھے۔ لیکن انھیں کسی سے کد نہیں تھی۔ ان کے یہاں خلوص اور نیک نیتی کا عمل دخل تھا۔ اس لیے ان کے اختلافات اگر کلی طور پر قابل قبول نہیں تو قابل رد بھی نہیں تھے۔ ان کے خطوط کے تین مجموعے ''مکتوبات سہیل بنام ساغر نظامی''، ''سہیل بنام اسری'' اور ''ہم کلام'' کی اشاعت ہو چکی ہے۔ ان خطوط کی روشنی میں معصوم عزیز کاظمی نے ان کے متعلق رائے قائم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''سہیل عظیم آبادی صناعی، کاریگری اور مرصع سازی کے قائل نہ تھے۔ انھوں نے جو کچھ محسوس کیا وہ بے کم وکاست لکھ دیا۔ ہر لفظ، ہر جملہ، ہر خیال ہم آہنگ ہے۔ جو پرشکوہ الفاظ، بیجا تشبیہات اور غیر ضروری استعارات سے پاک ہے۔ ان کے رواں دواں اسلوب میں بڑی سادگی اور دل کشی ہے۔'' [زبان وادب۔ دسمبر۔ ۲۰۱۱ء/ص۔ ۲۰]

سہیل عظیم آبادی کا اپنا اسلوب، اپنا نظریہ اور اپنا زاویہ فکر تھا، جو بہت ہی سادگی، مگر پُرکاری کے ساتھ ان کے خطوط میں ظاہر ہوتا تھا۔ وہ تصنع، ملمع اور بناوٹ کے بجائے صاف ستھری اور دوٹوک گفتگو پسند کرتے تھے۔ جن خطوط میں انھوں نے تنقیدی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے وہاں بھی یہ انداز غالب ہے۔ اگرچہ اکثر مقامات پر انھوں نے یہ توضیح پیش کی ہے کہ ان کا مطالعہ گہرا نہیں ہے لیکن وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں یا ان کے جو بھی تجربات ومشاہدات ہیں ان کے اظہار میں وہ کسی تکلف یا تامل سے کام نہیں لیتے۔ ڈاکٹر کمال الدین کے نام اپنے ایک مکتوب میں وہ کہتے ہیں:

''تم نے میرے متعلق رائے قائم کرلی ہے، لیکن میری رائے یہ ہے کہ کسی کے بارے میں آخری رائے قائم نہیں کرنی چاہیے ایک ہی آدمی ایک

وقت میں رام ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں راون......"

اس گہرے تجربے کے بعد وہ براہ راست ادب اور بالخصوص بنگلہ ادب کو اپنا موضوع بناتے ہوئے اپنے مکتوب الیہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ:

"بنگلہ تو ضرور پڑھ لو۔ اس کے بعد ہی تم جان سکو گے کہ ناول کیا ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی بنگلہ ناولوں جیسے کم ناول ہیں۔ ناولوں کا مطالعہ کرو۔ "آگ کا دریا" اور "اداس نسلیں" کی شہرت بہت ہے لیکن بنگلہ میں تو اس درجے کے دو ہزار ناول تو ضرور ہوں گے۔ سرت بابو کو پڑھو گے تو دل ہلتا رہے گا۔"

[بحوالہ: سہیل عظیم آبادی نمبر۔ زبان و ادب۔ پٹنہ۔ ۱۹۸۱]

اس سلسلے کو وہ آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ کو لکھتے ہیں:

"بنگال میں اردو سرمایہ ہے ضرور، لیکن اس سے زیادہ اہم اور قیمتی بنگالی ادب کا سرمایہ ہے، جو اردو میں منتقل ہو جائے تو اردو کی دولت میں اضافہ ہو۔ خاص کر ڈی ایل رائے، بنکم چندر چٹرجی، ٹیگور اور سرت چندر چٹرجی کی تخلیقات۔ مجھے سرت بابو کے ناول سے عشق ہے۔ میں بڑی ایمانداری کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ اپنے عہد کے وہ دنیا کے سب سے بڑے ناول لکھنے والے ہیں۔ بیسویں صدی میں جن کو نوبل پرائز ملا وہ سرت بابو کے سامنے طفلِ مکتب ہیں۔"

مندرجہ بالا خطوط کے حصوں سے انکشاف ہوتا ہے کہ اردو ہی کیا دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کے ناول بھی بنگلہ ناولوں کے سامنے ہیچ ہیں۔ اس طرح قطعیت اور شد و مد کے ساتھ یا تو وہ شخص اظہار خیال کر سکتا ہے جس نے پورا بنگلہ ادب کھنگال رکھا ہو یا وہ کہہ سکتا ہے جو صرف گفتنی میں دلچسپی رکھنے کا عادی ہو۔ بہر حال ایک حد تک سہیل صاحب کی نظر وسیع تھی، قلب فراخ تھا اور انداز دو ٹوک تھا۔ اس لیے ان کے تاثرات غور کیے جانے کے لائق ہیں۔ سہیل صاحب سرت چندر چٹرجی کی طرح ٹیگور کے بھی زبردست مداح تھے۔ وہ ٹیگور کے یہاں وسعت اور تنوع محسوس کرتے ہیں جب کہ ان کے ہم عصر اقبال کے یہاں انھیں مذہبی جارحیت اور جذباتیت کا احساس ہوتا ہے۔ چونکہ ڈاکٹر تارا چرن رستوگی کلام اقبال کا عمیق مطالعہ رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اس موضوع پر انھیں کئی خطوط روانہ کیے اور کھل کر اپنے موقف کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر رستوگی کے نام لکھے گئے مکتوبات کے چند حصے یہاں ملاحظہ فرمائیں:

"میرا اقبال کا مطالعہ ان کی شاعری تک محدود ہے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا معترف ہونے کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اسلام سے زیادہ "مسلم سیاست" کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر اپنی شاعرانہ قامت کو گھٹایا ہے۔ اقبال دنیا کے عظیم شاعروں میں سے ایک تھے اس میں شک نہیں، لیکن اقبال پرستوں نے ان کو بت بنا دیا ہے اور دوسروں سے بھی اس کی پرستش چاہتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ مسجد قرطبہ میں اگر اقبال نے نماز نہیں پڑھی تو ان کی عظمت میں کمی نہیں آتی اور اگر پڑھی تو اضافہ

نہیں ہوتا۔ خواہ مخواہ انھیں نماز پڑھوانا ضروری تو نہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ اقبال نماز کے پابند تھے۔ اگر نہیں تھے تو بھی ان کی شاعری پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن ہم جذباتی لوگ ہیں اللہ رحم کرے ہماری حالت پر۔" [۱۱ر دسمبر ۱۹۷۶ء]

مقتبس حصے کو پڑھ کر یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اقبال کے منکر تھے بلکہ وہ اقبال کو عالمی سطح کا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ لیکن انھیں مذہبی شاعر کے بطور پیش کرنے پر انھیں اعتراض تھا۔ وہ اقبال کے کچھ نظریات سے اختلاف رکھتے تھے۔ اور اکثر اس کا اظہار اپنے خطوط کے ذریعے کرتے رہتے تھے۔ وہ اقبال سے ٹیگور کا تقابل کرتے تھے۔ اور پھر نتائج بیان کرتے تھے۔ ایک دوسرے خط میں وہ ڈاکٹر رستوگی کو تحریر کرتے ہیں:

"یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ بیسویں صدی کے ہندوستان میں دو بڑے شاعر اقبال اور ٹیگور دونوں Revivalist تھے۔ ٹیگور نے اسے Rationalize کرنے کی کوشش کی لیکن اقبال نے اسے Crude بنا دیا اور اس شخص کے لیے اقبال کے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو مسلمان نہیں ہے۔ ٹیگور کے یہاں ایسی بات نہیں ہے۔ ٹیگور کے یہاں ویدانتی فلسفے کے غلبے کے باوجود انسانیت پر بہت زور ہے......" [۷/ اگست۔ ۱۹۷۶ء]

سہیل صاحب کے اتنے سخت ریمارکس کو بھی ڈاکٹر رستوگی نے معروضیت کے بدلے مروت سے قبول کیا۔ انھوں نے جواباً تحریر کیا کہ "نیشنلسٹ نقطۂ نظر سے بھائی جان کے متعلقہ خیالات وزنی بھی ہیں اور وقیع بھی۔ اور ایسے ہیں جن سے ناقدینِ اقبال مشکل سے ہی روگردانی کر سکتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں دیدہ ور تھے......"

مذکورہ بالا تمام اختلافی باتوں کے باوجود سہیل صاحب کے خطوط میں غضب کی برجستگی تھی۔ ان کا طرزِ فکر، تجزیاتی اور تقابلی انداز اور منصفانہ رویہ ان کی ہر تحریر سے مترشح ہے۔ وہ ادب میں خالص اور جینوئن فنکاروں کی ناقدری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ وہ سدرشن کو ایک اہم افسانہ نگار مانتے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی رسالے کا سدرشن نمبر شائع ہوتا کہ ان کے ساتھ ہوئی ناانصافی کا کچھ حد تک ازالہ ممکن ہو۔ اس ضمن میں وہ بہت ہی خلوص اور اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو لکھتے ہیں کہ:

"اب میری کوشش ہے کہ کوئی رسالہ "سدرشن نمبر" نکال دے۔ پریم چند پر کافی کام ہو رہا ہے۔ آپ کی کوششوں سے "سجاد حیدر یلدرم نمبر" شائع ہو چکا ہے...... نمبر نکالنے اور نکلوانے میں آپ بہت آگے تھے۔ اب میں نے یہ کام شروع کر رکھا ہے۔ اگر موقع ہو تو ایک مضمون سدرشن صاحب پر لکھئے۔ اردو افسانوں پر ان کا احسان ہے اور یہ عجیب بات ہے پریم چند اردو سے ہندی میں آئے تو دونوں نے ان کو اپنا مانا۔ لیکن سدرشن کو دونوں نے Disown کر دیا۔ اور وہ بھی خاموش ہو رہے لیکن ان کی خدمات کو تو نہیں بھلایا جا سکتا۔ آپ کا کیا خیال ہے کیا آپ ایک مضمون لکھیں گے؟"

مذکورہ بالا باتوں سے سہیل صاحب کی وسعت ذہنی اور انصاف پسندی کا پتا چلتا ہے۔ نیز یہ بھی

معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں ادیب صرف ادیب ہوتا ہے اور اس کی قدر و منزلت کا پیمانہ صرف اس کا فن پارہ ہوتا ہے نہ کہ اس کا کنبہ، اس کا طبقہ اور اس کا منصب و مال۔

سہیل عظیم آبادی ترقی پسند ضرور تھے لیکن سخت گیر نہیں تھے۔ وہ اپنے سامنے بہت سے ایسے شہری اور سوٹیڈ بوٹیڈ ٹائی والے ترقی پسندوں کو آپے سے باہر ہوتے ہوئے دیکھ رہے تھے جنھوں نے کبھی کسانوں کو کیا، مزدوروں اور محنت کشوں کو بھی قریب سے جا کر نہیں دیکھا تھا۔ بس وہ پروگریسو (Progressive) کہلانا چاہتے تھے۔ شور مچانا جانتے تھے۔ سہیل صاحب دور اندیش اور تجربہ کار ادیب تھے۔ انھوں نے اس قماش کے ادیبوں سے خود کو محفوظ رکھا۔ وہ اعتدال کے ساتھ وہی باتیں بہت آسانی سے کہہ کر بہت اچھا تاثر چھوڑ رہے تھے جن باتوں کو کہنے کے لیے متشدد ترقی پسندوں نے ادب کو رزم گاہ بنا رکھا تھا۔ دراصل سہیل صاحب کا مزاج باغیانہ نہیں اصلاح پسندانہ تھا۔ وہ مزدوروں کو بیدار تو کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں مارکسی انقلاب کے خوفناک بھنور میں پھنسا کر غرقاب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بھیمڑی کانفرنس کے بعد اشتراکیوں نے انھیں اعتدال پسندی کے الزام میں نکال باہر کیا۔ سہیل صاحب کا وژن، اپروچ اور دائرہ فکر وسیع تھا۔ اس لیے نئی ہوا کے تازہ جھونکوں کے لیے ان کا ذہن ہمہ وقت وا رہتا تھا۔ وہ ادب میں تغیر، انحراف اور تجربے کے حامی تھے۔ لیکن منفی، بے روح اور بے جواز سوچ اور رجحان کے وہ سخت مخالف تھے۔ وہ فن کی اساسی حیثیت کو ہر حال میں مقدم دیکھنا چاہتے تھے۔ اردو ادب میں جدیدیت ان کی آنکھوں کے سامنے داخل بھی ہوئی اور خارج بھی۔ وہ جدید رویے کے منفی اثرات کو گہرائی سے محسوس کر رہے تھے اور اسے ادب کے ساتھ مذاق تصور کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے عبدالقیوم ابدالی اور ظہیر کیفی امروہوی کو اپنے الگ الگ مکتوب میں لکھا کہ:

> ''زمانہ بدل چکا ہے۔ ادب میں بھی فیشن کی پیروی کی جارہی ہے۔ جدید ادب کے نام پر زیادہ تر ایسی تحریریں آرہی ہیں جن کو ادب کے ساتھ مذاق ہی کہا جا سکتا ہے۔'' [بنام عبدالقیوم ابدالی]
>
> ''زبان کو خواہ مخواہ تشبیہوں، استعاروں اور رنگین نگارش سے بوجھل نہ بنایئے۔ پڑھنے والا لفظوں کی بھول بھلیاں میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ اس سے بچیے...... عریانی اور پردہ داری کا میں خود بھی بہت قائل نہیں ہوں۔ لیکن فن تو ضرور ہو......''

مذکورہ دونوں اقتباس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جدیدیوں کو صرف لعن طعن ہی نہیں کرتے تھے بلکہ بہت ہی خلوص کے ساتھ انھیں ایسے افعال سے باز آنے کی تلقین بھی کرتے تھے جو ادب کے لیے حد درجہ مضر اور مہلک تھے۔

گزشتہ سطور میں کہا گیا کہ سہیل صاحب کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے بے شمار خطوط پوسٹ کیے اور ان کے جوابات بھی حاصل کیے۔ ملک اور بیرون ملک کے تقریباً تمام چھوٹے بڑے

لکھنے والوں سے ان کے روابط تھے۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ سرحد کے پار بیٹھے ادبا بھی ان کے ذکر سے اپنی محفلوں کو روشن کرتے رہتے تھے۔ معروف ادیبہ شکیلہ اختر نے ان کی موت پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون (چھین لے مجھ سے حافظہ میرا) مطبوعہ سہیل عظیم آبادی نمبر، زبان وادب پٹنہ ۱۹۸۱ء میں لکھا ہے کہ: ''کراچی میں جمیل جالبی کی خوبصورت کوٹھی ادیبوں شاعروں کی آماجگاہ تھی۔ جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد، ہاجرہ مسرور، اختر حسین رائے پوری، غلام عباس، ممتاز زمن اور ابوالفضل صدیقی سے دوران قیام میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ انھوں نے پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے سوال کیا کہ ہمارے دوست سہیل کیسے ہیں؟ میں نے پوچھا آپ نے سہیل کو دیکھا ہے، کہنے لگے'' ہماری ملاقات تو کبھی نہیں ہوئی لیکن ان کے خطوط اتنے برسوں سے پڑھتے رہے ہیں کہ اب یقین نہیں آتا کہ ہم ایک دوسرے سے نہیں ملے ہیں''۔ بعد میں احمد ندیم قاسمی ملے تو انھوں نے بھی یہی باتیں دہرائیں۔'' سہیل عظیم آبادی کی مقبولیت اور محبوبیت میں اس وجہ سے بھی روز بروز اضافہ ہوتا رہا کہ ان کے یہاں سینئر جونیئر اور معمولی وغیر معمولی کا کمپلیکس نہیں تھا۔ وہ ہر نئی آنے والی نسل کا خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کرتے تھے۔ ان کی بڑھ چڑھ کر حوصلہ افزائی کرتے تھے یہاں تک کہ ان سے اپنے نجی معاملات اور مسائل بھی شیئر کرتے تھے۔ ان کے یہاں عاجزی اور انکساری تھی۔ ادب کے لیے سچا Devotion تھا۔ ان کے پاس عزیزوں کے لیے اگر ڈھیر ساری دعائیں اور ہدایتیں تھیں تو بدنیتوں اور سازشیوں کے لیے عقل سلیم اور راہ راست کی نیک تمنائیں اور نیک خواہشات بھی تھیں۔

کامریڈ حبیب الرحمٰن نے سہیل صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ:

> ''ان کی ایک ہابی یہ تھی کہ وہ روزانہ تقریباً دس خطوط اردو ہندی کے ادیبوں کو لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں ساغر نظامی نے اپنے نام آئے ان کے خطوط کو شائع کر دیا۔ ان کے سب خطوط اگر حاصل ہو جائیں تو شائع کرنے کے بعد ۵۰۰ صفحات کا علاحدہ نمبر شائع ہو جائے گا۔ ایک دفعہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے کلام حیدری کی موجودگی میں مجھ سے کہا کہ سہیل صاحب اپنے PRO (Public Relation officer) خود ہی تھے۔ ان کے خطوط اس سلسلے کی اہم کڑی ہوا کرتے تھے۔'' رونق دکنی نے ان سے اپنی قربت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ'' سہیل صاحب خط وکتابت کے بڑے پابند تھے۔ وہ نجی حالات بھی مجھے لکھتے تھے۔ اور مشورہ طلب کرتے تھے۔ اپنے دو بیٹوں یعنی لطیف الرحمٰن اور شان الرحمٰن کو جنون کی حد تک پیار کرتے تھے۔ وہ بڑے فراخ دل اور علم دوست انسان تھے۔''

سہیل صاحب جب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو انھوں نے ماہنامہ ''سہیل'' کی ذمہ داری

قبول کرلی۔ اس ماہنامے سے جڑنے کے بعد انھوں نے اس کے نظریات کی نئے سرے سے وضاحت کی۔ انھوں نے لکھا کہ "یہ رسالہ ترقی پسند ہوگا لیکن تنگ نظر نہیں۔ اور کسی مخصوص سیاسی جماعت سے منسلک نہ ہوگا۔ ماہنامہ 'سہیل' میری طرح ترقی پسند ہے، شدت پسند نہیں۔ میں ادب میں نت نئے تجربے کا قائل ہوں لیکن رجعت پسندی اور انتشار کی اشاعت کا مخالف ہوں جو عام طور پر جدیدیت زدہ لوگ کرتے ہیں۔ مجھے ان کی نگارش اور اسلوب سے اختلاف نہیں' خیالات سے ہے۔"

سہیل عظیم آبادی کے متعلق جیسا کہ قبل میں عرض کیا گیا کہ ان کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ وہ ایک مستند افسانہ نگار اور صحافی کے ساتھ اردو تحریک کے ایک اہم ستون بھی تھے۔ خواہ وہ بہار کی سطح پر ہو یا مرکز کی سطح پر، انھوں نے پوری دلچسپی اور خلوص نیتی کے ساتھ اردو کو اس کے حقوق دلانے کے لیے دن رات جدوجہد کی۔ لیکن ہر زمانے میں اور زندگی کے ہر شعبے میں سیاست اور گروپ بازی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میڈیوکر لوگ روشنی میں رہتے ہیں اور اصل خدمت گار تاریکیوں میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی رکنیت کے زمانے میں یہی صورت حال سہیل صاحب کے درپیش تھی۔ وہ مسلسل اذیت کا شکار تھے کہ ان کی نظروں کے سامنے ناانصافیاں اور طرف داریاں ہو رہی تھیں۔ اردو کی فلاح سے زیادہ لوگوں کو اپنی غرض اور اپنی پسند سے مطلب تھا۔ ان حالات سے کبیدہ خاطر ہو کر ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ کو انھوں نے لکھا کہ:

> "میں نے مولوی عبدالحق کا زمانہ دیکھا ہے جب انجمن کی عالی شان عمارت تھی اور اب کھنڈر بن چکی ہے۔ سرور صاحب نے ایسا کر دیا ہے۔ برسوں میں اتنا بھی نہیں کر سکے جہاں مولوی عبدالحق لائے تھے...... میرا خیال ہے محترمی مُلّا کے علاوہ انجمن کے بارے میں کوئی کچھ سوچتا بھی نہیں...... محترمی مُلّا کی خواہش تھی کہ میں سکریٹری چنا جاؤں لیکن حیات اللہ انصاری اور لاہری صاحب کے علاوہ کسی نے ساتھ نہیں دیا۔ سرور صاحب نے خاص طور پر خلیق انجم کے لیے کوشش کی تھی۔ چنانچہ انجم عارضی سکریٹری مقرر ہو گئے۔ مجھے کوئی شکایت نہیں...... میں نے زندگی کا بہترین زمانہ یعنی ۲۷ سال کی عمر سے ۳۹ سال کی عمر تک مولوی عبدالحق کے حکم پر انجمن کے لیے چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں گنوایا۔ گاؤں گاؤں مارا پھرا، اسکول قائم کیے...... آج ہر گروپ اقتدار چاہتا ہے۔ اچھے اور کام کرنے والے لوگوں کی کمی ہے۔ بہار میں انجمن کی کانفرنس بھی سیاست اور گروپ بازی کا شکار ہوئی۔ کانفرنس میں باہر سے صرف شانتی رنجن بھٹاچاریہ، نارنگ اور حیات اللہ انصاری آئے۔ خرچ انجمن کو دینا تھی۔ پھر بھی کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس لیے ان سے کیا امید کی جا سکتی ہے مایوسی ہاتھ لگی۔"
> [۳؍اپریل ۱۹۷۴ء]

سہیل عظیم آبادی کی زندگی میں اس طرح کے تلخ اور حوصلہ شکن واقعات کی کمی نہیں۔ بہار اردو اکادمی کے زمانے میں بھی انھیں ایسے متعدد حالات سے دوچار ہونا پڑا جو نہ ان کے مزاج کے موافق تھے اور

نہ انصاف اور دیانت داری پر مبنی تھے۔ ان کے چھوٹے فرزند اور معروف شاعر شان الرحمٰن کے مطابق ان کے والد کی زندگی کے سب سے اذیت ناک ایام اکادمی میں رہتے ہوئے گزرے۔ وہ صاف دل، صاف گو اور معصوم انسان تھے۔ انھوں نے بڑے بڑے سیاست دانوں کو قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ لیکن ادب میں رہتے ہوئے وہ ادبی سیاست کو نہیں سمجھ سکے اور نہ ان سفید پوش ادیبوں کو پرکھ سکے جن کا تعلق ادب سے کم لیکن ادبی جوڑ توڑ سے بہت زیادہ تھا۔ یہی سبب تھا کہ انھیں اکثر مایوسی اور محرومی کا شکار ہونا پڑتا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ آخری دم تک متحرک رہے اور اسی حالت میں وہ کوچ بھی کر گئے۔ ان کی اچانک موت پر اپنے فوری تاثر کا اظہار کرتے ہوئے امرت رائے نے کہا کہ:

"جو آدمی ۲۶ رنومبر ۱۹۷۹ء کو سویرے اپنی دو ٹانگوں پر چلتا ہوا میرے یہاں آیا تھا وہ ۲۹ رتاریخ کو ایک لکڑی کے تابوت میں بند ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔"

سہیل عظیم آبادی واقعی اپنے گھر چلے آئے اور مٹی میں مل کر خاک ہو گئے۔ لیکن کیا کوئی سیاست اور گروپ بازی ان کے کارنامے کو دبا سکی؟ کیا ان کی انسان دوستی اور محبت کے اٹوٹ رشتوں کو ماند کر سکی؟ سہیل آج بھی اپنے مقام اور مرتبے کے ساتھ معاشرے کے ہر طبقے میں یاد کیے جانے والے شخص کی طرح موجود ہیں اور آئندہ بھی موجود رہیں گے۔

☆☆☆

مطربِ انقلاب: قاضی نذر الاسلام

● ساجد ذکی فہمی

دنیائے شعروادب میں ایسے شعرا کی تعداد نہ کے برابر ہے جنھوں نے روشِ عام سے ہٹ کر اپنی ایک الگ راہ بنانے کی کوشش کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کسی شاعر یا ادیب نے بندھے ٹکے زاویے سے اجتناب برتا، مخالفت کا ایک طوفان اس کے ردعمل کے طور پر اٹھ کھڑا ہوگیا، بھلے اس (شاعر) کے تجربات ادب کے لیے سودمند ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن یہ نکتہ بھی تاریخ کے اوراق سے پوشیدہ نہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ جوں جوں لوگوں کو نئے تجربات کی اہمیت کا اندازہ ہوا، اس کی تقلید کو باعثِ افتخار سمجھا گیا۔

قاضی نذر الاسلام کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے شاعری میں نئی روح، نیا انداز اور نئے تجربات کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ابتدا میں ان کی زبان اور شاعری کو زیرِ بحث بنا کر کافی پروپیگنڈے کیے گئے۔ قدامت پسندوں نے انھیں نئے نئے القاب سے بھی نوازا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس زمانے تک انقلابی یا باغیانہ شاعری کا رواج نہ تھا۔ لوگ داخلی زندگی کے مشاہدات اور تجربات کے بیان کو ہی شاعری سمجھتے تھے۔ یعنی وہی ہجر و وصال کے نغمے، گل و بلبل کی داستان، رندی و سرمستی کی باتیں

وغیرہ۔ دوسری یہ کہ ٹیگور بھی اسی انداز شاعری کی وجہ سے شعر و ادب کے اس مقام پر فائز ہو چکے تھے جہاں پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہ تھا۔ لہٰذا عوام بالخصوص بنگالیوں کے نزدیک ٹیگور کا انداز اور ان کی شاعری اسناد کا درجہ رکھتی تھی۔ یعنی اسی انداز کی شاعری کو قبولیت کا شرف حاصل تھا جو روایت کے مطابق ہو۔

قاضی نذر الاسلام نے اس روایت سے بغاوت کرتے ہوئے بنگلہ شاعری کو جہاں پھولوں کی سیج سے نکال کر خار زار میں داخل کیا وہیں اسے ایک نئے لب و لہجے اور نئے طرز بیان سے روشناس بھی کرایا۔ چونکہ نذرل نے فارسی و عربی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی جس کا خاطر خواہ اثر ان کی شاعری پر ہونا لازمی تھا۔ بلکہ ان کی شاعری میں بعض جگہ یہ رنگ اتنا گہرا نظر آتا ہے کہ پورا مصرع فارسی زدہ معلوم ہوتا ہے۔ عربی اور فارسی کے تعلق سے ان کی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے عمر خیام اور رباعیات حافظ کا براہ راست ترجمہ بنگلہ میں پیش کیا۔ فارسی اور عربی سے حد درجہ انسیت کی بنا پر ہی وہ بنگالیوں کے نزدیک معتوب قرار پائے تھے۔ بنگالیوں کے ایک گروہ نے تو ان الفاظ کے استعمال کی بنا پر انھیں فرقہ پرست کہنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان سب باتوں پر کان دھرنے کے بجائے نذرل اپنی دُھن میں مست رہے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ مکمل آزادی اور عوام کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنے کے لیے جن نغموں کی ضرورت ہے وہ ہجر و وصال یا گل و بلبل کے نغمے نہیں ہو سکتے۔ بہر حال انھوں نے اپنے جنگی تجربات و مشاہدات کو بروئے کار لاتے ہوئے ایسی شاعری شروع کی جس کو سن کر اقبالؔ اور ٹیگور بھی ششدر رہ گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب اقبالؔ کو نذر الاسلام کی نظم "نوجوان سے خطاب" کے کچھ بند سنائے گئے تو تڑپ اٹھے اور کہا: "اس کے زور بیان اور جوشیلے خیالات نے خدا معلوم بنگالی نوجوانوں میں کیا روح پھونکی ہوگی۔" اقبالؔ کا یہ خیال صد فیصدی درست تھا کیوں کہ نذرل کی شاعری نے بنگال کے تقریباً ہر طبقے کے اندر آزادی اور حریت کے تعلق سے اس قدر جوش بھر دیا تھا کہ ہر چھوٹا بڑا انگریزی حکومت کے خلاف نبرد آزما ہونے کو تیار تھا۔ ادھر ٹیگور، نذرل کی نظم "بھانگیر گان" (توڑ پھوڑ کا گیت) سن کر اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنا مشہور ڈراما "بسنت" کا انتساب ان کے نام کر دیا۔ حالانکہ اس وقت تک ٹیگور نوبل پرائز سے نوازے جا چکے تھے۔ اس لحاظ سے ٹیگور کا نذرل کو اس انداز سے خراج عقیدت پیش کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔

یوں تو نذرل کو بچپن سے ہی شعر و شاعری اور موسیقی سے دلچسپی رہی لیکن جنگ عظیم کی شمولیت نے ان کے اندر بغاوت کا جو تخم بویا تھا وہ ہندوستان واپسی تک ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ چونکہ ہندوستان میں بھی آزادی کے تعلق سے ہر طرف آگ لگی تھی، خلافت اور عدم تعاون تحریکوں کی گونج چاروں طرف سنائی دے رہی تھیں۔ غرض کہ نذر الاسلام جنگ کے میدان سے جو چنگاری اپنے سینے میں دبا کر لائے تھے اس نے یہاں شعلے کی شکل اختیار کر لی۔ ظلم، جبر، نا انصافی اور غلامی وغیرہ کے خلاف بغاوت کا علم لے کر وہ بھی اس کارزار میں شامل ہو گئے۔ شاعر تو وہ تھے ہی لہٰذا اپنے جذبات و احساسات کے اظہار

کے ساتھ عوام کے اندر جوش وجذبہ پیدا کرنے کے لیے انھوں نے اپنی شاعری کو ہی ذریعہ اظہار بنایا۔ اور ایسے جوشیلے اور ولولہ انگیز نظمیں تخلیق کیں جس کی وجہ سے وہ ''وِدروہی کوی'' کے لقب سے نوازے گئے۔ ان کی اسی خصوصیت کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر سرکار نے اپنی کتاب میں لکھا کہ:

''گذشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے آج اس کا آغاز ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا امنڈ پڑا ہے۔ مسلمانوں نے اب تک اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی نہیں کی جتنی ان پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کا سہرا شاید ان ہی کے سر بندھنے والا ہے۔'' [1]

''وِدروہی کوی'' کا لقب نذرل کو ان کی نظم ''وِدروہی'' [باغی] کی وجہ سے ملا تھا۔ اس نظم میں انھوں نے جس طرح ہندوستانیوں کو خواب غفلت سے بیدار کر کے اپنے حقوق کی خاطر لڑنے پر آمادہ کیا اس کی مثال ان سے پہلے نہیں ملتی۔ اس نظم میں جوش، ولولہ، حب الوطنی، ارادے کا استحکام، ہمدردی، غم خواری وغیرہ اپنے عروج پر نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جوانمرد کہہ دے میں ہوں سر بلند تناور ، تنومند ، اتنا بلند
کہ قد کش ہمالہ مرے سامنے ''سوالک'' کے مانند ہے سرنگوں
بہادر یہ کہہ دے فلک چیرتا مہ و مہر و انجم کو بھی روندتا
سکونِ ارم میں خلل ڈالتا جہنم کے طبقے الٹتا ہوا
تباہی ہوں، دہشت ہوں، طوفان ہوں سراپا ہلاکت کا سامان ہوں

پیش کیے گئے اشعار میں ایک ایک لفظ بغاوت کی بھٹی میں سلگا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن نذرل یہ کہنے کے بعد بھی خاموش نہیں ہوتے۔ انھوں نے جنگ کے دوران ہونے والے ظلم وزیادتی اور اپنے مفاد کی خاطر بنائے جانے والے قوانین کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ آئین و ضوابط کی پابندیاں فقط نچلے طبقوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں اونچے عہدے والے ہمیشہ اس سے مبرّا ہوتے ہیں۔ اگر کبھی یہ قوانین اعلیٰ طبقوں کی ترقی میں مانع ثابت ہوتی ہیں تو اسے تبدیل کر دیا جاتا ہے یا پھر اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ نذرل نے سماج کی اسی برائی اور ناانصافی کے خلاف با آواز بلند کہا تھا:

کچل دینا ہر ایسے قانون کو بہائے جو انصاف کے خون کو
عظیم ایک شعلہ ہوں اس کے لیے مٹانے کا اس کا تہیہ کیے
اڑادوں ہر آئین کی میں دھجیاں بھلا کیا ضوابط کی پابندیاں
مری راہ میں جو بھی حائل ہوا کیا بند بند میں نے اس کا جدا

نذرل سے پہلے بنگلہ شاعری کا دامن عشق وعاشقی اور حسن ومناظر کے موضوعات تک محدود تھا۔

خال خال کچھ اشعار ایسے دیکھنے کو مل جاتے تھے جس میں بغاوت کی بو باس کسی حد موجود ہوتی تھی ورنہ عام رجحان روایت پرستی اور اندھی تقلید کا تھا۔ ادب کا معاملہ ہو یا سماج کا جمود پوری آب و تاب کے ساتھ ان پر طاری تھا۔ یعنی سماجی اعتبار سے بھی عوام اس قدر بے حس ہو گئے تھے کہ لاکھ پریشانیوں کے باوجود بھی اپنے اوپر کیے جانے والے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز اٹھانا ان کے لیے محال تھا۔ یہ تمام چیزیں نذرل کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ سماج میں رہنے والے ہر فرد کو برابری کا درجہ حاصل ہو، اعلیٰ و ادنیٰ کی تفریق مٹا دی جائے، گورے کو کالے پر اور نہ امیر کو غریب پر فوقیت حاصل ہو۔ اپنے اسی نظریے کو منتہا تک پہنچانے کے لیے انھوں نے اشتراکیت کا دامن تھاما اور پوری قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

سڑا اور بوسیدہ ہے یہ سماج — اسی وجہ سے اس کا دشمن ہوں میں
عظیم ایک شعلہ ہوں اس کے لیے — مٹانے کا اس کا تہیہ کیے

وہ تن تنہا اس کارزار میں داخل ہوئے۔ انگریزوں کے خلاف لب کشائی کرنا جہاں فرد جرم قرار پاتا تھا وہاں انھوں نے بہ بانگ دہل پوری حکومت کو للکارا اور عوام کے جذبے کو ابھارتے ہوئے کہا:

بلا سے جو تنہا و بے یار ہوں
اکیلا میں اک فوج قہار ہوں

اکیلے شخص کا کسی مہم کو سر کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے، لیکن اس اکیلے نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کے دلوں میں حب وطن اور آزادی کے جذبے کو اس درجہ برانگیختہ کیا کہ ایوان حکومت لرزہ براندام ہو اٹھی۔ جب وہ عوام کو انقلاب کی دعوت دیتے ہیں تو ان کا انداز اس قدر جوشیلا اور ہنگامہ خیز ہوتا ہے کہ قاری نہ چاہتے ہوئے بھی بغاوت پر آمادہ ہو جائے:

اٹھو اٹھو، بڑھو بڑھو، حیات نو کے رہبرو
جمود گرد و پیش کو بہ یک نگاہ توڑ دو
عساکرِ شباب نو، غرور مرگ روند کر
گلے لگاؤ بڑھ کے تم حیات لازوال کو
بڑھے چلو، بڑھے چلو!
بڑھے چلو، بڑھے چلو!
حیات نو کے رہ برو!

ان اشعار کو پڑھ کر نذرل کی حب الوطنی اور باغیانہ شخصیت کا اندازہ بخوبی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ بغاوت کا عنصر ان کے خمیر میں شامل تھا۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ ہمیشہ عتاب کا نشانہ بنتے رہے۔ کبھی حکومت کے ہاتھوں پریشانیاں اٹھائیں تو کبھی ہندوؤں نے فرقہ پرستی کے الزام عائد کیے، کبھی ملاؤں کی

طرف سے فتوے صادر ہوئے تو کبھی عوام نے انھیں عورت پرست اور دشمنِ نسواں کہہ کر مخاطب کیا۔ لیکن وہ ان سب چیزوں سے بے نیاز اپنے نصب العین کی طرف گامزن رہے۔

نذرل کی شاعری میں جوش کا مادہ تو ابتدا سے ہی موجود تھا لیکن ۱۹۲۵ء کے بعد ہوش کا عنصر بھی اس میں شامل ہوگیا۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ نذرل کو وہ فلسفۂ زندگی اب جا کر نصیب ہوا جس کی تلاش میں وہ برسوں سرگرداں رہے۔ اندھا دیوتا، حاکم اور محکوم، نعرۂ انقلاب اور جوشِ انقلاب وغیرہ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ نعرۂ انقلاب کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

...قرض میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، اسے فوراً بے باق کرنا ہے
ہتھوڑی اور کدال سے، جو آسمان بوس پہاڑوں کو
کاٹ کر رکھ دیتا ہے
...تمھاری خدمت کے لیے جس نے قلی اور مزدور کا پیشہ اختیار کیا ہے
...وہی، صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے
میں اسی کے گیت گاتا ہوں
...یہ توقع نہ رکھو کہ یہ خاک نشیں صرف اسی وجہ سے
تمھاری توقیر کریں گے کہ تم بالانشیں ہو
جو لوگ فرطِ محبت سے زمین کو ہی اپنا اوڑھنا، بچھونا بناتے ہیں
اب یہ زمین اپنے کو انھیں کے سپرد کر دے گی
...اگر ایک کو تکلیف ہوگی تو سب کے دل اس کی کھٹک محسوس کریں گے
ایک کی توہین بنی نوعِ انسان کی توہین ہے

یہاں نذرالاسلام کی فکر اور ان کا فن اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس نظم میں انھوں نے اتنے گہرے اور باریک نکات پیش کیے ہیں جس کی مثال خود ان کی شاعری میں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی شاعری میں وہی نظریات پائے جاتے ہیں جس کی زندگی خود طالب ہے یعنی تغیر، تبدل، تجدد اور انقلاب۔ یہ سارے عناصر ان کے یہاں اس خوبصورتی اور منظم طریقے سے بیان کیے گئے ہیں کہ یقین ہی نہیں ہوتا کہ اس طرح کے خیالات میں اتنی ادبیت باقی رکھی جاسکتی ہے؟ کیوں کہ اس انداز کی شاعری کرنے والے اکثر شعرا کا کلام فقط نعرہ بازی یا پروپیگنڈہ بن کر رہ جاتا ہے اور اس کی گرمی لفظوں تک ہی محدود رہتی ہے۔ اس کی واضح مثالیں ترقی پسند شعرا کے یہاں دیکھی جاسکتی ہیں:

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی
ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے

"اندر آنا منع ہے" لکھ کر
لٹکانے سے حاصل کیا

یہاں بات تو انقلاب کے تعلق سے کی گئی ہے لیکن انقلاب کی روح سے یہ شعر یکسر خالی ہے۔ اسے نعرہ بازی تو کہہ سکتے ہیں انقلابی شاعری نہیں۔ یہ کمی ہمیں نذرالاسلام کے یہاں نہ کے برابر دکھائی دیتی ہیں۔ جذبات کی رو میں بہنے کے باوجود بھی ان کے اشعار میں ادبیت پورے آب وتاب کے ساتھ برقرار رہتی ہے۔ نذرل کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے اختر حسین رائے پوری رقم طراز ہیں:

> "پیغام کی نوعیت، زبان وبیان کی جدت اور طرزِ کلام کی قوت یہ وہ خوبیاں تھیں جنھوں نے بہت کم عمری میں نذرالاسلام کو بنگال کا سب سے مقبول شاعر بنادیا۔" [۳]

واقعی انھوں نے بہت کم عمری میں ہی بلندی کی وہ معراج حاصل کرلی تھی جہاں پہنچنے کے لیے ایک مدت درپیش ہوتی ہے۔ لیکن نذرل کے ساتھ ایک المیہ یہ رہا کہ جتنی جلدی انھوں نے شہرت حاصل کی تھی اتنی ہی تیزی سے اپنا ذہنی توازن کھوکر شاعری سے برطرف ہوگئے۔ ان کی زندگی کے آخری ایام اس قدر المناک اور دردانگیز تھے کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

نذرالاسلام کی پوری زندگی کرب و اضطراب کے عالم میں گزری۔ ابتدا میں مالی دشواریوں نے ستایا تو بعد کو حکومت نے اور ان سب سے نمٹنے کے بعد ان کے اندر جو کچھ رمق باقی رہ گئی اسے ملاؤں اور پنڈتوں نے ماند کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس کے باوجود ان کی شاعری میں نہ پژمردگی کا احساس ہوتا ہے نہ رنج و اضمحلال کا۔ جذبے کی صداقت اور منزل تک پہنچنے کے جنون نے انھیں دنیاوی مصائب و آلام سے مستغنی کردیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر طرح کے مصائب برداشت کرنے کے باوجود بھی حرفِ شکایت ان کی زبان سے ادا نہ ہوسکا۔

باغیانہ شاعری کے تعلق سے نذرل کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ان کا کسان کے گھر میں پیدا ہونا بھی تھا۔ جہاں ابتدا سے ہی ظلم وزیادتی اور مفلسی و بے چارگی کا دور دورہ تھا۔ وہاں کھانے کے لیے روٹی تھی نہ پڑھائی کے لیے فیس۔ غرض کہ ہر معاملے میں محتاجی کا احساس شدت سے ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں موسیقی سے دلچسپی اور جنگ میں شرکت نے انھیں اس روش پر ڈال دیا جو بعد کو ان کی شناخت بن گئی۔ ماہنامہ 'ادب' کراچی کے خاص نمبر میں نذرل کے تعلق سے یہ بات لکھی گئی کہ:

> "...غربت اور افلاس کے ہاتھوں اس کی پرورش ہوئی، میدانِ جنگ کی تباہی و بربادی نے اس کے خیالات کو جلا دی، خلافت اور عدمِ تعاون کی تحریکوں نے اس کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکایا...اس نے نہ صرف قومی تحریکوں کا ساتھ دیا اور حکومتِ وقت کے خلاف باغیانہ نظمیں لکھیں بلکہ اس نے پورے بنگالی ادب کے ڈھانچے کو یکسر بدل دیا۔ اس نے بنگالی

زبان کو رزمیہ شاعری دی اور یہ نذرالاسلام کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور آج بنگالی زبان میں اس کی شاعری کا چراغ ایک ایسی جوت جگا رہا ہے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔[۳]

اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ نذرالاسلام نے بنگالی شاعری کی روح کو ایسی توانائی اور تندی عطا کی جس کی مثال پورے بنگلہ ادب کی تاریخ میں بہ مشکل ملے گی۔ بنگلہ شاعری کو بزم سے رزم تک پہنچانے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ یہی نہیں بلکہ ہیئت کے اعتبار سے بھی بنگلہ شاعری میں کافی تبدیلیاں کیں۔ شاعری کے تعلق سے نذرل کے اس مثبت قدم کا اعتراف کرتے ہوئے جگر مرادآبادی رقم طراز ہیں:

> "...قوم کے دل و دماغ کو گرما دینے میں ان کی سعی مشکور ثابت ہوئی۔ انھوں نے اپنی گونجتی گرجتی اور زندگی شناس شاعری کا نعرہ اس وقت بلند کیا جب بنگال کی عشق پرور اور حسن خیز سرزمین ٹیگور کی خواب آور لوریاں سن رہی تھی۔ وہ انقلاب کے نقیب اور ترجمان ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا بیشتر کلام ان کے مسلسل ذہنی پیکار اور متواتر جد وجہد کا آئینہ ہے۔[۴]

مختصر یہ کہ قاضی نذرالاسلام ایک ایسے شاعر کی شکل میں ابھر کر ہمارے سامنے آئے جس نے اپنے اشعار کے ذریعہ انسانی زندگی اور اس میں پیش آنے والے دردناک پہلوؤں کی ترجمانی کی، ظلم و جبر اور ناانصافی کے خلاف ایک ایسی شورش برپا کی جس کی تپش اور گرمی بنگلہ ادب میں آج بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ ایسا نہیں کہ انھوں نے فقط انقلابی شاعری کی تھی، ان کے مجموعۂ کلام میں ایسی نظمیں بھی موجود ہیں جسے کلی طور پر رومانیت کے زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا حقیقی رنگ باغیانہ کلام میں ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اپنے اسی رنگ کی وجہ سے وہ بنگال میں ٹیگور کے بعد دوسرے بڑے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر بات فقط انقلاب کی ہو تو بنگال کا کوئی شاعر نذرل کا ہمسر نہیں۔

حواشی:

۱۔ شاعرِ آتش نوا، مرتب: اجمل اجملی، ادارہ انیس اردو، الٰہ آباد، ص۔ ۸۲۔۸۱، سنہ۔ ۱۹۶۰

۲۔ شاعرِ آتش نوا، ص۔ ۸۷

۳۔ صدائے زنداں، انتخاب و ترتیب: اسدالزماں، مغربی بنگال اردو اکادمی، ص۔ ۵۵، سنہ۔ ۲۰۰۱

۴۔ صدائے زنداں، ص۔ ۲۱۵۔۲۱۴

☆☆☆

شہرِ انتخاب

(۱)

'نعمت خانہ' : تجزیاتی مطالعہ

● پروفیسر صغیر افراہیم

مخالفتوں کے باوجود تخلیق نگار کی حیثیت سے خالد جاوید نے ادب میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ شہرت حاصل کرنے والے خالد جاوید آخر کیوں فکشن رائٹر ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ اُن کا یہ کہنا مصنف کا انکسار اور سنجیدہ اقرار نامہ ہے یا مخالفانہ رویوں سے بددل ہونے پر مایوسی کا اظہار:

> ''یہ میرا خود اپنے بارے میں بیان ہے کہ میں خود کو کوئی ناول نگار وغیرہ نہیں سمجھتا۔ حالانکہ میری منافقت کو دیکھئے کہ میں اپنی ناکام تحریر کو کبھی ''ناول'' کا نام دیتا ہوں تو کبھی کہانی کا۔''
>
> [پیش لفظ]

ناکام تحریر لکھنا اور کامیاب ناول نگار ہونا دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔ اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا کہ خالد جاوید ایک کامیاب اور شہرت یافتہ فکشن نگار ہیں۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بُرے موسم میں'' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا، جس نے اپنے مخصوص دکشن اور فلسفیانہ اسلوب سے ادبی دنیا کو نہ صرف چونکایا بلکہ ادب میں افسانہ نگار کی حیثیت سے خالد جاوید کی شناخت قائم کی۔ انھوں نے کچھ ترجمے بھی کیے اور 'مارکیز' نیز 'میلان کنڈیرا' پر کتابیں بھی لکھیں جنھیں خاصی شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ''تفریح کی ایک دوپہر''، ''آخری دعوت''، ''نیند کے خلاف ایک بیانیہ'' ان کے افسانوی مجموعے شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ گذشتہ برسوں میں ''موت کی کتاب (۲۰۱۱ء) لکھ کر انھوں نے ناول نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان بنائی۔ اس ناول کے سلسلے میں اختلافی اور توصیفی دونوں ہی طرح کی آرا کا اظہار کیا گیا ہے۔ کچھ

حضرات نے اسے ناول ماننے سے انکار کیا بلکہ ''موت کی کتاب'' کو ایک نیم جنونی اور ہذیانی کیفیت کا اظہار کہا یا پھر یہ کہ ''موت کی کتاب'' دو سو سال بعد آنے والے قاری کے لیے ہے لہٰذا اس پر ناقد نہیں بلکہ ماہر نجوم ہی تنقید کر سکتا ہے۔ دراصل مذکورہ ناول میں کشادہ کینوس، نظریاتی تصادم، اقدار کی کشمکش، کردار میں فعالیت اور تحرک کی کمی، کہانی کی سمت و رفتار میں سستی کا ہونا بہت کھٹکتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے خالد جاوید نے اس ناول کے حوالے سے انسان کے باطن کو کھنگالنے کی سعی کی ہے اور زندگی کی فنا پذیری کے احساس کو شدت کے ساتھ پیش کرنے میں جارحانہ رویہ اختیار کیا ہے۔

اسی طرح ''نعمت خانہ'' ناول میں زندگی کی نمو پذیری کے اردگرد موت کے لرزاں سائے، غذا اور بنیادی اجناس کے حوالے سے طرز اظہار اختیار کیا گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ناول میں باورچی خانہ اپنی تمام تر کثافتوں کے ساتھ بار بار نمودار ہوتا ہے۔ جس طرح ''موت کی کتاب'' میں جگہ جگہ معنی خیز جملوں کا استعمال ملتا ہے۔ اسی طرح مصنف نے ناول ''نعمت خانہ'' میں اسرار انگیز، پُرتجسس اور معنی خیز اسلوب اختیار کیا ہے۔ بہر حال مخالفانہ خیالات کے پسِ پشت ''نعمت خانہ'' کے ناول ہونے کا پوشیدہ اقرار تو ناقدین نے کیا ہے۔

جب صفحۂ قرطاس پر کوئی فکشن یا غیر فکشن کی صورت میں تخلیق آتی ہے تو وہ قارئین کی ملکیت ہو جاتی ہے۔ نقادوں کے فیصلے کے منتظر ادیب کا یہ بیان کہ:

> ''میں نقاد کا بہت احترام کرتا ہوں، کسی بھی ادب کو زندہ رکھنے کے لیے صرف اور صرف نقاد کی ضرورت ہوتی ہے۔''

حالانکہ کسی بھی ادب کو زندہ رکھنے کے لیے اُس کی باطنی قوت کی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ فن کی کسوٹی کے پیمانے بعد میں بنتے ہیں، تخلیقات پہلے وجود میں آتی ہیں۔ مصنف نے اس کی یہ دلیل دی ہے کہ تنقید لکھنا فطری کام نہیں ہے کہ اس میں زیادہ تر انفرادی شعور کے برخلاف چلنا پڑتا ہے۔ شعور کے برخلاف چلنے میں بڑی علمیت، عقلیت اور دانشوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ بہر حال نقاد کا عمل تخلیق کے بعد شروع ہوتا ہے اور تخلیق غیر شعوری عمل نہیں، شعوری کوشش کا نام ہے جس میں غیر شعوری عمل اور تحت الشعور کی کارفرمائیاں اپنے آپ شامل ہو جاتی ہیں۔

جب مصنف ''نعمت خانہ'' کو ناول کہتا ہے تو تجزیاتی مطالعہ انھیں بنیادوں پر کیا جائے گا جو ناول ہونے کے لیے صنفی تقاضوں کی بنیاد ہے۔ مذکورہ ناول بھی ''موت کی کتاب'' کی طرح ادب میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ یہ اردو کے دیگر ناولوں سے اس لیے مختلف ہے کہ ناول کی روایت سے خالد جاوید نے انحراف کیا ہے اور ناول نگاری کے پُرانے طریقۂ کار سے ہٹ کر نئے انداز میں اس ناول کو تحریر کیا ہے۔ دوسرے اس کا پیچ دار اسلوب بار بار پڑھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اگر ناول پڑھتے وقت

ذہن ذرا بھی اِدھر سے اُدھر بھٹک جائے تو ناول کو آگے پڑھنا اور دلچسپی قائم رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ شمس الرحمن فاروقی رقم طراز ہیں:

> ''خالد جاوید کے بارے میں کچھ لکھنا اس لیے مشکل ہے کہ اگر ہم ان کے افسانے کے معنی بیان کرنے کے بارے میں بات کریں تو ان کی نثر دامن گیر ہوتی ہے کہ پہلے ہم سے معاملہ کرو۔''

اس قسم کے ناول کے ساتھ ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ رسمیات کے پاسدار قارئین اور روایات کے حامی ناقدین عموماً بُت شکن تخلیق کاروں کے فنی تشخص کا خورد بینی سے جائزہ لینے سے اس لیے گریز کرتے ہیں کہ غیر معمولی شہ پاروں کی فنی بلندی ناپنے کے لیے نئے پیمانے ایجاد کرنے کی درد سری کون مول لے۔ نقاد اگر سنجیدگی اور ایمانداری سے جدت طراز تخلیق کاروں پر توجہ دیں تو نہ صرف فنکار کے تخلیقی تجربات، زبان کو برتنے کا طریقۂ کار، حیات و کائنات کے تعلق سے رویہ اور اس کے تخلیقی محرکات کی جانکاری ملے گی، بلکہ خود ناقدین کو ایک نئی روشنی، تازگی کا احساس اور مہمات سر کرنے کا روحانی انبساط حاصل ہوگا۔ تخلیقات کی گرہ کشائی کی الجھن سے بچنے کے لیے اس میں پوشیدہ جہانِ معنی، جدت وندرت، اسلوبی سطح پر اس کے امتیازات، موضوعی سطح پر اختصاص سے فنکار کا گریز اپنی جگہ، لیکن ایسا کرنے سے بعض بہت اچھی تحریریں اُس تحسین سے محروم رہ جاتی ہیں جو اُن کا حق ہے۔

یہاں ذکر قارئین یا ناقدین ہی کا نہیں، ہمارے تخلیق کاروں کا حال بھی اخلاقی اعتبار سے عجیب وغریب ہے:

> ''میں نے یہ ناول پڑھا ہی نہیں، بلکہ خالد جاوید کی صائب رائے یا پھر نیک مشورے پر عمل کرتے ہوئے اسے نالے میں پھینک دیا۔''

مذکورہ رائے ایک مشہور افسانہ نگار کی ہے۔ ''میں نے یہ ناول پڑھا ہی نہیں۔'' چلو اچھا کیا وقت بچ گیا۔ ''اسے نالے میں پھینک دیا۔'' بہت خوب اردو کی کتابوں کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔ جواز یہ پیش کیا کہ ''بلکہ خالد جاوید کی صائب رائے یا پھر نیک مشورے پر عمل کرتے ہوئے'' ایسا کیا گیا ہے------''۔

تنقیص کے طور پر پیش کیے گئے مختلف اقتباسات سے گریز کرتے ہوئے محض ''نعمت خانہ'' سے صفحہ نمبر ۱۵۰ کے اقتباس کو پیش کر رہا ہوں جسے ''نامعقول خرافات سے پُر'' کہہ کر اعتراض کیا گیا ہے:

> ''کھیر کی ہانڈی اپنی جگہ ویسی کی ویسی ہی رکھی تھی۔ مگر آفتاب بھائی کے منہ، حلق اور آنتوں تک میں پھنسی ہوئی سفید فیرنی باہر آ کر کھرنجے کے فرش پر پھیل گئی۔
>
> وہ پاگل اور مخبوط الحواس چوہا اُسے دیکھ کر مایوس، واپس آٹے کے کنستر کے پیچھے چھپ گیا۔ اُس کی یادداشت کام نہیں کر رہی تھی، وہ فیرنی کو پہچان نہ سکا۔

مگر میں نے صاف صاف اور واضح طور پر دیکھا، اس میں مجھے رتی بھر بھی شبہ نہیں ہے۔ ایک کاکروچ فیرنی کی ہانڈی کے پاس بیٹھا مجھے گھور رہا تھا۔ پھر شاید وہ ہنسا بھی تھا۔"

مذکورہ اقتباس میں باورچی خانہ کا ایک بھیانک منظر پیش کیا گیا ہے۔ جس میں راوی کے ہاتھوں لڑکپن ہی میں آفتاب بھائی کا قتل ہوتا ہے۔

"اپنی سانس روک کر، تمام طاقت کے ساتھ پتھر کی سل کو تھوڑا اور اونچا اُٹھاتے ہوئے، میں نے اُسے آفتاب بھائی کے سر پر دے مارا......." [ص ۱۵۰]

آفتاب بھائی نے انجم باجی کی عصمت باورچی خانہ میں بلا کر اس وقت لوٹی تھی جب وہ مایوس بیٹھی تھیں۔ اس فحش اور خوفناک منظر کو راوی حفیظ الدین بابر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ والدین بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ انجم باجی نے یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ اسے بہت پیار کرتیں اور اس کا پورا پورا دھیان رکھتی تھیں۔ اس حادثہ کو بیان کرنے میں مصنف کے اظہار نفرت کے پسِ پشت یہی پسِ منظر ہے۔ ساتھ ہی دل کے کسی کونے میں ایک رقابت کا جذبہ بھی کام کر رہا ہے۔ انجم باجی عمر میں حفیظ الدین بابر سے آٹھ نو سال بڑی ہے اور قبول صورت بھی ہے۔ منظر کی جزئیات کا تعلق راوی کی ذہنی کیفیت کے بیان کی اُس کاوش سے ہے۔ جس کو وہ خود سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس سے ایک ایسا عمل سرزد ہو گیا ہے۔ جس کے عواقب سے وہ آگاہ نہیں ہے۔ چوہے اور کاکروچ کو قتل کا گواہ بنا کر کردار کے احساس کی تصویر کشی کو نامعقول خرافات کہنا بے انصافی ہے۔

جو طرزِ بیان اختیار کیا گیا ہے اُس کا مقصد اُس Disgust کو واضح کرنا ہے جو راوی کے حواس پر مسلط ہے۔ زبان کا استعمال صورتِ حال اور کردار کے تقاضوں کے تحت ہوتا ہے نہ کہ اخلاقی اور جمالیاتی اصولوں سے۔ حفیظ الدین کی شادی مادی مصلحتوں کے تحت ہونے والی Marriage of convenience تھی۔ میاں بیوی کے مزاج میں کوئی مطابقت نہیں تھی۔ صفحہ نمبر ۳۱۷ پر راوی کی اپنی بیوی انجم سے مُباشرت کے بیان کے لب ولہجہ کو بھونڈا قرار دیا جانا غیر مناسب نہیں کیوں کہ نہایت گھٹیا انداز میں مباشرت کے منظر کو بیان کیا ہے۔ اس قسم کی زبان غیر ادبی ہی نہیں ناشائستہ بھی ہے جو ایک معتبر ادیب کو زیب نہیں دیتی۔ لگتا ہے مصنف عورت بیزار ہے جس کی ناول میں کوئی مناسب وجہ بھی نہیں بتائی گئی ہے۔ مذکورہ منظر میں، مباشرت، مشت زنی، عضوِ تناسل، اندام نہانی کا بے جھجک ذکر کیا گیا ہے اور انجم سے بے مزہ مباشرت سے بہتر مشت زنی کو کہا گیا ہے جو صنفِ نازک کی نفسیات پر حیوانی چوٹ ہے۔

صفحہ نمبر ۳۶۲ میں نزلہ، نیند، قبر، ڈاک گاڑی اور خمیری روٹیوں کے آپسی تعلق کو مجذوب کی بڑ کہنے میں مجھے تامل ہے کیوں کہ جہاں مصنف نے نیند کا منظر نامہ پیش کیا ہے ادھر بیماری کے غلبہ کی وجہ سے بھی انسان پر اس طرح کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ خواب ہو یا مجذوبیت انسان کے احساس اور نفسیات سے جڑے ہوئے پہلو ہیں جن کو فکشن کا حصہ عام طور پر فنکاروں نے بنایا ہے۔

صفحہ نمبر ۳۷۱ کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"جرم، سزا کی نقل کرتا ہے اور گناہ ثواب کی۔ میں اس تماشے کو ڈگڈگی بجا بجا کر دکھانے کے لیے قربان گاہ میں لایا جاتا ہوں۔ یہ ساری دنیا اسی طرح کا تماشہ ہے۔ نقل کر کے ہی یہ دنیا بنی ہے۔ انسانوں نے خدا کی نقل کرنا چاہی، وہ بے رحم اور آمر ہو گیا۔ جانوروں نے انسان کی نقل کی، وہ اسی کی طرح کمینے اور بے شرم ہو گئے۔ بچوں نے بڑوں کی نقل کی، اُن کے زیرِ ناف بال جلدی اُگ آئے۔ عورتوں نے مردوں کی اور مردوں نے عورتوں کی نقل کی، دونوں ہجڑے بنتے چلے گئے۔"

مندرج اقتباس کی وکالت مقصود نہیں لیکن فکشن رائٹر کو اتنی آزادی تو ملنی ہی چاہیے کہ اپنے بیان میں دوسرے کرداروں کی مضحکہ خیز نقل اتارنے والوں کو وہ ہجڑوں سے تشبیہ دے سکے۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہجڑا ابھی عورت کی نقل کرنے والا مرد ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ نامرد ہے تو ہجڑا بن کر مرد نہ ہونے کے تلخ احساس کو دبانے کے لیے دونوں کا مذاق اڑاتا ہے۔

صفحہ نمبر ۳۸۲ میں مندرج اقتباس پر اعتراض ہے:

"خواب میں ہجڑوں کے بیان پر کہا جاتا ہے کہ ظالم کو کوئی اور دیکھنے کو نہ ملا، ہجڑے ہی دیکھنے کو ملے۔"

ہجڑے بھی خدا کی مخلوق ہیں، اس سے اتنی بھی نفرت نہیں ہونی چاہیے کہ ان کا خواب بھی نہ دیکھا جائے۔ پھر خواب کا دیکھنا انسان کے بس میں ہے کہاں۔ خواب تو پھر خواب ہیں۔ خواب میں انسان انہونی حرکتیں، غیر انسانی افعال، خلافِ تہذیب وارداتیں انجام دیتا ہے۔ اس کی عجیب و غریب کائنات میں محیر العقول کارنامے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اسے ہی خواب کہتے ہیں جو پابندی سے آزاد اور ناقابلِ بیان ہو۔ اگر مصنف اس کو بیان کرتا ہے تو یہ اس کا کمال ہے بھلے ہی وہ فن کی حد نہ چھو سکے۔ اس پر اعتراض بے معنی ہے کیونکہ یہ ساری بحث اخلاقی نوعیت کی ہے۔ معترضین یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو کی روز بروز زبوں حالی کی وجہ سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ادب کے قارئین کی گھٹتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر تخلیق کاروں کو سہل، آسان اور جلد سمجھنے والا ادب تخلیق کرنا چاہیے۔ عام قارئین کی بات چھوڑیے دانشور طبقے نے بھی "موت کی کتاب" اور "نعمت خانہ" جیسی کتابوں میں بے مقصد سر کھپائی سے بچ کر ان ناولوں کو نظر انداز کر دیا۔ ابھی حال ہی میں کچھ حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ وہ ایسے نعمت خانہ سے متمتع ہونے کے مقابلے میں "فاقہ کشی" کو ترجیح دیں گے۔ ناول میں بیشتر غیر ملکی مشاہیر کے اقوال درج ہیں اس سلسلے میں معترضین کی تین باتیں ہیں۔ اول بلا وجہ ناول کے متعدد صفحات برباد کیے، دوئم مصنف نے ناول کو "بیساکھیوں" سے شروع کیا، اشارہ انھیں اقوال کی جانب ہے۔ سوئم مصنف اس طریقِ کار کو مستحسن سمجھتے ہوئے قاری کو ان اقوال سے مرعوب کرنا چاہتا ہے۔

اس سلسلے میں مختصراً اگر یہ کہوں گا کہ اردو ناول اور افسانہ نگاری کی تاریخ میں ایسی بہت ساری

مثالیں مل جائیں گی، صرف دو کے ذکر پر اکتفا کرتا ہوں۔ پروفیسر نیر مسعود کے زیادہ تر افسانے مغربی مفکرین کے اقوال سے شروع ہوتے ہیں۔ ناول ''امراؤجان ادا'' کے ہر باب کا آغاز اشعار سے ہوتا ہے۔ اردو فکشن میں یہ رواج عام ہے۔ ناول میں دیئے گئے اقوال سے اختلاف کرنا اس وقت تک غیر مناسب ہے جب تک یہ پتہ نہ لگالیا جائے کہ اقوال کا تخلیق سے کیا تعلق ہے اور مصنف نے کیوں ان کو درج کیا ہے۔ زیر مطالعہ ناول پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ ۱۔ ہوا۔ ۲۔ شور۔ ۳۔ نزلہ۔ ۴۔ شور۔ ۵۔ سناٹا۔ اول حصہ کو چھوڑ کر باقی چاروں حصوں کے عنوانات کا ناول کے متن سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ صرف نزلہ کا ذکر شروع باب کے تین چار پیراگراف میں یا عنوان کے تحت بار بار کیا گیا ہے باقی عنوانات کا کہانی سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ ان کی حیثیت حروف مقطعات [؟] کی سی ہے جس کے معنی و مفاہیم سے غالباً تخلیق نگار واقف ہوگا۔ ادب کے قارئین کو ایسے اعتراضات اور نکتہ چینی سے گریز کرنا چاہیے جن سے تخلیق کار کی شخصیت اور اس کے فکر و فن کی معتبریت مجروح ہوتی ہے[؟]۔ ادبی میزان کا تقاضہ یہ ہے کہ خالد جاوید کے فن پاروں کا یکسوئی اور سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے، تب بے باکانہ رائے کا اظہار کیا جائے۔

دراصل خالد جاوید کے انوکھے اسلوب اور چونکانے والے پیرایۂ اظہار نے حساس ادبی حلقے کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ میں اپنی اس رائے پر قائم ہوں کہ خالد جاوید نے رائج رویوں سے بڑی حد تک انحراف کرتے ہوئے اپنی تخلیقات پیش کرنے کے لیے فلسفیانہ طرز اظہار اور نیا اسلوب و آہنگ اختیار کیا ہے جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ناول ''نعمت خانہ'' کا بنیادی موضوع غذا ہے۔ غذا کا براہ راست تعلق باورچی خانہ اور نعمت خانہ سے ہے۔ انسانی زندگی سے غذا کا جو تعلق ہے اس سے کوئی منکر نہیں۔ زندہ رہنے اور زندگی کی توانائی برقرار رکھنے کے لیے غذا کی اہمیت اور افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا لیکن مذکورہ ناول میں تخلیق نگار نے ''غذا'' کے منفی پہلوؤں پر خصوصی توجہ صرف کی ہے۔ دنیا میں تمام جنگوں کی وجہ غذا اور کھانے کی اشیاء کو گردانا ہے اور غذا ہی موت بھی بنتی ہے۔ ہر بیماری اور برائی کی جڑ کھانا ہے۔ کھانا قتل و غارت گری کی وجہ ہے۔ دنیا میں قتل و خون کی وارداتیں رونما ہوتی ہیں اُن کا سبب بھی اجناسِ باورچی خانہ اور اشیاۓ خوردنی ہے۔ غذا ہی فضلہ بناتی ہے، گندگی پھیلاتی ہے۔ اسی کھانے نے دنیا کو غلاظت، گندگی اور تعفن سے بھر دیا ہے، جس کی وجہ سے دنیا میں بیماریاں پھیلتی ہیں اور اموات واقع ہوتی ہیں۔ جنگوں اور حادثات کے پیچھے بھی غذا کو حاصل کرنے کی وجوہ شامل ہیں۔ غرض پورے ناول میں کسی نہ کسی واسطے سے غذا کا ذکر آتا ہے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ ناول کی ساخت اور اس کی بُنت پر اثر نہیں پڑتا۔ بار بار موضوع کا ذکر آنے کے باوجود آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے اور مصنف غذا اور غذا کے ذکر میں کوئی نہ کوئی نیا پہلو ضرور نکال لیتا ہے:

''چندر گپت موریہ کے زمانے سے لے کر مغلیہ دورِ حکومت کے اختتام تک تاریخ اس امر

کی شاہد ہے کہ رسوئی اور باورچی خانے کا رول حکومتوں کو بنانے اور بگاڑنے میں بہت
اہم مگر خفیہ نوعیت کا رہا ہے۔''

مصنف کے نزدیک باورچی خانہ فتنہ گر اور دنیا میں تمام آفتوں کی جڑ ہے۔ یہاں تک کہ زندگی جیسی گھٹیا شے کو پائیدار بنانے کا خطرناک فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہ کھانے جنسی شہوت بڑھاتے ہیں۔ آدم کیا حوا کو بہکاتے ہیں۔

مصنف نے کہانی کو بیان کرنے کے لیے فلیش بیک تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ گذشتہ حالات اور ماضی کی باتوں کو اپنے حافظہ کے حوالے سے ناول کے فارم میں بیان کیا گیا ہے۔ ''حافظہ'' کے لیے مصنف نے ''وفادار کتے'' کا استعارہ دیا ہے اور رویہ بھی وہی اپنایا ہے جو ایک پالتو کتے کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے:

''مگر میرا حافظہ، وہ میرا وفادار کتا دبے پاؤں میرے پیچھے پیچھے چلا آتا ہے۔''

''حافظہ'' کے لیے ''وفادار کتا'' کا استعارہ بالکل جدید تو ہو سکتا ہے لیکن ناول میں جگہ جگہ اس کی تکرار ناگوار لگتی ہے۔ تصویر کے ایک ہی رخ کی پیش کش انتہا پسندی کی دلیل ہے لیکن کیا کیا جائے ناول کا بنیادی موضوع یہی ہے جس سے مصنف صرف نظر بھی نہیں کر سکتا۔ ناول کا مرکزی کردار راوی خود مصنف ہے۔ جس کردار کا یہ بیانیہ ہے وہ مخبوط الحواس Absurd قسم کا کردار محسوس ہوتا ہے۔ جس کی سوچ اور فکر قطعاً انسانوں جیسی نہیں لگتی۔ اس کے حرکات و سکنات سے بھی ایسا لگتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر ماؤف شخصیت کا حامل ہے ایک مقام پر اس کا کلاس فیلو جو اس کو اپنا دوست سمجھتا ہے:

''علاء الدین رو رہا تھا۔ مگر مجھے ایسی باتوں سے اُکتاہٹ ہونے لگی۔ ہمیشہ ہوتی ہے۔
سستی قسم کی جذباتیت میرے حواس و اعصاب کو سن کر کے رکھ دیتی ہے اور میرا دل پتھر کا
ہو جاتا ہے۔''

اپنی نفسیات کے حوالے سے کردار اپنے بارے میں کہتا ہے:

''مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میرے دل میں کسی کے لیے کوئی نرم جذبہ،
محبت، خلوص یا رحم اور ہمدردی کے جذبات بہت کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔''

کردار کے نزدیک مذکورہ انسانی اقدار کی حیثیت ان الفاظ سے زیادہ نہیں ہوتی جو لکھ کر فوراً ہی کاٹ دیے جاتے ہیں۔ کردار کے ہاتھوں بچپن ہی میں، جبکہ اس کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی، باورچی خانہ میں دو قتل سرزد ہو جاتے ہیں صرف رقابت کے جذبہ کے تحت۔ پہلا قتل انجم باجی کے عاشق آفتاب بھائی کا تھا جن کے سر پر وہ سِل اٹھا کر مار دیتا ہے۔ جائے حادثہ پر ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ دوسرا قتل انجم باجی کے شوہر کا جو ایک شرابی اوباش اور ظالم حیوان صفت انسان تھا۔ اور جسے منصوبہ بند طریقے سے باورچی خانہ میں جلا دیا جاتا ہے۔ اس قتل سے اندازہ ہوتا ہے کہ کردار شدید انتقامی ذہنیت کا مالک ہے اور لڑکپن ہی سے

مجرمانہ افعال و اعمال کا مرتکب رہا ہے یا کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہے۔ حیرت یہ ہے کہ مذکورہ اُن دونوں عورتوں کو اس بات کا قطعاً علم بھی نہیں پھر بھی وہ ان سے محبت اور احسان مندی کی امید رکھتا ہے۔ کم عمری میں ایک اور حادثہ قتل ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ باورچی خانہ کے پیچھے اندھیرے میں ایک رات ثروت ممانی اور فیروز خالو کو ناجائز حالت میں دیکھ لیا۔ ان کے اوپر شہد کے چھتہ پر کنکر مارنے سے شہد کی مکھیاں غصہ کی حالت میں دونوں کے برہنہ جسموں سے چمٹ گئیں۔ اس قدر خوفناک منظر کو پیش کرنے میں مصنف نے مناسب زبان کا استعمال کیا ہے۔ حفیظ الدین بابر نہایت فعال اور بے حد متحرک ہے اس کے واسطہ سے خاندان کے دیگر افراد بھی کہانی سے جڑتے چلے گئے ہیں۔ لیکن مصنف نے مرکزی کردار پر اپنی پوری کی پوری تخلیقی صلاحیت صرف کی ہے۔

ناول میں ایک مخصوص ماحول کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے پسِ منظر میں ایک زمین دار گھرانہ ہے جو روبہ زوال اور تقریباً نادار ہو کر بھی شان و شوکت کو برقرار رکھنے کی قابلِ رحم کوشش کرتا ہے۔ اسی حویلی کے کھنڈرات میں راوی کی پرورش عزیز و اقارب کے زیرِ سایہ ہوتی ہے چونکہ بچپن ہی میں اس کے والدین فوت ہو جاتے ہیں دادیہال اور نانیہال کے افراد پر مشتمل ایک بھرا پُرا خاندان ہے۔ پورا ناول راوی کے حافظہ کے وسیلہ سے قاری تک پہنچتا ہے۔ جب راوی کالج میں ایل ایل بی کرنے کے لیے داخلہ لیتا ہے تب اس کا نام حفیظ الدین بابر رکھتا ہے۔

انجم باجی حفیظ الدین کی خالہ زاد بہن ہے۔ آفتاب باجی کا پھوپی زاد بھائی تھا۔ جس کا قتل ہو جاتا ہے:

> ''انجم باجی مجھے گود میں لیے لیے گھوما کرتیں اور باہری دالان کے کنڈے میں لٹکے ہوئے طوطے کے پنجرے کے پاس لے جاتیں اور طوطے سے کہتیں ''لو گڈو میاں آگئے، گڈو میاں آگئے۔''

انجم آپا مرکزی کردار کی دور کی رشتہ دار ہے جو جاسوسی اور رومانی ناول پڑھنے کی شوقین تھی۔ ناولوں کے لین دین کا اس سے واسطہ تھا۔ اسی کا شرابی شوہر آگ لگنے سے ہلاک ہوا ہے۔

ثروت ممانی اور فیروز خالو کے ناجائز رشتے کی بدنامی ہونے کے سبب فیروز خالو کہاں چلے گئے کسی کو پتہ نہیں اور ثروت ممانی ٹھیک ہونے کے بعد پاکستان چلی گئیں ایسا گمان ہے۔

نور جہاں مصنف کی خالہ ہیں جو بعد میں پاگل ہو گئیں۔ ریحانہ مصنف کی پھوپھی ہیں۔ بڑے ماموں یعنی ثروت ممانی کے شوہر اور چھوٹے ماموں، دادی وغیرہ سب ہی خاندان کے افراد ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ ان کا ایک ہی باورچی خانہ ہے۔ مشترکہ خاندان کی حیثیت سے رہتے ہیں۔ ان سب کی اپنی مخصوص شناخت ہونے کے باوجود ایک تہذیبی پسِ منظر بھی ہے۔ ثقافتی اقدار کس طرح تخلیقی حسیت اور ایک

بسیط حقیقی تجربہ کا حصہ بنتی ہیں اور ارضیت کس طرح فلسفیانہ جہت اختیار کرتی ہے یہی اس ناول کی روح ہے۔

مذکورہ ناول میں مصنف کے گہرے مشاہدات اور تجربات کی جھلک ہر جگہ نظر آتی ہے۔ زندگی اور کائنات کی بے رحم سچائیاں اور برہنہ حقائق کو پیش کرنے کے لیے مصنف نے سفاک لب ولہجہ، ترش انداز بیان اور پُر جلال اسلوب بھی استعمال کیا ہے۔ کبھی کبھی پڑھتے وقت احساس ہونے لگتا ہے جیسے بڑے بڑے ناخنوں سے ملائم جسم کی کھال کوئی اتار رہا ہو۔ یہاں اس امر کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے کہ خالد جاوید کے افسانوں کی زبان نہایت شائستہ، خوبصورت، تہہ دار، پُر معنی ہوتی ہے لیکن ناولوں کی زبان نہایت سخت، سفاک اور پُر جلال ہو جاتی ہے، جو حیرت میں ڈالتی ہے کہ مصنف فکشن کی ایک فارم سے دوسری فارم میں کس طرح اپنا بدلتا ہوا لب ولہجہ اختیار کر لیتا ہے۔

مذکورہ ناول ایک تہذیبی ناول بھی ہے جس میں وہاں کے شادی و بیاہ کے رسم و رواج، مہندی، ابٹن، مایوں کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔ مذہبی رسومات، محرم کی تعزیہ داری، شب برأت کے موقع پر شب بیداری کا منظر، عید میلاد النبی کے جلسہ، رمضان شریف کے روح پرور مناظر، عید، بقر عید کی خوشیاں، نیاز، نذر اور فاتحہ وغیرہ کے تفصیلی اظہار کے علاوہ سماج میں پھیلے توہمات کا ذکر جا بہ جا نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ مسلکی ٹکراؤ کی جھلکیاں بھی ناول میں دکھائی پڑتی ہیں۔ خود حفیظ الدین بابر کی بیوی انجم اس کے کلاس فیلو علاء الدین کی بڑی بہن دوسرے مسلک سے تعلق رکھتی ہے جس کی وجہ سے شوہر و بیوی کے درمیان ٹکراؤ کی صورت بنی رہتی ہے۔ ان کے تصادم کی ایک وجہ ان دونوں کی تنگ مزاجی بھی ہے۔ ناول میں روایت پرستی، فرسودہ رسومات، سماجی بندشوں کی بھی تصویر دکھائی گئی ہے۔

مذکورہ ناول میں جزئیات نگاری کمال درجے کی حیثیت رکھتی ہے۔ باورچی خانہ کے برتنوں کی تفصیل میں چمٹا، پھونکنی، توا، سِل بٹہ وغیرہ سب ہی شامل ہیں۔ طرح طرح کی سبزیاں، پھل، میوہ جات، انواع و اقسام کے کھانوں کی تفصیلات، داستانوں کی یاد تازہ کر دیتی ہیں۔

ناول میں ماحول کی تصویر کشی پر بہت زور دیا گیا ہے، منظر کشی، اور موسموں کے حال کے علاوہ طرز رہائش، معاشرے کے بے رحم تضادات، تشکیک اور بے اطمینانی ہر جگہ ابھر کر آتی ہے۔ لیکن ان تمام جزئیات کے درمیان باورچی خانہ پوری طرح جلوہ گر رہتا ہے۔ پرانے طرز کے باورچی خانے کی گندگی جس میں کاکروچ، چھپکلی، سانپ، بھِی، مچھر، مدھو مکھیوں کا ذکر اپنی جگہ تعفن، کیچڑ جو اس سے جڑی ہے اس کا تفصیلی بیان ملتا ہے۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ مصنف نے پرانی طرز کے باورچی خانہ اور جدید طرز کے کچن کے فرق کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

پلاٹ کا تانا بانا بننے کے لیے ناول کے کینوس پر ایک قصبہ اُبھرتا ہے جہاں ایک خاندان کی لٹتی ہوئی زمین داری کا بیان ہے وہیں ناول کا مرکزی کردار حفیظ الدین بابر کا بچپن سے جوانی تک بتدریج نشو و

نما ہوتا ہے، وہ حصولِ تعلیم کے لیے شہر جاتا ہے جہاں سے ایل ایل بی کی ڈگری لے کر پریکٹس شروع کر دیتا ہے اور اپنے دوست علاء الدین کی بہن انجم سے شادی کر لیتا ہے۔ سسرالی شہر ہی کو اپنی رہائش گاہ بنا لیتا ہے۔ اس طرح شہر اور کالج کی تمام تفصیلات بھی ناول میں آجاتی ہیں۔

ناول کی فضا بندی میں باورچی خانہ اس کے متعلق لوازمات، غذائی اجناس، گھریلو ماحول کی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے جس کے بغیر کہانی اپنی ساری انفرادیت کھو دے گی۔ مذکورہ ناول مقدرات، توہمات اور مذہبی رسومات پر بے پناہ اعتماد کے انسانی رُجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے، خصوصی طور سے باورچی خانہ میں کوئی بھی بہتر غذا پکتی ہے تو کردار کی چھٹی حس بیدار ہو کر اس بات کی شاہد ہو جاتی ہے کہ کوئی نہ کوئی غیر معمولی واقعہ ہونے والا ہے۔ حفیظ الدین بابر، جس کو بچپن میں خاندان کے افراد ''گڈو'' کہہ کر پکارتے تھے، کے مذہبی ماحول سے جذباتی رویوں کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کے ذہنی اور سماجی عمل کا تجزیہ اس طرح سے خاصا اہم ہے کہ اس زمانے میں ایک مخصوص علاقے کے تہذیبی، سماجی اور مذہبی معاشرہ سے ہمیں متعارف کراتا ہے۔ اس ناول میں مشرقی تہذیب خصوصی طور سے ایک علاقائی تہذیب کی سماجی صورتِ حال کو اُجاگر کیا گیا ہے اور ایک ایسے انسان کی ذہنی کشمکش بیان کی گئی ہے جو بچپن ہی سے تذبذب، تشکیک اور بے چینی کا شکار ہے، کہیں کہیں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ کسی نفسیاتی بیماری کا شکار ہو۔

مذکورہ ناول کا جو تجزیاتی خاکہ بنا ہے وہ چاہے ایک ہی خاندان کی کہانی کا پس منظر رکھتا ہو، لیکن اس کے مختلف کرداروں کے رابطوں اور رشتوں سے جو وسعت اس میں پیدا ہوئی ہے وہ اس زمانہ کی تہذیبی، معاشرتی نظام کی عکاسی کرتی ہے۔ ناول کو وحدت کے تار میں پرونے والا حفیظ الدین بابر کا یہ وہم بلکہ Phobia ہے کہ گھر میں بعض کھانوں کے پکتے ہی کچھ ناخوشگوار واقعات رونما ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا Obsession ہے جس کا تعلق غذا اور موت کے اُس پُراسرار رشتہ سے ہے جو خالد جاوید کی بعض دوسری تحریروں میں بھی نمایاں ہے۔ مثلاً ''آخری دعوت''۔ Abnormal Consciousness میں دلچسپی شاید اس لیے ہے کہ ہمارا معمولی روزمرہ کا شعور ہم کو اُس حقیقت تک پہنچنے نہیں دیتا جو اشیا اور واقعات کے پیچھے چھپی رہتی ہے، جسے ہم ذہنی بیماری کہتے ہیں۔ وہ بھی ادراک کا ایک وسیلہ ہے لیکن ہم اُس سے اس لیے بچنا چاہتے ہیں کہ اُس معمول کی زندگی میں خلل نہ پڑے جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔ ناول میں مرکزی کردار کا یہ وہم ایسے کئی واقعات کو سمیٹنے کا کام بھی کرتا ہے جس سے ناول کا تاریخی، سماجی اور سیاسی پس منظر اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ اس طرح یہ ناول نفسیاتی حقیقت نگاری سے بنیادی سروکار کے باوجود روایتی حقیقت نگاری کے عناصر بھی رکھتا ہے۔

ناول کے بالائی اور زیریں اسٹرکچر کی کشمکش کے باعث پڑھنے والے کی توجہ اُن عناصر سے ہٹ جاتی ہے جن کی باہمی تشکیل سے کہانی کا ایک مانوس اور واضح تاریخی اور معاشرتی پس منظر بنتا ہے۔ حفیظ

الدین بابر کے نام کی صوتی تاریخی مماثلت کو اگر اتفاقی قرار دیا جائے تب بھی یہ احساس باقی رہتا ہے کہ جس گروہ کا حفیظ الدین ایک فرد ہے اُس کی تقدیر کے تعین میں کہیں نہ کہیں اُس حکومت کا ہاتھ ہے جو ظہیر الدین بابر نے ہندوستان میں قائم کی تھی۔ جب حفیظ الدین اپنی کہانی بیان کرتا ہے تو قتل جیسے ڈرامائی واقعات اور اُس کی اپنی چھٹی حس [Sixth Sense] پر فوکس [Focus] مستقل قائم رہنے سے زمینداری کا خاتمہ، فرقہ وارانہ فسادات اور خود حفیظ الدین کے لڑکوں کی اپنے باپ کے طرزِ فکر سے بیزاری اور بنیاد پرست مذہبی رُجحانات سے لگاؤ اور ایسے کئی موضوعات دب جاتے ہیں جن کی شمولیت کے باعث ''نعمت خانہ'' محض نفسیاتی الجھنوں کے بیان سے آگے بڑھ کر وقت اور مقام کے تناظر میں ایک معتبر ادبی دستاویز بن گیا ہے۔

''نعمت خانہ'' دراصل فرد اور معاشرے کی عدم مطابقت اور بیگانگی کی کہانی ہے جس کو پڑھ کر کامیو کے Outsider کا خیال آنا ناگزیر ہے حالانکہ یہ دونوں ناول ایک قبیل کے نہیں ہیں۔ حفیظ الدین ایک ایسا حساس شخص ہے جس کی فطری دلچسپی ان مجرد ذات سے ہے جو روزمرہ کی زندگی کے پس پشت کارفرما ہیں۔ علاء الدین کو ایک ایسے کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو باوجود دوست اور رشتہ دار ہونے کے حفیظ الدین کی ضد ہے۔ حفیظ الدین کی قوتِ ارادی کس طرح مفلوج ہوئی اس سوال کا کوئی حتمی جواب ناول میں نہیں ہے۔ قتل سے پیدا ہونے والے جرم کے احساس کو حفیظ الدین کی بے عملی کا واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حفیظ الدین نے جو دو قتل کیے ان میں بھی جنسی رقابت سے قطع نظر حق اور انصاف کے لیے جدو جہد کا ایک جذبہ تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ حفیظ الدین روزِ اول سے ہی اپنے اطراف و جوانب سے بیگانہ [Alienated] تھا۔ اپنے سسرال والوں کی سرپرستی میں رہنے سے اُس کی یہ بے گانگی اور بڑھی اور وہ بے چارگی کے درجہ کو پہنچ گیا مگر وہ مردم بیزار اور Cynical نہیں تھا۔ اپنے ہم نفسوں کی بے رحمی سے اُس کو دکھ ہوتا تھا مثلاً ایک ہندو خوانچے والے کے فساد میں مارے جانے کو وہ جس طرح یاد کرتا ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا مایوس شخص ہے جو خود اپنے گھر کے اندر ایک اجنبی کے طور پر رہ رہا ہے۔ کردار نگاری ''نعمت خانہ'' کا ایک نہایت اہم جزو ہے۔ اس ناول کا سروکار زیادہ تر ایک ہی کردار سے ہے جس نے اپنی کہانی بیان کی ہے۔ اس قسم کے کردار کو اگر کسی ماہرِ نفسیات کے پاس بھیجا جائے تو وہ neurosis اور Psychosis کی علامتوں کے پیشِ نظر اُس کا علاج شروع کر دے گا اور CaseReport بھی تیار ہو جائے گی۔ ناول نگار کا کام تشخیص اور علاج نہیں ہے اور نہ وہ Casereport لکھتا ہے۔ وہ ایک ایسا لسانی مرقع آپ کے سامنے رکھ دیتا ہے جس میں کردار اپنے روابط کے ساتھ اس طرح نمودار ہوتا ہے کہ آپ اُس کے بارے میں کوئی ایسا فیصلہ نہیں کر سکتے جیسا فیصلہ ماہر نفسیات کرتا ہے۔ آپ حیران ہوتے ہیں، پریشان ہوتے ہیں، لطف اندوز بھی ہوتے ہیں مگر یہ مرقع پوری طرح آپ کی گرفت میں نہیں آتا اور یہی ادب کا امتیاز ہے۔

☆☆☆

(۲)

'پہلے سے لکھی روداد' : تجزیہ

● اظہار خضر

''پہلے سے لکھی روداد'' اردو کے معتبر اور سنیئر افسانہ نگار اقبال مجید کا تازہ ترین افسانہ ہے [مطبوعہ سہ ماہی ''آمد'' پٹنہ، شمارہ ۱۲-۱۱، اپریل تا ستمبر ۲۰۱۵ء]۔ ایک نئی اور ایڈوانس تکنیک میں لکھا گیا یہ افسانہ ان کی دانشورانہ فکر کی جدت طرازی کا ایک عمدہ تخلیقی نمونہ ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے جس موضوع کو انھوں نے اپنی تخلیقی فکر کا حصہ بنایا ہے، اسے ان کے دانشورانہ Innovation پر محمول کرنا ہی مناسب معلوم پڑتا ہے۔ کیونکہ اقبال مجید نے افسانے میں جس مسئلے کو موضوع بحث بنایا ہے اسے تکنیک کی سطح پر حددرجہ Innovate کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ روش عام سے ہٹ کر تانیثیت کے مسئلے کو انھوں نے فکر وفہم کے ایک نئے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار تانیثیت کا نہ تو ہمنوا ہے اور نہ ہی مخالف، بلکہ وہ اس کی فکری شدت پسندی سے اپنی بے اطمینانی کا بلا جھجک تخلیقی اظہار کرتا ہے۔ افسانے کا اختتامی مکالمہ ان کے اس موقف کی تائید کرتا نظر آتا ہے:

''ہمارا کام طلبا کو تعلیم کے بہتر مواقع فراہم کرنا ہے، تانیثیت وغیرہ کی بحثوں میں الجھنا نہیں۔''

یہ مکالمہ اس افسانے کی شاہ کلید [Master Key] ہے، جو افسانے کے اختتام میں وقوع پذیر ہوا۔ اور یہی ہونا بھی چاہئے تھا۔ کیونکہ تجسس وتعاقب کی تخلیقی فضا بندی ایک تحیّر آسا کلائمکس پر ہی ختم ہوتی ہے۔ بڑے اور کامیاب افسانہ نگاروں کی تخلیقی ریاضت اسی قسم کے فنکارانہ نتیجوں کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

زیر تجزیہ افسانہ میں افسانہ نگار کے تخلیقی نگار خانوں کو کھولتے جایئے اور اس کی تخلیقی فکر ونظر کی سنجیدہ طبعی کی سیر کرتے چلے جایئے، اندازہ ہوگا کہ افسانہ نگار لایعنیت اور مہملات کی بحثوں سے گریز پا نظر آتا ہے۔ سنجیدہ طبعی کی حامل اس کی یہی وہ فکری اور تخلیقی گریز پائی ہے جو اس کے فکر وفہم کی جدت طرازی کی موجب بنتی نظر آتی ہے۔ مطلب یہ کہ افسانہ نگار نے اس افسانے میں تانیثیت کی کوئی نئی تعبیر وتشریح پیش نہیں

کی ہے بلکہ مسئلے کو فکر وسوچ کی انا پسندی اور خود پرستی کی سطح پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔
عرض یہ کرنا ہے کہ تحریکیں پانی کے ایک ریلے کی طرح آتی ہیں اور ناپختہ اور خام ذہنوں کی قطع برید کرتی چلی جاتی ہیں۔ اس میں ہمارے ان نام نہاد دانشور قلمکاروں کی تندی وتیزی اور مستعدی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے، جو فکر ونظر کی شکست وریخت کی تخلیقی بنت اس انداز سے کرتے ہیں کہ مسئلہ مزید الجھتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مسئلے کی نزاکتوں اور اس کی حساسیت کے پیش نظر اس کی دکھتی رگوں پر کس انداز سے انگلیاں رکھی جائیں کہ اسے بہ آسانی Instigate کیا جا سکے۔ میرا خیال ہے کہ زیر گفتگو افسانے میں دانشوروں کی اس ذہنی اور فکری بے راہ رویوں، ناہمواریوں اور شاطرانہ چالوں پر بھی نشانہ سادھنے کی تخلیقی کوشش کی گئی ہے۔
دیکھیے نسائی خو بو کا ہونا ایک فطری امر واقعہ ہے جبکہ اس کے بے جا تفوق و برتری کا مظاہرہ تانیثیت ہے، جس میں نفسیات کی سطح پر وجود کا Dominating attitude حد درجہ متحرک وفعال رہتا ہے۔ خیال رہے کہ حرمتِ نسواں کا جذبہ واحساس اور اس کی پاسداری فرضِ اولیں کا درجہ رکھتی ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ اقبال مجید نے تانیثیت کو Negate نہیں کیا ہے بلکہ اس کے سماجی جواز پر ایک سوالیہ نشان لگایا ہے کہ واقعی نسائی تشخص کی سطح پر اس مسئلے کا کوئی جواز ہے بھی یا نہیں؟ ان امور پر تفصیلی گفتگو آگے کی سطور میں کی جائے گی۔
افسانہ میں کرداروں کے نام نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی بیانیہ بہت ہی واضح ہے۔ البتہ افسانہ نگار نے زبان کے تخلیقی اور جدلیاتی نظام کے پیش نظر جو علامتی اور اشاراتی گفتگو کی ہے اس سے بیانیہ کا فریم ورک مزید چست درست ہوتا نظر آتا ہے اور فکر وفن میں رمزیت وایمائیت کا احساس بھی ہوتا ہے۔ ترسیل فکر وفلسفہ کی سطح بے حد صاف وشفاف نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ ہے بے جا ابہام پسندی سے فنکارانہ اجتناب۔ حالانکہ ابہام کے مطلوبہ فنکارانہ حُسن کو افسانہ نگار نے ملحوظ رکھا ہے۔ افسانے کا اختتامی مکالمہ تحیر آسا ہے، جو "پہلے سے لکھی روداد" کی عقدہ کشائی کرتا نظر آتا ہے۔ افسانے کی تخلیقی فضا بندی Ego اور Super Ego کے مابین clash سے عبارت ہے۔ افسانہ نگار نے تانیثیت کے زیر اثر پروان چڑھتی انا پسندی اور خود پرستی کو سبلائم اور Neutralise کرنے پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ ہم نے مغرب کے اس طوق کو خواہ مخواہ اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے، یہ سمجھے بغیر کہ وہاں کی سماجی اور تہذیبی روایت وقدر مشرق سے یکسر مختلف ہے۔
ہاں تو، اس افسانے کے دو حصے ہیں اور کردار بھی دو ہیں۔ یہ دو کردار دو خود پرست زن وشو کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ موقع ایک جلسے کا ہے۔ جس میں زید نام کے ایک شخص [فرضی] کو، ایک اصلاحی اور امدادی غیر سرکاری ادارے نے جس کا دائرہ کار مسلمانوں کی تعلیمی امداد سے متعلق تھا، مالی مدد کی غرض سے اپنے سالانہ جلسے کو خطاب کرنے کے لیے بلایا تھا۔ ان حضرت کے ساتھ ان کی بیوی بھی تھی۔ یہ دونوں حد درجہ متمول تو تھے ہی، زیور تعلیم سے آراستہ بھی تھے۔ لیکن زید نام کا یہ شخص اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے نحیف ونزار ہو چکا تھا جب کہ ان کی بیوی فربہ وتوانا۔ وجہ عمر کا تفاوت۔ وجود زن وشو کے درمیان عمر کے اس تفاوت کی نفسیاتی کشمکش کو زیر

تجزیہ افسانے میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ بیوی کی جدید عصری تعلیم نے اس کو حد درجہ خود آگاہ اور خود آرا بنادیا تھا۔ شاید افسانہ نگار یہ کہنا چاہتا ہے کہ جدید زمانے کی جدید عصری تعلیم نے اخلاقیات اور چند بنیادی Code of Ethics سے آج کے معاشرہ کو الگ تھلگ کر دیا ہے۔ سر دست اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ البتہ افسانہ میں اس کی تفصیل دونوں ہی کرداروں کی زبانی پیش کی گئی۔

منتظمین جلسہ نے زید نام کے اس شخص کو جلسے سے خطاب کرنے کے لیے پہلے بلایا۔ اب یہ دیکھیے کہ اس کردار نے اپنی نفسیاتی الجھنوں، جبریہ احساس کمتری اور اپنی خود پرستی کا اظہار کس انداز سے اور کس نہج سے کیا۔ چنانچہ ذہنی اور فکری کشمکش کے اس دوراہے پر افسانے کی کرافٹنگ کے لیے، اس بوڑھے شوہر نامدار کی مخاطبت اور گفتگو کے دو ہی مرکز ومحور قرار پائے۔ اس کی جوان بیوی کی رعنائیاں اور جدید عصری تعلیم سے آراستہ ہونے کی وجہ سے اس کی حد درجہ روشن خیالی، آزادانہ روی اور احساس برتری کے نفسیاتی پیچ وخم۔ ذیل کے ان اقتباسات کو پیش نظر رکھیے اور غور فرمائیے کہ تند وتیز اور صبر آزما تلخ حقیقتوں کو تصور و تخیل کے مجازی منظر نامہ پر افسانہ نگار نے کس انداز سے پیش کیا ہے:

(۱) ''میری بیوی سماج کی بہت سی فلاحی اسکیموں کو چلانے والی بہت سی سرگرمیوں کے بوجھ کے نیچے دبی اپنے بے حد مصروف شب و روز گزار رہی ہے اور میرے بستر کو تو چھوڑیے میری خواب گاہ میں بھی جھانکنے کا موقع تک نہیں نکال پاتی۔''

(۲) ''یہ تعلیم کا ہی فیض ہے کہ مجھ سے زیادہ آج اخباروں کی سرخیوں میں میری بیوی رہنے لگی ہے۔ مجھ سے زیادہ ڈاک اس کے پاس آتی ہے۔ میں کبھی نہیں چاہوں گا اس کے پتے سے خلق کو میرا پتہ ملے۔''

(۳) ''تعلیم نے اس کے ہوش وحواس روشن کر دیئے ہیں۔ تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنی ایک الگ پہچان اور دستخط بنا سکے۔''

(۴) ''تعلیم ہوش مندی پیدا کرنے کا عمل ہے۔ لیکن ہوش مندی ہلکان بھی کرتی ہے۔ کیونکہ ہوش مندی جہاں ایک نعمت ہے وہیں ایک عذاب بھی ہے۔''

چونکہ یہ تقریر ایک تعلیمی ادارے کے سالانہ جلسے کے لیے کی گئی، لہٰذا موضوع سخن تعلیم ہی قرار پایا۔ البتہ سوچنے کی یہ بات ضرور ہے کہ دوران تقریر اس بوڑھے شوہر نامدار نے اپنی بیوی کو ہی نشانے پر کیوں رکھا؟

اس سلسلے میں عرض یہ کرنا ہے کہ افسانہ نگار نے نام نہاد تحریک آزادیِ نسواں کے زیر اثر اپنائی جانے والی جدید عصری تعلیم سے اپنی بے اطمینانی کا تخلیقی اظہار نہیں کیا ہے۔ اگر آپ افسانے کا بغور مطالعہ کریں تو محسوس کریں گے کہ افسانہ کے بیانیہ میں حرمتِ نسواں کے تصور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسے آپ بے چارگی اور مجبوری محض پر محمول نہ کریں۔ بلکہ انسانی زندگی کے لیے بنائے گئے ضابطۂ اخلاق میں اس

تصور کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

چنانچہ زید نام کے اس بوڑھے شوہر کی تقریر کے توسط سے جس قسم کی فکر مندیوں کا تخلیقی اظہار کیا گیا ہے وہ دراصل بے مقصد، بے معنی اور خودسری سے مملو روشن خیالی اور آزادانہ روی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تقریر کرنے والا بوڑھا شخص اپنی بیوی کی خودسری کے پیش نظر جس قسم کی ذہنی اور نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا تھا اس کا اظہار تو وہ کر ہی رہا تھا۔ لیکن بنیادی مسئلہ اعتدال و توازن اور بہرصورت شخصیت کے Submissive ہونے کا ہے۔ یہاں ایک بار پھر میں اپنے اس موقف کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ اسے آپ خودسپردگی پر محمول نہ کریں، بلکہ افسانہ نگار صرف بے جا خود پرستی اور انا پسندی کے مسئلے کو اجاگر کرنا چاہتا ہے۔ خیال رہے کہ فنکار صرف مسائل کو اجاگر کرتا ہے، مداوا نہیں۔

آخر زن و شو کے اپنے کچھ سماجی اور اخلاقی تقاضے بھی تو ہیں۔ بیس برس کی بیوی اور ۳۴ برس کے شوہر کا ہونا، ازدواجی تعلقات کے درمیان تلخی و ترشی کا سبب نہیں بن سکتا ہے۔ لیکن کیا کیجیے کہ نام نہاد تحریک آزادیٔ نسواں نے تمام قسم کی پاسداریوں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ یہاں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ یہ افسانہ مرد تفوق معاشرہ [Male dominated society] کے پیش نظر نہیں لکھا گیا ہے۔ بلکہ افسانہ نگار اپنی تخلیقی فکر و سوچ کے وسیلے سے ایک صالح اور صحت مند معاشرہ کا خواب دیکھ رہا ہے۔ جبھی تو افسانہ نگار نے اپنے اس وسوسے اور فکر مندیوں کا تخلیقی اظہار کھل کر کیا ہے:

> ''تعلیم ہوش مندی پیدا کرنے کا عمل ہے۔ لیکن ہوش مندی ہلکان بھی کرتی ہے۔ کیونکہ ہوش مندی جہاں ایک نعمت ہے وہیں ایک عذاب بھی ہے۔''

ٹوٹتی بکھرتی اور چرمراتی نفسیاتی صورت حال کے حوالے سے فکر و نظر کے تضاد و تصادم پر مبنی یہ مکالمہ ہمیں تبدیلی پسند سوچ [Radical Thinking] کی طرف راغب کرتا ہے۔ اس تجزیاتی نکتہ کو پیش نظر رکھیے اور غور فرمائیے کہ زید نام کے اس بوڑھے شخص کی ذاتی زندگی اپنی جوان بیوی کی حد سے زیادہ نمو پذیر ہوتی ہوئی ہوش مندیوں کی وجہ سے واقعی عذاب بن گئی۔ ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا ہو کہ حرمتِ نسواں اور بعض دوسری سماجی اور اخلاقی پاسداریوں کے نام پر خواہشاتِ نفس کی سرکوبی کیوں کر قبول کی جائے۔ خاکسار مذہبیات اور اخلاقیات کی دہائی دینا نہیں چاہتا اور نہ ہی افسانہ نگار کا یہ تخلیقی مدعا و منشا ہے۔ یہ تو صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے۔ معاملہ وہی فرد کے Submissive ہونے کا ہے جس کو بہرصورت ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔

اسے آپ افسانہ نگار یا خاکسار کے ترغیبی نقطۂ نظر پر محمول نہ کریں۔ البتہ اتنی بات تو ضرور ہے کہ موجودہ زمانہ جس قسم کی روشن خیالی اور انتشار و پراگندگی کی صورت حال سے نبرد آزما ہے، افسانہ نگار زمانے کی اس نبرد آزمائی کے تئیں نیک خواہشات رکھتا نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ افسانے میں اس نے اس بچویشن

کا بلا کم و کاست تخلیقی اظہار کیا ہے۔

مذکورہ پیش کردہ اقتباسات بہ ظاہر تو سپاٹ اور بیانیات (Narratology) کے اکہرے پن کے حامل نظر آتے ہیں لیکن بہ باطن ان میں افسانہ نگار کی فکری تہہ داریاں اور گہرائیاں حد درجہ فعال و متحرک نظر آتی ہیں۔ ترسیل فکر و فلسفہ کے لیے جس قسم کی معروضیت پسندی اور سائنسی طریقۂ اظہار کو افسانہ نگار نے اپنایا ہے، میرا خیال ہے کہ زبان و بیان کی سطح پر یہی اس افسانے کا فنکارانہ حُسن ہے۔

افسانہ کے پہلے حصے میں جلسے کے پہلے خصوصی مقرر کے وجود میں پنپتی اور پلتی نفسیاتی کشمکش اور کھینچا تانی کی جو روداد بیان کی گئی ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ روداد مقرر کے ذہن و فکر میں برسہا برس سے رچی بسی تھی۔ یہ پہلے سے تیار اور لکھی ایک روداد تھی جس کا برجستہ اظہار افسانے کی وحدتِ تاثر کو مزید Compact اور چست درست کرتا نظر آتا ہے۔

یہاں اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا کہ یہ روداد مقرر کے دل کی بھڑاس تھی، اس کے احساس کمتری کی مظہر تھی یا پھر یہ اس کی للکارتی ہوئی غیرت و حمیت کی آواز تھی جو ایک خود شناس اور انا پسند وجود کے لیے بے حد ضروری ہے۔ وجہ جو بھی ہو مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ افسانہ نگار اقبال مجید نے تخلیق کی جس اوبڑ کھابڑ عقبی زمین کو ہموار کرنے کا فنکارانہ مظاہرہ کیا ہے، اس سے ان کے فکر و فن کی تازہ کاری اور جدت طرازی کا پتہ چلتا ہے۔ مزید یہ کہ عصری حسیت (Contemporary Sensibility) کے تخلیقی وقوعوں کے لئے جس قسم کے فنی عناصر کو برتا گیا ہے اس سے افسانہ روحِ عصر کا ترجمان نظر آتا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگار کا تخلیقی ذہن بڑا ہی زرخیز اور بوقلموں ہے۔ Anti Story پر مبنی تخلیقی آمیزہ کو Story بنا کر پیش کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ افسانہ کے دوسرے حصے کا آغاز اس نحیف و نزار شوہر نامدار کی بیگم صاحبہ کی تقریر سے ہوتا ہے۔ تقریر کیا تھی بس یوں سمجھیے کہ ایک Repercussion تھا جس میں خود پرستی اور انا پسندی کے حوالے سے اس کی برہنہ گفتاری کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

خیال رہے کہ بیگم صاحبہ اپنی آزادروی اور روشن خیالی کی سطح پر جدید زمانے کی ایک Promiscuous خاتون تھیں۔ اپنی تمام تر آزادی کے ساتھ Quick Mixing ان کے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ لیکن اس آزادانہ اور بے تکلفانہ گھلنے ملنے میں ان کے مزاج کی خودسری حد درجہ متحرک و فعال محسوس ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی Confronting فکر و سوچ خود پرستی کی انتہا ہے۔

اس گفتگو کے پیش نظر عرض یہ کرنا ہے کہ افسانہ نگار کا تخلیقی مطمحِ نظر بھی یہی ہے کہ فکر و سوچ کی اعتدال پسندی ہی وہ لازمی عنصر ہے جو وجود کی بہتر بقا کا ضامن بن سکتا ہے۔ افسانے میں بیان کردہ اس فکر و فلسفہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ذیل کے ان

اقتباسات کو ملاحظہ فرمائیے:

(۱)''میرے شوہر نے اپنے دل میں جس جلن اور حسد کا ذکر کیا ہے، اس سے میری دل آزاری نہیں ہوئی۔ کیونکہ میرا ماننا ہے کہ نہ انسان عورت ہوتا ہے اور نہ مرد۔ وہ اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ صرف انسان ہوتا ہے۔''

(۲)''میری معلومات تو یہ ہے کہ تعلیم آدمی میں دوسروں کے لیے خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ بڑھاتی ہے۔ ان باتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت اور قابلیت کو پختہ کرتی ہے جو باتیں کسی سبب سے اسے عادتاً ناقابل قبول ہیں۔ آخر میرے شوہر کے اندر ابھی تک وہ compassions اور Tolerance کیوں نہیں پیدا ہوا...... میرے شوہر یہ بھی کہتے ہیں کہ بیوی کو اتنی شہرت نہیں کمانا چاہیے کہ اس کے شوہر کی شہرت کو گہن لگے۔''

(۳)''ان برقعہ پوشوں میں لگتا ہے ایک بھی لڑکی ایسی نہیں جو میرے شوہر سے پوچھ سکے کہ اگر اس کے پتے سے خلق کو اس کے شوہر کا پتہ ملتا ہے تو شوہر کی ذات پر کون سا گہن لگ جائے گا۔''

(۴)''پوچھیے میرے شوہر کو بلا کر سب کی گواہی میں کہ تعلیم نے ان کی کتنی سوچ بدلی ہے۔''

تخلیق فن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ یہاں فرد اور زندگی کے نہ جانے کتنے بکھیڑوں اور قضیوں کی فنکارانہ مصوری چپکے چپکے ہوتی چلی جاتی ہے۔ انھی قضیوں میں سے ایک قضیہ Adjustment اور Tolerance کا ہے۔ بعض اعلیٰ اخلاقی پاسداریوں اور شرافت نفس کا ہے۔ اب ذرا یہ دیکھیے کہ Lofty Ideologies کے حامل ان پیش کردہ اقتباسات میں بیگم صاحبہ کی زبان سے ادا کرائے گئے یہ مکالمے کتنے Attacking اور Agressive ہیں۔ کیا یہ مکالمے افسانہ نگار کے ذہنی اور فکری تحفظات کی چغلی کھاتے نظر آرہے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے قاری کے لئے ایک لمحۂ فکریہ فراہم کیا ہے کہ آخر یہ کس قسم کی تانیثیت ہے؟ کس قسم کی روشن خیالی ہے؟ یہ صحیح ہے کہ مرد ہو یا عورت اس کی شخصیت کے بعض بنیادی اوصاف ایسے ہوتے ہیں جو اس کے لئے مرکز کشش کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس کی شہرت و مقبولیت کے ضامن بنتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ابھی یہ عرض کیا گیا ہے کہ ایک بامعنی اور متوازن انسانی زندگی کے لئے بہر صورت بعض اخلاقی پاسداریاں اور شرافت نفس اپنا وجودی جواز رکھتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ افسانہ نگار نے فکر و فلسفہ کے اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھا ہے جو افسانے کی کرافٹنگ کو ایک تخلیقی جواز فراہم کرتا ہے۔ مذکورہ دونوں کرداروں کے حوالے سے افسانے کا مکالماتی انداز بیان اس کے بیانیہ کو فکر و سوچ کی ایک رزم گاہ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں دونوں کرداروں کے مابین Dialogue اور Counter dialogue فکر و فہم کی سطح پر آپ کی ذہانت و ظرف کی امتحان گاہ بھی ہے۔

افسانے کی تعبیر و تفہیم کے حوالے سے کی گئی اس گفتگو کے پس منظر میں غور و فکر کے ایک اور پہلو کی جانب آپ کی توجہ مبذول کیا چاہتا ہوں:

کہنا یہ ہے کہ محترمہ اندرا گاندھی اور ارونا آصف علی کے ناموں سے خلق کو ان کے شوہر کی مرکزیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ ان دو بڑی خاتون شخصیتوں کی تہذیب وشرافت اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی روشن مثال ہے۔ یہ دونوں خواتین حد درجہ روشن خیال تو تھیں ہی ان کے پاس فکر وسوچ کا ایک International window بھی تھا۔ خاندانی جاہ وجلال اور وجاہت کا کیا کہنا! یہ صحیح ہے کہ اندرا جی کو جو شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی وہ فیروز گاندھی کو نہیں۔ لیکن اندرا جی کو وراثت میں جو تہذیب وشرافت ملی تھی اس کے سامنے تحریک آزادی نسواں اور تانیثیت چہ معنی دارد؟

میری اس توجیہ پسندانہ گفتگو کے پیش نظر زیر تجزیہ افسانے کی بیگم صاحبہ کی تانیثی شخصیت پر غور فرمائیے۔ اندازہ ہوگا کہ اپنی تمام تر ثروت مندی اور روشن خیالی کے باوجود بیگم صاحبہ کی حیثیت بی جمالو کی سی تھی۔ بی جمالو کی تانیثیت مضحکہ خیزی نہیں تو اور کیا؟ یہ ایک قسم کی نسائی فکری نراجیت ہے جس کو افسانہ نگار نے فوکس کرنے کی کوشش کی ہے۔ گو کہ افسانہ میں اس کا براہ راست تخلیقی اظہار نہیں ہوا ہے۔ البتہ اشاروں کنایوں کے پردے میں جو تخلیقی گفتگو کی گئی ہے اس کی گونج بیانیہ کے بین السطور میں واضح طور پر سنائی پڑتی ہے۔ افسانہ نگار کا قلم بڑا ہی چابکدست ہے۔ وہ Art of Narrotology کو جزئیات نگاری کے راستے سجاتا اور نکھارتا ہے۔

تانیثیت کے حوالے سے افسانہ نگار نے جن مسائل اور قضیوں کی فنکارانہ مصوری کی ہے اس سے اس کی تخلیقی جدت طرازی کا پتہ چلتا ہے۔ اختتامی مکالمے کی اشاراتی گفتگو ترسیل فکر وفلسفہ کی سطح پر افسانے کا End Point تو ہے ہی ساتھ ہی ایک تحیر آسا تخلیقی فضا بندی کا شدت سے احساس بھی ہوتا ہے:

> ''دوسرے دن کے اخباروں میں اس جلسے کی روداد پہلے سے لکھے ہوئے بعض حصوں کے ساتھ شاندار رپورٹ کی شکل میں شائع ہوئی۔ بعد میں پریس والوں نے جب ادارے کے بڑی داڑھی والے صدر سے مہمان کی بیگم کی تقریر پہ ان کی رائے جاننا چاہی تو صدر محترم نے جواب دیا: ''ہمارا کام طلباء کو تعلیم کے بہتر مواقع فراہم کرنا ہے، تانیثیت وغیرہ کی بحثوں میں الجھنا نہیں ـــــ''

غور فرمائیے کہ افسانے کی اختتامی منزل پر مہمان خصوصی کی بیگم کی تقریر کو ہی افسانہ نگار نے کیوں Focus Point بنایا ؟ میرا خیال ہے کہ تانیثیت کے حوالے سے ایک قسم کے State of domination کی صورت حال کو افسانہ نگار نے شدت سے محسوس کیا ہے۔ البتہ اس کے تخلیقی اظہار میں افسانہ نگار نے اعتدال پسندی اور فکر وفن کی تحیر سامانی کو ملحوظ رکھا ہے۔ افسانہ نگار کا یہ پیش کردہ تخلیقی موقف صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے !

☆☆☆

(۳)

'ڈھونڈ پھری چاروں دھام' : تجزیہ

● اظہار خضر

یہ مشہور و معروف اور معتبر افسانہ نگار زاہدہ حنا کا تازہ ترین افسانہ ہے۔ [مطبوعہ سہ ماہی ''آمد'' پٹنہ، شمارہ ۱۲-۱۱، اپریل تا ستمبر، ۲۰۱۴ء] ڈیمائی سائز میں مطبوعہ ۱۸ صفحات پر مشتمل یہ افسانہ برصغیر ہند و پاک کی تاریخ، تہذیب اور سیاست کے حوالے سے ایک تخلیقی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ کوزے میں دریا کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ موضوع اور تقسیم کے پیش نظر تقاضائے سخن مکمل ایک ناول کی تخلیق کا متقاضی محسوس ہوتا ہے لیکن اس موضوع کے حوالے سے لکھے گئے بیشتر ناولوں سے زاہدہ حنا باخبر ہیں۔ وہ افسانے کی ایک پختہ کار فنکار ہیں۔ جانتی ہیں کہ اُگلے ہوئے نوالے کو چبانے سے کیا فائدہ! باسی کڑھی میں ابال پیدا کرنے سے اس کی تازگی بہر صورت مشکوک ہی رہے گی!

مختصر افسانہ ایجاز نویسی کا فن ہے۔ لہٰذا موضوع کی وسعت کے پیش نظر بیانیہ کو محض ۱۸ صفحات میں سمیٹ دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ان صفحات میں فکر و آگہی کا ایک جہان معنی آباد ہے۔ پورے افسانے میں محسوسات کی تیز آنچ قاری کے فکر و شعور کو گرماتی محسوس ہوتی ہے۔

بہ ظاہر تو افسانے میں بیانیہ کا تکمیلی طریقۂ نگارش ماضی گرفتہ سے عبارت ہے۔ لیکن خیال رہے کہ ماضی کی روشن اور تابناک روایت و قدر کے پیش نظر عصبیت قلب و نظر سے پاک کرنے کی یہ ایک مبہم جو یانہ تخلیقی جست ہے۔ چنانچہ زاہدہ حنا اس افسانے میں تاریخ، تہذیب اور سیاست کو آج کے پس منظر میں دیکھتی اور محسوس کرتی نظر آتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں وہ اپنی تہذیبی اور تاریخی وراثت پر فخر کرتی ہیں۔ وہ جانتی ہیں کہ قدریں دائمی ہوتی ہیں۔ وہ عصر حاضر کی تہذیب و سیاست میں بھی انہی قدروں کو تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔ لیکن کیا کیجئے کہ ان قدروں کا ٹوٹتا بکھرتا منظر نامہ اُن کی تخلیقی فکر و سوچ کو مایوس کرتا نظر آتا ہے۔ یہ حال کا ایک عجیب و غریب المیہ ہے جس سے ہم سب جوجھ رہے ہیں۔

عرض یہ کرنا ہے کہ زیر تجزیہ افسانہ، فنکار زاہدہ حنا کی انہی مایوسیوں کا تخلیقی اظہاریہ ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ آزادی تو مل گئی لیکن ''یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر'' کی مانند ملی آزادی اس کی تہذیب و تاریخ پر

ایک سوالیہ نشان لگاتی نظر آتی ہے۔ مدیر ''آمد'' جناب خورشید اکبر نے اس افسانے کے تعلق سے اپنے ادارتی نوٹ میں ٹھیک ہی لکھا ہے کہ زاہدہ حنا کا افسانہ برصغیر میں آزادی کے مفہوم پر ایک نیا سوال قائم کرتا ہے!

ہم آزادی کے دامن کو امن وآشتی اور اتحاد ویگانگت کی جس تہذیب وسیاست سے بھرا دیکھنے کا خواب دیکھ رہے تھے وہ خواب تو چکنا چور ہو گیا۔ افسانہ نگار اس کی معنویت اور جہد آزادی کے جواز کی تلاش میں کھونٹ کھونٹ چاروں دھام ماری پھرتی نظر آتی ہیں!

> ''لندن اور پیرس............گوکل اور برندابن تھے۔ جرمنی کے کنسنٹریشن کیمپ چاروں دھام تھے۔ اور وہ دیے کی لو کی طرح تڑپتی ہوئی آزادی کو ڈھونڈتی رہی تھی۔ تلاش کا اپنا رنگ اپنا نام............سمٹے چاروں دھام تھا۔ تلاش چاروں کھونٹ تھی۔ سجاتا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آزادی نور کو نہیں ملی تھی۔ اور وہ جو سجاتا تھی اسے اور اس جیسے کروڑوں لوگوں کو آزادی نہیں مل سکی تھی۔''

افسانے کی تخلیق کی اس عقبی زمین کو پیش نظر رکھئے اور غور فرمایئے کہ افسانہ نگار زاہدہ حنا کے تخلیقی ویژن میں کس قسم کی فکرمندیاں اور دردمندیاں رقص کر رہی ہیں۔ ذیل کی سطور میں انہی امور پر تفصیلی گفتگو کی جائے گی!

سجاتا اس افسانے کی ایک Apparent کردار ہے۔ جس کو محض ترسیل فکر وفلسفہ کے لئے ایک Tool کے طور پر استعمال میں لایا گیا ہے۔ دراصل افسانے کے داخل میں دو اہم تاریخی کردار ہیں۔ جو بنیادی طور پر افسانے کے فکر وفلسفہ کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ خیر اس گفتگو سے قطع نظر عرض یہ کرنا ہے کہ سجاتا ایک لبرل اور روشن خیال دانشور خاتون تھی۔ اس کی لبرل ازم اور روشن خیالی میں ملک وقوم کے تئیں بے پناہ دردمندیاں اور فکرمندیاں جاگزیں تھیں۔ تاریخ اور تہذیب پر اس کی نگاہ تیز تھی۔ ہندو بنگالی ہوتے ہوئے بھی اس نے تاریخ اور تہذیب کی دبیز گرد آلود تہوں کو جھاڑ پھٹک کر ایک ایسی مسلمان لڑکی کو دریافت کیا جس کی رگوں میں انگریزوں سے لڑنے والے شہید کا خون دوڑتا تھا۔ اس کی زندگی کو جاننے اور اس کے بارے میں لکھنے پر کئی برس لگا دیئے۔ جب کتاب شائع ہوئی تو ہندوستان کے رائٹ ونگ والوں نے کافی واویلا مچایا۔ کیونکہ وہ ہندوستان کے صوفی گائیک مرشد عنایت خاں کی بیٹی تھی۔ ماں امریکی نژاد۔ پیدا ہوئی ماسکو میں نام تھا نور۔ جس کی تہذیب وثقافت کی جڑیں بہت دور تک ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ جڑیں ایک نقطۂ اتصال (Point of Confluence) پر آ کر Terminate کرتی ہیں۔ تاریخ کے اس Terminal Point کا نام تھا ٹیپو سلطان۔ نور، ٹیپو کی سگو پوتی تھی۔ حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے ممتاز ادیب اور افسانہ نگار جناب ظیسین احمد کی اطلاع کے مطابق:

> ''نور کا اصل نام نورالنساء تھا۔ وہ ۲رجنوری ۱۹۱۴ء میں روس میں پیدا ہوئی اور

۱۲/ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں Schutz Stafeensl میں اسے دوسری تین عورتوں کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا۔ وہ SOE کی خفیہ ایجنٹ بھی تھی۔"

[بحوالہ سہ ماہی "آمد" شمارہ ۱۴۔۱۳]

سجاتا کے توسط سے انہی دو تاریخی کرداروں کو افسانے کے داخل میں فوکس کیا گیا ہے! یہاں پر یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ہمارے بعض ذہنی تحفظات کے پیش نظر افسانہ نگار نے نور کے کردار کے وسیلے سے ٹیپو کی تاریخی حیثیت کو از سر نو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے افسانے کی دانشورانہ سطح بلند ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار زاہدہ حنا کی تخلیقی فکر و نظر میں ٹیپو کی تاریخی حیثیت اور اس کی ولولہ انگیزیاں ایک Source of Inspiration کی صورت میں رقص کناں ہیں۔

آخر انجام اس کاروں نے تاریخ کو کوکھ جلی کیوں کر بنا دیا۔ یہ تو بڑی ہی زرخیز اور سرسبز و شاداب تھی۔ اس حوالے سے گفتگو آگے کی سطور میں کی جا رہی ہے! پہلے سجاتا کی کتاب کی ایک کردار نور کے حوالے سے ذیل کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے!

"شاید اس کے اندر (نور) یہ احساس شدت سے تھا کہ اس کی رگوں میں ٹیپو سلطان کا خون دوڑ رہا ہے، فرانسیسیوں نے آخر لمحے تک اس ٹیپو کا ساتھ دیا۔ اس کی طرف سے انگریزوں سے لڑتے تھے اور مارے گئے۔ شاید اس نے یہی قرض اتارنا چاہا تھا۔ تب ہی وہ انڈر گراؤنڈ فرنچ ریزسٹنس کا حصہ بنی۔"

عرض یہ کرنا ہے کہ زیر تجزیہ افسانے میں نور ٹیپو کی Historical Revival اور اس کی ناقابل فراموش قربانیوں کو زندہ رکھنے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ باقیات الصالحات میں اگر تابانی ہے تو اس کا Revival تو ہونا ہی چاہیے۔ خاکسار اس اخلاقی ذمہ داری کو فکر و نظر کی دانشوری سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ سجاتا نے ٹیپو کی اس سگو پوتی کی زندگی کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے کو کسی آرکیالوجسٹ کی طرح ڈھونڈا تھا۔ لیکن کوئی تو می یک جہتی کے اس تصور اور اس کے انسانی جذبے کو سمجھے تب تو رائٹ ونگ والے شدت پسندوں کا یہ الزام تھا۔

"یورپ اور امریکہ سے پڑھ کر آنے والی یہ مہیلائیں اپنے لبرل ازم اور سیکولر ازم سے مسلمانوں کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیں۔ وہ ہماری پرم پرا کو، ہماری سنسکرتی کو ناش کر رہی ہیں۔...... ہمیں ٹیپو کی پوتی، پڑپوتی سے کیا لینا دینا۔ اسی ٹیپو نے ہمارے مندر توڑے تھے ہماری رانی لکشمی بائی اس لئے شہید ہوئی تھی کہ اس کے مسلمان سپاہیوں نے اس سے غداری کی تھی۔ انگریزوں سے جا ملے تھے۔

یہ جھوٹ سجاتا کو یاد آیا تو اس وقت اسے جھرجھری سی آگئی۔ ہر طرف

جھوٹ کی دکان سجی تھی۔ یہ مسلمان سپاہی تھے جو لڑتے کٹتے ہوئے شہید رانی کی لاش کو انگریز فوج کے بیچ سے نکال لے گئے تھے۔ رانی ان کی عزت تھی، اس عزت پر آنچ نہ آئے۔ یہ کون لوگ تھے جو اتہاس پر کالک پھیر رہے تھے۔''

تاریخ، تہذیب اور سیاست کے تناظر میں افسانے کی سیکولر تخلیقی فکر ونظر ہمارے لئے ایک لمحہ فکریہ فراہم کرتی ہے۔ زیر نظر اقتباس کو افسانہ نگار کی مسلم دوستی یا ہندو دشمنی پر محمول کرنا ایک قسم کا ذہنی اور فکری دیوالیہ پن ہی ہوگا! ٹیپو کی وطن دوستی اور وطن پرستی اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ یہ الزام کہ سجاتا نے اپنی کتاب میں ٹیپو اور ٹیپو کی سگی پوتی، نور کو اتنا زیادہ Glorify کیوں کر کیا!! اس نے جھانسی کی رانی کے بارے میں کیوں نہیں لکھا! یہ سوال ہندوستان میں بھی کیے گئے اور پاکستان میں بھی۔ اس کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہونے لگی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ برصغیر کی جغرافیائی حدود تو بدلی ہی اس کا ذہنی اور فکری نقشہ بھی بدل چکا ہے! اب ان لوگوں کو کون بتائے کہ:

''تاریخ کپڑے کا تھان نہیں ہوتی جسے پھاڑ کر آدھا کرلیا جائے''

اپنی جغرافیائی حدود میں رہتے ہوئے کسی خطۂ مخصوص کی تہذیب وثقافت کو اس کی Totality میں دیکھنے کی ضرورت ہے! سجاتا کی باتوں پر کان دھرنے کی کسی کو فرصت ہی نہیں۔ افسانہ نگار۔ زاہدہ حنا کی یہی وہ تخلیقی کس مپرسی ہے جو افسانے کو اثر انگیزی سے ہمکنار کرتی ہے! تاریخ اور تہذیب کے سکڑتے رشتوں کی نوحہ خوانی افسانے کو المیہ نگاری کا اک خوبصورت اور عمدہ تخلیقی نمونے کی صورت میں پیش کرتی ہے۔ سجاتا چیخ چیخ کر لوگوں کو بتانا چاہتی ہے:

''وہ نور کی کہانی لکھ کر اپنے یہاں کے راکھشسوں سے نجات چاہتی تھی۔ اتہاس پکشی پکھیرو تھا۔ جس کے پروں پر بیٹھ کر وہ سمے کے گگن پر اڑتی چلی جاتی۔''

متذکرہ دو بے حد سحر آگیں تخلیقی نوعیت کے مکالموں سے قطع نظر عرض یہ کرنا ہے کہ اختیار کردہ موقف کے پیش نظر افسانہ میں پیدا ہونے والے سوال در سوال کے سلسلوں، اندیشوں اور وسوسوں کا تخلیقی اظہار جس انداز سے کیا گیا ہے اس سے افسانے کی کرافٹنگ میں توجیہ پسندانہ طریقۂ نگارش کو تقویت پہنچتی محسوس ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اس قسم کے مکالموں سے افسانہ کے تخلیقی جواز پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ جب سجاتا کی کتاب پاکستان میں شائع ہوئی اور وہ اس کی پبلسٹی ٹور پر وہاں گئی تو وہاں بھی مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سجاتا کو تو یہ گمان تھا کہ پاکستان میں ٹیپو کے بہت چاہنے والے ہوں گے اور وہاں اس کی کتاب کو بہت داد ملے گی۔ پاکستان میں مخالفتوں کا سامنا کیوں کرنا پڑا، اس کی توجیہ بیان کرتے ہوئے زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

''والد دینا اور ستارے کرٹن ٹن کرتے ہوئے یورپ میں گھومنے لگے۔.......شادی

فرنگن سے کر لی۔ صاحبزادی ہوئیں تو وہ سایہ پہن کر فرنچ اور انگلش بولتی رہیں۔
........سگو دادا (ٹیپو) انگریزوں کے خلاف لڑتا ہوا شہید ہوا۔ یہ انگریزوں کی خفیہ ایجنٹ بن گئیں۔ نام نور اینکر تھا۔ گسٹاپو کے ہاتھ لگیں۔ نازیوں نے ان کا جو حشر کیا ہوگا وہ ڈھکی چھپی بات تو نہیں۔ آپ ہی بتایئے کہ مسلمان ایک ایسی لڑکی کو کیوں اپناتے جسے اپنی عزت کا ذرا سا بھی خیال نہیں تھا۔"

خیال رہے کہ یہ اقتباس نور کی زندگی کے تاریک گوشوں سے عبارت نہیں ہے۔ بلکہ زمانے کے تھپیڑوں نے نور کو جہاں پر لا کر کھڑا کر دیا تھا اس کا من وعن تخلیقی اظہار ہے۔ نور انگریزوں کی ایجنٹ نہیں تھی۔ بلکہ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر جرمنوں سے اس لئے لڑ رہی تھی کہ فرانس آزاد ہو جائے وہ فرانسیسی جنہوں نے انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں ٹیپو کا ساتھ دیا۔ نور کی خواہش تھی کہ جب پیرس آزاد ہو جائے گا تو وہ ہندوستان چلی جائے گی۔ اور یہاں کی فریڈم موومنٹ سے جڑ جائے گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی ـــــ لیکن نور کی اس فکری اور ذہنی اسپرٹ کو سمجھنے کے لئے کوئی تیار ہی نہیں۔ تاریخ کے چہرے کو داغدار کرنا اور دل وقت کی دھڑکنوں کے تقاضوں سے روگردانی سیاسی بازیگروں کا شعار رہا ہے۔ تہذیب وثقافت کی جو توانا جڑیں دور تک برصغیر کی سماجی زندگی کی زمین میں پھیلی ہوئی ہیں وہ ان جڑوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں!

زیر تجزیہ افسانے کا یہ فکری منظرنامہ بڑا ہی فکر انگیز اور بصیرت افروز ہے! اب یہ دیکھئے کہ سجاتا کی کتاب کے حوالے سے دونوں مخالفتوں کی نوعیت الگ الگ ہے۔

ہندوستان میں مخالفت اس لئے ہوئی کہ کتاب کی مرکزی ہیروئن نور، ٹیپو کی سگو پوتی تھی۔ وہ ٹیپو جس نے مندر تڑوائے اور رانی لکشمی بائی اس لئے شہید ہوئی کہ اس کے مسلمان سپاہیوں نے اس سے غداری کی تھی۔ انگریزوں سے جا ملے تھے۔ سجاتا کو رائٹ ونگ والے شدت پسندوں کے اس جھوٹ سے جھرجھری سی آگئی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی!

پاکستان میں سجاتا کی اس کتاب پر مخالفت اس لئے ہوئی کہ ٹیپو کی سگو پوتی نور کی شخصیت میں Integrity نہیں تھی۔ وہ ایک آزاد خیال Radical قسم کی لڑکی تھی۔ جسے اپنی عزت تک کا خیال نہ رہا۔ وہ انگریزوں کی دلال تھی۔ اب اس فرسودہ خیالی اور ذہنی وفکری جکڑ بندیوں کا کوئی جواب ہے؟ قوموں کی فکر وسوچ میں انتشار و پراگندگی اسی راستے سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ افسانہ اسی مفلوج ومخدوش اذہان کے خلاف احتجاج کا ایک اچھوتا اور نادر الوجود تخلیقی منظرنامہ ہے۔ جس میں تاریخ، تہذیب اور سیاست ایک دوسرے میں گھل مل کر ہماری فکر وسوچ کو جھنجھوڑتی نظر آتی ہیں۔ سماجی، تہذیبی اور سیاسی Assimilation کا یہ ایک انوکھا تحرک آمیز تخلیقی نمونہ ہے۔ اس افسانہ میں زاہدہ حنا کا فکر وفن تاریخی اور سماجی پس منظر میں اپنی Radical فکر وسوچ کا تخلیقی جواز فراہم کرتا نظر آتا ہے!

اتنا ہی نہیں وہ پورے افسانے میں عصبیت قلب ونظر کے بڑھتے قدم سے جو جھتی نظر آتی ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ آج کے افسانوں کے تخلیقی کینوس سے نری رومانیت پسندی کے نقوش مٹ چکے ہیں اور اس کی جگہ زمانے کے بدلتے اور بگڑتے مزاج وتیور نے لے لی ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ بڑا اور سچا تخلیقی فنکار اپنے عہد کا نبض شناس ہوتا ہے۔ لہٰذا افسانہ نگار کی نبض شناسی کے کمال فن پر غور فرمایئے کہ زمانہ ٹیپو اور اس کی سگی پوتی، نور کی تاریخی حیثیت واہمیت کو سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دو تاریخی کرداروں کی Relevancy آج کے تناظر میں ختم ہو چکی ہے! یہی وہ عصبیت قلب ونظر ہے جس کے پیش نظر افسانہ نگار زاہدہ حنا کی تخلیقی فکر ونظر تیز وتند ہوتی محسوس ہوتی ہے! چنانچہ نور کی زبانی جو مکالمہ ادا کرایا گیا ہے اس میں قلب ونظر کی بے چینی، گھٹن اور حزن وملال کی داخلی کیفیتوں کو آپ واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں:

> ''سلطان بابا (ٹیپو سلطان) انگریزوں سے لڑتے رہے۔ لیکن تاریخ سر کے بل کھڑی ہو جاتی ہے۔ میں ان کی سگی پوتی انگریزوں کے ساتھ مل کر جرمنوں سے لڑ رہی تھی آزادی کے لئے۔........اگر سلطان بابا انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتے اور میرے مرشد بابا (مرشد عنایت خاں) اپنا وطن نہ چھوڑتے تو پھر میں ماسکو میں نہیں، ہندوستان میں پیدا ہوتی۔ یہ تمہارا کرم ہے کہ تم نے مجھے زندہ کر دیا ورنہ میں تو کاغذوں کے انبار میں دفن ہو چکی تھی۔''
>
> سجاتا کی آنکھیں جھلملائیں ''تمہاری زندگی اتنی شاندار تھی کہ میں نہیں تو کوئی اور تمہیں کھوج لیتا۔''

غور فرمایئے کہ تاریخ سر کے بل کھڑی ہے۔ اس سے بڑی مضحکہ خیزی اور مسخرہ پن کیا ہو سکتا ہے۔ افسانہ نگار شاید اس افسانہ کے توسط سے تاریخی اور تہذیبی سطح پر برصغیر کے مخدوش ومفلوج فکری منظرنامہ کو دکھانا چاہتی ہیں۔

چنانچہ اس چرمرائے ہوئے فکری منظرنامہ کے پس منظر میں نور کی تاریخی حیثیت واہمیت کو بھی سمجھانے کی بساط بھر کوشش کی گئی ہے۔ لیکن کوئی نور کے جذبہ واحساس کو سمجھے تب تو۔ یہاں تو چہار جانب سے، حقائق کی بنیاد پر کتاب میں پیش کردہ تاریخی اور تہذیبی دستاویز کو مخالفتوں اور مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے خیال میں یہ مزاحمتیں اور مخالفتیں عصبیت قلب ونظر کا نتیجہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نور ماسکو میں پیدا ہوئی اور شہریت کے اعتبار سے وہ فرانسیسی تھی۔ لیکن ہندوستان کے تئیں اس کی وطن دوستی اور وطن پرستی کا جذبہ دیکھنے کے لائق ہے۔ وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کی تحریک میں بھی حصہ لینا چاہتی تھی، لیکن اس کا موقع ہی نہ ملا۔ اسے ملال تھا کہ بابا اگر یورپ نہ جاتے اور میں ماسکو میں پیدا نہ ہوتی تو ہندوستانی ہی ہوتی۔

عرض یہ کرنا ہے کہ نور کے کردار وشخصیت کے اندر وطن پرستی اور وطن دوستی کی جو تیز سلگتی آنچ

دیکھنے کو ملتی ہے وہ دراصل سلطان بابا (ٹیپو سلطان) کی سرفروشی اور جانبازی کا پرتو ہے۔ ٹیپو ایک جانباز شہید وطن تھا۔ لیکن آج تاریخ کے صفحات سے اس کی سرفروشی اور جانبازی کے چرچے اور قصے تعطل کے شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ تاریخ کے ساتھ سراسر ظلم ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ تاریخ کبھی کبھی سر کے بل کھڑی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ برصغیر کے تاریخی اور تہذیبی بکھراؤ اور انتشار کے اس دوراہے پر نور اور ٹیپو کو افسانے میں ایک تاریخی اور تہذیبی وحدت کی صورت میں پیش کر کے افسانہ نگار نے آزادی پر ایک سوال قائم کیا ہے۔

یہ کیسی آزادی ہے جہاں فکر و سوچ پر پہرے لگے ہیں؟ جہاں عصبیت کا ناگ پھن پھیلائے اخوت و ہم آہنگی کی فضا کو زہرناک اور مسموم کر رہا ہے۔ لہٰذا یہ افسانہ محض نور اور ٹیپو کی داستان حزن و یاس نہیں ہے بلکہ برصغیر ہند و پاک کے متعصبانہ سیاسی اور سماجی رویے کا ایک تخلیقی اعلانیہ ہے۔ اس لحاظ سے افسانے کا تھیم تعصب ہے۔ اس Thematic approach کو پیش نظر رکھیے اور یہ دیکھئے کہ افسانہ میں ٹیپ کے بند کی طرح یہ مکالمہ بار بار دہرایا گیا ہے:

"ہوا کی لہر پر بہتے ہوئے لفظ اس تک آئے۔ گوکل ڈھونڈی، برندابن ڈھونڈی.....
ڈھونڈ پھری چاروں دھام۔"

مسلسل تلاش، تعاقب اور جستجو کہ شاید کہیں قرار واقعی حاصل ہو جائے۔ کہیں تو کشادگی فکر و نظر کی جائے امان مل جائے۔ افسانے کا اختتام موضوع اور تھیم کے پیش نظر اس فکر انگیز مکالمہ پر ہوتا ہے:

"کاش نور نے کولکاتا، دلی اور لاہور کو دیکھا ہوتا۔ یہ وہ شہر تھے جنہیں برٹش راج سے آزاد کرانے کے لئے وہ جان دینے کی باتیں کرتی تھی اور وہی شہر ان جیسوں کی جان کے درپے تھے۔ برٹش راج سے آزادی مل گئی تھی لیکن اب ہر طرف نفرت کرنے والوں کا راج تھا۔ یہاں بھی وہاں بھی۔ نور نے اور ہزاروں لاکھوں نے اس آزادی کو چاروں دھام ڈھونڈا تھا۔ اور جان دے دی تھی۔ وہ آزادی کل بھی نہیں تھی، آج بھی نہیں ہے۔ آزادی سچ ہے تو پھر وہ سچ کہاں ہے؟"

مہاتما گاندھی کے پڑپوتے تشار گاندھی نے بھی آزادی پر سوال قائم کرتے ہوئے اپنے ایک حالیہ اخباری بیان (روزنامہ "قومی تنظیم"، پٹنہ مورخہ ۸ رمئی ۲۰۱۵ء) میں کہا ہے کہ آزادی کے 67 برس بعد بھی ہم باپو کے خوابوں کا ہندوستان نہیں بنا پائے ہیں! جو لوگ باپو کو ایک مثال قرار دیتے ہیں انہوں نے بھی باپو کے ساتھ وفاداری نہیں کی!

مختصر یہ کہ افسانہ نگار زاہدہ حنا کی تاریخی اور سیاسی بصیرت کا حامل یہ افسانہ ان کے فکر و فن کا ایک عمدہ تخلیقی نمونہ ہے!

☆☆☆

(۱)

'معصومہ': تعبیر و تشریح

● روبینہ تبسم

یوں تو عصمت چغتائی کے اسلوب اور فن کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے ان کے مقام اور انفرادیت کا اندازہ ہو جاتا ہے، مگر ناول ''معصومہ'' پر لکھی گئی تحریروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ 'معصومہ' کی کردار نگاری اور ناول کی دوسری فنی خصوصیات کو محدود نظر سے دیکھا گیا ہے۔ لہٰذا اس مضمون میں ناول اور دوسری تنقیدی تحریروں کا تجزیہ کر کے ایک نئے سرے سے تعبیر و تشریح کی کوشش کی گئی ہے۔

ناول ''معصومہ'' ایک ایسی لڑکی کی دکھ بھری داستان ہے جس کو زندگی کے ناسازگار حالات نے معصوم ''معصومہ'' سے طوائف ''نیلوفر'' بنا دیا۔ زوال حیدر آباد کے پس منظر میں لکھا ہوا یہ ناول فلمی دنیا اور بمبئی شہر کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ انھوں نے یہاں کے ہوٹل مینجرس، راجاؤں، سیٹھ ساہوکاروں، فلم پروڈیوسروں اور سرکاری حاکم وغیرہ کے توسط سے معاشرے کے گھناؤنے پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

انھوں نے اس ناول کے لیے ایسا ماحول تیار کیا جہاں ہر طرف منفی کردار بکھرے پڑے ہیں۔ کہیں بھی کوئی مثبت کردار نظر نہیں آتا۔ جہاں صرف گناہ، برائی، بے شرمی، بے حیائی اور بے وفائی ہے۔ ہر طرف جنس، دولت، شہرت اور روٹی کے بھوکے ہیں۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ کہیں بھی روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ اس ماحول میں ایک ایسے غیر ذمہ دار باپ کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جو

زوال حیدرآباد کے بعد اپنے بڑے بیٹوں کو لے کر پاکستان چلے جاتے ہیں اور اپنے پیچھے بیگم اور چار چھوٹے بچوں کو چھوڑ جاتے ہیں اس وعدے کے ساتھ کہ کچھ دنوں کے بعد وہ ان کو پاکستان بلالیں گے۔ لیکن وہاں وہ ایک انیس برس کی لڑکی سے شادی رچا لیتے ہیں۔ باپ کی طرح بھائی بھی پاکستان میں شادی شدہ زندگی کی شروعات کر دیتے ہیں۔ انھیں اپنی ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی ہے۔ رنڈیوں کے دلال شاطر دماغ احسان بھائی جیسے لوگ ہیں جو معصومہ جیسی بے سہارا لڑکیوں کی دلالی کرتے ہیں اور شہرت کے لیے اصلی بیوی کو چھوڑ کر فلمی بیوی کے آغوش میں چلے جاتے ہیں اور جس کے ساتھ بنا شادی کیے شادی شدہ زندگی گزارتے ہیں۔ تمن جیسی بیوی ہے جو شوہر سے عاجز آ کر اپنے منہ بولے بھائی مظہر کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ سورج مل اور احمد بھائی جیسے رئیس لوگ ہیں جو بیوی کے ہوتے ہوئے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے داشتائیں رکھتے ہیں۔ رابعہ صاحب جیسے دھوکے باز اور عیار سماج سیوک ہیں جو ایک طرف دکھاوے کے لیے غریبوں میں پیسے بانٹتے ہیں وہیں دوسری جانب دنگے کرواتے ہیں اور بڑے بڑے سرکاری افسروں کو خوش کرنے کے لیے لڑکیاں مہیا کرتے ہیں۔ کرنل جیسے سرکاری افسر ہیں جو ہمہ وقت لڑکیوں کا جنسی استحصال کرتے ہیں اور ایک ایسی ماں ہے جو پیسوں کے لیے اپنی بیٹی کی نائیکہ بن جاتی ہے اور ایک انیس سالہ لڑکی ''معصومہ'' ہے جو اپنے بھائی بہنوں کی ناؤ کو پار لگانے کے لیے طوائف بن جاتی ہے۔ ناول پڑھ کر پہلا سوال ہمارے ذہن میں یہ آتا ہے کہ آخر معصومہ کے طوائف بننے کا ذمہ دار ہم کس کو ٹھہرائیں۔ اس کے ماں باپ، سماج یا پھر خود معصومہ کو؟ سچ یہ ہے کہ معصومہ کے طوائف بننے میں یہ سارے ہی ذمہ دار ہیں۔ یہاں تک کہ خود معصومہ بھی۔

عیاشانہ مزاج کے والد جنھوں نے کسی زمانے میں خواہش کی تھی کہ معصومہ کو ولایت بھیجیں گے، اس کی کسی آئی۔ سی۔ ایس سے شادی کریں گے، پاکستان جا کر انیس سالہ لڑکی سے شادی رچا لیتے ہیں بنا یہ سوچے سمجھے کہ ان کے پیچھے ان کی انیس سالہ لڑکی کا کیا بنے گا۔ عیاشانہ مزاج کی ماں شوہر کی بے وفائی کے بعد حیدرآباد سے بمبئی چلی آتی ہیں یہ سوچ کر کہ شاید یہاں پیسوں کا کوئی ذریعہ نکل آئے۔ یہاں ان کی ملاقات ایک پرانے شناسا احسان صاحب سے ہوتی ہے۔ وہ کچھ دن تو ان کی مدد کرتے ہیں اس کے بعد اپنے مطلب کی خاطر ایک رئیس احمد بھائی کے لیے معصومہ کی دلالی شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں سے سماج معصومہ کی زندگی کو تباہی کے راستے پر لے جانا شروع کر دیتا ہے۔ بیگم صاحبہ کا ممتا کا جذبہ جوش مارتا ہے اور وہ یہ برداشت نہیں کر پاتی ہیں کہ کوئی ان کی بیٹی کی دلالی کرے لیکن پھر بعد میں پیسے کو مجبوری بنا کر سودا کر لیتی ہیں۔ نیز اپنی بیٹی کو طوائف بنا کر وہ کہیں نہ کہیں اپنے شوہر سے بدلہ لینا چاہتی ہیں۔ وہ سوچتی ہیں کہ بڑے میاں کو جب پتہ چلے گا کہ ان کی بیٹی نے دھندہ شروع کر دیا ہے تو مزہ آ جائے گا۔

یہاں یہ بات بعید از قیاس لگتی ہے کہ ایک ماں محض پیسے اور بدلے کی خاطر اپنی بیٹی کا سودا کیسے کر سکتی ہے۔ لیکن عصمت چغتائی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے آگے یہ بات بھی بتادی کہ جاگیردارانہ گھرانوں

کا ماحول ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ روزہ، نماز کی خواہ کتنی ہی پابندیاں کیوں نہ ہوں لیکن برائیاں اپنی جگہ قائم تھیں اور غربت نے اسی برائی کو از سر نو زندہ کر دیا تھا:

''جاگیرداری نظام کی تمام لعنتیں سوئی پڑی تھیں۔ فاقوں اور غربت نے انھیں رگوں میں پھر زندہ کر دیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لڑکیوں کے سودے تو پشتوں سے ہوتے چلے آئے تھے۔ ان کی جوان خالہ بڈھے پھونس نواب قمرالدین کو پیسے کی خاطر بیاہی گئی تھیں۔ کھلے بندوں ان کا سول سرجن صاحب سے تعلق تھا۔ خود ان کی بڑی کے شوہر نے ایک میم سے شادی کر لی تھی۔ اس کا غم وہ ایک شاعر کی آغوش میں غلط کرتی تھیں۔ عزت اور شرافت کا پیمانہ تھا دولت اور مرتبہ۔''[1]

بہت سے ناقدین نے معصومہ کے کردار کو لے کر کچھ اعتراضات کیے ہیں۔ وہ یہ کہ معصومہ جاندار کردار نہیں ہے۔ عصمت نے اس کردار پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ گناہوں کے جال سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتی ہے۔ گرچہ وہ اپنی اس زندگی سے خوش نہیں ہے اور بعض اوقات وہ ماضی کی ان بھول بھلیوں میں کھو جاتی ہے جہاں وہ ہل مل کر سپارے پڑھ رہی ہے لیکن اس کی کمزوری یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو اپنا تقدیر مان لیتی ہے اور اس سے نکلنے کی جدوجہد نہیں کرتی۔ چونکہ وہ تعلیم یافتہ تھی لہٰذا طوائف بننے کے علاوہ روزی روٹی کا کوئی اور ذریعہ بھی ڈھونڈھ سکتی تھی۔ پھر آخر کیوں اس نے اپنے دماغ کا استعمال نہیں کیا اور اس دلدل میں پھنستی چلی گئی؟

ڈاکٹر عبدالحق کاس گنجوی اپنے مضمون ''عصمت چغتائی اور حقیقت نگاری'' میں رقم طراز ہیں:

''عصمت کی ہیروئن اپنے بے راہ روی اور جنسی دلدل میں لوٹ لگانے کے لیے معاشی حالات کو ذمہ دار قرار دیتی ہے۔ وہ یہ کہہ کر تسلی دیتی ہے کہ اگر اس کا عورت پن نیلام ہو رہا ہے تو یہ اس کی غلطی نہیں۔ معاشی بدحالی اور اس سے پیدا ہونے والی مجبوریاں اسے اس گرے ہوئے مقام پر لے آئی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ لیکن آفاقی اقدار کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اندر کا انسان مرنے نہ پائے۔ وہ ان واقعات اور حالات کے اصل مسئلے پر غور کر کے ان پر قابو پانے کی ہر ممکن مسلسل جدوجہد کرتا رہے۔''[2]

ڈاکٹر فرزانہ اسلم لکھتی ہیں:

''عصمت کو معصومہ سے اگر واقعتاً ہمدردی ہوتی تو وہ اسے تقسیم کا المیہ بنا سکتی تھیں۔۔۔۔۔۔۔ اس ناول میں جاندار کردار صرف دو ہیں سیٹھ سورج مل کنوڈیا اور راجہ صاحب۔ احسان صاحب کے کردار میں بھی حقیقت نظر آتی ہے لیکن معصومہ ایک طوائف سے اوپر نہیں اٹھتی۔''[3]

''معصومہ'' جاندار کردار ہے یا نہیں یہ الگ بحث ہے البتہ عصمت نے معصومہ کے کردار کو جس

انداز میں پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس کردار کو پیش کرنے کے پیچھے ان کا جو مقصد تھا وہ بالکل واضح ہے۔ معصومہ کے کردار میں کسی طرح کی کوئی جدو جہد نہ دکھانے کے پیچھے وجہ یہ ہے کہ عصمت اس کے توسط سے اس حقیقت کو پیش کرنا چاہتی ہیں کہ معصومہ کی طرح اور نہ جانے سماج میں کتنی لڑکیاں ہیں جو حالات کے آگے سر جھکا دیتی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان اپنی پریشانیوں کو سبب بنا کر کس طرح اور کتنی جلدی گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہے اور جب وہ گناہوں کے دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے تو پھر اس کو کوئی بھی غلط کام کرنے میں جھجک محسوس نہیں ہوتی، سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔ نیز عصمت اپنے کرداروں کی بے راہ روی کے لیے محض معاشرے کو ہی الزام نہیں دیتیں بلکہ اس کے لیے وہ عورت کو خود بھی اس کا ذمہ دار ٹھہراتی ہیں، ورنہ معصومہ کے حوالے سے وہ یہ باتیں کبھی نہ کہتیں:

> ''بدی کتنی جلدی اور آسانی سے انسان میں رچ جاتی ہے۔ نیکی کی تلقین کے لیے بڑے بڑے اوتار اور پیغمبر سر پٹک کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ہار گئے۔ بدی دلچسپ ہے، ہنگامہ خیز ہے، نیکی کٹھن لوہے کے چنے چبانے کی طرح ہے۔ ساری عمر کی تربیت رانگے کی قلعی کی طرح دو چار تاو لگنے سے اتر گئی۔'' ۴
>
> ''گناہ جب ضرورت زندگی کی صورت اختیار کر لے تو پھر گناہ نہیں عقل و دانش کا تقاضا بن جاتا ہے۔ جس حمام میں سب ہی ننگے تھے وہاں اسے اپنے برہنہ پن سے کیوں تکلف محسوس ہوتی۔'' ۵

عصمت کو اس بات کا احساس ہے کہ معصومہ پیسے کے لیے کوئی اور جائز راستہ اپنا سکتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں کرتی بلکہ وہ مجبور ہو کر اپنی ماں کے فیصلے کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ یہاں پر معصومہ کی وہ کمزوری ابھر کر سامنے آتی ہے جو عصمت دکھانا چاہتی ہیں۔ اسی طرح ماں محنت کر کے کسی طرح پیسے کا انتظام کر سکتی تھیں اور اپنی بیٹی کو غلط راستے پر جانے سے بچا سکتی تھیں لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ محنت و مشقت کرنا ان کی فطرت میں ہی نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی کبھی کوئی مشکل کام نہیں کیا تھا۔ خالاؤں، پھوپھیوں اور نانی نے معصومہ کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ انھوں نے اس کو نو مہینے پیٹ میں رکھا تھا اور شاید اسی کا کرایہ وصول کرنے جا رہی تھیں۔ غرض کہ عصمت کے دوسرے ناولوں کی طرح اس میں بھی ماں کا کردار بہت ہی غیر ذمہ دارانہ ہے۔

''عصمت، معصومہ کو تقسیم کا المیہ بنا سکتی تھیں'' یہ کہنا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ معصومہ تقسیم ہند کی وجہ سے تباہی کے راستے پر نہیں پہنچی۔ تقسیم تو اس کی تباہی کا صرف ایک بہانہ ہے۔ اصل ذمہ دار اس کے والدین ہیں جنھوں نے اسے قعر مذلت میں دھکیل دیا۔

غرض کہ ان تمام تر باتوں کے پیش نظر معصومہ کے حوالے سے یہ کہنا کہ عصمت کو کردار نگاری میں مہارت حاصل نہیں ہے یا یہ کہ عصمت انسان کی اعلیٰ اقدار کو ذہن میں نہیں رکھتیں اور نہ ہی وہ یہ ثابت کرتی ہیں کہ انسان اپنی لگن اور ذہنی صلاحیتوں کی وجہ سے ہر قسم کی پریشانیوں سے نجات پا سکتا ہے یا پھر یہ کہ عصمت کو

اس کردار کی پیش کش میں حقیقت کے ساتھ تخیل سے بھی کام لینا چاہیے تھا اور اس کردار میں تھوڑی بہت لچک پیدا کرنی چاہیے تھی، یا پھر یہ کہ عصمت اس کردار کی جانب تھوڑا اور توجہ دیتیں تو یہ دوسری 'امراؤ جان ادا' بن جاتی۔ یہ سب کہنا بے معنی سا لگتا ہے کیونکہ عصمت سماج کی اس حقیقت کو پیش کرتی ہیں جو وہ خود دیکھتی ہیں۔ انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کوئی ان کے کردار کو جاندار کہے یا بے جان، حقیر ترین مخلوق کہے یا اعلیٰ اقدار کا نمونہ۔ انھوں نے اس کردار کا نقشہ جس طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے اس سے بس ہمیں یہی سمجھنا چاہیے کہ اگر سماج میں کرشن چندر کی ''لاچی'' [ایک عورت ہزار دیوانے] جیسی باغی، سمجھدار اور پُر ہمت لڑکیاں ہیں تو ''معصومہ'' جیسی بزدل، فرمانبردار اور مشکل حالات میں سر جھکا دینے والی لڑکیاں بھی ہیں۔

چونکہ عصمت چغتائی کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے مسلم متوسط طبقے کے گھرانوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی جنسی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو اپنا موضوع بنایا، لہٰذا ان کی تحریروں میں جنسی عناصر کی کارفرمائی فطری بات ہے۔ ناقدین نے ان کی جنس نگاری کے سلسلے میں الگ الگ توجیہات پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر ہارون ایوب لکھتے ہیں:

> ''عصمت چغتائی کے ناولوں کا اہم موضوع جنس ہے جس کو انھوں نے بڑی بے باکی اور بے تکلفی سے پیش کیا ہے لیکن جنسی حقیقت میں لذتیت کا کوئی پہلو نمایاں نہیں ہوتا۔'' ۶

ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاس گنجوی رقم طراز ہیں:

> ''عصمت چغتائی نے حقیقت نگاری کے جوہر تو دکھائے ہیں کمی صرف اس بات کی ہے کہ انھوں نے مسائل کا گہرا فلسفیانہ تجزیہ نہیں کیا ہے۔ وہ لذتیت کی دلدل سے بچ کر نہیں نکلتیں۔'' ۷

ڈاکٹر نیلم فرزانہ لکھتی ہیں:

> ''نیلوفر کے سلسلے میں بعض بیانات میں اس قدر عریانیت آگئی ہے کہ وہ گراں گزرتی ہے۔ اس طرح کے عریاں بیانات سے اگر یہ ناول پاک ہوتا تو بھی اس کی حقیقت نگاری میں کوئی فرق نہ آتا۔'' ۸

عصمت چغتائی ایک بے باک تخلیق کار ہیں۔ انھوں نے انسان کی جنسی زندگی کی جس نئی حقیقت کا سراغ لگایا تھا اس کو پیش کرنے کے لیے انھیں ہر طرح کی سماجی پابندیوں، اخلاقی اقدار، رسومات اور ماحول سے بغاوت کرنی تھی۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے ناول ''معصومہ'' میں دوسرے ناولوں کے بالمقابل جنسی عناصر سے زیادہ کام لیا ہے۔ لیکن یہ بات محلِ نظر رہے کہ عریانیت سے کام لینا ان کی مجبوری تھی ورنہ یہ کیسے پتہ چلتا کہ وہ معصومہ جو ایک نارمل ہستی کی طرح کہانی میں داخل ہوئی تھی حالات و واقعات سے متاثر ہو کر اپنے اوپر سے ایک ایک چادر اس طرح ہٹاتی چلی گئی کہ اس کا جسم ہی نہیں بلکہ روح

بھی ننگی ہوگئی تھی اور کس طرح کہانی کے انجام تک پہنچتے پہنچتے اس کے اندر کے طوائف کا رویہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ کہانی میں بعض لمحے ایسے بھی آتے ہیں جہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی بے حیائی، بے شرمی اور فحاشی سے سامنے والے کو تھپڑ مارنے کی کوشش کر رہی ہو اور یہ کہہ رہی ہو کہ دیکھو تم سب لوگوں نے میرا غلط استعمال کیا تو میں بھی کسی سے کم نہیں:

''میں ڈھل گئی ہوں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بلاؤز تار تار کر ڈالا اور تن کر کھڑی ہوگئی۔ دیکھ اندھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ اس بپھرے ہوئے طوفان کو دیکھتے رہ گئے۔ بیگم کے ہاتھ سے سلاد کی پلیٹ چھوٹ پڑی۔''

''ہے ہے نامراد۔ دیوانی ہوئی ہے کیا؟ شرم نہیں آتی؟''

''نہیں آتی شرم۔ نیلوفر نے آنسوؤں بھرا قہقہہ لگایا اور جھٹکے سے بکھرے ہوئے بال پھینک کر بالکل احسان صاحب کے سر پر چڑھ آئی۔'' 9

''دام نہیں خرچنا ہوں گے۔ مفت۔ بس ایک بار۔ لو مجھے بانہوں میں لے لو۔ اس نے ڈریسنگ گاؤن کرسی پر چھوڑ دیا اور کھڑی ہوگئی اور جب منیجر صاحب کے گیلے گیلے رال میں تر ہونٹ اس کے قریب آئے تو اس نے اپنے دل کا سارا غصہ بھاری بھتک منہ میں سمیٹ کر اس کے چہرے پر تھوک دیا۔'' 10

عصمت نے اس ناول میں سیٹھ سورج مل کنوڈیا کے توسط سے بمبئی کی فلمی دنیا کا مکمل نقشہ کھینچا ہے اور اس چمک دمک کی اصل زندگی کے پول کھولے ہیں۔ کس طرح یہاں سود، رشوت، بلیک پیسہ کا بازار گرم ہے۔ سب ایک دوسرے کو لوٹنے پر لگے ہوئے ہیں۔ یہاں جس انسان کو آسمان پر چڑھایا جاتا ہے پل بھر میں اس کو زمین پر گرا دیا جاتا ہے۔ پروڈیوسر ہیروئنوں کو اپنی فلم میں رکھنے کا وعدہ کر کے ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ سیٹھ سورج مل بھی انھیں میں سے ایک ہے جو فلم میں آنے والی لڑکیوں سے دستخط کروا کے ان کے نام سے لڑکیوں کا لین دین کرتا ہے۔ معصومہ پڑھی لکھی تھی لیکن اس کے باوجود وہ سائن کر دیتی ہے کیونکہ اسے اسی میں فائدہ نظر آتا ہے۔ وہ سورج مل کو اپنا شوہر مان چکی تھی لیکن سورج مل سے معصومہ کے جب ایک لڑکی ہو جاتی ہے تو پھر اس کے لیے اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہ جاتی۔ اب اس کی نظر پنجاب سے آئی ہوئی ایک نئی لڑکی میں سما جاتی ہے۔ نیلوفر کو جب اس بات کا علم ہوتا ہے تو وہ غصے میں آ کر چیک پر دستخط کرنے سے منع کر دیتی ہے لیکن سورج مل کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا ہے کیونکہ پنجاب کی نوخیز کلی شگوفہ کے پاس جسم ہی نہیں بلکہ پیسہ بھی ہے۔

فلمی دنیا کی اصل زندگی کو مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھیے:

''کیا بھگوان کی لیلا ہے اس کی ماں کا یار اس کا قانونی شوہر قانون اور شوہر، شوہر اور قانون.......... سب ایک سڑک کے پتھر ہیں، جن سے نیلوفر جیسی

بے بس لڑکیوں کو سر پھوڑنا پڑتا ہے.......... کل شگوفہ کے پہلے فلم کی مہورت
ہے۔ وہی ہیروئن ہے، وہی اپنا پیسہ لگا رہی ہے۔ اپنا پیسہ.......... سیٹھ کا
پیسہ.......... اپنا جسم.......... اور سیٹھ کا جسم!
یہی پیار ہے.......... اور یہی بیوپار!'' [1]

عصمت نے اس ناول میں راجہ صاحب کے توسط سے تقسیم کے بعد کی سیاسی صورت حال کا بھی نقشہ کھینچا ہے کہ تقسیم کے بعد کس طرح زمین دار اور جاگیردار تاجر بنتے جا رہے تھے۔ یہ خود کو حب الوطن اور سماج سیوک کے روپ میں پیش کر رہے تھے اور افسروں کو رشوت دے کر اپنا اُلّو سیدھا کر رہے تھے۔

سورج مل نے اونچی قیمت لگا کر معصومہ کو راجہ صاحب کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ یہ راجہ صاحب ایک ایسے ہی سماج سیوک تھے جو راجہ ہوتے ہوئے بڑے بڑے شہروں میں اپنی جائیداد بنا رہے تھے۔ اپنے کاروبار میں اضافہ کرنے کے لیے بڑے بڑے سرکاری افسروں کو شراب اور حسین لڑکیاں پیش کر کے ان سے دوستی مضبوط کرتے تھے۔ معصومہ بھی آئے دن کرنل صاحب کا دل لبھانے کے لیے مہیا کی جاتی۔

اس ناول کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ سماج کے مکروہ چہرے احسان، احمد بھائی، سورج مل کنوڈیا، راجہ صاحب وغیرہ آج بھی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کے مقابل ''معصومہ'' جس کو اپنی غلطی کا احساس ہے جو اپنی بہن حلیمہ کی شادی نہ ہو سکنے کا سارا الزام اپنے سر لے لیتی ہے، جو اپنے بھائی بہنوں کی تعلیم کے لیے پوری زندگی پیسوں کا انتظام کرتی ہے، سماج کی پیشانی پر ایک بدنما داغ بن کر رہ گئی۔ سماج میں اس کی حیثیت ایک رنڈی سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اس طرح اس کا کردار ایک زبردست المیہ بن کر ابھرتا ہے۔

عصمت کی تخلیقات میں جو چیز سب سے زیادہ قاری پر اثر کرتی ہے وہ ان کی زبان ہے۔ اصطلاحات و محاورات، نت نئی تشبیہات میں ان کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ ان کی تحریریں پڑھتے ہوئے بات چیت کے جس تجربے سے ہم گزرتے ہیں وہ ہمیں بیدی، کرشن چندر اور منٹو کے یہاں کم ہی نظر آتا ہے۔ غرض کہ عصمت نے اپنے ناولوں کے ذریعے معاشرے کی ایسی تہہ در تہہ پرتیں کھولی ہیں جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی نہیں تھیں۔ یہ عصمت ہیں جنھوں نے ایک بار پھر ہمیں ان کی جانب ایک نئے انداز سے متوجہ کیا۔

حواشی:

۱۔ عصمت چغتائی، معصومہ، ص ۵۴، آفسیٹ پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۲ء
۲۔ ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاس گنجوی، مضمون عصمت چغتائی اور حقیقت نگاری، مشمولہ عصمت چغتائی نقد کی کسوٹی پر (جمیل اختر)، ص ۴۳۲، میکاف پرنٹرس، دہلی، ۲۰۰۱ء
۳۔ ڈاکٹر فرزانہ اسلم، عصمت چغتائی بحیثیت ناول نگار، ص ۱۰۵۔۱۰۶، انیس آفسیٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء ر ۴۔ معصومہ، ص ۵۳۔۵۴ ر ۵۔ ایضاً، ص ۹۶

۶۔ ڈاکٹر ہارون ایوب، پریم چند کے بعد اردو ناول، ص۱۴۲، اردو پبلشرز، لکھنؤ، جون ۱۹۷۸ء
۷۔ ڈاکٹر عبدالحق حسرت کاس گنجوی، مضمون عصمت چغتائی اور حقیقت نگاری، ص۲۴۰
۸۔ نیلم فرزانہ، اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، ص ۹۷، جے کے آفسیٹ دہلی، ۲۰۱۴ء
۹۔ معصومہ، ص۷۰ / ۱۰۔ ایضاً ص۸۶۔۸۷ / ۱۱۔ ایضاً ص۶۸

☆☆☆

فارم - 4
[ضابطہ 8 کے تحت]

۱۔ اشاعت کی جگہ : پٹنہ [بہار]
۲۔ اشاعت کا وقفہ : سہ ماہی
۳۔ پرنٹر کا نام : عظیمہ فردوسی
شہریت : ہندستانی
پتہ : آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج،
پوسٹ آفس: گلزار باغ، پٹنہ - 800007 [بہار]
۴۔ ناشر کا نام : عظیمہ فردوسی
شہریت : ہندستانی
پتہ : آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج،
پوسٹ آفس: گلزار باغ، پٹنہ - 800007 [بہار]
۴۔ ایڈیٹر کا نام : عظیمہ فردوسی
شہریت : ہندستانی
پتہ : آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج،
پوسٹ آفس: گلزار باغ، پٹنہ - 800007 [بہار]

میں عظیمہ فردوسی تصدیق کرتی ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات بالکل درست اور صحیح ہیں۔

[دستخط]
عظیمہ فردوسی

☆☆☆

(۲)

'اس کی بیوی' : ایک نفسیاتی تجزیہ

● سلمان عبدالصمد

انسانی نفسیات کے مطالعہ کا موضوع انسانی کردار اور وہ ماحول یعنی اشیا ہیں، جن کے درمیان انسان رہتا ہے۔ یا پھر یہ کہا جانا مناسب ہے کہ 'عمل اور ردعمل' کے محور پر ہی نفسیاتی مطالعہ گردش کرتا ہے۔ محور کے گرد ہونے والی گردش کا تجزیہ ہی یہ واضح کرتا ہے کہ انسانی افعال برے ہیں تو کیوں، اچھے ہیں تو کیوں ؟ کن عوامل کی کارفرمائی انسانی ذات کو کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ غلام عباس کی یہ کہانی 'اس کی بیوی' کے مختلف کردار اس ضمن میں ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔

''ہم نفسیات میں فطرتِ انسانی کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے لیے ہم کو صرف اتنا ہی نہیں جاننا چاہیے کہ انسان کے افعال کیا اور اس کے تجربے اور کردار کی صورتیں کیا ہیں بلکہ ہمیں یہ بھی جاننا ہوگا کہ انسان کا فعل مختلف طریقوں سے کیوں ہوتا ہے اور اس کے تجزیے کی مختلف صورتیں کیوں ہوسکتی ہے''۔(1)

امرتسر میں اس آب وگل کے چمن میں آنکھ کھولنے والے غلام عباس کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور، دہلی اور کراچی میں بسر ہوا۔ ان کی پہلی کہانی 'بکری' 1922ء میں شائع ہوئی تھی۔ تاہم ان کا پہلا باقاعدہ افسانہ 'جلاوطن' تسلیم کیا گیا، جو ٹالسٹائی کے ایک افسانے سے ماخوذ تھا۔ 1928ء میں غلام عباس لاہور سے شائع ہونے والے بچوں کے مشہور ماہنامے 'پھول' سے وابستہ ہوگئے۔ اسی دوران غلام عباس صاحب کا پہلا طبع زاد افسانہ 'مجسمہ' شائع ہوا۔ لیکن غلام عباس کی شہرت کا نقطۂ آغاز 'آنندی' ہے، جو 1939 میں شائع ہوا تھا۔ 1948 میں شائع ہونے والے ان کے پہلے افسانوی مجموعے کا نام بھی 'آنندی' ہی ہے۔ 1938 میں غلام عباس آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوگئے اور ریڈیو کے رسالوں ''آواز'' اور ''سارنگ'' کی ادارت کی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے اور اس کے رسالے ''آہنگ'' کے مدیر مقرر

ہوئے۔''آنندی'' کے بعد غلام عباس کی متعدد کتابیں شائع ہوکر منظر عام پر آئیں۔جن میں افسانوی مجموعے'جاڑے کی چاندنی'، 'کن رس'، 'زندگی نقاب چہرے'، ناول 'گوندنی والا تکیہ'، انگریزی افسانوں کے تراجم 'الحمرا کے افسانے'، فرانسیسی ادب پارے سے ماخوذ 'جزیرہ سخنوراں'، ناولٹ 'دھنک' اور بچوں کی نظموں کا مجموعہ 'چاند تارا' شامل ہیں۔

جب بھی کبھی اردو افسانہ نگاری کے حوالے سے راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، کرشن چندر وغیرہ کا نام لیا جائے گا وہیں غلام عباس کا نام بھی اپنی انفرادیت درج کروائے گا۔ان کے افسانوں میں صداقت، واقعیت اور حقیقت پسندی کا وہ جوہر جھلکتا ہے جو افسانہ نگاری کی جان ہے۔ان کے کردار روز مرہ زندگی اور معاشرے کے چلتے پھرتے اور جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں۔ان کی کہانیاں ہمارے عہد اور ماحول کی کہانیاں ہیں۔انھوں نے زندگی کے فوری اور معمولی تجربات سے بھی نہایت اہم اور دور رس نتائج اخذ کیے ہیں۔اس کے افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم جن تجربات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ان میں بھی گہری معنویت پوشیدہ ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں نفسیاتی دروں بینی کا عنصر بھی بہت نمایاں نظر آتا ہے اور وہ اپنے کرداروں کی نفسیات کا مکمل تجزیہ پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

دیگر کہانیوں سے قطع نظر پچیس سالہ نوجوان کے اردگرد گھومنے والی یہ کہانی 'اس کی بیوی' ایک طرف مرکزی کردار نوجوان کے پیچ وخم کو سلجھانے کا مطالبہ کرتی ہے تو دوسری طرف نسرین نامی طوائف کی محرومی [احساس کمتری] بھی انسانی ذہن پر کچوکے لگاتی ہے۔غلام عباس نے اس عام فہم کہانی میں بنیادی نفسیات یا بنیادی تھیم کے علاوہ کئی ایک معاشرتی مسئلے کو ابھارا ہے۔کہانی کا نفسیاتی مطالعہ سب سے پہلے طوائف نسرین کی محرومی کو نشان زد کرتا ہے کہ وہ ماں کی محبت سے یکسر محروم ہے۔ساتھ ہی ساتھ بہن بھائیوں کا پیار بھی اسے نصیب نہیں ہوا۔اسی محرومی کی دین ہے کہ وہ نوجوان [مرکزی کردار] کی ماں کا تذکرہ بڑے اہتمام سے سنتی ہے۔اس کی بہن کی کہانیوں میں اسے خاصی دلچسپی ہے۔یہاں احساس ہوتا ہے کہ یہ محرومی [Deprivation] انسانی تحت الشعور میں اس طرح پیوست ہوتی ہے کہ جہاں بھی کہیں محبت والفت کا احساس ہو، محروم فرد اس کی طرف از خود بڑھنے لگتا ہے۔ایک انوکھا انجانا کشش پیدا ہو جاتا، جیسا کہ اس کہانی میں مختلف مقامات پر اس کا احساس ہوتا ہے:

''اور آدھی تنخواہ آپ اپنی امی جان کو بھیج دیتے ہیں''۔

نسرین نے محسوس کیا کہ اس کی ماں اسے بہت چاہتی ہوگی۔

نسرین کا خیال تھا کہ وہ کم سے کم ایک گھنٹہ نوبہار کے ہاں ضرور ٹھہرے گی، مگر پاؤ گھنٹہ بھی نہ

گزرنے پایا تھا کہ اٹھ آئی اور سیدھی اوپر کی منزل میں پہنچی۔''

پھر جس طرح بچہ سوتے سوتے ڈر جائے تو ماں اسے چھاتی سے چمٹا لیتی ہے، نسرین نے بھی اسی طرح اس [نوجوان] کا سر اپنے بازو میں لے کر اسے اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔

کہانی کے یہ جملے اس بات پر شاہد ہیں کہ نسرین طوائف کو اپنی اس محرومی کا احساس ہے، جو اس کے اندر ماں کی ممتا اور بھائی بہنوں کی الفت کے فقدان کی صورت میں پیدا ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ ایک ایسے نوجوان کی طرف کشاں کشاں کھنچی چلی جارہی ہے، جس نے اپنی ماں اور بہن کی کہانی سنائی اور کچھ لبھاؤنے جملوں سے نسرین کے دل کو اپنی طرف ملتفت کر لیا ہے:

''ماں کی شفقت سے محرومی Oral Deprivation کہلاتا ہے۔ ایام طفولیت میں ماں کی شفقت اور نگہداشت سے محروم ہو جانے کی وجہ سے جس ذہنی تکلیف کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔''(2)

کہانی ایک ایسے نوجوان کی ہے، جو اپنی بیوی کی موت کے بعد طوائف کے پاس جاتا ہے اور اس سے اپنی بیوی کا سا سلوک کرتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نوجوان کو اس میں اپنی بیوی کا عکس نظر آتا ہے۔ نسرین طوائف سے نوجوان کا مکالمہ اور رویہ، نسرین کی تحلیل نفسی کو ابھارتا ہی ہے، ساتھ ہی ساتھ کہانی کے دیگر نفسیاتی پہلوؤں کو بھی واضح کرتا ہے۔

نسرین ایک طرف جہاں نوجوان کی ماں اور بہن کے تذکرے میں دلچسپی لیتی ہے، وہیں اس کی بیوی کا تذکرہ اس کی تیوری چڑھا دیتا ہے۔ حالانکہ اسے خوش ہونا چاہئے تھا کہ نوجوان کی بیوی اس سے مماثلت رکھتی تھی۔ اس کی بیوی کا عکس اس کے اندر بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن نوجوان کی بیوی کے تذکرہ سے طوائف نسرین کو پریشانی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں پر یہ احساس ہوتا ہے کہ عورت اپنے ہم پلہ عورت کے تذکرہ سے خوش نہیں ہوتی، بلکہ وہ رقابت کی آگ میں جھلسنے لگتی ہے۔ رقابت کا یہی جذبہ 'سوتن' کے معاملے میں شدت اختیار کر جاتا ہے۔ اگر ماں کے روپ میں کسی دوسری ماں کے پاس یہ تذکرہ ہو تو وہ سوچتی ہے کہ مجھ سے بہتر کوئی ماں ہو بھی کیوں۔ اگر کسی بیوی کا ذکر ہو تو، مخاطب عورت کے اندر ہلچل مچ جاتی ہے کہ مجھ سے بہتر بیوی کوئی ہوگی بھی تو کیوں۔ یعنی ہم پلہ عورت میں یہ رقابت کا جذبہ شدید تر ہوتا جاتا ہے:

''وہ سوچ رہی تھی کہ یہ کیسا مرد ہے جس کے پاس بات کرنے کو بیوی ہو اور کوئی موضوع ہی نہیں۔ وہ دو گھنٹے سے برابر اسی عورت کا ذکر کئے جا رہی تھی، جو اب دنیا میں موجود نہ تھی''۔.....شروع شروع میں نسرین کو اس ذکر سے کچھ یوں ہی سی دلچسپی ہوئی تھی جیسا کہ ابتدا میں عموماً ایک عورت کو دوسری عورت کے ذکر سے ہوا کرتی ہے مگر جلد ہی اس سے بیزار ہو گئی تھی۔''

ضمنی کردار کے ان نفسیاتی پہلوؤں کے علاوہ اس کہانی کی بنیادی (نفسیاتی) تھیم نوجوان کی بیوی

کی بدچلنی ہے۔

فضیل جعفری کہانی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: اس کہانی کے آخری منظر میں غلام عباس نے بڑی مہارت کے ساتھ جنسی خواہش اور لذت پرستی کو خالص محبت کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ فضیل کے لفظوں میں: ''نسرین طوائف نہیں رہ کر محض ایک عورت رہ جاتی ہے۔'' میں فضیل سے اتفاق نہیں کرتا۔ نوجوان نسرین کے پاس محبت کی خاطر نہیں آیا ہے بلکہ اپنی نفرت بانٹنے آیا ہے۔ نوجوان اگر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیوی کی بے وفائی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے اور بیوی کا احترام باقی ہے تو سچ تو یہ ہے کہ محبت نفرت میں بدل چکی ہے۔'' (2)

معاصر فکشن میں جنسی دروں بینی کے حوالے سے شہرت رکھنے والے شموئیل احمد کا کہنا ہے محبت نفرت میں بدل چکی ہے۔ وہ اس طرح کہ بیوی کے غیر مرد سے تعلقات تھے، جو کہ اب مر چکی ہے۔ جس کا علم اس کے مرد کو بھی تھا، مگر اس نے بدچلنی پر کچھ نہیں کہا کہ کیا فائدہ؟ مگر اب جب کہ وہ کسی ایسی طوائف کے پاس ہے، جس کے نین ونقشے، عادات واطوار اور زلفیں اس کی بیوی سے ملتی جلتی ہیں تو مرد اس کی ہی تحقیر کرتے ہوئے ایک جسم بیچنے والی عورت کی حیثیت سے اپنی بیوی کی شناخت کر رہا ہے، کیوں کہ وہ بدچلن بیوی کو کچھ کہہ نہیں سکا تھا۔

میرے نظریہ سے ''اس کی بیوی'' کی فضا شموئیل احمد کے نظریہ کے علاوہ دیگر نظریہ کی بھی تصدیق کرتی ہے، کیوں کہ بیوی کی بدچلنی کا علم ہونے کے بعد بھی نوجوان اس سے متنفر نظر نہیں آتا، حتیٰ کہ انتقال کے بعد صدمے سے چور ہو جاتا ہے اور نہ ہی اس کی بیوی غیر مرد سے رشتہ استوار کرنے کے بعد اپنے آپ کو شوہر کے لیے کسی جزدان میں لپٹے ہوئے مذہبی صحیفے کی حیثیت اختیار کرنے کی کوشش کرتی۔ اگر وہ پاکباز بننے کی کوشش کرتی تو مرد کے اندر تحقیر کی نفسیات جنم لیتیں۔ مزید اپنی بیوی کی طرح طوائف کے ساتھ سلوک کرنا، گوشت خرید کر لانا اور اسی کے گھر پر خود اپنے ہاتھوں سے بنانا، بہن کی کہانی سنانا، بازار میں ٹہلانا اور تحفے تحائف 'محبت کو نفرت' میں بدلنے کی علامت شاید نہیں۔ اس کی استطاعت نہیں تھی کہ وہ نسرین کے پاس جاسکے، تاہم تدبیروں کے ساتھ روپے جمع کر کے جانا قطعاً نفرت کی آگ لگانے کی علامت نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر نسرین سے نوجوان یہ کہتا کہ میری بیوی بھی تمھاری جیسی تھی، میں اسے فلاں فلاں چیزیں لا کر دیتا تھا مگر تمھارے لیے نہیں لا سکتا۔ اس کے لیے ہنڈیا پکاتا تھا، مگر تمھارے لیے نہیں پکا سکتا۔ مرد کا رویہ بدل جاتا تو یہ کہنے کی گنجائش رہتی کہ بیوی کی بدچلنی کے بعد وہ سزا نہیں دے سکا تو اب اس عورت کو جس میں بیوی کا عکس نظر آتا ہے، سزا دے رہا ہے۔ پوری کہانی کا ایک بھی جملہ شموئیل کے قول کی تائید نہیں کرتا ہے۔ پھر شموئیل احمد کے اس قول: 'نوجوان اگر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیوی کی بے وفائی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا ہے اور بیوی کا احترام باقی ہے' پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو ردعمل سامنے ہے، اس پر غور وفکر نہیں

کرنا اور جو مسئلہ بالکل ہی معدوم ہو اور اس کے وقوع کا کوئی قرینہ بھی نہیں پایا جاتا ہو، اس پر ہی نفسیاتی ارتکاز قائم رکھنا، کہاں مناسب بات ہوگی۔

اگر کہانی کی اس 'رومان پرور فضا' پر 'نفرت' کا لیبل چسپاں کر کے شموئیل انوکھی جنسیات واضح کرنا چاہتے ہیں تو اس سے بھی انوکھی جنسیت کچھ یوں ہو سکتی ہے، جس کی تائید کہانی کی فضا کرتی ہے۔ بین السطور سے ابھرنے والی کہانی کے مدنظر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نوجوان کی نفسیات جنسیت زدگی کی بدترین شکل میں ابھر رہی ہے، بایں طور کہ شاید اب اس کی نگاہ میں ایسی عورت ہی بھلی لگنے لگی ہو، جس پر صرف ایک ہی مرد حکمراں نہیں ہو، تاکہ نوجوان زعم میں مبتلا رہے کہ جس عورت میں میری دلچسپی، اسی سے بہت سارے مرد بھی الجھے ہیں، یعنی میری عورت کی خوبصورتی اور پر کشش اداؤں کا جلوہ دیکھ! یہی وجہ ہے کہ وہ نسرین کے ساتھ بھی بیوی کی طرح ہی حسن سلوک کر رہا ہے۔ نوجوان کے اسی حسن سلوک کی دین ہے کہ طوائف کو فقط اپنے پیشے سے ہی سروکار نہیں رہ جاتا ہے، بلکہ یہی رویہ اس کے دل میں بھی محبت کا جادو جگا جاتا ہے۔ یعنی محبت اب یک طرفہ نہیں، بلکہ دو طرفہ ہے۔ اس رومان پرور فضا میں 'نفرت' دم بھی مارے تو کیسے؟۔ ہاں نوجواں کی جنسی کجروی [Sex Aberration] کا عنصر کھینچا تانی میں نکل سکتا ہے۔

حواشی :

(1) سید محمد محسن، ابتدائی نفسیات، (طبع ثالث) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2014، ص 12۔

(2) الفریم روزن، ابنارمل نفسیات، (مترجم: ذکیہ مشہدی) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1985، ص 162)

(3) شموئیل احمد، اردو کی نفسیاتی کہانیاں (مرتب)، ارم پرنٹرس، دریاپور، پٹنہ 2014، ص 13۔

☆☆☆

شہرِ غزل

پیش رَو غزلیں

سلطان اختر ر

عبدالرحیم نشتر رقمر سیوانی رظفر اقبال ظفر رضیا فاروقی ر

دس خاص غزلیں

راشد جمال فاروقی رعبدالاحد ساز رکہکشاں تبسم ر

ہم عصر غزلیں

رئیس الدین رئیس رڈاکٹر رونق شہری رڈاکٹر علی عباس امید ر

ڈاکٹر صفدر رراشد طراز رسردار آصف رشکیل اعظمی رمحمد عابد علی عابد راختر کاظمی ر

عقیل گیاوی رمناظر حسن شاہین رطارق متین رڈاکٹر نوشاد احمد کریمی ر

ڈاکٹر وارث انصاری رزاہد کونچوی رنورالحسن نور ر

نثار جیراجپوری رمصداق اعظمی ر

سیودہ ساقی ر

سوغات غزلیں

احمد عطا [پاکستان]

بیس میزبان غزلیں

خورشید اکبر

تعزیتی غزلیں

محمد مختار وفا

نوخیز غزلیں

فیاض احسن ر

بابر شریف ر

پیش رَو غزلیں

• سلطان اختر

مسلسل رائیگاں میں ہو رہا ہوں
کہ پانے سے زیادہ کھو رہا ہوں
خوشی کی گرد چہرے پر بہت ہے
جنھیں اب آنسوؤں سے دھو رہا ہوں
عجب سی کیفیت میں گم ہوں، یعنی
نہ ہنستا ہوں نہ اب میں رو رہا ہوں
کبھی بھی میں نے آئینہ نہ بدلا
وہی ہوں آج بھی، کل جو رہا ہوں
درودیوارِ جاں میں ہوں مقید
میں اپنے آپ میں اب سو رہا ہوں
مری قسمت میں ہے فصلِ تباہی
جو کاٹی ہے اُسی کو بو رہا ہوں
میں اب بچوں کو اپنے کیا بتاؤں
بزرگوں کی انا کیوں ڈھو رہا ہوں
خوشی ہاتھ آئے گی حد سے زیادہ
کئی دن سے مسلسل رو رہا ہوں
ابھی کچھ نم ہے اختر دل کی مٹی
سو پھر تخمِ تمنا بو رہا ہوں

صحرائے تشنگی نہ سمندر میں قید ہے
ہر شخص آج خوف کے محور میں قید ہے
آزادِ فکر ہے مری پروازِ بے مثال
پاگل ہوا ابھی مرے شہپر میں قید ہے
بے چارگی کے بوجھ سے لہریں نڈھال ہیں
موجوں کی مار عزمِ شناور میں قید ہے
رنگِ جمال ہو کہ طلسمِ خیال ہو
سب کچھ فسادِ ذہن کے محور میں قید ہے
تکیے پہ نرم بوسوں کی خوشبو ہے موجزن
قربت کی تشنگی ابھی بستر میں قید ہے
زندانِ مصلحت میں ہے ہر شخص خیمہ زن
کوئی کھلی فضا میں نہ تو گھر میں قید ہے
دستِ ستم سے سُرخیاں آزاد ہو چکیں
لیکن لہو کا ذائقہ خنجر میں قید ہے
بام و درِ شعور دھنک رنگ ہو گئے
یہ کس کا عکس شام کے منظر میں قید ہے
وہ جامِ خوش خیال ہو یا زہرِ صد ملال
جو کچھ ہے خواہشوں کے سمندر میں قید ہے
اختر کوئی پناہ کی صورت کہیں نہیں
عالم تمام وقت کے محور میں قید ہے

● سلطان اختر

قبول ہوگی شہادت وضو تو کرلیا جائے
کہ نوکِ نیزہ کو زیبِ گلو تو کرلیا جائے

یقین ہے کہ ملے گی سکوتِ جاں سے نجات
کہ شورِ گریہ کبھی چار سُو تو کرلیا جائے

اُڑا کے دیکھ تو لیں تھوڑی خاکِ دربدری
کہ جستجو کو کبھی خوبرو تو کرلیا جائے

پھر اس کے بعد متاعِ ہنر سمیٹیں گے
کہ چاک جیب و گریباں رفو تو کرلیا جائے

بس ایک بار فلک چھو تو لے مری پرواز
کہ حوصلوں کو کبھی سُرخرو تو کرلیا جائے

وہ جس کے عکس سے روشن ہے آئینہ دل کا
کہ اس کا ذکر کبھی روبرو تو کرلیا جائے

کسی طرح تو بجھے اپنی تشنگی کا چراغ
کہ تیرہ بختی کو نذرِ سبو تو کرلیا جائے

فسانہ ختم ہے وقتِ وداع ہے اخترؔ
کہ اپنے آپ کو اب قبلہ رُو تو کرلیا جائے

مصلحت کی دھوپ میں تنہا سفر کرنا پڑا
آنسوؤں سے مجھ کو کشکولِ خوشی بھرنا پڑا

روز و شب مجھ کو طوافِ جسم و جاں کرنا پڑا
زندگی بھر زندہ رہنے کے لئے مرنا پڑا

حوصلے میرے مجھے آواز دے کر رہ گئے
عمر بھر اپنی ضرورت سے مجھے ڈرنا پڑا

میں کہ ہنسنے کھیلنے والا مسافر تھا مگر
اُس کی خاطر دشتِ گریاں کا سفر کرنا پڑا

زندگی! تُجھ کو نہیں معلوم تیرے واسطے
کیسی کیسی خواہشوں کا مجھ کو دَم بھرنا پڑا

کانپ اُٹھا پانی میں وہ اپنا سراپا دیکھ کر
مُدتوں پھر اُس کو اپنے آپ سے ڈرنا پڑا

کیسے کیسے حوصلے مسمار ہو کر رہ گئے
وقت کے زینے پہ پہلا پاؤں جب دھرنا پڑا

اس کا رخ بھی کسی سے ملتا ہے
وہ بڑی بے رخی سے ملتا ہے

صورتِ تشنگی سے ملتا ہے
کوئی پیاسا ندی سے ملتا ہے

پاؤں اٹھتے ہیں تیرگی کی طرف
راستہ ، روشنی سے ملتا ہے

اس کا اپنا ہی ایک عالم ہے
کب جنوں آگہی سے ملتا ہے

دھیان کی سیڑھیاں اترتا ہوا
ایک سایہ کسی سے ملتا ہے

کون غائب ہو چھت سے کیا معلوم
شاہزادہ ، پری سے ملتا ہے

دھوپ کی پتیاں سمیٹے ہوئے
ایک دھڑکا سا ، جی سے ملتا ہے

پھول کی ایک پنکھڑی لے کر
عشق ، بخیہ گری سے ملتا ہے

دور کوئی غروب ہوتا ہوا
ایک لمحہ صدی سے ملتا ہے

• عبدالرحیم نشتر

جو میری روح میں اترا تھا تشنگی بن کر
چھلک رہا ہے وہ آنکھوں سے اب نمی بن کر

مجھے بھی گھیر رہی تھی اُداس تاریکی
وہ جھلملانے لگا دل میں روشنی بن کر

حصارِ آتشِ نادیدہ چھوڑتا بھی مجھے ؟
نجات کس نے عطا کردی شبنمی بن کر

کسی کی آنکھ کا آنسو چمک بھی سکتا ہے
کسی شگفتہ سے چہرے کی تازگی بن کر

یہ کیسی بزم سجائی ہے یار لوگوں نے !
ہر ایک چیخ بکھرتی ہے نغمگی بن کر

ہمارے چاروں طرف کوئی گنگناتا ہے
سمئے کے ہونٹوں پہ خاموش بانسری بن کر

رہے خیال کہ دریا بھی آگے آتا ہے
نکل پڑی تو ہو میدان میں ندی بن کر

تماش بین سلیقے سے چھپ کے دیکھتے ہیں
ندی سے کون نکل آیا جل پری بن کر

بہت دنوں سے وہ خود بھی نہیں ملا خود سے
مجھے ہی دیکھ رہا ہے جو اجنبی بن کر

• عبدالرحیم نشتر

کچھ ایسا اپنے ہی شعلوں سے جل اٹھا ہے کوئی
بدن چراغ سے دنیا کو پھونکتا ہے کوئی

اتار پھینکی ہے پوشاک کہکشاؤں نے
بدن کی آگ سے گویا جھلس رہا ہے کوئی

نشاط و عیش بھی کیسی عجیب خواہش ہے
تمام رشتوں سے انجان ہو گیا ہے کوئی

وبالِ جنس میں قدریں بھی تار تار ہوئیں
لپیٹتا ہے کوئی اور کھولتا ہے کوئی

وہ روشنی کی چکاچوند ہے خدا کی پناہ
نہ جانے کتنے اندھیروں میں جا پڑا ہے کوئی

نہ انتظار کی لذت ، نہ وصل کی راحت
دل و نگاہ کے سودے میں اب مزا ہے کوئی ؟

نجانے کارِ ہوس کس مقام تک لے جائے
بدن وہی ہے مگر روپ دوسرا ہے کوئی

یہ خشک پتے ، یہ سوکھے شجر ، یہ سناٹا
ادھر بھی ہجر کے موسم کا سلسلہ ہے کوئی

زمینِ درد کو گلزارِ رنگ و بو کر دے
کسی کے ہونٹوں پہ معصوم سی دعا ہے کوئی

سنتے ہیں کوئی دھماکہ تو بکھر جاتے ہیں
جو کبوتر ہیں وہ چپ چاپ بکھر جاتے ہیں

تجھ کو پہچان لیا ہے تو یہ عالم اب ہے
تیرے کوچے سے بھی خاموش گزر جاتے ہیں

کتنے برسوں سے وہی روپ ہے تعبیروں کا
کتنے برسوں سے وہی خواب نظر آتے ہیں

منہ اٹھائے چلی آتی ہے قضا کی آندھی
جاں بچانے کے لئے لوگ کدھر جاتے ہیں

کیوں نہ پھر کوچہء قاتل میں کھڑے ہو جائیں
ہم اگر جان چراتے ہیں تو مر جاتے ہیں

ذکر اور فکر کا رشتہ ہی اگر کچا ہو
ایک تسبیح کے دانے بھی بکھر جاتے ہیں

سبز پتوں پہ چمک اٹھتی ہے شبنم کیسی
غم کی بوچھار سے انسان سنور جاتے ہیں

زندگی ساری کرائے کے مکاں میں گزری
موت آئی تو چلو اپنے ہی گھر جاتے ہیں

• عبدالرحیم نشتر

طلب کیا تو وہاں عرضِ حال سے بھی گئے
حدیثِ درد سناتے ، مجال سے بھی گئے
ہزار شکوے ہیں لیکن سخن کی تاب کہاں
تمھاری بزم میں طرزِ ملال سے بھی گئے
کسی میں ضبط کا یارا بھی اب رہا باقی ؟
کہ درد مند جنوب و شمال سے بھی گئے
حصار باندھ رہی ہے عجیب خاموشی
ضمیر والے تو چبھتے سوال سے بھی گئے
بجھے بجھے سے ہیں شام و سحر کے ہنگامے
یہ بے لباس تو رنگِ جمال سے بھی گئے
یہ کیسی نیند نے گھیرا ہے بے حسی کا سماں
لطیف جسم لہو کے اُبال سے بھی گئے
نشاط و عیش کی راتوں نے ساتھ چھوڑ دیا
وہ دن ملے ہیں کہ مال و منال سے بھی گئے
وہ جن کی دھوم رہی کل کے سور ماؤں میں
کہاں کی تیغ زنی اپنی ڈھال سے بھی گئے
وہ خوش خصال تو جاتا رہا ہے نشتر جی !
بدن میں رمتے ہوئے اک غزال سے بھی گئے

ہر ایک شخص کو اظہارِ حق کی دعوت ہے
ہزار پردوں میں بیٹھی ہوئی سماعت ہے
تمام شہر میں سنتے ہیں اس کی عزت ہے
وہ جس کے سر پہ کوئی طرّہ ٔ فضیلت ہے
تمام شہر تصنع سے جگمگاتا ہے
فقیرِ شہر کی آنکھوں میں گردِ حسرت ہے
جسے بھی دیکھا گرفتارِ آرزو پایا
اکیلے مجھ کو کہاں قیدِ بامشقت ہے
سنا ہے پھر سے اندھیروں نے سر اٹھایا ہے
سنا ہے پھر کسی خورشید کی ضرورت ہے
ہجومِ رنگ نے بے نور کر دیا ایسا
سمجھ رہا ہوں جسے روشنی وہ ظلمت ہے
سنا ہے شہر بدر کر دیا گیا اس کو
جسے یہ ناز تھا مئی سے اس کی نسبت ہے
مچی ہے شہر میں ہولی کی دھوم نشتر جی !
کسی بھی رنگ میں رنگ جایئے اجازت ہے

• قمر سیوانی

کہاں روشن کوئی فن کی ڈگر ہے
اندھیروں میں غزلِ محوِ سفر ہے
اِدھر بادِ صبا آئے بھی کیسے
مری ہستی سلگتی دوپہر ہے
ہنسی کس کی اڑاتے ہو عزیزو!
کھنڈر بھی ہے تو محلوں کا کھنڈر ہے
جو کشتی موجِ دریا پر ہے نازاں
بھنور کی سازشوں سے بے خبر ہے
شرافت ڈھو رہا ہوں دورِ نو میں
قدم میرا دہکتی آگ پر ہے
طواف آکر خوشی کرتی ہے جس کا
بتا اے دل! وہ شہرِ غم کدھر ہے
قمر یہ کون سا رستہ ہے جس پر
نہ رہرو ہے نہ کوئی راہبر ہے

دھیمی دھیمی سی روشنی کیوں ہے
شمع میں جوش کی کمی کیوں ہے
یہ تو خوددار پیاس ہی جانے
اس سے خائف ہر اک ندی کیوں ہے
درد نے لی ہے کیا نئی کروٹ
تیرے ہونٹوں پہ یہ ہنسی کیوں ہے
ایک جگنو کے جگمگانے سے
چاند تاروں میں کھلبلی کیوں ہے
مات کس کی انا کو دی اس نے
اتنی خوش میری عاجزی کیوں ہے
آنسوؤں میں نہا کے سوجائے
میری تنہائی جاگتی کیوں ہے
کون سی بات چاند نے کہہ دی
اتنی حیرت میں چاندنی کیوں ہے
اے قمر تو بتا خلاف مرے
آخر اکیسویں صدی کیوں ہے

• ظفر اقبال ظفر

آنکھوں میں آ کے پھیل گیا زندگی کا کرب
دیکھا گیا نہ مجھ سے جو خود آگہی کا کرب
سانسوں میں زہر بن کے مری پھیلتا رہا
اُترا ہوا تھا دل میں مرے دوستی کا کرب
صدمے ہمیشہ ہجر کے میں نے اٹھائے ہیں
دل سے ہوا نہ محو کبھی عاشقی کا کرب
دریا میں رہ کے میں نے گزاری تمام عمر
لیکن ہوا نہ دُور مری تشنگی کا کرب
آنکھوں کو اپنی پھوڑ لیا اضطراب میں
ڈسنے لگا ہے مجھ کو جو بے منظری کا کرب
اتری ہوئی تھیں میری سماعت میں تلخیاں
بکھرا ہوا تھا لب پہ مرے بے بسی کا کرب
آنکھوں کو اپنی کوئی ظفر کھولتا نہ تھا
تھا شہر شہر پھیلا ہوا روشنی کا کرب

قدم قدم پہ مری راہ میں تھا پتھر بھی
کہ راستے سے بہت دور تھا مرا گھر بھی
سبھی کے ہاتھ میں تھیں مشعلیں اور شمشیریں
پھر اُس کے بعد تھا بربادیوں کا منظر بھی
دعا کو ہاتھ اٹھائے ہوئے سبھی تھے یہاں
ہمارے شہر میں تھا آندھیوں کا لشکر بھی
زباں پہ زخم ہمارے تھے چیختا کیسے
گلے پہ رکھا ہوا تھا ہمارے خنجر بھی
اَنا بچاتے میں اپنی لگا ہوا تھا ظفر
اگرچہ زد میں عدو کے رہا مرا سَر بھی

● ظفر اقبال ظفر

تھک کے بیٹھوں تو آسماں چھولوں
گر یقیں ہو تو میں گماں چھولوں
ہونٹ پیٹخے ہیں تشنگی سے مرے
کاش! میں موجِ بیکراں چھولوں
فاصلے تو گزر گئے کب کے
بڑھ کے میں گردِ کارواں چھولوں
اتنا اِدراک دے خدا مجھ کو
اپنی میں خواہشِ نہاں چھولوں
دائرہ بڑھ گیا ہوس کا مرے
آگ لے لوں کہ میں دھواں چھولوں
ان میں یادیں ہیں میرے بچپن کی
دَر و دیوار کھڑکیاں چھولوں
منزلیں دور ہیں ظفر مجھ سے
اپنے قدموں ہی کے نشاں چھولوں

زمیں کے ساتھ رہا سر پہ آسماں خالی
مکیں تو خواب ہوئے ہو گیا مکاں خالی
سلگتے شہر کی تفصیل کِس طرح لکھوں
ہے خاک وخون کی بستی میں بس دھواں خالی
کسی کے عشق کا قصہ نہ لیلیٰ مجنوں کوئی
کوئی پڑھے بھی تو کیسے یہ داستاں خالی
اسی سہارے پہ اک عمر کاٹ دی میں نے
تھا میری آنکھوں میں اک خواب بیکراں خالی
وہ ساتھ تھا تو یہ دنیا حسین لگتی تھی
پھر اس کے بعد لگا مجھ کو یہ جہاں خالی
چہار سمت سے یلغار تھی حوادث کی
تھا میرے سر پہ دعاؤں کا سائباں خالی
رہِ وفا میں ظفر ساتھ وہ چلا نہ کبھی
تمام عمر لیا اُس نے امتحاں خالی

• ضیا فاروقی

خواب دیکھا تھا کہ تھی آنکھوں میں تصویرِ غبار
ایک میں تھا پابجولاں ایک تھا ناقہ سوار
شب کے سناٹے میں یہ کس نے پکارا ہے مجھے
ہوگئی طرزِ تکلم سے سماعت مشکبار
طاق پر بجھتے چراغوں کے سوا کچھ بھی نہیں
کس کو آخر دیکھتی ہے چشمِ حسرت بار بار
میں دریدہ پیرہن جاؤں تو اب جاؤں کہاں
اک رفوگر بھی نہیں ہے سب کا دامن تار تار
عجلتوں میں وصل کی لذت ادھوری رہ گئی
اُس کو بھی جلدی بہت تھی میں بھی تھا دیوانہ وار
آج جو قدموں کے نیچے ہے یہ بے برگ وگیاہ
ہم نے دیکھا ہے اسی میدان میں رقصِ بہار
ہم سے پوچھو آسماں کا دردِ تنہائی ضیا
ہم نے دیکھا ہے اسے روتے ہوئے زار وقطار

اس تجسس میں تھک گئے کچھ اور
دشتِ امکاں سے ہے پرے کچھ اور
میں ہی تنہا نہ تھا گریباں چاک
ساتھ میرے تھے سر پھرے کچھ اور
اس کو سمجھیں گے کیا جہاں والے
تیرے میرے ہیں رابطے کچھ اور
تھے جو کل تک مرے لیے سب کچھ
اب وہی ہیں مرے لیے کچھ اور
بڑھ گئی اور تشنگی میری
چھو کے دریا کو لب جلے کچھ اور
کیسے سمجھاؤں میں ان آنکھوں کو
ہے یہ منظر مرے لیے کچھ اور
یہ تماشا بھی دیکھ لیں آنکھیں
اپنے کپڑے اُتار دے کچھ اور
وضعداری کو جو نبھاتے تھے
دوستو ! ہم سفر وہ تھے کچھ اور

دس خاص غزلیں اُترا کھنڈ سے

• راشد جمال فاروقی

ان دنوں ہم پر عجب عالم پریشانی کا ہے
ہم کہ بستر سے لگے ہیں حکم جنبانی کا ہے
ہو رہا ہے پے بہ پے تازہ بہ تازہ انکشاف
کیا کہیں یاروں کہ یہ موسم ہی حیرانی کا ہے
کچھ تمھارا شہر بھی شامل ہے اس اُفتاد میں
اور ہم کو شوق بھی کچھ چاک دامانی کا ہے
ہم سبھی کٹھ پتلیاں چپ چاپ محوِ رقص ہیں
اور جو فرمان ہے سب اُس کی سلطانی کا ہے
اب کوئی دریا کناروں کی ذرا سنتا نہیں
بستیوں، کو کھیتیوں کو، خوف طغیانی کا ہے
ڈھونڈیے کچھ قتلِ ناحق کے نشاں شاید ملیں
ہاں یہی کوچہ ہمارے دشمنِ جانی کا ہے
اس نے خود پر اک دوامی حبس عائد کرلیا
یہ طریقِ منصفی راشد سے زندانی کا ہے

میرے اندر رفتہ رفتہ کون ہے مرتا ہوا
اور سب کو اپنے ہونے کی خبر کرتا ہوا
سرد سناٹوں کی یورش خون میں شامل رہی
چل رہا ہوں اپنی ہر آہٹ سے خود ڈرتا ہوا
ایک چاہت بے گھری کی راہ دکھلاتی ہوئی
اور اک دلکش سراپا دل میں گھر کرتا ہوا
کوئی بے چارا مری راہوں کے پیچ و خم میں گم
میں کسی دیگر مسافر کا سفر کرتا ہوا
کتنی مشکل سے بچا پائے ہیں کچھ آسانیاں
اب یہ سب آسائشیں ہیں اور دل بھرتا ہوا
سننے والوں میں عدم دلچسپیاں سی تیز تر
اور قصہ گو کہ قصہ مختصر کرتا ہوا
کچھ تماشہ دیکھتے ہیں کچھ تو رُکتے بھی نہیں
ایک چوراہے پہ زخمی ہاؤ ہو کرتا ہوا
بولنا راشد کا گویا اک قیامت ہوگیا
سب نے یہ دیکھا کہ پانی تھا کہیں مرتا ہوا

راشدؔ جمال فاروقی

اِذنِ سفر ازل سے ہے بکھرا ہوا ہوں میں
میرا ہے کیا کہ خاکِ خلا آشنا ہوں میں

اے کاش سوچ پاؤں کبھی بولنے سے قبل
ہوتا یہ ہے کہ بول کے پھر سوچتا ہوں میں

مجھکو بھی اور کوئی ٹھکانہ کہاں ملا
اٹھ کر چلا گیا تھا، لو پھر آ گیا ہوں میں

غیبت بُرا شعار نہیں جانتے ہو تم
منھ پر تمھارے عیب گِنا تا رہا ہوں میں

چھائی ہے ہر حواس پہ یہ کس بلا کی نیند
آنکھیں ہی جاگتی ہیں کہاں جاگتا ہوں میں

غزلیں تو تازہ خوں کی کمی سے ہیں مضمحل
مصرعوں کو لیپ پوت کے چمکا رہا ہوں میں

میرے سخن میں تازہ مسائل تو ہیں نہیں
بے وقت راگنی سی یہ کیا گا رہا ہوں میں

لوگوں کے بیچ آ کے کہا اور نہ کچھ سنا
منبر پہ ایک وعظ سا فرما رہا ہوں میں

طواف کرنے کو ایک محور دکھائی دیگا
تمھیں بھی سُرخاب اس کے سر پر دکھائی دیگا

عدالتیں ہوں، شفا کدے ہوں کہ منڈیاں ہوں
کہیں بھی جاؤ بس ایک محشر دکھائی دیگا

سفر میں بے رحم بستیوں سے گزر رہے ہیں
ہمیں بھی کیا کوئی بندہ پرور دکھائی دیگا

سفر ہی پانی کا ہے تو ساحل کو بھول جاؤ
ابھی تو آگے بھی اک سمندر دکھائی دیگا

اُدھر کے رُخ سے جو دیکھ آئے سو دیکھ آئے
اِدھر سے دیکھو! کچھ اور منظر دکھائی دیگا

کبھی تو ذوقِ سفر سے اُکتائے گی طبیعت
کبھی تو راشدؔ بھی اپنے گھر پر دکھائی دیگا

• راشد جمال فاروقی

ہمیں باندھے ہوئے تھا خانہ ویرانی سے پہلے
یہ گھر گلزار تھا میری بیابانی سے پہلے
مناظر دو مناظر دیکھنے کی اک ہوس تھی
تجسس تھا عجب سا ہم کو حیرانی سے پہلے
بہت مصروف تھے، تیشہ بکف رہتے تھے ہر دم
یہی معمول تھا اپنا تن آسانی سے پہلے
پریشانی تو کب کی جا چکی کیوں رو رہے ہو
بہت ہلکان رہتے تھے پریشانی سے پہلے
کوئی رختِ سفر باندھا نہ کچھ تیاریاں کیں
اشارہ مل چکا تھا سب کو طغیانی سے پہلے
کسی کو یاد کیوں ہو شہر میں اب یہ قرینہ
ہماری خوش لباسی چاک دامانی سے پہلے
نظر انداز کرنا، نفرتوں سے گھورنا کیا
تشدد بھی ہوا ہم پر ہراسانی سے پہلے
اب عادت تو بدلنے سے رہے قلاش بندے
وہ جس تنگی سے گزرے ہیں فراوانی سے پہلے
تمھیں راشد اگر کچھ شعر کہنے کا جنوں تھا
زبانِ دل سمجھتی تھی زباں دانی سے پہلے

میں جب اس کو چھوڑ کے جانے والا تھا
وہ مجھ کو "اک بات" بتانے والا تھا
تن آسانی میں یہ سب کب یاد رہا
وحشت کا موسم بھی آنے والا تھا
اس کی قربت میں برگد کی ٹھنڈک تھی
اس کا ہر انداز لبھانے والا تھا
تیرے زخموں کو دیکھا تو بھول گیا
میں اپنی اک چوٹ دکھانے والا تھا
جانے اتنا پھوٹ کے پھر کیوں رویا وہ
وہ تو ہم پر دھاک جمانے والا تھا
اچھا ہے راشد صاحب خود مان گئے
یوں بھی ان کو کون منانے والا تھا

● راشد جمال فاروقی

میرے شعروں کی جان تھا اور ہے
وہ جو کچھ بدگمان تھا اور ہے
ہم کہ بس کوئلہ نکال سکے
وہ تو ہیرے کی کان تھا اور ہے
کچھ تو حاجت روائی میری بھی!
تو اگر مہربان تھا اور ہے
اب وہاں کوئی بھی نہیں رہتا
وہ جو کچا مکان تھا اور ہے
خوانِ نعمت الٹ چکا کب کا
تخت پر پاندان تھا اور ہے
اس کے تمغوں سے یاد آیا مجھے
پشت پر اک نشان تھا اور ہے
تھا سفر دھوپ کا مگر راشد
سَر پہ اک سائبان تھا اور ہے

مجھے کچھ دیر رونا چاہیے تھا
پھر اس کے بعد سونا چاہیے تھا
یہ کشتی ریت پر کیا کررہی ہے
اسے پانی میں ہونا چاہیے تھا
یونہی بستر سے اٹھ کر آگئے کیا
کم از کم منھ تو دھونا چاہیے تھا
یہ نم آنکھیں تو سب سچ بول دیں گی
مجھے گھٹ گھٹ کے رونا چاہیے تھا
تمھیں مسند مبارک ! اور ہم کو
دری کا ایک کونا چاہیے تھا
مرا دستِ دعا بھی نم نہیں تھے
مجھے دامن بھگونا چاہیے تھا

• راشدؔ جمال فاروقی

کس قدر شور بپا ہے مجھ میں
کون یہ چیخ رہا ہے مجھ میں

دوڑتا پھرتا ہوں تھکتا ہی نہیں
کوئی آسیب وبلا ہے مجھ میں

اشک رو کے سے نہیں رکتے ہیں
باندھ سا ٹوٹ گیا ہے مجھ میں

لے گیا مجھ کو چھڑوا کر مجھ سے
خود کو وہ چھوڑ گیا ہے مجھ میں

کرچیاں چبھتی ہیں شہ رگ میں کہیں
جیسے کچھ ٹوٹ گیا ہے مجھ میں

پورے آکاش پہ چھا جانے کو
کوئی پَر تول رہا ہے مجھ میں

اب میں پہلا سا وہ راشدؔ بھی نہیں
تو کسے ڈھونڈ رہا ہے مجھ میں

وہ جو آبادیاں ہم نے دیکھی نہیں وہ بھی دنیا میں ہیں
اور جو وادیاں ہم نے کھوجی نہیں وہ بھی دنیا میں ہیں

چند رستوں پہ ہم چل سکے کچھ قدم، باقی رستے ہمیں تاکتے رہ گئے
کتنی پگڈنڈیاں ہم نے روندی نہیں وہ بھی دنیا میں ہیں

ایک حد تک تو ہم تھوڑے گونگے بھی ہیں تھوڑے بہرے بھی ہیں
وہ زبانیں کہ جو ہم نے سیکھیں نہیں وہ بھی دنیا میں ہیں

اور ہر آزمائش سے گزرے ہوں ہم یہ بھی سچ ہے مگر پورا سچ تو نہیں
وہ جو آسائشیں ہم نے برتی نہیں وہ بھی دنیا میں ہیں

مشکلوں کو تو حکمت سے آسان کرتے گئے دکھ مگر اک رہا
ایسی آسانیاں جو ملیں ہی نہیں وہ بھی دنیا میں ہیں

چند جذبوں کو ہم شعر کرتے رہے اور کتنا تو سب ان کہا رہ گیا
ایسی باتیں کہ جو ہم کو سوجھیں نہیں وہ بھی دنیا میں ہیں

دس خاص غزلیں مہاراشٹر سے

● عبدالاحد ساز

آج پھر شب کا حوالہ تری جانب ٹھہرے
چاند مضمون بنے، شرح کواکب ٹھہرے
داد و تحسین کی بولی نہیں، تفہیم کا نقد
شرط کچھ تو مرے بکنے کی مناسب ٹھہرے
نیک گزرے مری شب صدقِ بدن سے تیرے
غم نہیں رابطۂ صبح جو کاذب ٹھہرے
مخلصی باعثِ تضحیک، ذہانت دشمن
یہ محاسن تو، مرے حق میں معائب ٹھہرے
میں ہوں خود سے متقابل متبادل، متضاد
روح ٹھہرے مرا عنواں، کبھی قالب ٹھہرے
بات ہی دل کے جُدا ہوں تو بھلا کون آخر
کس کا ہم وزن بہ میزانِ مطالب ٹھہرے؟
سازؔ رہتے تھے ارادت میں جو گویائی کی
اب وہ دربارِ "گویائی" کے حاجب ٹھہرے

مزاجِ سہل طلب اپنا رُخصتیں مانگے
ثباتِ فن مگر اے دل عزیمتیں مانگے
اُفق پہ حُسنِ اَدا کے طلوعِ مہرِ خیال
فضائے شعر سَحَر کی لطافتیں مانگے
مُصر ہے عقل کہ منطق میں آئے عقدۂ جاں
قدم قدم پہ مگر دل بشارتیں مانگے
نئی اُڑان کو کم ہیں یہ ذوق کے شہپر
نئی ہواؤں کا ہر خم ذہانتیں مانگے
شعور کے قد و قامت پہ ہے نظر کس کی
یہ فربہ چشم زمانہ جسامتیں مانگے
نفیس و سہل نہیں وضعِ شعر کی تدریج
ہر ایک سوچ دِگرگوں سی حالتیں مانگے
سکونِ طولِ وفا ہے طلب کی کوتاہی
کہ لمسِ یار دھڑکتی جسارتیں مانگے
شعاعِ مہر سے دُھل جائیں جیسے ماہ و نجوم
ترا خیال انوکھی طہارتیں مانگے
نہ پوچھ سازؔ کو، وہ تو سراب والوں سے
پھرے ہے کاسۂ دل میں حقیقتیں مانگے

• عبدالاحد ساز

کیسی مانوسیتیں تھیں
رات دن کیفیتیں تھیں
پَر جذبوں کی زمیں پر
سر پہ خوابوں کی چھتیں تھیں
شامِ بادہ، شب نغمہ
ہم کو کیا کیا نہ لتیں تھیں
جاگ اُٹھتے تھے کئی غم؛
کیا دُھنیں، کیسی گتیں تھیں
کبھی ساحل، کبھی گلشن
حُسن کی مرحمتیں تھیں
ایک نیلی سی عمارت
جس کی زرکار چھتیں تھیں
باغ کے بیچ میں پانی
اور پانی میں بطیں تھیں
ہر علاقہ کوئی چہرہ
شہر کی شخصیتیں تھیں
تھے مناظر متحرک
دید کی نوعیتیں تھیں
ساز ماری گئیں آخر
کتنی زندہ وہ متیں تھیں

اکِ نظامِ جبر میں ہم رہ رہے ہیں
یہ بھی کیا کم ہے کہ کچھ کم سہہ رہے ہیں
سطح پر اٹھلا رہے ہیں آپ جس کی
اُس سمندر کی کبھی ہم تہہ رہے ہیں
ایک سکتہ ہے؛ سفر کیسا، حضر کیا
ہم یہیں پر گہہ نہیں تھے، گہہ رہے ہیں
خوب ماتیں کھائیں ہیں لفظوں سے گرچہ
قلعۂ معنی کے ہم فاتح رہے ہیں
اب کے شاید دل ہے مرکز زلزلے کا
ذہن کے مینار سارے ڈھہہ رہے ہیں
ہم رواں تھے سازؔ لمحوں کی ڈگر پر
اب سَمے کے دائرے میں بہہ رہے ہیں

● عبدالاحد سازؔ

ریاضت گو زیادہ ہو رہی ہے
کسی صورت غزل ہو تو رہی ہے

یہاں افکار کی فصلیں اُگیں گی
نفی کے بیج دانش بو رہی ہے

اُسے دنیا میں ہر سو، کھوجتا ہوں
مری دنیا جو مجھ میں کھو رہی ہے

نگاہِ ناز بھی موزوں ہے کتنی
کہ جو دل میں ترازو ہو رہی ہے

پریشانی کھڑی ہے ہاتھ باندھے
''اُداسی بال کھولے سو رہی ہے''

رہی کچھ بھی نہ اپنے بس میں لیکن
بُرا کیا ہے، اگر کہہ دو، رہی ہے

ہے بوجھ الفاظ کا یا بارِ معنی
قلم کی نوک جس کو ڈھو رہی ہے

کہے ہیں سازؔ نے اشعار کم کم
طبیعت اُس کی گو پُرگو رہی ہے

کچھ وہی مجھ سے بدگمان بھی تھا
جس کے حق میں مرا بیان بھی تھا

جب بھی پیروں تلے زمیں کھسکی
''تب لگا سر پہ آسمان بھی تھا''

خود سے رشتہ نہ تھا کسی کا مگر
سب کا ایک ایک خاندان بھی تھا

جگہ اک رسائی ممکن تھی
لیکن اک شخص درمیان بھی تھا

اختیارات بھی تو جبر ہی تھے
خود نتیجہ ہی امتحان بھی تھا

کوئی کردار اُس کا تھا بھی نہیں
اور وہی نفسِ داستان بھی تھا

میری محکوم بھی تھی میری غزل
مجھ پہ ہر شعر حکمران بھی تھا

سازؔ! وہ لمحۂ فراموشی!
جس کا ہر وقت مجھ کو دھیان بھی تھا

• عبدالاحد سازؔ

کوئی جذبہ کوئی احساس چمکتا نہیں ہے
دل دھڑکتا نہیں ہے شعلہ لپکتا نہیں ہے

میں نے اک رات کبھی خواب میں دیکھی تھی کہیں
ایسی دُنیا کہ کوئی جس میں سسکتا نہیں ہے

جن کا ایک لمس بھی تھا حدِ جسارت گویا
اُن کو چھو لینے میں اب کوئی جھجکتا نہیں ہے

چھن گئے جیسے نگاہوں سے بھی لہجے کے حقوق
ڈال کر آنکھوں میں آنکھیں کوئی تکتا نہیں ہے

وہ صراحت ہے کہ افشا نہیں ہوتا کوئی رمز
کوئی آنچل کسی شانے سے سرکتا نہیں ہے

سازؔ ہوتی نہیں اب بحر کوئی خوں میں رواں
سانس کی لے پہ کوئی شعر تھرکتا نہیں ہے

روشن اب عشق کا طبق نہیں ہے
تیرے رُخ پر بھی اب شفق نہیں ہے

کشتیاں ڈوبتی اُبھرتی ہیں
کوئی ساحل، کہیں اُفق نہیں ہے

کس جماعت میں آگیا ہوں میں
یاں کوئی میرا ہم سبق نہیں ہے

فیصلہ جس کا دل پہ ہو جائز
کسی قانون میں وہ شق نہیں ہے

زندگی کیا نہیں ہے بحرِ سکوت
کیا یہ صحرائے لق و دق نہیں ہے

آہ! یہ اکتفائے مُردہ دلی!
زندگی کی کوئی رمق نہیں ہے

● عبدالاحد ساز

یوں میں بھی دل احباب کے ہم نے گا ہے گا ہے کھتے تھے
اپنے زخمِ نظر پہ خوش فہمی کے پھاہے رکھتے تھے

ہم نے تضادِ دہر کو سمجھا، دوراہے ترتیب دیئے
اور برتنے نکلے تو دیکھا سہ راہے رکھتے تھے

رقص کدہ ہو، بزمِ سخن ہو، کوئی کارگہِ فن ہو
زَردُوزوں نے اپنی ماتحتی میں جلاہے رکھتے تھے

محتسبوں کی خاطر بھی اپنے اظہار میں کچھ پہلو
رکھ تو لیے تھے ہم نے، اب چاہے اَن چاہے رکھتے تھے

جو وجہِ راحت بھی نہ تھے اور ٹوٹ گئے تو غم نہ ہوا
آہ! وہ رشتے کیوں ہم نے اک عُمر نباہے رکھتے تھے

کاہکشاں بندی میں سخن کی رہ گئی سازؔ کسر کیسی
لفظ تو ہم نے ٹُن کے نجومے، مہرے، ماہے رکھتے تھے

زاویے قدروں کے پھر سے ناپنا
دہر کا نقشہ نیا اک چھاپنا
آگ اک شب بھر پرائی تاپنا
اور پھر اک عُمر پشچا تاپ — نا!
ہر قدم پر ایک دیوار، اک حصار؛
راستوں کے بیچ ہر اَستھاپنا
پھر وہی لے دے کے مقصد: ایک چھت
پیٹ بھرنا، اور تن کو ڈھانپنا
دل دُکھانا سب کا، پھر پڑھنا نماز
نا بھئی — سنگین ہے یہ پاپ — نا!
پھول، جگنو، تتلیاں — مالائیں ہیں
با انھی کو منترانا، جاپنا
یہ بھی ہے اس کی عطا، وقتِ دُعا
میرا تھر تھر کپکپانا، کانپنا
کس کی کیا سُن کر کبیدہ ہو گئے
سازؔ سے کچھ کہہ رہے تھے آپ نا!

دس خاص غزلیں بہار سے

• کہکشاں تبسم

بساطِ وقت پہ دیکھو کہاں رکھے ہوئے ہیں
جو پیادے تھے سرِ بزمِ شہاں رکھے ہوئے ہیں

ابھی کچھ اور برسے گی گھٹا دریا پہ جا کر
سرِ ساحل جو ہم پیاسی زباں رکھے ہوئے ہیں

ہم اپنی بند مٹھی کھول دیں پھر دیکھنا تم
سمیٹے کس طرح ہفت آسماں رکھے ہوئے ہیں

کبھی تو منصفی پہنے قبائے پاک ہوگی
سو ہم اس طور دل کو خوش گماں رکھے ہوئے ہیں

بظاہر سرسری سے رابطوں میں کیسے کھلتا
دبا سینے میں ہم آتش فشاں رکھے ہوئے ہیں

انھی سے پوچھنا تھا رنگِ موسم کیسے بدلا
کہ نبضِ وقت پر جو انگلیاں رکھے ہوئے ہیں

تمھارے قرب کا لمحہ نہیں بھر پائے گا وہ
پرانے فاصلے جو درمیاں رکھے ہوئے ہیں

ادھر زعمِ مسافت میں چلے موجوں میں نکلے
ادھر کچھ ہیں کنارے کشتیاں رکھے ہوئے ہیں

یہ پرچھائیں سی اوڑھے کون ہے، ہم تو نہیں ہیں
بھرم بے سائیگی کا کہکشاں رکھے ہوئے ہیں

☆

چھتیں ہواؤں کی دیوار و در تھے پانی کے
طلسمی شہر میں ہر سمت گھر تھے پانی کے

پھوار، بارشیں، سیلاب، بلبلے، شبنم
کھلا یہ ہم پہ کہ کیا کیا ہنر تھے پانی کے

سفر کے شوق میں کن وادیوں میں آ نکلی
چٹان کاٹتے دھارے جدھر تھے پانی کے

کئی جنم سے مقدر میں صحرا گردی تھی
اور اب کے پاؤں سے لپٹے سفر تھے پانی کے

سنی پڑی ہوئی مٹی بھی، چاک بھی پانی
چراغ گھڑتے ہوئے کوزہ گر تھے پانی کے

حباب چہروں کا یہ شہر بھی عجوبہ تھا
لباس اُوس کے اور بخیہ گر تھے پانی کے

کہاں کی دھوپ، کہاں چاندنی کی دلداری
فلک کی آنکھ میں شمس و قمر تھے پانی کے

گئے وہ دن کہ پرندوں کا آشیانہ بنیں
نئی زمین پہ سارے شجر تھے پانی کے

یہ معجزہ جو نہیں تھا تو کہکشاں کیا تھا
کہ برف آگ بگولہ شرر تھے پانی کے

☆

گزرتے جاتے ہیں باتیں ہزار کرتے ہوئے
یہ کون لوگ ہیں رستہ غبار کرتے ہوئے

ہر ایک دن گیا چھالوں کی آبرو رکھتے
ہر ایک شب کئی جگنو شمار کرتے ہوئے

بچھڑ کے مجھ سے کہیں دشت تو اُداس نہیں
خیال آیا تھا دریا کو پار کرتے ہوئے

بلائیں اوڑھ کے بادل ہیں رقص میں پیہم
قبائے لالہ و گل تار تار کرتے ہوئے

زمیں تھی خاک، فلک بھی دھواں دھواں دیکھا
دھنک کے رستے خلاؤں کو پار کرتے ہوئے

وہ خوش گمانی پہ اپنی بہت ہیں شرمندہ
جنھیں تھا فخر تمھیں شہریار کرتے ہوئے

کوئی تو رشتہ دعا کا بھرم ہی رکھ لیتا
گلے ملیں گے مگر کاروبار کرتے ہوئے

☆

• کہکشاں تبسم

موجِ دریا بھی مخالف اور بھنور میرے خلاف
عرصۂ موجود میں میرا سفر میرے خلاف

آگ کے شعلوں سے قسمت کی لکیریں کھینچنے
کیوں اکٹھا ہو گئے سب دیدہ ور میرے خلاف

من گھڑت قصے، دھواں لفظوں کی تاریخی نوشت
ہے کتابِ وقت میں اب ہر خبر میرے خلاف

پتھروں سے میں نے بھی چاہا تراشوں ایک بت
پر تھا دستِ آزری! تیرا ہنر میرے خلاف

ہے ستاروں سے پرے نادیدہ اک روشن جہاں
اک خبر: بکھرے ہوئے ہیں بال و پر میرے خلاف

زندگی انعام کی صورت تھی شرطوں سے بندھی
مرحلہ در مرحلہ شام و سحر میرے خلاف

موسموں کی نبض پر رکھی تھیں میں نے انگلیاں
اور ہوا تیور چڑھائے ہر شجر میرے خلاف

پاؤں میں پائل سفر کی باندھ کر میں کہکشاں
دیکھتی ہوں ہوگی کب تک رہ گزر میرے خلاف

☆

• کہکشاں تبسم

ترے حضور میں فریاد کیا، دہائی کیا
ہمارے درد ہی گونگے ہیں دیں صفائی کیا
لہو کی شاخ ہری ہے، بہت غنیمت ہے
دریدہ پیڑ سے کونپل کی آشنائی کیا
تمام عمر رہا پل صراط پر چلنا
عجیب قید تھی ملتی بھلا رہائی کیا
ہماری آنکھ میں کاجل سا بن گیا ساون
مژہ پہ جمنے لگی آنسوؤں کی کائی کیا
مسافرت ہے مقدر تو سوچنا کیسا
کہ آگے دشت ہے، پربت ہے یاترائی کیا
ہمارا جرم تو ثابت نہیں، مگر دیکھو
ہمارے نام پہ ہوتی ہے کارروائی کیا
چراغ زخم کے جلتے ہیں کہکشاں ہر پل
سنور گیا ہے مرا کاسۂ گدائی کیا

☆

نقشِ سوال لے کے پھروں تیرے شہر میں
خاموشیوں کی گونج سنوں تیرے شہر میں
ہے قید کس طلسم میں جاں کا شجر یہاں
برگِ صدا پہ قطرۂ خوں تیرے شہر میں
انجان فاصلوں کا سفر کر کے تھک گئی
اب کے ذرا سی دیر رکوں تیرے شہر میں
ہیں کاسۂ صدا میں کھنکتے ہوئے سوال
ہونٹوں پہ سب کے قفل ہے کیوں تیرے شہر میں
تو نے تو مجھ سے چھین لی پہچان ہی مری
کیوں ہو کے بے نشان رہوں تیرے شہر میں
آسائشیں حساب سے زیادہ ملیں، مگر
نایاب شئے تھی دل کا سکوں تیرے شہر میں
ہر شخص کو ہے ذوق خدائی کا کہکشاں
کس کس کے آگے سجدہ کروں تیرے شہر میں

☆

زمیں کے ٹکڑے کیے، آسمان بانٹے گا
وہ شاہِ وقت ہے سارا جہان بانٹے گا

لٹے گا جس کے اشارے پہ زورِ گویائی
وہی تو بعد میں گونگی زبان بانٹے گا

رکھے رہے گا وہ تیروں پہ دسترس اپنی
ہمارے بیچ تو خالی کمان بانٹے گا

جو کاٹ لے گیا فصلِ یقیں بھی کھیتوں سے
پلٹ کے آئے گا شاخِ گمان بانٹے گا

کتر کے پنکھ ہمارے دروں کو کھول دیا
خبر ملی تھی کہ اونچی اڑان بانٹے گا

کہاں وہ درد کا رشتہ رہا سلامت اب
جو ہاتھ تھام کے ساری تکان بانٹے گا

تمام چہرے دھواں ہو گئے تبسّم جب
تو کس کے بیچ وہ شہرِ امان بانٹے گا

☆

• کہکشاں تبسّم

موسم، خوشبو، رنگ دھنک کے منظر سارے اس کے تھے
رات کی کالی چھلیا میری، چاند ستارے اس کے تھے

بیچ سمندر بخت ہمارا ساحل تک یہ آتا کب
موج بھولپہ نام تھا اس کا دور کنارے اس کے تھے

سہمی سہمی، گونگی، بہری ایک گجریا میری تھی
ہنستے گاتے ڈھول اڑاتے راج دلارے اس کے تھے

اک چھوٹی سی چھت کی خاطر کیا کیا خواب گنوا بیٹھی
بھول گئی کہ اینٹیں اس کی مٹی گارے اس کے تھے

زنجیروں کے بدلے اب بھی گہنے پاتے بنتے ہیں
صدیوں سے یہ جبر کے بندھن بیچ ہمارے اس کے تھے

کتنی عجب تقسیم تبسّم کرتی ہے یہ دنیا بھی
میرا حصہ زہر ہلاہل امرت دھارے اس کے تھے

☆

• کہکشاں تبسم

مانگے ہے اک ستارہ سرآسمان پھر
دل چاہتا ہے سوئے افق ہو اڑان پھر
پھر اے قفس نشینو! اٹھاؤ دعا کو ہاتھ
ہے شاخ شاخ موسم وہم وگمان پھر
ہر لحظہ کس محاذ کی جانب سفر میں ہے
کھینچے ہوئے رگوں میں لہو کی کمان پھر
دریاؤں کا یہ چپ تو خطرناک ہے بہت
باندھو بلند شاخ پہ لوگو مچان پھر
پہلے خراج مانگ رہا ہے امیروقت
لوٹائے گا وہ شہر میں امن وامان پھر
دل تنگ ہو گیا تو زمیں بھی ہوئی ہے تنگ
ہم خواب کے نگر میں بنائیں مکان پھر
ان ہچکیوں کا کچھ تو سبب ہوگا کہکشاں
شاید کسی کو آیا کہیں میرا دھیان پھر

☆

کھلی تھی آنکھ مگر لمحہ خواب جیسا تھا
کہ شاخ جاں پہ مہکتا گلاب جیسا تھا
تمام عمر رہی جس سفر پہ سرگرداں
یقین کیسے کروں وہ سراب جیسا تھا
ہیں اختیار میں اس کے خموشیاں میری
سوال جس کا ہمیشہ جواب جیسا تھا
دلوں کی سمت تنی تھی کمان شعلوں کی
مزاج شہر یہاں آفتاب جیسا تھا
قیامتوں کی گھڑی جیسے جاں سے لپٹی ہو
یہ لمحہ لمحہ سلگنا عذاب جیسا تھا
تقاضہ اس سے کہاں منصفی کا ہم کرتے
کہ اس کا عدل بھی اس کے عتاب جیسا تھا
اُڑا کے لے گئی سارے ورق ہوا، لیکن
بچا جو ہاتھ میں وہ انتساب جیسا تھا
محبتوں کے لئے شرط تھی تقدس کی
سپارہ دل کا مقدس کتاب جیسا تھا

☆

ہم عصر غزلیں

● رئیس الدین رئیس [مرحوم]

یہ قریہ شہر میں رہنے لگا ہے
مسلسل زہر میں رہنے لگا ہے

سمندر بن گیا ہے کس کا آنسو
جو اکثر قہر میں رہنے لگا ہے

نکلتا ہی نہیں کیوں خود سے باہر
بدن کے دہر میں رہنے لگا ہے

عجائب میں اسے گن لو کہ اب تو
سمندر نہر میں رہنے لگا ہے

نہیں قطرے کو خوفِ خشک یعنی
بھری دوپہر میں رہنے لگا ہے

انا کی زد میں وہ آیا ہے جب سے
بلا کی لہر میں رہنے لگا ہے

رئیس اس عہدِ حاضر کے کرم سے
اندھیرا مہر میں رہنے لگا ہے

ہاتھوں میں میرؔ جیسا قلم اپنے لائیو
پھر سامنے تو شوق سے میرے بھی آئیو

دیکھا ہے تُونے کیا، نہ کسی کو بتائیو
بد حالتی پہ میری نہ ہنسیو ہنسائیو

سورج کا مرثیہ جو لکھا ہے تمام دن
تاریک شب جو آئے تو اُس کو سنائیو

وہ اپنا چہرہ دیکھ کے حیران ہو تو ہو
موقع ملے تو آئینہ اُس کو دکھائیو

تعبیر جن کی شہرِ گماں سے پرے ملے
آنکھوں میں اپنے خواب نہ ایسے سجائیو

ماں نے کہا تھا جنگ پہ جائے تو میرے لعل
کوئی بھی تیر اپنی کمر پہ نہ کھائیو

جس میں ملے شکست یقیناً ہمیں رئیسؔ
وہ کھیل کون سا ہے ہمیں بھی سکھائیو

● رئیس الدین رئیسؔ [مرحوم]

مجھ کو بھی اب دکھا دشتِ سیارگاں
درد کا آئینہ دشتِ سیارگاں

میں بھی تیار بیٹھا ہوں پا بہ سفر
مشکلیں کچھ بڑھا دشتِ سیارگاں

ناز ہے آبلہ پائی پر بھی مجھے
اور کانٹے بچھا دشتِ سیارگاں

میرے قدموں سے لپٹے تو ہیں فاصلے
دور پھر کیا رہا دشتِ سیارگاں

جب اُجالوں میں تقسیم راتیں ہوئیں
اُجلا اُجلا لگا دشتِ سیارگاں

شب کی مٹھی کھلی چند جگنو اُڑے
جگمگا جگمگا دشتِ سیارگاں

تم بھی تو اے رئیسؔ استفادہ کرو
شہر سا ہو گیا دشتِ سیارگاں

یہ چاند بھی ہے تمھارا، تمھارا تارہ اخی
ہمارے حصّے میں آیا فقط خسارہ اخی

حسیں تریں جو زمیں آسماں میں شے دیکھی
سبھی میں دیکھا گیا تیرا ہی نظارہ اخی

تمام لفظ سمٹ آئے میری غزلوں میں
کہاں یہ غزلیں کہاں تیرا استعارہ اخی

نہیں رُکے ہیں کہیں بھی مرے قدم یوں تو
ہزاروں ہاتھوں نے مجھ کو کیا اشارہ اخی

مرے وجود کو وہ خاک کر کے رکھ دے گا
تمھاری آنکھ میں دیکھا ہے وہ شرارہ اخی

اسے مطالعہ کرنے کو ہے صدی درکار
پڑھے گا کون یہاں میرا گوشوارہ اخی

بھنور گلے سے لگائے ہوئے تھے مجھ کو رئیسؔ
مگر پکار رہا تھا مرا کنارہ اخی!

● ڈاکٹر رونق شہری

پُر کشش ہی سہی، عورت ہی نہیں ہے دُنیا
صورتِ مرد تری چھت ہی نہیں ہے دنیا

فاقہ مست اب کے ہیں سرشار لگا کر ٹھوکر
صرف احساسِ امارت ہی نہیں ہے دنیا

چھوڑ دینے سے اسے دوسری لگ جائے گی
کیونکہ صرف ایک بُری لت ہی نہیں ہے دنیا

تم ہو مکروہ اُجالا کہ عروسِ شب ہو
دیکھنے کی کوئی حسرت ہی نہیں ہے دنیا

منصفِ وقت قلم توڑ چکا ہے شاید
مسئلہ زیرِ سماعت ہی نہیں ہے دنیا

خول سونے کا چڑھا پھر بھی نظر آتا ہے
ایستادہ کوئی پربت ہی نہیں ہے دنیا

ایسا موقع ہی میسّر نہیں آیا مجھ کو
دیکھتا تجھ کو میں با چشمِ حقارت دُنیا

اگلے وقتوں کے کچھ لوگ جو زندہ ہوتے
چہرۂ دنیا دیکھ کے ہی نابینا ہوتے

صرف شرافت کی پونجی سے کام نہ چلتا
کام کوئی ایسا کرتے شرمندہ ہوتے

حزن وملال میں آنکھیں خون کے آنسو روتیں
ان کا غم ملتا اہلِ سرمایہ ہوتے

خواہش ہوتی ہے کہ کچھ دن کی خاطر ہی
کوئی نہیں پر آپ مرے ہمسایہ ہوتے

بزم آرائی کی توفیق اسی نے دی ہے
دیکھ لیا ہے جس نے مجھ کو تنہا ہوتے

چند ہرے پتے لپٹے ہیں شاخوں سے جو
دیکھا ہے ہم نے ان کو آوارہ ہوتے

نقد کی اب میزان پہ ناقد بیٹھ گئے ہیں
دیکھئے جی بھر اُن کو تولہ ماشہ ہوتے

● ڈاکٹر علی عباس اُمّید

دوستو! ایک نئے عہد کی میں ہوں تمہید
صفحۂ وقت پہ لکھ دو علی عباس اُمّید
آئنہ چشم ہیں گر آپ تو ممکن نہیں دید
مل نہیں سکتے وہ گم گشتہ عزیزانِ سدید
سب کا قاتل ہے یہ جلتے ہوئے لمحوں کا سکوت
کیوں نہ مل جل کے کریں دردبیاں کی تجدید
تم کو رکھنی ہے بدلتے ہوئے موسم پہ نظر
منجمد ذہن تو کرتے ہی رہیں گے تنقید
جیتنی ہم کو بہرحال ہے ماحول کی جنگ
پست ہو جائیں گے آخر یہ مسائل کے یزید
میں رہوں یا نہ رہوں پھیلتا جائے ہر سو
یہ مرا فن کہ مرے خونِ جگر کی ہے کشید
اب بہت دور نہیں منزلِ نو بھی اُمّید
آپ کرتے رہیں ذہنوں کو سفر کی تاکید

میں تو اک لمحۂ پریدہ رہا
جانے کیوں وہ بہت کشیدہ رہا
رُو بہ رُو ذکر ناشنیدہ رہا
اُٹھ گیا تو مرا قصیدہ رہا
میں بھی بندہ ہی تھا خدا کی قسم
یہ الگ ہے کہ برگزیدہ رہا
اور تو کوئی غم نہ تھا اس کو
بس مری چاہ میں تپیدہ رہا
شب کی پیشانی کا میں جھومر تھا
کیا ہُوا گر ہوا گزیدہ رہا
میرے حصّے میں اس صحیفہ کا
اک ورق تھا وہی دریدہ رہا
کوئی اُمّید بر نہ آئی کبھی
زندگی بھر ستم رسیدہ رہا

• ڈاکٹر علی عباس اُمّید

ہونٹ پہ اگر اُس کے بجلیاں نہیں ہوتیں
نفرتوں کے شعلوں میں بستیاں نہیں ہوتیں
کاش بیٹھنے والے بھول کے بھی یہ سوچیں
آدمی سے اونچی تو کرسیاں نہیں ہوتیں
اب خزاں کا سایہ ہے موسمِ بہاراں پر
پھول کھلتے ہیں لیکن شوخیاں نہیں ہوتیں
بھول کے نہ رُخ کرنا خواہشات کے گھر کا
دَر تو اس میں ہوتا ہے کھڑکیاں نہیں ہوتیں
آرزو ہے یہ اُمّید جاگنے لگیں وہ بھی
جن کی سوئی قسمت میں روٹیاں نہیں ہوتیں

خواب کے پھول نہیں، فکر کے پتھر بھی نہیں
اب تو یادوں کی حویلی میں کبوتر بھی نہیں
زندگی بھر کی وفاؤں کا صلہ ہے چادر
اور چادر کہ وہ پیروں کے برابر بھی نہیں
مجھ کو اس موڑ پہ لے آئی ہے قسمت کہ جہاں
میرا صحرا بھی نہیں اور ترا گھر بھی نہیں
ہم کہ غرقآب ہوئے قطرۂ رسوائی میں
ورنہ اَوروں کو تو کافی یہ سمندر بھی نہیں
پہلے سچائی کے نیزوں سے تھی امّید مگر
اب کہاں ڈھونڈیں کہ سر اپنے بدن پر بھی نہیں

• ڈاکٹر علی عباس اُمید

کجکلاہی کی سزا اب یوں ہمیں دیتے ہیں لوگ
پھول سی باتوں پہ بھی پتھر اٹھا لیتے ہیں لوگ
دشمنی بدنام ہے صدیوں سے لیکن ان دنوں
دوستی کے نام پر اکثر دغا دیتے ہیں لوگ
پست اتنا ہو چکا ہے آدمیت کا وقار
اپنی لاش اپنے ہی کاندھوں پر اٹھا لیتے ہیں لوگ
گل کی رنگینی سے ہوتا ہے بہاروں کو ثبات
برگ آوارہ کو جانے کیوں ہوا دیتے ہیں لوگ
مل رہا ہے اس طرح اب تو شہادت کو خراج
دامنوں پر خون کے دھبے لگا لیتے ہیں لوگ
جب مرے سورج کے آگے اوڑھ لیتے ہیں دھواں
آپ ہی اپنے چراغوں کو بجھا دیتے ہیں لوگ
اپنی ناکامی سے ہے امید شاید اس لئے
آنسوؤں کے درمیاں بھی مسکرا لیتے ہیں لوگ

میں جستجو میں رہوں اور پھر نہ پاؤں اُسے
مگر یہ ہو نہیں سکتا کہ بھول جاؤں اُسے
وہ شعر کی طرح نازل ہو روح پر میری
میں نا اُمیدی کے لمحوں میں گنگناؤں اُسے
یہ معجزہ مری چاہت کبھی تو دکھلائے
بھلانا چاہے مجھے اور یاد آؤں اُسے
وہ شاخِ گل کی طرح خوشبوئیں لٹاتی رہے
میں شوخ جھونکے کی مانند گدگداؤں اسے
تمام رات میں آنکھوں میں کاٹ دوں لیکن
نسیمِ صبح کو ہاتھوں میں لوں، جگاؤں اُسے
زمانہ شوق سے سُنتا رہا مجھے امید
مگر میں سوچا کیا کاش کچھ سناؤں اسے

• ڈاکٹر صفدر

بارود کی نالیں نہ جہازوں کی صدائیں
سوچوں کی کمانوں پہ چڑھے تیر ڈرائیں
پھر صاحبو میں اور نگر کھوجنے نکلا
تب رنگ اُڑاتے تھے زمیں اور ہوائیں
اب فیصلہ میں نے بھی کیا خود کو لٹادوں
یاروں سے گزارش ہے مرا ہاتھ بٹائیں
میدان کی تہذیب لگے ایک ہیولا
منظر کے لئے آنکھ تلاشے ہے گپھائیں
بستی کا وہ پھیلاؤ حدیں ٹوٹ گئیں سب
کچھ سادہ طبع پوچھتے پھرتے ہیں دشائیں
بہتی ہوئی بجلی کی رویں، گھومتے پہیے
مختار ہیں اب میرے شب و روز بنائیں

ایک ہی نام نہیں اب ہیں مرے نام بہت
سب تو الزام نہیں پھر بھی ہیں الزام بہت
ایک احساس کہ رہتا ہوں اکیلا تنہا
یوں تو ہر وقت ستائے پہ سرِ شام بہت
میری آنکھوں میں وہ اک دوسری صورت ڈھونڈے
پہ کہاں میرا اچلن آج جو ہے عام بہت
مجھ کو وہ سادہ طبع ایک بہت ہے لیکن
اب مرا روکتے ہیں راستہ گلفام بہت
چند سکّے لیے مٹھی میں خریدار مرا
مجھ سے کہتا ہے: مبارک ہو لگے دام بہت
دعویٰ ان کو ہے مگر ان پہ نہیں کوئی گواہ
دوستوں میں ہیں مرے شام بہت رام بہت

● ڈاکٹر صفدر

کب تک حاتم کی راہ تکو
اپنے گھوڑے پر زین کسو
ہم کو بھی خبر ہو جانا ہے
ڈرتے ڈرتے اخبار پڑھو
بارود پرستوں کے آگے
مت پھولوں کی سوغات رکھو
تم تو پھولوں کے دشمن تھے
دیکھو ، کانٹوں پر چلتے ہو
سچ تم پر بھی کھل جائے گا
اندھے بہرے گونگے لوگو !

یہاں اب بھی کوئی چھوٹا نہیں ہے
یہ میرا دیش ہے لنکا نہیں ہے
ذرا چہرے پہ پھیرو انگلیاں بھی
میاں ! ہر آئینہ میلا نہیں ہے
اسے ہے قرب کا نشہ ابھی تک
مسافر ریل سے اُترا نہیں ہے
سعیِ رائیگاں اس کی تلاشی
وہ اب بازار میں آتا نہیں ہے
زمانے بھر کو سمجھاتا پھروں میں
میاں! وہ اس قدر سادہ نہیں ہے

● راشد طراز

اگر لہو ہے، رگوں میں اُبال کر دیکھو
پھر اس کے بعد عدو پر اچھال کر دیکھو
سنبھالی ہوگی بہت کائنات بھی تم نے
شکستہ دل کو مگر اب سنبھال کر دیکھو
مٹا کے ہجر میں اندیشۂ زوال کبھی
تم اپنی شامِ تصوّر اُجال کر دیکھو
نشاط ملتی ہے جس کے خیال سے تم کو
وہ کفر روح سے اپنی نکال کر دیکھو
کھلیں گے اور بھی رازِ درونِ ہستی طرازؔ
تخیلات کو پیکر میں ڈھال کر دیکھو

گناہگار ہوں تصویر میں نہیں رہتا
مرا بدن کسی زنجیر میں نہیں رہتا
میں جاں بچاتا نہیں ہوں کسی مشقت سے
مگر یہ کیا ہے کہ تنویر میں نہیں رہتا
نشاط و رنج کی ساعت گزرتی جاتی ہے
مگر وہ رَن ہے کہ تاثیر میں نہیں رہتا
میں سازگار تو کر لیتا اپنی دنیا کو
اگر تعاقبِ تقدیر میں نہیں رہتا
جنوں ہے جس کا، اسے حل جنوں سے کرنا ہے
میں اس لئے کسی تدبیر میں نہیں رہتا
میں خونِ دل سے جو کرتا نہیں رقم خود کو
یقین ہے کہ میں تحریر میں نہیں رہتا
طرازؔ خواب تو اپنا بھی دین و ایماں ہے
مگر میں شیشۂ تعبیر میں نہیں رہتا

• سردار آصف

بستی تھی کبھی، اب تو بیابان ہے مجھ میں
اے دوست پہنچنا نہیں آسان ہے مجھ میں
اک شخص تو وہ ہے کہ جو ہنس بول رہا ہے
اک شخص کوئی اور پریشان ہے مجھ میں
ہر سانس پہ کرتا ہے کوئی میری حفاظت
لگتا ہے کوئی میرا نگہبان ہے مجھ میں
شاید میں ذرا دیر سے آؤنگا سمجھ میں
مشکل ہے کوئی لفظ نہ آسان ہے مجھ میں
کیا واقعی دنیا کا میں حصہ ہی نہیں ہوں
بارش ہے نہ آندھی ہے نہ طوفان ہے مجھ میں
میں شہر ہوں : گھبرایا ہوا ہے مرا چہرہ
شاید کہ ہوا پھر کوئی اعلان ہے مجھ میں
پیشانی پہ کیا میری کوئی نام لکھا ہے
کیا عہدِ گذشتہ! تری پہچان ہے مجھ میں

باندھا ہے کسی کو، کوئی سردار کھلا ہے
لگتا ہے ابھی شاہ کا دربار کھلا ہے
دکانیں تو اب شہر کی سب بند ہیں لیکن
لگتا ہے ابھی جسم کا بازار کھلا ہے
دل صبح کو دکھ جائے تو دن کاٹنا مشکل
اب کام سے لوٹے ہیں تو اخبار کھلا ہے
تم آج سمجھ پائے ہو دنیا کی حقیقت
ہم جیسوں پہ یہ راز کئی بار کھلا ہے
دو چار علاقوں کا بُرا حال ہے اب بھی
اس سمت بھی دو گھنٹے کو بازار کھلا ہے
ہونٹوں کی زباں میری سمجھ میں نہیں آتی
آنکھوں میں مگر آپ کی، انکار کھلا ہے
یہ مرحلۂ زیست بھی دروازہ ہے کوئی
سو بار ہوا بند تو سو بار کھلا ہے

• سردار آصف

دیکھو کہ کیسا جبر کسی پر کیا گیا
وہ آدمی تھا اور اُسے پتھر کیا گیا

دستار میری مانگ کے پہنائی ہے اُسے
یوں اُس کو میرے قد کے برابر کیا گیا

سب لوگ خوش بہت ہیں کہ چوڑی ہوئی سڑک
ان سے بھی پوچھ لو جنھیں بے گھر کیا گیا

روشن ہوئے ہیں دل میں امیدوں کے کیوں چراغ
آخر کھنڈر کو کس کے لئے گھر کیا گیا

دھرتی کو حکم ہے کہ یوں ہی گھومتی رہے
سورج کو نگہبان مقرر کیا گیا

اک شخص مئے کدے میں دکھائی دیا نیا
لگتا ہے پھر تباہ کوئی گھر کیا گیا

تعریف کے نہ پوچھئے باندھے ہیں کتنے پل
اک جھیل تھی، کہ جسکو سمندر کیا گیا

کیسے کریں سفر کہ نئی لیک چاہیے
کچھ سرپھروں کو پھر کوئی تحریک چاہیے

کاسہ نہیں ہے ہاتھ میں چہرہ بھی اس کا دیکھ
آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں اُسے بھیک چاہیے

شاعر ہوں، لفظ میرے لیے سب ہیں محترم
مجھ کو کہیں 'درست' کہیں 'ٹھیک' چاہیے

اچھا ہے آستین کے سانپوں کا یہ خیال:
رہنا ہمیشہ اپنوں کے نزدیک چاہیے

پھر اپنے آئینے کو کیا میں نے آج صاف
پھر خود سے مجھ کو تھوڑی سی تضحیک چاہیے

اس چاندنی میں جگنو دکھائیں گے کیا کمال
ان کو رات تھوڑی سی تاریک چاہیے

● سردار آصف

جس کو دیکھو وہ دوسرا ہی ہے
صرف تنہا یہاں خدا ہی ہے
ہو گئی یہ بہت پرانی بات
دل محبت میں ٹوٹتا ہی ہے
تھوڑا دُھندلا گیا ہے وقت کے ساتھ
آئینہ پھر بھی آئینہ ہی ہے
زخم میرے ہرے ہوئے ہیں پھر
رنگ بادل کا سانولا ہی ہے
رقص دھرتی کے ساتھ جاری ہے
زندگی ایک دائرہ ہی ہے
آج کیوں ہو ڈرے ڈرے سے تم
آج تو اپنا سامنا ہی ہے

یوں تو مروّتوں کا صلہ کچھ ملا نہیں
لیکن ہماری آنکھ کا پانی مَرا نہیں
بے چینیوں کا دل کی، سبب ہے ضرور کچھ
یوں ہی تمام رات کوئی جاگتا نہیں
دیوار گر کے پھر سے اُٹھی ہے تو دیکھیے
زندہ ہے اس کا سایا ابھی تک مَرا نہیں
رشتوں میں ایسی آگ لگی ہے کہ پوچھ مت
کیا دَور ہے کہ کوئی کسی کا ہُوا نہیں
زندہ رہا ہوں دم پہ میں جسکے تمام عمر
اس شے کا زندگی سے کوئی واسطہ نہیں
پہلے تو میرے دل میں ہی اس کا مکان تھا
وہ آج کل کہاں ہے مجھے بھی پتا نہیں
بدحالیوں کو اپنی چھپاؤں میں کس طرح
میرا لباس جھوٹ کبھی بولتا نہیں

شکیل اعظمی

اُڑا کے گردِ محبت سکون اس نے دیا
میں صرف صحرا تھا مجھ کو جنون اس نے دیا

مری ہوس نے رگِ عشق کاٹ ڈالی تھی
میں ختم ہونے لگا جب تو خون اس نے دیا

لباسِ سایہ بنا دھوپ میں وہ میرے لئے
ردائے جسم کو سردی میں اون اس نے دیا

میں کر رہا تھا ہواؤں میں زندگی تعمیر
مرے گمان کی چھت کو ستون اس نے دیا

میں اپنے آپ کو باہر سے جانتا تھا شکیلؔ
اُتر کے مجھ میں درِ اندروں اس نے دیا

یوں بچا تھا کہ دل و جان میں بستا تھا بہت
پھر بھی میں نے نہ چُنا اس کو کہ سستا تھا بہت

جھاڑیاں کاٹ کے ہموار کیں راہیں میں نے
یہ جو جنگل ہے مرے پاؤں میں پھنستا تھا بہت

عکس اس کا مجھے نزدیک کے چہروں پہ ملا
وہ جو اک سانپ مجھے خواب میں ڈستا تھا بہت

آتے آتے ہمیں راس آ گیا رشتے کا لباس
جب نیا پہنا تھا تو دونوں کو کستا تھا بہت

اب وہ پاگل ہُوا پھرتا ہے تو حیرت کیسی
کچھ دنوں پہلے اسے دیکھا تھا ہنستا تھا بہت

یہ جو اس شخص کی پتھرائی ہوئی آنکھیں ہیں
انھی آنکھوں سے کبھی پیار برستا تھا بہت

اب کوئی شرط نہ بازی نہ کوئی ہار نہ جیت
یہ تو تب ہوتا تھا جب چلنے کو رستہ تھا بہت

● محمد عابد علی عابد

بہت ہی تیرہ وتاریک ہے یہ جائے سکوت
لحد کہ جس کو کہا جائے تنگنائے سکوت
سوال کو لب اظہار کی ضرورت کیا
سخن کے واسطے کافی ہیں نالہ ہائے سکوت
ہمیں سہولتِ اسباب خود کلامی ہے
وگرنہ ہجر میں رکھا ہے کیا سوائے سکوت
سفید فام شبِ ماہ ہم سفر تھی مری
چراغ راہ ہوئی نقرئی فضائے سکوت
سکوت کہنے کو طوفاں کا پیش خیمہ ہے
مگر گزرنے پہ طوفان کے بھی جائے سکوت
کسی کی ممکنہ آمد کا منتظر ہے یہ
ہمارا دیدۂ پُرنم ہے آبنائے سکوت
تلاش میں رہے عابدؔ تمام عمر مگر
جہاں میں ہم کو کہیں بھی ملی نہ جائے سکوت

بیکار جانا نالۂ آفاق گیر کا
بہنا کسی کے ہجر میں آنکھوں سے نیر کا
جانا تلاشِ یار میں دشت وجبل کی سمت
سمجھانا بارہا مجھے میرے ضمیر کا
رہنا یہاں بشر کا سدا مشکلات میں
ہونا ضروریات کے جمِ غفیر کا
آرام کرنا سایۂ دیوار کے تلے
یہ کام بھی ہے ریختہ تمثال میرؔ کا
سازش میں حاکموں کی، شہنشاہ کے خلاف
ہونا بطور خاص ملوث وزیر کا
دیرینہ التجا مری یارب قبول کر
ماحول خوشگوار ہو برِ صغیر کا
منہ سے نکلنا بات کا اچھی بُری سبھی
تحویل سے کماں کی نکلنا ہے تیر کا
لینا بیان فرد کا پیشی سے پیشتر
کرنا سوال قبر میں منکر نکیر کا
عابدؔ متاعِ وقت نہ لانا بروے کار
آنا اخیر عمر دمِ ناگزیر کا

• محمد عابد علی عابد

[نذرِ کرشن کمار طور]

اَلاماں نور و نار تجھ مُکھ کے
آتشیں ہیں عذار تجھ مُکھ کے
روشنی ، دھوپ ، مہر و ماہ و چراغ
ہیں گرد و غبار تجھ مُکھ کے
مَیکشی بے خودی کی وجہ سہی
مست ہیں بادہ خوار تجھ مُکھ کے
دھوپ، شعلہ، شفق، دھنک، سایہ
رنگ ہیں بے شمار تجھ مُکھ کے
زلف سایہ فگن ہو تب دیکھے
کوئی لیل و نہار تجھ مُکھ کے
سو گیا ماہتاب آخرِ شب
لے کے بوسے ہزار تجھ مُکھ کے
صبح اور شام ، مشرق و مغرب
ہیں یمین و یسار تجھ مکھ کے

ہے ایک طرح سے حالانکہ ہم نشیں میرا
یہ آئنہ ہے ہمیشہ سے نکتہ چیں میرا
یہ راستے کا بگولا ہے جانشیں میرا
بدن بھی خاک ہُوا تھا یہیں کہیں میرا
اُتر گیا ہے رگ و پے میں میرے زہرِ غم
ہے مجھ سے خوف زدہ مارِ آستیں میرا
قیامِ امن ہے عالم میں اوّلیں ترجیح
جدال و جنگ کا حامی نہیں ہے دیں میرا
میں اس کا بوجھ اٹھاؤں گا ایک دن عابد
ابھی ہے بوجھ اُٹھائے ہوئے زمیں میرا

• اختر کاظمی

بہہ گئے دیوار و دَر انسان بے گھر ہو گیا
آ گیا سَیلاب تو دَریا سمندر ہو گیا

کیسی کیسی رُونما ہوتی گئیں تبدیلیاں
کانچ کے گھر ہو گئے، انسان پتھر ہو گیا

لحظہ لحظہ جگنوؤں کے پَر ہواؤں میں کھُلے
راستہ شب کے مُسافر کا مُنوّر ہو گیا

آخرش اُس کے مُواہب اِس قدر کیوں عام ہیں
کیوں امیرِ شہر اِتنا نیک محضر ہو گیا

ذہن میں آتا رہا جو نقش بیت اللہ کا
سامنے آیا وہ پس منظر تو منظر ہو گیا

ہم نے مانا جیسے تیسے عمر اُس نے کاٹ دی
وہ سمجھتا ہے کہ کوئی معرکہ سَر ہو گیا

تارکِ دُنیا ہُوا، پھر تارکِ عُقبیٰ ہُوا
بے خودی میں آدمِ اصغر قلندر ہو گیا

یا تو ہر شے پر نظر آنے لگا ہے اِنحطاط
یا تو پھر اخترؔ ہمارا ذہن بنجر ہو گیا

شب کی ظلمات نے آفاق کو گھیرا کیوں ہے
جب شَفق جاگ اُٹھی ہے تو اندھیرا کیوں ہے

چند قطروں کے لیے ہانپ رہی ہے دھرتی
جب بَرستا نہیں بادل تو گھنیرا کیوں ہے

مُتّصل سبز دَرختوں کا خیابان ہے جب
سُوکھے پیڑوں پہ پَرندوں کا بسیرا کیوں ہے

یہ کسی پیکرِ دِلکش کا تحفّظ تو نہیں
چاند کے گِرد سِیہ اَبر کا پھیرا کیوں ہے

کِس لیے مائلِ اَصنام ہُوا کرتا ہے
دِل کی چوکھٹ پہ عزازیل کا ڈیرا کیوں ہے

آستینوں میں کئی سانپ ہیں پالے اُس نے
مُجھکو معلوم ہے وہ شخص سپیرا کیوں ہے

شب تَرَدُّد ہی تَرَدُّد میں تھی اخترؔ، لیکن
جب مَنارے نہیں جاگے تو سویرا کیوں ہے

• اختر کاظمی

کلی جو اوس کی بوندوں کو شب میں پیتی ہے
وہی تو حسن کلی کا نکھار دیتی ہے
وہ اپنے اشک کے دھاگے سے ٹانکتی ہے اُسے
پھٹے پرانے جو بیوہ لباس سیتی ہے
ہنر ملا ہے یہ اردو زبان کو کیسا
یہ ہر زبان کے لفظوں کو سیکھ لیتی ہے
وہ رزق اپنا کہیں سے بھی ڈھونڈ لیتے ہیں
کہاں زمیں پہ پرندوں کی کوئی کھیتی ہے
نکالی جاتی ہیں شرحیں غریب و غربت کی
کسے پتہ ہے یہ مخلوق کیسے جیتی ہے
کتابِ زیست محض داستاں نہیں میری
مشاہدات ہیں کچھ اور آپ بیتی ہے
غزل کا رنگِ سخن تو بدل چکا ہے مگر
سخن میں آج بھی لوگوں کی یہ چہیتی ہے
ہر ایک شے میں ہے اختر ظہور قدرت کا
عجائبات سے روشن یہ روئے گیتی ہے

حرف نکلے جو زباں سے تو کہاں تک پہنچے
ہے جہاں سرحدِ ادراک وہاں تک پہنچے
میں ندا دوں تو ہر اک جن و بشر جاگ اُٹھے
کاش آواز مری پیر و جواں تک پہنچے
حق پرستوں کے لیے اُس نے سجائے مقتل
سر نہ میرا بھی کہیں نوکِ سناں تک پہنچے
دام بڑھنے لگے تو بک گئے سچے چہرے
ہم ذرا دیر سے چہروں کی دکاں تک پہنچے
عمر بھر ہم تو لگاتے رہے ممتا کا سراغ
ماں کے قدموں سے چلے لوٹ کے ماں تک پہنچے
جو تھے سیراب سرابوں سے گزرتے کیسے
ہم تو پیاسے تھے سدا آبِ رواں تک پہنچے
میں نے چاہا کہ بچا لوں میں سلگتا ہوا گھر
دستِ امکان بڑھے بھی تو دھواں تک پہنچے
سچ یہی ہے کہ دعاؤں میں اثر ہے اختر
شرط ہے دل سے جو نکلے تو زباں تک پہنچے

• عقیل گیاوی

چراغ اپنے اُجالے شمار کرتا ہوا
کہاں گیا وہ اندھیرے پہ وار کرتا ہوا
بجھا کے سو گیا آخر وجود کو اپنے
کسی کا کوئی یہاں انتظار کرتا ہوا
حریف سمت سے کس کے خلوص کا پودا
نمو پذیر ہے ذکرِ بہار کرتا ہوا
کہیں قریب ہی بادل برس رہا ہے، مگر
پہاڑ، دشت، ندی کو شمار کرتا ہوا
چراغ اس کی فراست کا بجھ گیا کیسے
جو گھر سے نکلا ہے بچّوں کو پیار کرتا ہوا
منافقت کا وہ لمحہ گزر گیا، لیکن
خلوصِ قلب کو نذرِ غبار کرتا ہوا
یہ کس کی اندھی سیاست کا قافلہ گزرا
ہماری پشت پہ دشمن سا وار کرتا ہوا

اُفق پر ذہن کے ہیں استعارے بولنے والے
یہ منظر اور تمثیلی شکارے بولنے والے
اگر ہیں دور بینی کے سلیقے تو ذرا دیکھو
دھوئیں کی تہہ میں ہیں کتنے شرارے بولنے والے
انھیں کاٹو نہیں، رہنے دو جنگل کے احاطے میں
پلاسوں کے گھنے پودے ہیں سارے بولنے والے
میں خود حیران ہوں زرخیز موسم کے حوالے میں
کہاں سے آ گئے اتنے خسارے بولنے والے
سنہری شب کا قائم ہے ابھی رشتہ اُجالوں سے
ابھی دامن میں اس کے ہیں ستارے بولنے والے
ابھی محفوظ ہے اس میں علامت سرفرازی کی
بکھرتی زندگی کے ہیں اشارے بولنے والے

• مناظر حسن شاہین

کل کر نہ سکے، آج کیا کریں گے
بیمار ، علاج کیا کریں گے
دے دو کسی بندۂ ہوس کو
درویش یہ تاج کیا کریں گے
دُنیا کو اگر بدل سکیں ہم
فرسودہ رواج کیا کریں گے
ہم طالبِ دل، طالبِ محبت
شاہوں کا خراج کیا کریں گے
فاقہ زدوں میں لٹا دو اس کو
آسودہ ، اَناج کیا کریں گے
جن کو آتی ہی نہیں محبت،
نفرت کا علاج کیا کریں گے
گُم کردہ راہ جو خود ہیں شاہیںؔ
اصلاحِ سماج کیا کریں گے

جہانِ عیش و مسرّت کا خواب ٹوٹتا ہے
کھڑی ہے موت سرہانے سَراب ٹوٹتا ہے
دلِ شکست کی اک آہ کا اثر تو نہیں،
ستارے ٹوٹ چکے، ماہتاب ٹوٹتا ہے
سمندروں میں کئی راستے نکلتے ہیں،
عصائے عزم سے بھی زورِ آب ٹوٹتا ہے
فلک پہ چاند ستاروں کے اشک بہتے ہیں
زمیں پہ جب کسی مفلس کا خواب ٹوٹتا ہے
نکل کے صحنِ چمن سے ہے دَر بہ دَر خوشبو،
ستم کے ہاتھ سے کوئی گلاب ٹوٹتا ہے
خموش ہو گئے اب ساکنانِ شہرِ قلم
وہ شور ہے کہ دمِ انقلاب ٹوٹتا ہے
نکل کے دیکھو بھی عشرت کدے سے اے شاہیںؔ
کہ حق پرستوں پہ کیسے عتاب ٹوٹتا ہے

طارق متین

غزالِ درد مرے دشتِ جاں میں رہتا ہے
بہت سکون سے اپنے مکاں میں رہتا ہے
کہاں کی دولتِ نایاب مل گئی ہے اسے
عجیب شخص ہے کارِ زیاں میں رہتا ہے
جسے بھی ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا آیا
زمیں پہ رہ کے وہی آسماں میں رہتا ہے
مرے یقیں کی حفاظت مرے خدا کرنا
وہ بے خطر ہے جو تیری اماں میں رہتا ہے
یہ کیسا روگ مرے دل کو لگ گیا طارقؔ
ہر ایک پل اسی شہرِ بتاں میں رہتا ہے

جیسے جنگل میں چھپا کوئی ہرن رہتا ہے
میری آنکھوں میں ترا سانولاپن رہتا ہے
کسی درویش کی صحبت کا اثر ہے کہ یہ دل
جہاں جس حال میں رہتا ہے مگن رہتا ہے
جب بھی ہوتا ہوں کہیں دور وطن سے اپنے
مجھے اندیشۂ اربابِ وطن رہتا ہے
مال و اسباب پہ اترا تو رہے ہو لیکن
ایک ہی گھر میں ہمیشہ کہیں دھن رہتا ہے
دَر و دیوار میں خوشبو سی بسی ہے طارقؔ
شاید اس گھر میں کوئی مشک بدن رہتا ہے

● ڈاکٹر نوشاد احمد کریمی

نجات مل نہ سکے جس سے وہ عذاب لیے
کھڑا ہے کون سرِ نیزہ آفتاب لیے
دیارِ خواب سے نکلی جو روشنی کی کرن
پگھل گئی ہے کوئی رات ماہتاب لیے
چڑھی جو دھوپ تو اس کا بھی زعم ٹوٹ گیا
جو منتظر تھا سحر کا سنہرے خواب لیے
میں جس کو بھول کے مسرور اپنے آپ میں تھا
وہ آگیا ہے پرانا کوئی حساب لیے
نہیں ہے سہل اُسے ان دنوں سمجھنا بھی
دل و نگاہ میں آیا ہے وہ سراب لیے
فصیلِ شام پہ جلنا نہ آسکا تھا جسے
وہ آگیا ہے ہتھیلی پہ آفتاب لیے
کہاں کہاں سے نہ گزرا ہوں میں یہاں نوشاد
یہ روز و شب کا تسلسل ہے اضطراب لیے

یہ سفینہ جو بے حد روانی میں ہے
مجھ کو معلوم ہے کتنے پانی میں ہے
خوش بیانوں کو اس کی خبر ہی نہیں
کچھ الگ ہی مزہ بے زبانی میں ہے
جو مری سوچ کا کوئی حصہ نہیں
وہ بھی کردار میری کہانی میں ہے
اس کی یادوں کا کوئی دریچہ نہ کھول
لمحۂ رائگاں بھی نشانی میں ہے
جس سمندر کا کوئی کنارہ نہیں
ایک تنکا اسی بیکرانی میں ہے
میرے شعروں میں میرا ہی پرتو نہیں
وہ بھی پوشیدہ لفظ و معانی میں ہے
کوئی نوشاد مجھ سے خفا ہے، مگر
اک تعلق بھی اس بدگمانی میں ہے

• ڈاکٹر وارث انصاری

دریا دریا آگ لگی ہے پانی میں
کشتی میری جھلس رہی ہے پانی میں
ساحل ساحل رونے کی آوازیں ہیں
جانے کس کی جان گئی ہے پانی میں
دیکھو کتنے خوف کے منظر بکھرے ہیں
پرچھائیں بھی کانپ رہی ہے پانی میں
سیلاب اس کے گھر تک تو آ پہنچا ہے
دنیا کیا کیا ڈھونڈ رہی ہے پانی میں
ڈھونڈ رہے ہیں سورج چاند ستارے سب
آسمان کی ایک پری ہے پانی میں
آدھی دنیا تو ہے وارث تشنہ لب
آدھی دنیا ڈوب رہی ہے پانی میں

آنسوؤں کی کتاب لکھتا ہوں
زندگی کا نصاب لکھتا ہوں
اک سراپا ہے رو بہ رو میرے
پھول، خوشبو، گلاب لکھتا ہوں
اس قدر تیرگی کا عالم ہے
روشنی کی کتاب لکھتا ہوں
راحتِ وصل تو جدائی کبھی
عمر بھر کا حساب لکھتا ہوں
زندگی کے سوال کا پیہم
مدّتوں سے جواب لکھتا ہوں
نیند کب آئے گی خدا جانے
میں تو کاغذ پہ خواب لکھتا ہوں
وارث ہر شئے شباب لگنے لگی
جانے کس کا شباب لکھتا ہوں

• زاہدؔ کونچوی

سنگ برسیں کہ مرے جسم پہ تلوار گرے
میری کوشش ہے محبت کا نہ معیار گرے
پھول سے تتلی بچھڑ کر یوں گری ہے دیکھو
جیسے بستر پہ تڑپ کر کوئی بیمار گرے
ٹوٹ ہی جائے گی مضبوط سے مضبوط چٹان
اُس پہ پانی کی مُسلسل جو کوئی دھار گرے
لوگ مدہوش تھے وہ گرتے مناسب تھا مگر
راہ میں ٹھوکریں کھا کر کئی بیدار گرے
خوف زردار سے تھا یا کہ تھا زر کا لالچ
اُس کے قدموں میں کئی صاحبِ کردار گرے
فن کی رُسوائی زمانے میں یقینی سمجھو
اپنے معیار سے جب بھی کوئی فنکار گرے
کوششیں کرتے ہیں ہر روز سیاسی تاجر
اِن کا منشا ہے کہ نفرت کی نہ دیوار گرے
کام ایسے نہ کبھی کرنا جہاں میں زاہدؔ
جس سے اجداد کی عظمت کی بھی دستار گرے

خوب پتھر یہاں پر اُچھالے گئے
آئینے خود کو پھر بھی بچا لے گئے
شوق گھر گھر میں کچھ ایسے پالے گئے
تیرگی آگئی سب اجالے گئے
فکر میں مبتلا ہو گیا آدمی
حادثے زندگی کا مزہ لے گئے
خوب قسمت ہے میرے عزیزوں کی بھی
بددعا دے کے مجھ سے دعا لے گئے
سچ اکیلا تھا خاموش بیٹھا رہا
رنگ محفل میں جھوٹے جما لے گئے
خاص لوگوں کی فریاد سن لی گئی
اور ہم ہیں کہ وعدے پہ ٹالے گئے
اب کے بے موسمی بارشوں کے سبب
ہاتھ سے مفلسوں کے نوالے گئے

● نورالحسن نورؔ

عبث، بیکار باہر دیکھنا ہے
اسے اپنے ہی اندر دیکھنا ہے
بدل ڈالی تھی جس نے میری دنیا
دوبارہ پھر وہ منظر دیکھنا ہے
تخیّل! باوضو ہو کر ہی آنا
کسی کو دل سے چھو کر دیکھنا ہے
اگر ہوتے ہیں ہو جانے دو پتھر
ہمیں پیچھے بھی مڑکر دیکھنا ہے
چمن کی آبرو کہتے ہیں جسکو
مجھے بھی وہ گلِ تر دیکھنا ہے
تم اپنے آسمانوں کو ہٹالو
مجھے اب زورِ شہپر دیکھنا ہے
ہُوا تسخیر نورؔ اوجِ فلک بھی
تمھیں اب کیا مسخّر دیکھنا ہے

دل کی آنکھوں سے نظر سب کی ٹٹولی جائے
تب کہیں زلفِ سخن بزم میں کھولی جائے
اپنی تحریر کا ہر لفظ شگفتہ ہوگا
اک ذرا نوکِ قلم دل میں ڈبولی جائے
روشنی اتنی زیادہ ہے گلی میں اسکی
کوششیں لاکھ کروں آنکھ نہ کھولی جائے
اسکو وحشی بھی سمجھ لیتے ہیں آسانی سے
پیار کی بولی کسی بولی میں بولی جائے
اعتبار اپنا بہر حال وہ کھو دیتی ہے
بات جو دل کے ترازو میں نہ تولی جائے
وقت کم ہے تو اسے لہو ولعب میں نہ گزار
فصل وہ فصل ہے جو وقت پہ بو لی جائے
نورؔ یہ نرم مزاجی نہیں ملتی سب کو
چیز اچھی ہے طبیعت میں سمولی جائے

گھر کے بھی گھٹاؤں میں یہ کالے نہیں پڑتے
کچھ چاند ہیں جن پہ کبھی ہالے نہیں پڑتے
صہبائے محبت سے جو لبریز کبھی تھے
نظروں پہ وہ اب سانولے پیالے نہیں پڑتے
اَٹ جائیں بہت گرد میں حالات کی، لیکن
کردار کے سکّے کبھی کالے نہیں پڑتے
صحرائی تپش جب سے گزر کر گئی دل میں
اس روز سے ان پاؤں میں چھالے نہیں پڑتے
ممتا کی تڑپتی ہوئی آغوش میں بچّے
سو جاتے ہیں اور منہ میں نوالے نہیں پڑتے
تاریکیاں چھائی ہیں نثاؔر اب کے عجب طور
پندار کے روزن پہ اُجالے نہیں پڑتے

• نثارؔ جیراجپوری

بادل کی پارہ پارہ رداؤں میں. چاندنی
کھوئی ہوئی ہے کس کے خیالوں میں چاندنی
کرتی ہے غسل جھیل کے پانی میں آ کے وہ
شبپر کو پھر سکھاتی ہے باغوں میں چاندنی
اشکوں کو پونچھ دیتی ہے دامن سے اپنے وہ
ملتی ہے جب بھی نیم کی چھاؤوں میں چاندنی
پچھلے پہر دریچے کے رستے اُتر کے وہ
زلفیں بکھیرے آتی ہے بانہوں میں چاندنی
اس کے سوا لبھاتی نہیں کوئی شے مجھے
ایسے بسی ہوئی ہے نگاہوں میں چاندنی
ساون کی بھیگی، بھیگی فضاؤں میں آ کے وہ
پلکیں بھگویا کرتی ہے خوابوں میں چاندنی
سایہ فگن تھی مجھ پہ جو کل شب. بہت نثاؔر
گم ہوگئی ہے اب وہ ستاروں میں چاندنی

• مصداق اعظمی

آہٹیں سن کر ہی مرجاتی ہے صحراؤں کی خاک
اب ترے وحشی سے ڈر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
کون خیمہ زن کہاں ہے ڈھونڈھ لو، کیونکہ یہاں
پل میں سب کچھ خاک کر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
اس جنونِ عشق کی ٹھوکر میں آجانے کے بعد
آسمانوں میں بکھر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
انگلیاں تیری پکڑ کر سن لے اے بادِ صبا!
اب تو گلشن سے گزر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
خوشنما منظر تو سب دھندلے نظر آتے ہی ہیں
جب دلوں میں بھی اُتر جاتی ہے صحراؤں کی خاک
پاؤں پھیلاتی ہے یہ صحرانوردی جب مری
کو بہ کو مصداقؔ بھر جاتی ہے صحراؤں کی خاک

بے سبب روز لڑائی بھی بہت ہوتی ہے
اس کی نسبت سے بھلائی بھی بہت ہوتی ہے
سادگی، پیار، وفا اور مروّت جیسی
ہم غریبوں میں بُرائی بھی بہت ہوتی ہے
شرم کو دھرم کے حصّے سے گھٹا کر دیکھو
ایسے دھندے میں کمائی بھی بہت ہوتی ہے
تیری یادوں کے سبھی داغ ہیں دل پر باقی
جبکہ رو رو کے صفائی بھی بہت ہوتی ہے
تجھ کو معلوم نہیں ہے مری قیمت شاید
وقت پڑ جائے تو پائی بھی بہت ہوتی ہے
میں پہاڑوں کی بلندی کو فراموش کروں
میرے نزدیک تو رائی بھی بہت ہوتی ہے
تیرے دَر کی جبیں سائی جنھیں منظور نہیں
ایسے بندوں پہ خدائی بھی بہت ہوتی ہے

● سبودھ ساقی

خود سے آگے نکل گیا ہوں میں
جانے کس رَو میں بہہ رہا ہوں میں
اُس کی آنکھوں سے جھانکتا ہوں میں
میں سمجھتا تھا گمشدہ ہوں میں
تیرے دَر پر ذرا رُکا ہوں میں
ورنہ بہتی ہوئی ہَوا ہوں میں
دشتِ وحشت میں، صحنِ مقتل میں
ہر جگہ خود کو دیکھتا ہوں میں
کفر کو دھرم ماننے والا
ایک دلچسپ زاویہ ہوں میں
اپنے رشتوں پہ بوجھ ہوں شاید
بارہا یہ بھی سوچتا ہوں میں
اپنی بربادیوں کے ماتم میں
کتنا مشغول ہو گیا ہوں میں
ہوں بھی لیکن برائے نام ہوں بس
جیسے جنگل میں راستہ ہوں میں
اجنبیت عجیب عالم ہے
مستقل کوئی دوسرا ہوں میں

خودی سے ضد سے اور غصے سے ناطہ توڑ آیا ہوں
میں اس اوتار میں اپنا ہی ایک دھندلا سا سایہ ہوں
میں تھوڑی دیر پہلے تک ترا ہمراز سایہ تھا
یقیں کا دیپ بجھتے ہی میں اب بالکل پرایا ہوں
ملاقاتیں، حسیں وعدے، تغافل، روٹھنا، منا
غزل کی پوٹلی میں دیکھ! سب کچھ باندھ لایا ہوں
مجھے جو کچھ بھی کہنا تھا وہ لفظوں کے پرے نکلا
ترے دروازے پر اک کورا کاغذ چھوڑ آیا ہوں
نہیں تھی جب وفا مجبوریوں کا دوسرا پہلو
میں اس ماحول کا بچہ ہوں، اس پیڑھی کا جایا ہوں
مرے اندر چھپے بالک نے مجھ کو گدگدایا ہے
بہت دن بعد میں بے ساختہ یوں مسکرایا ہوں

• سبودھ ساقی

منا رہا ہے بہاروں کے دن چمن اپنا
کلی کلی نے اُتارا ہے پیرہن اپنا

رہا کروں گا کبھی خود کو اپنے زندوں سے
ابھی تو گھوم رہا ہوں لئے بدن اپنا

بھٹک گئے ہیں کہیں پھر جنون کے جھونکے
بہت دنوں سے ندارد ہے بانکپن اپنا

ہماری بہکی ادائیں بھی ہو گئیں مقبول
اس اتفاق میں شامل ہے کچھ جتن اپنا

میں اپنے ساتھ یہ ماحول لے کے چلتا ہوں
تمھارے شہر میں پھیلاؤں گا میں بَن اپنا

جنوں گمراہ نکلا، عقل کے نقشے غلط نکلے
کبھی منزل غلط نکلی، کبھی رستے غلط نکلے

ارادے نیک نیت صاف منصوبے مناسب تھے
ہماری دستکیں بے جا تھیں، دروازے غلط نکلے

نہ ہم بیتاب تھے اُتنے نہ تم بے چین تھے بالکل
وہ جن سے کی تھی پیمائش وہ پیمانے غلط نکلے

بسا ہے آرزو کا شہر حیرت کی حدوں سے دور
ہماری جستجو کے سارے تخمینے غلط نکلے

بھڑکتی ہی رہی ہے قطرہ قطرہ تشنگی میری
جو بتلائے تھے ساقی نے وہ سب نسخے غلط نکلے

سوغات غزلیں

● احمد عطا [پاکستان]

دُعا کے پھول کھلاتے ذرا نکھر جاتے
قبولیت کی گھڑی آتی اور مر جاتے
فنا کے خواب کئی دن سے آ رہے ہیں مجھے
میں دیکھتا ہوں پرندوں کو جھیل پر جاتے
قبولیت سے بھلا کیا ہمیں شکایت ہو
دعا ہی اونگھنے لگتی ہے عرش پر جاتے
فرشتے رات یہ کہتے رہے وہ تیرا نہیں
بتانا غیر ضروری تھا، بس گزر جاتے
میں خواب دیکھ چکا ہوں، تباہیوں کے خواب
مگر یہ خواب ہی تعبیر سے مُکر جاتے

میں تری مانتا لیکن جو مرا دل ہے نا
دَر کا پتھر ہے، ہٹانا اسے مشکل ہے نا
یہ ترا حسن کچھ ایسا نہیں پوجیں جس کو
لیکن اے یار ترے گال کا جو تِل ہے نا
جو مرے واسطے دن رات دعا کرتے ہیں
دشمنِ جاں! یہ بتا ان میں تُو شامل ہے نا
مانگنا آتا نہیں اور خدا کہتا ہے
اے فرشتو! اسے دیکھو یہ جو سائل ہے نا
زندگی عشق میں گزرے تو قصیدہ لکھوں
کہ وہی ایک قصیدہ ترے قابل نا

بیس میزبان غزلیں

• خورشید اکبر

خسارے میں بھی آمد کا شمارہ دیکھنے والے
بہت نادم ہوئے پھر گوشوارہ دیکھنے والے

نئے الہام کی بخیہ گری سے خود پشیماں ہیں
ہماری زندگی کو پارہ پارہ دیکھنے والے

فلک انگشت بھرا ے کاش! رکھ پاتے زمیں اندر
بلندی پر سدا اپنا ستارہ دیکھنے والے

ہماری تشنگی کو بھی بلاغت سے بجھاتے ہیں
سمندر کی زباں پر استعارہ دیکھنے والے

وہ ہر اک سانس بدلے کی طرح چن چن کے لیتے ہیں
خدا کے کام میں بھی استخارہ دیکھنے والے

سفینہ شہر ڈوبا، وقت کا پشتہ کہیں ٹوٹا
بتائیں کیا بھنور اندر کنارہ دیکھنے والے

غزل ہے چاندنی ہے جام و ساقی لے کے بیٹھے ہیں
کنار آب دریا میں شرارہ دیکھنے والے

کہیں شب خون ماری سے کوئی خورشید مرتا ہے
کہاں ہیں ندیوں میں خوں ہمارا دیکھنے والے

کیا اس نے بنایا ہے بشر اپنی طرح کا
دنیا میں جو آتا ہے نظر اپنی طرح کا

بارود سے گوندھی ہوئی مٹی ہے یہاں کی
اُگتا ہے دھواں دھار شجر اپنی طرح کا

اک سانس ہی بندھ جائے تو نیت کوئی باندھوں
پھر ہوگا دعاؤں میں اثر اپنی طرح کا

منظر ہیں انوکھے، نئے چہروں کا ہے سیلاب
ہم ڈوبے جاتے ہیں، سفر اپنی طرح کا

وہ پیڑ تعلق کا اُگا دل میں کہ جس پر
نکلا ہے شفق رنگ ثمر اپنی طرح کا

بچپن میں جو مارا تھا کسی شخص کو پتھر
اب تک ہے مجھے یاد وہ سَر اپنی طرح کا

میں نے جسے ہر حال میں سینے سے لگایا
پہنچایا ہے اس نے بھی ضرر اپنی طرح کا

اِس شہر سے نکلے تو کہاں جاؤ گے خورشید
تم نے کہیں دیکھا بھی ہے گھر اپنی طرح کا

• خورشید اکبر

شہرِ انکار میں اقرار کے سکے کی کھنکتی رہی لذت جاناں!
رفتہ رفتہ ہوئی کافور وہ ہر بات پہ تکرار کی عادت جاناں!
خوب روتا تھا وہ معصوم مگر ماں بھی جاتا تھا کھلونے لے کر
اس کو بہلانا تھا لازم کہ تھی بازار میں ہر رنگ کی راحت جاناں!
کیا وہ تہذیب تھی خوددار جو مٹی میں پڑی یوں ہی تڑپتی ہوگی
کیا بہ صد حسنِ طلب وقت کی دہلیز پہ بیٹھی ہے قیامت جاناں!
میں نے کب جامہ فروشی کے عوض صوفی و صافی کا لقب چاہا تھا
شہرِ فاقہ میں ہوئی عید تو پھر ٹوٹے گی زنجیرِ قناعت جاناں!
بات کیا ہے جو کہیں قبر بنائی نہیں جاتی ہے زمیں زادوں کی
آگ سے کھیلتے بچوں کو سُلانے کی بھی ملتی نہیں مہلت جاناں!
یہ الگ بات کہ اُس ایک خدا کے لیے ہر کام کیا جاتا ہے
یہ الگ بات کہ سجدوں سے سوا ہوتی ہے بندوں کی ضرورت جاناں!
عاشقِ دید کی اُمید میں اک عید کی تمہید تھی پوشیدہ مگر
کس کو معلوم کہ ہے وعدۂ معشوق بھی جنت کی سیاست جاناں!
موج در موج وہ آکاش ہے سیلانی، وہ طغیانی، وہ حیرانی بدوش
جیسے صحرا میں سمندر کی ہو بے ساختہ، بے واسطہ ہجرت جاناں!
رات جیسی ہو چراغوں کو جلا کر یا بجھا کر بھی گزر جاتی ہے
کیا اندھیرے سے لپٹ کر کسی خورشید کو رہتی ہے ندامت جاناں!

سُخن یاد کر وہ شتابی سخن
شرابوں سی آنکھیں شرابی سخن
بدن سے اُبلتی رہے چاندنی
وہ لب ریز شب ماہتابی سخن
دریچے حسابوں کے کھلتے ہوئے
سلیقے سے پھر بے حسابی سخن
وہ آنکھوں کی پُرنور غرقابیاں
وہ زیرِ فلک آفتابی سخن
سفینہ وہ پیالا، وہ ساقی فلک
سمندر نشہ بازیابی سخن
وہ پھولوں کا جھڑنا وہ خوشبو کی رات
بدن سے بدن کا گلابی سخن
فلک در فلک لہر اُٹھتی ہوئی
وہ مٹی سے مٹی کا آبی سخن
سماعت ہے محوِ نوائے سروش
وہ حُسنِ طلب! وہ نقابی سخن
عجب رنگ خورشید کی شاعری
وہ خوش ذائقہ لاجوابی سخن

سہ غزلہ

• خورشید اکبر

[۱]

[عرفان صدیقی کی نذر!]

جس کو فلکِ پیر حریصانہ اُٹھالے
لازم نہیں درویش وہی دانہ اٹھا لے
کس ضبط کے عالم میں بنی ہیں یہ بہشتیں
راوی ہو وہی جو غمِ افسانہ اُٹھالے
بجھتی ہوئی شمعوں کی وصیت ہے صبا یاد!
پلکوں کی نمی سے پرِ پروانہ اُٹھالے
اس شہر میں آدم ہے نہ آدم کی کوئی ذات
جنگل نہیں بستا ہے تو ویرانہ اٹھالے
کیا ہو: جو یہاں خاص علاقہ ہے قضا کا
گر جامِ شہادت وہ حکیمانہ اٹھالے
جو بارِ امانت نہ اُٹھا ارض و سما سے
ممکن ہے اُسے عشق رقیبانہ اُٹھالے
کیا ہو جو خلل عطیۂ غیبی میں کبھی آئے
جب دولتِ الہام وہ دُزدانہ اُٹھالے
سو سال چمکتا رہے دربار سخی کا
ہم جیسے فقیروں کا جو ہرجانہ اُٹھالے
میں نے تجھے یوں سر پہ اُٹھایا سگِ دنیا!
کاٹے تو جسے سر پہ وہ دنیا نہ اُٹھالے
خوشیوں کے علاقے میں ہیں کچھ دشمنِ احباب
ہمدم بھی کہیں رنج عدو کا نہ اُٹھالے

[۲]

[عرفان صدیقی کی نذر!]

جو اپنے عوض خلعتِ شاہانہ اُٹھالے
کشکولِ انا کیسے فقیرانہ اُٹھالے
وہ شاہ بھی کیسا ہے جو فریاد سُنائے
وہ کیسا قلندر ہے جو نذرانہ اُٹھالے
اس دشمنِ جانی کو دعا دے کے میں جاؤں
آئے ! وہ مرا دردِ حریفانہ اُٹھالے
شاید کہ یہ دنیا بھی ہے بچّوں کا کھلونا
اس کھیل میں شاید کوئی دنیا نہ اُٹھالے
رہتا ہے مرے ساتھ وہ ہمزادِ سخاوت
مجرم ہو کوئی اور وہ جرمانہ اُٹھالے
شہِ رگ سے زیادہ نہیں خنجر کی گواہی
مٹی نہیں بے داغ تو دستانہ اُٹھالے
اس چاند کے پہلو نے عجب رقص اُٹھایا
جیسے کوئی جنگل میں پری خانہ اُٹھالے
یہ خرقہ ہے آفاق بدن سے بھی زیادہ
سانسوں کی یہ مضراب سر و شانہ اٹھالے
وہ شاہِ انا بھوکا ہی مرجائے ! جو خورشید
اُس خوشۂ اوقات کا ہر دانہ اُٹھالے!

• خورشید اکبر

[۳]

[عرفان صدیقی کی نذر!]

گردش میں ہے کیا لذت پیمانہ اُٹھالے
ہنس ہنس کے ہر اک رنج رفیقانہ اُٹھالے

ہر سانس میں جب موت کی قربت کا نشہ ہے
پھر جامِ جہاں شہر ظریفانہ اُٹھالے

پیالے میں سمندر کا وہ طوفان چھپا ہے
جو رات گئے سر پہ نہ مے خانہ اُٹھالے

حورانِ بہشتی نے کہا : شیخ ! پیا کر
تقویٰ کی صراحی کو بھی رندانہ اُٹھالے

یہ اشکِ ندامت ہے مری روح کا صدقہ
آئے ! وہ بصد شانِ کریمانہ اُٹھالے!

دریا میں بہت نیکیاں برباد ہوئیں ہیں
کشتی یہ گناہوں کی، فرشتا نہ اُٹھالے

اس شخص کے کردار پہ شک کون کرے گا
جو شخص ہر اک کام شریفانہ اُٹھالے

یا کھینچ لے صحرا و سمندر بھی زمیں سے
یا شہرِ شہادت سے عزاخانہ اُٹھالے

آدم کی کہانی کا سبق یاد ہے خورشید
معصوم اگر گندمِ یک دانہ اُٹھالے!

کیسی دشوار تھی آسان ہوئی بخیہ گری
زندگی موت کا سامان ہوئی بخیہ گری

یوں تو مٹی کا بدن ہے ترے آدم کا لباس
اس پہ اندر کی گرہ جان ہوئی بخیہ گری

کہیں سیتی ہے کہیں اور مَسک جاتی ہے
ایک کپڑے سے پشیمان ہوئی بخیہ گری

شاعری! تیری امانت کا یہ بوسیدہ لباس!
اور کیا حاصلِ دیوان ہوئی بخیہ گری

قصرِ شاہی میں ہوئی جامہ تلاشی دستور
اس کے دروازے کی دربان ہوئی بخیہ گری

مرتبہ خاص تھا ایواں میں رفوکاروں کا
جب کسی ملک میں سلطان ہوئی بخیہ گری

کیا کریں، رشتۂ توحید ہے پارہ پارہ
کہنے کو مسلکِ ایمان ہوئی بخیہ گری

کوئی آسان ہے تہذیب کے کھانچے بھرنا
نورِ خورشید سے حیران ہوئی بخیہ گری

● خورشید اکبر

رکھتا تھا جو سینے میں گماں اور طرح کا
نکلا ہے وہی بن کے دھواں اور طرح کا

اک شہر کے اندر ہے سماں اور طرح کا
اک تیرا ہے اک میرا مکاں اور طرح کا

پہلے بھی ترے چاہنے والے تھے پشیماں
اس پر ترے منکر کا بیاں اور طرح کا

کیا چیز ہے! ترے نام کی برکت کے سہارے
ہم کو بھی ملا کارِ زیاں اور طرح کا

اک شیشۂ نازک پہ کوئی پھول گرا تھا
پتھر کے بدن پر ہے نشاں اور طرح کا

چہرہ دلِ شفاف کی دیتا ہے گواہی
اک شخص ہے اندر سے دھواں اور طرح کا

بکھرا نہ کبھی تپتی ہوئی ریت کی مانند
اس شخص میں دریا ہے رَواں اور طرح کا

ان خانہ خرابوں کی خرابی پہ نہ جاؤ !
رکھتا ہے الگ خانۂ جاں اور طرح کا

شعروں سے اُبھرتا ہے وہ خورشیدِ معانی
ہے اس کی شہادت کا بیاں اور طرح کا

جو اُس نے سنائی تھی زبانی ہے کوئی اور
کیا دل پہ گزرتی ہے کہانی ہے کوئی اور

دہلیزِ فقیراں پہ قناعت ہے بڑی چیز
ورنہ کسی سلطان کا پانی ہے کوئی اور

وہ کرشن کنہیا کسی رادھا کی طلب ہے
سنتے ہیں کہ میرا سی دِوانی ہے کوئی اور

کیا جسم کا سنگار ہے، کیا روح کی خوشبو
دنیا ہی میں جنّت کی نشانی ہے کوئی اور

وہ سات حجابوں میں ہے تہذیب سراپا
روتی ہے مگر اصل کہانی ہے کوئی اور

ہر سانس میں، دھڑکن میں وہی ملکۂ احساس
اور شہرِ رقیباں میں سیانی ہے کوئی اور

منجدھار سے نکلا ہے وہ خوابوں کا جزیرہ
ساحل پہ وہ تعبیر نشانی ہے کوئی اور

دریا! ترے پانی سے بجھی ہے نہ بجھے گی
انساں کی رگوں میں جو رَوانی ہے کوئی اور

ظاہر میں وہی غیب ہے، وہ غیب میں روپوش
باقی نہیں خورشید تو فانی ہے کوئی اور

دو غزلہ

• خورشید اکبر

[۱]

[عرفان صدیقی کی نذر!]

مسکرائیں کبھی ہم شور مچانے لگ جائیں
صدمۂ جاں ! تجھے اوقات بتانے لگ جائیں

یہ الگ بات کہ ہم جشن منانے لگ جائیں
خود سے روٹھیں تو منانے میں زمانے لگ جائیں

کیا کریں ایک دریچہ نہ کھلا تیری طرف
کیا کریں ہم کہیں دیوار اٹھانے لگ جائیں!

کیا ہو: جب شہر کو ملتا نہ ہو اپنا چہرہ
کیا ہو: جب چاروں طرف آئینہ خانے لگ جائیں

حاشیہ بن کے محبت کھڑی رہ جائے تو کیا
دشمنِ جاں کو بھی ہم دوست بنانے لگ جائیں

کون مانگے سے بھی دیتا ہے خوشی کی خیرات
ہم تجھے یاد کریں ہاتھ خزانے لگ جائیں

ہم پہ کس طرح کھلے کوئی کتابی چہرہ
اس کی تفسیر میں جب سارے سیانے لگ جائیں

صاحبو! ان کے ہی دم سے ہے زمیں عشق آباد
دونوں عالم کی جو زنجیر ہلانے لگ جائیں

صبح آئینہ میں روشن ہو وہ تہذیب جمال
رات کی زلف سے خورشید کے شانے لگ جائیں

[۲]

[عرفان صدیقی کی نذر!]

جو ہیں سورج کے عزادار وہ آنے لگ جائیں
شام ہوتے ہی چراغوں کو بجھانے لگ جائیں

بے کفن لاشیں بھی خوشبو سے نہانے لگ جائیں
شہرِ مرحوم میں ہم پھول بچھانے لگ جائیں!

ہم کسی شہرِ شہادت کے گنہگار ہیں کیا
ہم بھی اوروں کی طرح ناچنے گانے لگ جائیں!

کیا ہو اس وقت: جو یہ تمغۂ ہجرت، یہ پرند
پیٹ کی آگ میں کچھ اور ملانے لگ جائیں

پرورش ہوتی ہے خشکی سے بھی شادابی کی
ہم ہیں صحرا تو سمندر کے سرہانے لگ جائیں

اس سے پہلے کوئی تہذیب جلے بستی میں
آگ وحشی نہ بنے! عشق سکھانے لگ جائیں

دیکھنا زیرِ فلک دردِ سمندر کی جگہ
عقل والے نہ کہیں خاک اڑانے لگ جائیں

درد کے محورِ آفاق پہ چلتی ہے زمیں
درد ہم اوڑھ لیں کیا درد بچھانے لگ جائیں

● خورشید اکبر

سفر کیسا وہ روحانی سفر تھا
پھر اس کے بعد جسمانی سفر تھا
نچھے تھے کوہ و دریا راستے میں
بلندی پر تھی طغیانی ، سفر تھا
بدن کے ساتھ روشن شہرِ امکاں
شگفتہ خطۂ جانی ! سفر تھا
یہ مانا لوٹ آیا ہوں سلامت
مگر وہ دشمنِ جانی سفر تھا
تمہاری آنکھ میں ٹھہرا ہے کب سے
وہ میری آنکھ کا پانی سفر تھا
بہت روئے تھے تیکھے موڑ پر ہم
پھر اس کے بعد امکانی سفر تھا
نہ مشکیزہ، نہ پانی کا کٹورا
تنِ تنہا بیابانی سفر تھا
تماشائی بھی آئینہ بنے تھے
سراسر عکسِ حیرانی سفر تھا
کبھی رختِ سفر کھلنے نہ پایا
ہوئی دل کی نہ دربانی سفر تھا
زمیں اوجھل رواں تھی خواب کشتی
ہزاروں میل تک پانی سفر تھا
عجب تھی دشت و صحرا کی امانت
وہی خورشید سیلانی! سفر تھا

ندی میں ڈوب کے اس نے کہا کہ پانی ہے
یہ واقعہ بھی کسی برف کی زبانی ہے
ہمارے گھر میں اندھیرے بچھا دیئے گئے ہیں
ہمارے شہر میں سورج کی حکمرانی ہے
زباں سے زیر کبھی دشمنوں کو کرتی تھی
کٹی پھٹی سی وہ تصویر بے زبانی ہے
ہمارے لوگ نئے موسموں سے ڈرتے ہیں
ہمارے خون میں کچھ ہے جو خاندانی ہے
جو روند آئے ہو تم آشیاں ہمارے تھے
جو چھوڑ جائیں گے ہم درد کی کہانی ہے
جو خواب گنبدِ بے در پہ ہو گیا قرباں
اس ایک خواب کی تعبیر زعفرانی ہے
وہ ایک موہنی صورت خطا بغاوت کی
جھلک گلابی ہے، ملبوس آسمانی ہے
زمین ماں ہے محبت کی بات کرتی ہے
پھر اس کے بعد سیاست بھی سائبانی ہے
دیارِ شام کے رستے میں قبرِ نورانی
خدا کا شکر ہے خورشید کی نشانی ہے

• خورشید اکبر

شاخ در شاخ کھلے پھول شناسائی کے
پھل جو ٹوٹے تو نوالے ہوئے تنہائی کے

اس کے سینے میں اُتر کر مری تلوار گری
پھر لکھے اس نے قصیدے مرے پسپائی کے

اس نے اشکوں سے مرا زخمِ جنوں دھویا تھا
اور مرہم بھی لگائے تھے پذیرائی کے

عشق ناکام ہے صحرا کا سمندر ہونا
ڈوبنے والے جزیرے ہیں شکیبائی کے

اب کسی جسم کے اندر نہیں حساس وجود
اب کہیں میلے بھی لگتے نہیں رسوائی کے

شہر میں کتنی برہنہ ہے یہ جامہ زیبی
اور انداز بھی لگتے نہیں ہرجائی کے

اس نے بھی شاخِ تعلق کو ہرا رکھا ہے
میں نے بھی پیڑ لگائے نہیں دانائی کے

ایک معصوم شرارے سے جلا تھا دامن
عمر بھر پھول کھلاتے رہے بھرپائی کے

زہر ماحول میں سانسوں کا وظیفہ نہ رہا
اس نے آداب سکھائے تھے مسیحائی کے

یہ الگ بات کہ پھر شہربدن ٹوٹ گیا
قصے مشہور ہوئے وقت کی انگڑائی کے

شاد و آباد رہے صبحِ قیامت خورشید
سُرخ جوڑے سے الگ بول تھے شہنائی کے

خواب ہے کیا منظرِ نایاب کے جیسا ہے کیا
کھیل سارا موسمِ احباب کے جیسا ہے کیا

پیاس مشکیزے تو اوندھے منہ گرے ہیں ریت پر
اور صحرا میں سماں سیلاب کے جیسا ہے کیا

حُسن کا چاکِ گریباں کس نے دیکھا مگر
عشق میں بندِ قبا آداب کے جیسا ہے کیا

ساری دنیا مل گئی ملتا نہیں پھر بھی قرار
حال اس کا بھی دلِ بے تاب کے جیسا ہے کیا

جو بھی جنگل اور جزیرے تھے مہاجر گاہ تھے
وہ سفینہ شہر بھی غرقاب کے جیسا ہے کیا

میں جہاں جاتا ہوں ساحل اس جگہ گردش میں ہے
پاؤں سے لپٹا ہوا گرداب کے جیسا ہے کیا

گاہ آندھی، گاہ بارش، گاہ لرزش میں زمیں
یار کی فطرت میں کچھ سیماب کے جیسا ہے کیا

شش جہت سے تپ رہا ہے ایک صحرائی وجود
درمیاں وہ خطۂ شاداب کے جیسا ہے کیا

اُٹھ رہا ہے پھر کوئی خورشید اپنی راکھ سے
مطلعِ شہرِ شفق! یہ خواب کے جیسا ہے کیا

• خورشید اکبر

کیا بدن ہے سبز خواہش کا شجر ہے
سُرخ رنگت شاخِ مژگاں کا ثمر ہے
نیلی پیلی حسرتوں کا نام گھر ہے
دیکھتی ہے کیا یہ دنیا آنکھ بھر ہے
کیا خبر کس دم بدل جائے یہ موسم
کیا محبت کیا مسافر کی نظر ہے
غیب کے پردے میں ہے سیرِ بہشتی
کون جانے یہ سفر بھی رہ گزر ہے
ماہیت بدلی ہے تیری شہرِ جاناں!
برف ہے یا آب دیدہ اک شرر ہے
ایک چہرہ موسموں کے رنگ جیسا
ایک چہرہ آئینے سا معتبر ہے
سیر گاہِ جان و تن کے سب مسافر
کیا سُنائیں حالِ دنیا مختصر ہے
خواب میں کل شب غزالِ دشت دیکھا
چشمِ حیراں میں سمایا ایک ڈر ہے
خوف صدیوں کا بسا خورشید مجھ میں
ایک چنگاری کا شاید یہ اثر ہے

کیا ان پہ گماں اور ہے کیا مجھ پہ یقیں اور
کیا دردِ محبت سے جدا ہے یہ زمیں اور
وہ خانہ نشیں میری خرابی پہ ہے راضی
دے مجھ کو مکاں اور جو نہ دے اس کو مکیں اور
سجدے کے عوض دوسری دنیا نہ خریدوں
گھس گھس کے سیہ رنگ ہوئی میری جبیں اور
مٹی سے بنانا کبھی مٹی میں ملانا
مٹی سے اٹھانا ہے فلک خاک نشیں اور
کھلنے کو کھلے پھول بہت باغِ طلب میں
ملنے کو ملا شہر کہاں تم سا حسیں اور
یہ بھید سمجھ میں نہیں آنا تھا نہ آیا
بے چین یہاں سب ہیں وہ دنیا ہو کہ دیں اور
ظاہر ہو کہ باطن ہیں سبھی زیرِ تصرّف
کیا ثابت و سیار ہیں! سب زیرِ نگیں اور
مژگاں پہ بسے شہر میں سیلاب جو آیا
پھر جس کا ٹھکانا تھا، ٹھکانا تھا کہیں اور

● خورشید اکبر

[ایک غزل نظم نما]

خدا کے سامنے وہ ہاتھ باندھے رو پڑی ہے
قضا انگشت میں اک جاں نگینے سی جڑی ہے
فلک اوندھا گرا ہے اور زمیں اُلٹی پڑی ہے
لرزتے وقت کی دیوار پر ٹوٹی گھڑی ہے
زمیں تانبے کی ہے اس پر سوا نیزے کا سورج
وہ قربت دھوپ کو وہ نور سے زیادہ کڑی ہے
بجا کہ ثابت و سیار کے خیمے ہیں اُکھڑے
فنا کی نال جو شہرِ شہادت میں گڑی ہے
زمیں ہے دھونکنی ، سیال بہتے جا رہے ہیں
سَروں پر آگ بارش ہے عذابوں کی جھڑی ہے
کچھ ایسے ٹوٹ کر بکھری ہوئی ہے ایک دنیا:
کسی کے ہاتھ سے جیسے صراحی گر پڑی ہے
پرندے ، پھول، شبنم، اور شفق نذرِ شہادت
فلک کی آنکھ میں پاتال کی سوئی گڑی ہے
ارادہ تو ہے یزداں پر کمندیں پھینکنے کا
اَنا تردید لیکن راستہ روکے کھڑی ہے
یہاں تک انتظارِ دید میں ہم آگئے ہیں
یہ اک صبحِ قیامت کتنی صدیوں سے بڑی ہے
قضا کے بعد ہم سب حشر کے میدان میں ہیں
حسابِ دوستاں کا دن ہے سب کو دھڑ پکڑی ہے
قیامت بعد پھر نکلا وہی خورشید اکبر
یہ لگتا ہے کہ دنیا نیند میں پھر چل پڑی ہے

جستجو کیا منظرِ نایاب کی ہے
کیا ہے یہ دُنیا سواری خواب کی ہے
پھیلتا جاتا ہے ریگستان مجھ میں
تشنگی کیا خطۂ شاداب کی ہے
پھر فلک سیارگاں ڈوبے کہ نکلے
کیا کہانی شہر میں سیلاب کی ہے
بہہ گئی ہے پانیوں میں ساری دُنیا
بے زبانی کیا شبِ غرقاب کی ہے
خواہشیں سکوں سے داغی جا رہی ہیں
کیا حکومت شاہِ عالم تاب کی ہے
آسماں اوڑھیں زمیں اپنی بچھائیں
کیا ضرورت اطلس و کمخواب کی ہے
جسم کے اندر بہت بے چین سی وہ
جان کیا ہے اک ادا سیماب کی ہے
موت کیا ہے تلخ اَمرت کی صراحی
زندگی کیا چاشنی زہراب کی ہے
جل اُٹھی خورشید انگشتِ شہادت
کیا نشانی آتشِ بے تاب کی ہے

تعزیتی غزلیں

• محمد مختار وفا

[منظر سلطان کی یاد میں]

منظر سرِ منظر وہی منظر پسِ منظر
کچھ ٹوٹ رہا تھا مرے اندر پسِ منظر
وہ شورِ جنوں، سوزِ دروں، دیدۂ پُرخوں
کھلتا رہا سناٹوں کا دفتر پسِ منظر
جب آخرِ شب بجھ ہی گئی شمعِ فروزاں
کس کام کا یہ مہرِ منور پسِ منظر
پروازِ تگ و تاز کا ہمراز تھا کل تک
ہے کتنا شکستہ وہی شہپر پسِ منظر
ساحل کے تماشائیو! اب لوٹ بھی جاؤ
خاموش ہوئی موجِ سمندر پسِ منظر
اس راہِ جنوں کا تھا وہی تنہا مسافر
شاہد ہے وفاؔ میل کا پتھر پسِ منظر

[منظر سلطان کی یاد میں]

خدایا، کون سی ترکیب آزماؤں میں
کسی کو یاد رکھوں خود کو بھول جاؤں میں
وہ شام بجھ گئی مہتاب جب نکلتا تھا
کوئی چراغ سرِ بزم کیا جلاؤں میں
وہ گفتگو وہ تکلم وہ رس بھرا لہجہ
ترے حصار سے باہر نکل نہ پاؤں میں
ہمارا شہر ہے مصروف خود نمائی میں
وہ آئینہ تھا کسے آئینہ دکھاؤں میں
تمام راستے مسدود ہوگئے تو کیا
کہیں سکوں تو ملے راستہ بناؤں میں
بچھڑ رہے ہیں گلے مل کے سارے دوست وفاؔ
اجل ملے تو اسے ہی گلے لگاؤں میں

نو خیز غزلیں

• فیاضؔ احسن

قصیدے لکھے مگر بادشاہ والے نہیں
کہ ہم خریدی ہوئی واہ واہ والے نہیں

مزاج سب کا میاں ایک سا نہیں ہوتا
ادب سے بات کرو ہم مزاح والے نہیں

انھیں اُبھرتے ہوئے نقش مت دکھا دینا
یہاں کے لوگ ہماری نگاہ والے نہیں

بس ان کے پاؤں کی مٹی سنبھال رکھی ہے
یہ بات سچ ہے کہ ہم مہر و ماہ والے نہیں

ہمیں زمانے نے استاد مانا ہے فیاضؔ
یہ اور بات کہ ہم درس گاہ والے نہیں

وہ جا چکا ہے مگر پھر بھی اک گماں ہے مرا
نہ تو زمیں ہے مری اور نہ آسماں ہے مرا

زمیں پہ آب کہاں ہے کہاں پہ بارش ہے
ہے دل میں آگ کہاں اور کہاں دھواں ہے مرا

میں آسمان سے آیا ہوا مسافر ہوں
کہاں مکان نہیں ہے، کہاں مکاں ہے مرا

میں سوچتا ہوں کہ دو گز زمیں بھی میری نہیں
میں دیکھتا ہوں کہ یہ سارا آسماں ہے مرا

وہ آگ میں نے جو دیکھی تھی آب میں فیاضؔ
اس ایک پل ہی میں سب کچھ دھواں دھواں ہے مرا

نوخیز غزلیں

• بابر شریف

کسی کے ساتھ یارانا نہیں ہے
مگر اِس شہر سے جانا نہیں ہے
مُنافق بستیوں کے باسیوں کو
غلط کہنے پہ جُرمانا نہیں ہے
پُرانے زخم تازہ ہو گئے ہیں
مگر لہجے کو مہکانا نہیں ہے
کہیں کھوجاؤں گا یہ ڈر ہے لیکن
جدھر سب ہیں اُدھر جانا نہیں ہے
مرے اندر کوئی رہتا ہے شاید
مگر وہ جانا پہچانا نہیں ہے
غزل کا جسم چھلنی ہو چکا ہے
ہُنر نے آج تک جانا نہیں ہے
اُسے دینے کو تیرے پاس بابر
کوئی انمول نذرانا نہیں ہے

ہواؤں سے لڑے کچھ بن گئے ہیں
دِیے ضد پر اَڑے کچھ بن گئے ہیں
سفر جو چاک کا جاری ہوا ہے
'مناسب سے گھڑے کچھ بن گئے ہیں'
وہ سارے لفظ جو نامحترم تھے
غزل میں یوں جڑے کچھ بن گئے ہیں
اُدھر روٹھا خُدا بیٹھا ہوا ہے
کہیں پتھر گڑے کچھ بن گئے ہیں
ہمارے لوگ سنگِ میل جیسے
اکیلے ہی کھڑے کچھ بن گئے ہیں
یہاں بونوں کو یہ لگتا ہے اکثر
کہ جیسے وہ بڑے کچھ بن گئے ہیں

پیش رَو نظمیں

شاہد عزیز / رئیس الدین رئیس

بارہ خاص نظمیں

انور شمیم

ہم عصر نظمیں

شارق عدیل / سبودھ ساقی

سوغات نظمیں

ایوب خاور [پاکستان]

صوفیہ انجم تاج [امریکہ]

رباعیات

رئیس الدین رئیس / زاہد کونچوی /

حفیظ انجم کریم نگری

(۱)

نہ محدود ہو کوئی

کبھی اے کاش ایسا ہو
نہ سورج ہی کوئی ڈوبے
نہ کوئی رات کالی ہو
نہ کوئی خواب ہی ٹوٹے
نہ کوئی آنکھ زخمی ہو
ہوا چلتی رہے یوں ہی
ندی بہتی رہے یوں ہی
نہ موسم خشک ہو کوئی
نہ چہرہ زرد ہو کوئی
پرندے جب جہاں چاہیں
درختوں پر اُتر جائیں
اُڑانوں پہ نکل جائیں
نہ پھر محدود ہو کوئی
زمین و آسماں کی
سرحدوں میں قید ہو کوئی

(۲)

موسم بتائیں گے

کبھی تم اپنی آنکھوں میں
چھپے خوابوں سے پوچھو گے
تو یہ تم کو بتائیں گے
کہ میں نے کیسے موسم میں
تمھارے راستوں کو
اپنی پلکوں پہ سجایا تھا
تمھاری اس طرح آمد کا
کب سے منتظر تھا میں
یہ سب موسم بتائیں گے

(۳)

بے حسی

جو منظر میں نے دیکھے ہیں
اگر تم دیکھ لیتے تو
یہ دھرتی چھوڑ دیتے تم
کہ اس زندہ حقیقت سے بھی
نظریں موڑ لیتے تم

(۴)

کون رقص کرتا ہے

دیکھ اس اندھیرے میں
روشنی کے گھیرے میں
کون رقص کرتا ہے
چاند ہے کہ سورج ہے
عشق یا محبت ہے
یا کوئی ضرورت ہے
روشنی کے گھیرے میں
کون رقص کرتا ہے

(۵)

محبت

محبت وقت کی دیوار کو بھی
توڑ سکتی ہے
مخالف ان ہواؤں کے
سبھی رُخ موڑ سکتی ہے
مگر یہ تم سے ڈرتی ہے
کہ تم سے مل کے
اپنی خواہشوں کا
پیٹ بھرتی ہے !

(۶)

تو ہی تو

اوّل تو ہے آخر تو
ہر جانب ہے تو ہی تو
پھر تو مجھ سے کیوں ڈرتا ہے
مجھ سے پہلے کیوں مرتا ہے

(۷)

شاداب زندگی

میں نے ہی آسمانوں میں
تارے سجائے ہیں
میں نے ہی اس زمین پر
ذرّے بچھائے ہیں
میرے ہی دم سے رہتی ہے
شاداب زندگی
کرتی ہے روز و شب
مجھے آداب زندگی !

☆☆☆

● رئیس الدین رئیس [مرحوم]

بدن کہانیاں

(۱)

بدن کہانی کے لکھنے والو!
بدن کہانی کو کیا لکھو گے
زمیں پہ جب تک ہے اُگتا گندم
بدن کہانی بھی ہے اُدھوری
کئی مورّخ بھی جا چھپے ہیں
اسی زمیں میں
جہاں سے گندم اُگا رہے ہو
یہی بدن ہے
یہی مورّخ یہی کہانی ہے بس بدن کی!!

(۲)

ابھی مسلسل سفر ہے جاری
طلوعِ حد سے
غروبِ حد تک
یہ اپنی منزل پہ جب رُکے گا
بدن کتھائیں بھی
ختم ہوں گی
وگرنہ اس لمحہ، ابد تک
نہ پوری ہوگی بدن کہانی!!

(۳)

نہیں وہ آنکھیں جو دیکھ پائیں
نہیں وہ الفاظ
جو اس کے رموزِ پنہاں کا
اور حقیقت کا
برملا انکشاف کر دیں
بدن کہانی کو لکھنے والو !
قلم ہیں جھوٹے
کہ رنگ ان میں
بہت ہی پھیکے بھرے ہوئے ہیں
کہ حق نگاری خوں کی
سرخیوں سے محروم ہیں سراسر
بدن کہانی کو لکھنے والو!!

(۴)

عشاء ساعتوں کے
بعد افلاک سے
طلوعِ فجر کی پاکیزہ
ساعتوں سے ذرا سا پہلے
بدن کہانی کو لکھنے والو !
لکھو مگر یہ کہانی پوری نہ ہوگی ہرگز
کہ بعد ازاں کی ہر ایک ساعت
تمھارے جسموں پہ خود کہانی
کوئی نہ کوئی رقم کرے گی!!

انور شمیم •

بارہ خاص نظمیں

عناصرِ بدن مرے

یہ سنگ ریزے سب،
عناصرِ بدن مرے،
یہاں وہاں پڑے ہوئے

میں چن رہا ہوں جانِ جاں!
قرینے سے سجا کے دے سکوں وہ شکل
جس میں اک مجسمہ،
لبوں پہ بانسری دھرے،
فضا کو عطر بیز،
دشتِ بے حنا کو سحر خیز،
خامشی کو عشق راگنی سے کر رہا ہو رقص رنگ

کہ مجھ پہ ایک بار پھر
مرے عیال،
میرے ہم رکاب و ہم صفیر
ضربِ تیشہ دے سکیں!!

☆

مگر نظم تصویر ہوتی نہیں

خموشی ہے ——
گہری، گھنی، رونگٹوں میں سراسیمگی بھرنے والی،
نہایت ہی سفاک —— گہری خموشی
مگر
شور ہے قصرِ خاکی کے اندر
غضبناک شور ——
سرِ دشت پھرتی ہوئی جیسے
بے چین روحوں کی چیخیں
کہ جوں
موسمِ برق و باراں میں سینوں کو دھڑکاتی
سرکش ہواؤں کا شور
کہ جیسے
تموج میں بے دست و پا
ڈوبتی اور اُبھرتی صداؤں کی گونج
میں ایزل (Easel) پہ آنکھیں دھرے
سوچتا، رنگ چنتا ہوں جاناں!
مگر ——
نظم تصویر ہوتی نہیں!!

☆

انور شمیم

اکتارے والا بنجارا

رخصت

اے ہوائے یخ بستہ
پھاگن کی ہوا گاتی آئی
پر کھول کے جاگی انگڑائی
باغوں میں آم کی شاخوں پر
پھر من للچاتے بور لگے
بچپن کو شرارت پھر سوجھی
سردی سے ٹھٹھری گٹھڑی سی
کم بخت خطائیں پھر سنکیں
کویل منقار میں کوک لیے
خوشبو کی جسامت ڈھونڈ رہی
پاگل پن کی تصویر ہوئی
پھر من جنگل میں
مور نے رقص کو دعوت دی
سکڑی سمٹی شریانوں میں
پھر موجیں ہلورے لینے لگیں
پھر لمس ہوا نے دہکائی
مٹی میں نمو کی چنگاری
لیکن جاناں ——!
یہ ہریالی
کیوں گاؤں سے شہر نہیں آتی
من گلیارے میں نہیں گاتا
اکتارے والا بنجارا!!

☆

اپنا سر پانی سے باہر رکھنا

اپنا سر پانی سے باہر رکھنا
سر ڈوبا تو تم ڈوبے
اپنا سر پانی سے باہر رکھنا
ڈوب رہو تم اور پانی کا لقمہ ہو جاؤ
شل بازو کو جنبش دیتے رہنا
اپنا سر پانی سے باہر رکھنا

سانسوں کے سرگم پہ ناچتے رہنے کی کوشش میں
شریانوں کے گرم لہو کو گردش دیتے رہنا
اپنا سر پانی سے باہر رکھنا

تیرتے رہنا
تیرتے رہنا
ساحل سے جا لگنے والا تختہ ہونے تک
اپنا سر پانی سے باہر رکھنا

☆

● انور شمیم

باغ سے آرہی تھی ہَوا

کیسے بے حِس ہم ہو چکے
اب —— کوئی بھی چھوَن
سطحِ دریا پہ لہریں بناتی نہیں
مکتبِ جاں میں لہرا کے گاتی نہیں
موجہ خوں میں ہلچل مچاتی نہیں
اب کوئی بھی چھوَن
قریہ تن میں سہرن اٹھاتی نہیں
باغ سے آرہی تھی ہوا
اب وہ بازار سے گھوم کر آرہی ہے!!

☆

دو منظر —— اک منظر میں گُم

شب چادر پہ سلوٹیں کاڑھتی،
تکیے پہ مژگاں سے ستارے تانک رہی،
اک گُم سُم سی لڑکی
اور دیوار کی دوسری جانب ——
پیالوں سے قطرے شبنم کے پونچھ رہا،
اک گُم سُم سا لڑکا
دو منظر —— اک منظر میں گُم
جاناں!
جیسے ہم تُم
اور پس منظر میں پھیلی
ہجر ندی پہ
بھیگی بھیگی ایک روپہلی
ریتیلی چادر!!

☆

● انور شمیم

رواں آبِ دریا پہ کاغذ کی کشتی

سمندر کے ساحل پہ پھیلی ہوئی
ریت چادر پہ نظمیں کوئی لکھ رہا ہے
اسے کیا پتا ہے ——؟
ہوا سب گھروندے گراتی،
لکیریں مٹاتی،
یہاں سے گزر جائے گی!
کوئی لکھ رہا ہے تو کیوں لکھ رہا ہے
شفق زار کینوس پہ
کرنوں تراشی دھنک رنگ قوسیں
اسے کیا پتا ہے ——؟
کہ بارش بہا کر
ہر اک خوش ادائی کسی پل بھی لے جائے گی
اور آنکھوں کو صحرائی ریتوں سے بھر جائے گی
کوئی لکھ رہا ہے تو کیوں لکھ رہا ہے
رواں آبِ دریا پہ کاغذ کی کشتی
اسے کیا پتا ہے ——؟
اسے...... ہاں...... پتا ہے
ہوا اور بارش کے اپنے تماشے ہیں جاناں!
تو پھر نظم خالق کا اپنا جنوں،
اپنی دیوانگی ہے !!

☆☆☆

خطا و بندگی کا سلسلہ

ابھی تک لکھ رہا ہوں
اگرچہ انگلیوں کی جھرّیاں
پانی پہ مکتوباتِ فانی لکھ رہی ہیں
اگرچہ اب ہوائے سرد
شریانوں میں بہتی سرخی وحدت بجھا کر
لہو میں ——
برف کے ریشے جماتی جا رہی ہے
اگرچہ دھوپ، شبنم چاٹ جانے پہ مصر ہے
مگر اب تک لرزتی انگلیوں نے
قلم کے ہاتھ لی بیعت نہیں توڑی
ابھی تو جنبشِ خامہ مہکتی روشنائی سے
مہ و انجم، فضائے کہکشانی
سبک لہروں پہ کشتی بادبانی
عروسِ شب کی بے شانہ لٹوں کی بے زبانی
سرائے جاں کی گونگی، سخت جانی
سوا نیزے سے نیچے حشر سامانی،
سروں کی بے امانی لکھ رہی ہے
یا......
ہوا کے تن پہ
آیاتِ جنوں کے حرف و معنی لکھ رہی ہے
یہیں تک سلسلہ یہ ختم ہونے کا نہیں جاناں!
ستارے بجھنے بجھنے تک
سمندر خشک ہونے تک......!!

● انور شمیم

کہیں کچھ تو غلط ہے

کہیں کچھ تو غلط ہے
نہ تم مانو، مگر جاناں!
کہیں کچھ تو غلط ہے
کہ جن کی انگلیاں،
پتوں پہ ٹھہرے
جھلملے شبنم کے دانے چُنیں،
تجسس سے بھری معصوم آنکھوں سے لگاتیں
اور ستاروں کا مچلنا دیکھتیں اُن میں
وہ آنکھیں قہر وخوں سے بھر رہی ہیں
کہیں کچھ تو غلط ہے
کہ جن کی پشت پہ بستے لدے ہوتے
کہ جن کے ہونٹ
نغمے گنگناتے، کھلکھلاتے
کہ جن کے ننھے ننھے پاؤں مٹی پہ تھرکتے
اب اُن آنکھوں میں بچپن کا کوئی سایہ نہیں،
لاوے ہیں نفرت کے
اور اُن کی انگلیاں
مضراب بن کر چھیڑنے کو مضطرب ہیں،
سازِ آتش بار
کہیں کچھ تو غلط ہے !!

☆

مری پسلی کہاں ہے !

ادھورے پن کا یہ احساس ——
یوں ہی تو نہیں ہے
دھڑکتا دل تو ہے اپنی جگہ پہ
کہ اب بھی چونک اٹھتا ہے
ذرا سی دستکِ بادِ صبا سے
کسی کی آہٹوں کا تو بھرم ہے
کسی کی
خوشبوئے موجودگی سے
عود و عنبر کا سماں ہے
بظاہر دست و پا سالم
سلامت عضو ہیں سارے
وہی ہیں،
لمس آگیں انگلیاں اپنی جگہ پہ
کہ جن میں،
رقص کرتے ہیں کئی مہتاب لمحے
کہ جن لمحوں نے روشن کردیے ہیں
مکاں اور لامکاں کے چھپے اسرار سارے
مگر احساس جاں لیوا ——
ادھورے پن کا یہ احساس یوں ہی تو نہیں ہے
بدن چھو کر تو دیکھو
ٹٹولو ملبۂ خاشاک جاناں!
اور —— بتاؤ تو
مری پسلی کہاں ہے !!

☆

● انور شمیم

خواب کا پیرہن

موت کا رنگ کالا نہیں
زعفرانی ہے یہ ہم نے جانا نہ تھا
ہم تو کیسر کی خوشبو سنی خاک سے
رنگ کی فصل، اُجلے کنول
زندگی کی ——
نئی زندگی کی علامت اُگانے میں مصروف تھے
تم نے جاناں مگر
اتنا دلدوز یہ تجربہ کیا کیا؟
خواب کا پیرہن
سرخ شعلوں کو پہنا دیا !!

☆

رو رہے ہیں سب کے سب

سہمے سہمے لوگ،
بارش آگ کی، اور ——
نزع کے عالم میں شہر و دشت
ریزہ ریزہ ہو کے اڑتی سخت چٹانوں کا شور
آسماں کی سمت اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے،
سر جھکائے،
رو رہے ہیں سب کے سب
پھر ابابیلوں کا لشکر بھیج دے
کیا انھیں جاناں!
خبر کچھ بھی نہیں؟
اَبرہہ نے
تجربہ گاہوں میں اپنی
فتح حاصل کر لی —— اور ساری ابابیلیں
اشاروں پہ ہیں اس کے
محوِ رقص !!

☆

● انور شمیم

بتاؤ تو جاناں ——!

یہ لوگ سارے
قطار اندر قطار سر کو جھکائے،
ہاتھوں کو ناف نیچے ادب سے باندھے،
چھپائے سینوں میں ہلچلیں جو،
بہت سکوں سے کھڑے ہوئے ہیں
بتاؤ جاناں ——!
بدن دریدہ، عضا بریدہ
کھنڈر کھنڈر قصرِ جاں سنبھالے
یہ لوگ جو ہم سے مل رہے ہیں،
ہمارے ہی جیسے لگ رہے ہیں
ہمارے خوابوں کی ڈولیاں جو،
اٹھائے کاندھوں پہ چل رہے ہیں
ہماری عیار گفتگو سے بہل رہے ہیں
یہ ڈھیہ گئے تو
ہم اپنے ایواں میں بچ رہیں گے ——!!

☆

دکانیں جتنی تھیں، سب اُٹھ چکی ہیں

ثنا و حمد کی خوشبو بسی صحبیں
جہاں انگڑائیاں لیتی
دریچوں کو جگاتی تھیں
شمامہ، عود و عنبر، مشک، صندل
چنبیلی، موتیا، بیلا،
گلِ دوپہر، جوہی، لالہ، داؤدی
گلال اور رنگ بکتے تھے
دکانیں جتنی تھیں
سب اُٹھ چکی ہیں
مناجاتوں نہائی بے غرض شامیں
جہاں سنگت پہ سُر کی رقص کرتی تھیں
وہاں صحراؤں کے ہُو کا سماں ہے
یہاں سایوں میں مدغم سایوں کے بھی درمیاں
اک بے کراں اندھا خلا ہے
جہاں اک دوسرے کی بات کیا جاناں!
کہ خود اپنی خبر لیتا نہیں کوئی
کبھی سیار و ثاقب
مداروں سے نکل کر
کسی اک سمت بھاگے جا رہے ہیں
اور اک گہری سیاہی کا سمندر
اڑانوں کو نگلتا جا رہا ہے !!

☆

ہم عصر نظمیں

• شارق عدیل

تخاطب

کل رات ہوا یوں بھی
اک چاند بدن لڑکی
تخئیل میں یوں اتری
دنیا کے مسائل نے
ہر دل کی مسرت کو
مصلوب بنا ڈالا
اور اس سے تخاطب پر
محسوس ہوا مجھ کو
جیسے کئی صدیوں کی
بچھڑی ہوئی دو روحیں
آپس میں مخاطب ہوں
بے روح کی قالب ہوں !

☆☆☆

میرے الفاظ استعارے ہیں

پھول، پتھر، چراغ، آئینہ،
دھوپ، صحرا، شجر، سمندر، ریت
میری نظموں کے استعارے ہیں
پئے اظہار جو تراشے ہیں
تا کہ تم پر یہ منکشف کر دوں
نئی تہذیب کے اندھیروں نے
روشنی کے حسیں لبادوں کو
اپنے جسموں کا پیرہن کر کے
کس طرح کر کے ذات کو تنہا
کر دیا ہے سکوں سے بے گانا

☆☆☆

• شارق عدیل

جسم کا ادھورا پن

چاندنی کے موسم میں
زندگی کے رستے میں
پیار کے درختوں کے
دلفریب سے سائے
رینگتے نظر آئے
کشمکش کے عالم میں
خود بخود جھکیں پلکیں
سائے بن گئے زنجیر
دھڑکنیں پکار اٹھیں
جسم کا ادھورا پن
موت کی علامت ہے!

☆

سڑک چلنے دو

کبھی پانی نہ آنے پر
کبھی بجلی نہ آنے پر
بہت سے نو جواں مل کر
سڑک کی گردشوں کو روک دیتے ہیں
مگر یہ بھول جاتے ہیں
سڑک کو روک دینے پر
زیاں جو وقت کا ہوگا
نہ جانے کتنے لوگوں کے
مقدر کی سنہری
...... ساعتوں کو چھین لے گا
نہ جانے کتنے لوگوں کے
تصور پر خراشیں ڈال دے گا

☆

• سبودھ ساقی

بے وطن پَل

جہانِ خواب کی
کھوئی ہوئی سرحد کے
ذرا سا اِس طرف؛
جہانِ ہوش کی
بے رحم سرحد کے
ذرا سا اُس طرف
نیم خوابی کی
طلسمی وسعتوں میں
بس گئے ہیں:
وہ خدائی بے وطن پَل
جن کے رشتے دار ہیں
دونوں طرف؛
جن کو ویزا کی
ضرورت ہی نہیں

☆

بے سہارا

کسی پُرزے میں کچھ بکھرے سے مصرعے
نہ جانے کب سے مجھ کو ڈھونڈتے تھے؛
ہر اک مصرع یہ مجھ سے پوچھتا تھا:
'یہاں کس کے سہارے چھوڑ کر ہم کو
اچانک ہو گئے غائب؟
ہمیں پہنچاؤ اب اک نظم کی منزل تلک
وگرنہ
پھر بلاؤ گے تو ہم
تمھاری دستکوں پر کیوں دھریں گے کان؟
تمھارے ہر تخیل کی صدا کھو جائے گی
لغت کے جنگلوں میں'!!!!!

☆

ایک لونڈیہ کی کہانی: روہت کے نام

اِس پر اتنی حیرت کیوں؟
ایک لونڈیہ کی قسمت میں تو یہی لکھا تھا
اس کا پیدا ہونا ہی تھا
ایک حادثہ، بہت بھیانک
شامل جس میں
کالی چمڑی، چہرے پر غربت کی خراشیں
اور ماتھے پر کبھی نہ مٹنے والی کالک
اُس نے جو کچھ کھویا اُس کی اپنی ہی نادانی تھی
کس نے کہا تھا اُس سے
دیکھے چاند ستاروں کے سپنے؟
کس نے کہا تھا اُس سے
اپنے جسم سے آگے بھی سوچے؟
آخر اس نے روح پہ کھا کے زخم
یہی تو جانا
صدیوں پرانی اس تہذیب کی
اک سچائی یہ بھی ہے
ارجن سا بننے سے پہلے
کئی جنم لینے ہوں گے
درونا چاریہ کو نذر میں اپنے
سب سپنے دینے ہوں گے!

☆

سنگیت

میں نے جادو دیکھا ہے
خاموشی کی کوکھ سے اُپجا
سُر کا وہ پہلو دیکھا ہے
جس میں لَے اور تال کا سنگم
ناد اور دھیان کا مدھر ملن
وہ ماحول بنا سکتے ہیں
جس میں نور کے چشمے جاگیں
نورس میں بھیگے سنسار
سیماؤں سے اوپر اٹھ کر
وقت کی پابندی سے آگے
ایسی ہو جھنکار: جس میں ڈوب کے
گاؤں، نگر، بستی، بازار
گلی، محلے، جنگل، گلشن
مدہوشی کے عالم میں
ناچیں، گائیں دور دور تک بھریں اُڑان!
میں نے جادو دیکھا ہے !!

☆

● سبودھ ساقی

نیا وقت

جو نظر اٹھتی ہے کرتی ہے سوال
لوگ آنکھوں میں مری جھانکتے ہیں
قہقہے طنز کیا کرتے ہیں:
دھوپ میں کچھ بھی نہیں پوشیدہ
دن میں بے باک سی عریانی ہے
رات آجائے تو کچھ چین پڑے
رات کے پاس کوئی کام نہیں ہو جیسے
پنشنر جیسا ہی برتاؤ کیا کرتی ہے
جانے کیا یاد کی فائل میں پڑھا کرتی ہے:
سوئے زخموں کو کریدے ہے کبھی
کبھی تنہائی سے، خاموشی سے
بے سبب بات کیا کرتی ہے
صبح آجائے تو کچھ چین پڑے
اک نیا وقت کریں اب ایجاد
وہ جہاں کوئی تقاضے ہی نہ ہوں
وہ جہاں کوئی بھی رفتار نہ ہو
کوئی در پردہ گرفتار نہ ہو
اک نیا وقت کریں اب ایجاد!

☆

بکھراؤ

خیالوں کے سمندر کے کنارے پر
پہنچ جاتی ہیں اکثر
اَن گنت ناویں
اور ہر اک ناؤ میں
جذبات، ارادے اور منصوبے
کنارے سے عمل کے گاؤں تک
تنگ سڑک پر بھیڑ ہے جس پر
ہزاروں خوانچے ہیں
اور ہیں ہر موڑ پر
چند تاجر اور مہاجن
بہت سے خواب اور جذبات
ارادے اور منصوبے
یہیں نیلام ہوتے ہیں
یہیں پر لُٹ بھی جاتے ہیں
انھی میں چند ایسے بھی ہیں جو
واپس کنارے پر پہنچ کر
کچھ ٹھٹھک کر
خیالوں کے سمندر میں، بھنور میں
ڈوب جاتے ہیں !!!!

☆

• ایوب خاور [پاکستان]

(۱)

نظم لکھتی ہے تجھے!

میں نہیں
یہ نظم لکھتی ہے تجھے
اپنی سطروں میں ترے ہاتھوں کی شمعوں کی
نزاکت
صبحِ حرفِ خواب کے رنگوں سے لکھتی ہے
تری ان سبز آنکھوں کے انوکھے زاویوں کو،
جھوٹ سچ کو، جھوٹ سچ اور مصلحت کو اور
حسنِ مصلحت کے راز لکھتی ہے
جانِ جاں یہ میرے لہجے میں
ترے سُر تال لکھتی ہے
مرے دن کی اُداسی، راستہ تکنے کی عجلت
اور مری آنکھیں جو تیری چمپئی خوشبو کی
گرہوں میں بندھی رہتی ہیں
ان کا حال لکھتی ہے
نظم میری ہے مگر دھڑکن کے وقفوں میں
ترے قدموں کی آہٹ اور ترے سب خال وخد
نقطوں، کششوں اور دائروں کے باب میں
لکھتی ہے کاغذ کی سفیدی پر ترے ماتھے کی
روشن صبحیں
شامیں درج کرتی ہے
کبھی تیرے گھنے بالوں سے مضموں باندھتی ہے
اور کبھی تیری سلگتی سانس سے مصرع بناتی ہے
کبھی تیرے لہو کی آنچ سے عنواں چراتی ہے
ترے چشم ولب ورُخ کے کنارے
تجھ سے ملنے کے کئی رستے بچھاتی ہے
کچھ اس انداز سے تجھ کو
مری خاطر
مری یہ نظم لکھتی ہے!

☆

● ایوب خاور [پاکستان]

(۲)

محبت آب ودانے کی طرح سے ہے

غزالِ جاں!
محبت آب ودانے کی طرح سے ہے
اُنھیں شہروں، محلّوں اور گلیوں اور
گھروں تک
اور گھروں کے آنگنوں تک کھینچ لاتی
ہے
جہاں وہ پلتی بڑھتی ہے
رگِ گل کی طرح شاخِ تمنا پر مہکتی ہے
ہَوا کے ساتھ خوشبو کی طرح بن بن
کے چلتی ہے
لبِ دریا
سرِ صحرا
کسی صحنِ گلستاں میں
کسی رستے کی جھلمل میں
کسی دُوری کی منزل میں
کسی صبحِ گُلِ تر میں
کسی شام سُبک سَر میں
کسی دن شب کے سائے میں
کسی شب دن کے پہرے میں کھڑی
ویراں سرائے میں
محبت اِک شکاری کی طرح دل کو کہیں بھی
گھیر سکتی ہے
محبت آب ودانے کی طرح سے ہے
مقدّر میں اگر یہ ہو
تو بارش کی طرح ہر ہر مسامِ جاں
کے اندر تک برستی ہے
جمالِ وصل کی صورت
گُلِ صدرنگ کی ہم راز سطحوں پر مہکتی ہے
رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کے
ایک اک قطرے کے اندر درد کی صورت
پگھلتی ہے
لباسِ ہجر کے اندر بدن بن کر سلگتی ہے
غزالِ دشتِ جاں..... اے دِل!
نظر کشکول ہے !!

☆

● صوفیہ انجم تاج [امریکہ]

ایک سوال

میں روزِ ازل سے
نمودِ سحر کی تمنا کو جاں میں سموئے
ترے عہد و پیماں کے ایفا کی امید دل میں سجائے
سنہرے سے خوابوں کی گٹھری کو سر پہ اُٹھائے
کڑی دھوپ میں زندگی کی
غموں کو دُکھوں کو سہے جا رہی ہوں
چلے جا رہی ہوں
بہت پُر خطر رہ گزر ہے
زمیں تپ رہی ہے
تو سورج سے لاوے کا طوفاں رواں ہے
ہر اک کام مشکل ہے کوہِ گراں ہے
مگر چل رہی ہوں کہ جذبہ جواں ہے
تو اے حاکمِ شہر! یہ تو بتا دے کہ کب تک
لہو کے مناظر، یہ دہشت، یہ وحشت
یہ ماؤں کی ویران گودیں
یہ گلیاں، یہ معصوم جانوں کی قربان گاہیں
یہ خوں میں نہائی ہوئی بستیاں اور کوچے
لہو رنگ راہیں

یہ اشکوں کے سیلاب اور سرد آہیں
یہ قانون و آئین کی پاسداری
ہر اک فرد مظلوم ہر اک بھکاری
مگر حاکمِ شہر! تجھ کو خبر ہے
کہ صبحِ ازل سے یہ شامِ ابد تک
نہاں کا، عیاں کا، وہ سارے جہاں کا
بس اک حکمراں ہے
کہ محشر کے میداں کا تنہا وہ منصف
ترے قول و فکر و عمل کا
اور وعدوں کا تجھ سے
سوالوں کی بوچھار کرنے لگے گا
تو، تُو کیا کہے گا...... تو، تُو کیا کرے گا

☆☆☆

رباعیات

• رئیس الدین رئیس [مرحوم]

☆

بے خوف یہ بہتے ہوئے دھارے ہوتے
طوفان میں کشتی کے سہارے ہوتے
موقوف تھا ہلچل پہ نظامِ ہستی
موجیں جو نہ ہوتیں تو کنارے ہوتے

☆

پیری کا گماں گزرا جوانی نہ گئی
اس قلزمِ ہستی سے روانی نہ گئی
ہر حال میں زندہ رہی رودادِ وفا
یہ عشق و محبت کی کہانی نہ گئی

☆

☆

ہم اہلِ کدورت سے کہاں ڈرتے ہیں
جو کرتے ہیں بے خوف وخطر کرتے ہیں
ہم ہی سے تو روشن ہیں محبت کے چراغ
ہم ہی تو ترے نام کا دَم بھرتے ہیں

☆

خوابوں کی تعبیر رہی پیروں میں
خود اپنی تقدیر رہی بیروں میں
مستقبل و حاضر کے اندھیروں میں رہے
ماضی کی زنجیر رہی پیروں میں

☆

• زاہد کونچوی

☆

اخلاص یہاں لوگوں میں دیکھا نہ گیا
پردہ بھی تعصب کا ہٹایا نہ گیا
نا اہل کی تعریف میں مصروف تھے سب
فنکار کو محفل میں نوازا نہ گیا

☆

پُر امن وفاؤں کا نگر کوئی نہیں
خوشحال زمانے میں بشر کوئی نہیں
گر کر جہاں برتن نہیں کرتے آواز
ایسا تو نظر میں میری گھر کوئی نہیں

☆

تم اس کو مروّت نہ محبت سمجھو
یا خول میں عیاری کے شفقت سمجھو
ممکن ہے یہاں تم کو وہ رسوا کر دے
کم ظرف کے احسان کو ذلّت سمجھو

☆

حق بات سدا وقت پہ کہنا سیکھو
انساں کی طرح دنیا میں رہنا سیکھو
کچھ ایسا کرو وقت تمھارا ہو جائے
تم وقت کے دھارے میں نہ بہنا سیکھو

☆

رباعیات

● حفیظ انجم کریم نگری [مرحوم]

(۱)

آسان نہیں کہنا رُباعی یارو!
ہر مصرع کو اچھی طرح گھولو تولو!!
تیاّر کرو تاج محل لفظوں کا
ہو کیف بھی طاری وہ رُباعی بولو!!

(۲)

یادوں میں حیف شہر بسا لیتا ہوں
تنہائی ترا خوب مزا لیتا ہوں
میں دور ہی رہتا ہوں جفا کاروں سے
الزام بھی میں مثلِ وفا لیتا ہوں

(۳)

تہذیب و تمدّن کی عمارت اُردو
اخلاص و مروّت کی علامت اُردو
جینے کا قرینہ ہے وِراثت اِس میں
رغبت ہے عنایت ہے شرافت اُردو

(۴)

احسان کیا ہے تو جتاتا کیوں ہے
نقارہ شب و روز سجاتا کیوں ہے
لوگوں میں مزہ لیکے سنانے والے
آنکھوں سے مری خون رُلاتا کیوں ہے

(۵)

باکار کو بیکار کہا کرتے ہیں
اچھوں کو بھی بیمار کہا کرتے ہیں
احباب کی باتوں میں نہ آنا انجم
پھولوں کو بھی یہ خار کہا کرتے ہیں

(۶)

لو اور بڑھی اب تو قیادت کی گھٹن
دنیا میں یہ پھیلی ہے سیاست کی گھٹن
ہے سب سے رسائی بھی بڑی دھوم بھی ہے
کہتے ہیں اسے آج حماقت کی گھٹن

(۷)

میں جانتا ہوں خوب ہے ڈالر کا کمال
جو کچھ بھی میسّر ہے اسی کا ہے جمال!
اترانا بُری بات ہے اس دولت پر
یہ ختم بھی ہو سکتا ہے پیسے کا اُبال!

(۸)

ہے سر پہ تمھارے یہ عمامہ کس کا
پیشانی پہ رخشندہ ہے سجدہ کس کا
پڑھتے ہو دِکھاوے کی نمازیں لیکن
ہے دل پہ تمھارے بھی یہ قبضہ کس کا

شہرِ افسانہ

کتابوں پر مُوتنے والی

• اقبال مجید

شام ہوئی تو عبداللہ کے دروازے پر کالے رنگ کی ایک گاڑی آ کر رُکی اس میں سے گورے بدن پر کالی ساڑھی پہنے اپنے کانوں کے جھمکوں کی طرح لہراتے لچکیلے بدن والی ایک جوان لڑکی اُتری جس کو اس نے پہچان لیا۔ وہ زلیخا تھی۔ وہ بزرگ افسانہ نگار جو اَب رنڈیوں کے سامنے کوڑے تو کھا سکتی تھیں مگر انعام کے نام پر ایک دوشالے کی بھی روادار نہ تھیں۔ زلیخا ان کی نازوں پالی اکلوتی لڑکی تھی جو اُن دنوں ہندی پتر کارتا کے میدان میں خاصی تیز دوڑ رہی تھی اور مشاعرے وغیرہ میں پہلی صف میں بیٹھے منتریوں پر مسکراہٹوں کی بجلیاں گرا کر طبیعت مچل دینے والے عشق و عاشقی والے شعر سناتی تھی۔

زلیخا گاڑی سے اُتر کر سیدھی عبداللہ کے گھر میں داخل ہوئی، جو پیشے سے ریٹائرڈ پوسٹ ماسٹر تھے۔ وہ خوب جانتی تھی کہ گھر کے کس حصے میں وہ ٹی وی پر بی بی سی کی خبریں سنتے ہوئے ملیں گے۔

''عبداللہ چچا'' کمرے کے دروازے کی دہلیز پر پیر رکھتے ہی زلیخا نے زور سے آواز لگائی۔ وہ عبداللہ ملک کو عبداللہ چچا کہہ کر بچپن سے ہی پکارتی تھی۔

مگر عبداللہ چچا اس وقت ٹی وی پر خبریں نہیں سن رہے تھے۔ سلگتا ہوا نقشیں حقہ پاس ہی مسکین بنا سر جھکائے کھڑا تھا، گود میں اردو کا ایک ضخیم پاکستانی رسالہ کھلا تھا۔

زلیخا نے ان کی گود میں رکھے رسالے کو اپنی طرف کھینچ کر بند کیا اور پھر پہلو میں رکھی پرانی دھرانی میز پر پٹک کر انھیں خبر دی۔

آپ کو کچھ خبر ہے عبداللہ ملک کو ان کی مجموعی خدمات پر ریاست کی اکادمی نے 5 لاکھ کا مولانا محمد حسین آزاد اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

عبداللہ نے مسکراتے ہوئے زلیخا کی طرف اچٹتی سی نظر ڈالی۔ زلیخا اپنی ننھی سی کتیا کو اولاد کی طرح گود میں لیے پیار سے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ کتیا کی آنکھوں میں قدرت نے بڑا پُر کشش کاجل لگایا تھا۔

اسی وقت عبداللہ کے موبائل پر گھنٹی بجی، زلیخا کی دی ہوئی خبر کی تصدیق اکیڈمی کے وائس چیئر مین نے فون پر کر دی تھی۔

میں دیکھ رہی ہوں یہ اعزاز پچھلے تین سالوں سے لگاتار افسانہ نگاروں کو مل رہا ہے۔

عبداللہ ملک کو جیسے لقوا مار گیا تھا، وہ سناٹے کی کیفیت میں کرسی پر بت کی طرح ساکت بیٹھے رہ گئے تھے۔

زلیخا نے بہت سی باتیں کیں۔ عبداللہ چچا کو بتایا کہ یونیورسٹی کے پروفیسروں نے اکیڈمیوں کی انعامی کمیٹیوں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے، وہ شاعروں کو ذلیل اور مشاعرہ پڑھنے والے مقبول ترین شعراء کو ذلیل تر سمجھتے ہیں۔ وہ اس صدی کو فکشن کی صدی مانتے ہیں۔

پھر اس نے عبداللہ کو یاد دلایا کہ جب وہ اٹھارہ سال کی تھی تب سے عبداللہ کے افسانے اور ان کی تحریریں پڑھ رہی ہے۔ پھر زلیخا نے اپنے منہ بولے عبداللہ چچا سے آنکھیں چار کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا: ''میں آپ کو 5 لاکھ کے انعام پر مبارکباد دینے نہیں آئی ہوں بلکہ اس موضوع پر کھل کر آپ سے کسی وقت بات کرنا چاہتی ہوں۔ عبداللہ ملک انعام پانے کی خبر پر ابھی بھی سناٹے میں تھے۔ وہ کچھ بول نہیں پا رہے تھے لیکا یک زلیخا اپنی جگہ پر سے یہ کہتے ہوئے اُٹھی:

میری ماں نے دس سال میں چوبیس ناولیں لکھیں جب کہ لوگ ایک ناول لکھنے پر تین تین سال لگا دیتے ہیں، اس غریب کو کسی نے انعام واکرام کے لیے نہیں پوچھا۔ 'عبداللہ چچا' وہ یکبارگی تلملا کر بولی: ''اب آپ دیکھیے گا کہ میں کیا کرتی ہوں۔ وہ وقت دور نہیں ہے''۔ اس کے بعد زلیخا کچھ سوچتے ہوئے اپنی کتیا کا سر سہلانے لگی۔ عبداللہ نے اندر کی آنکھوں سے پہلی بار زلیخا کی کتیا جولی کو ٹٹولا۔ اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ جولی اور زلیخا کی آنکھوں میں کتنی زبردست مشابہت تھی۔ وہی بے نیازی وہی کھلنڈرا پن۔ لاعلمی کے صدقے میں عطا کی ہوئی طمانیت جولی کی آنکھوں میں بھی چمک رہی تھی جیسی زلیخا کی آنکھوں میں۔ عبداللہ کو لگا کہ زلیخا کی گود میں بیٹھی جولی متواتر اسے گھورے جا رہی تھی ایک بار تو عبداللہ کو ایسا لگا جیسے زلیخا کی طرح جولی کی آنکھیں بھی اس سے کہہ رہی ہوں:

بیوقوف یہ بھی نہیں جانتے کہ یہاں ادب تحریر کرنا کوئی عیاشی نہیں ہے، پھر تمھیں پڑھنے والے کتنے ہیں، اُن میں کتنی غربت ہے، جہالت ہے اور انھیں ناانصافی میں پیسنے والی چکیاں ہیں، تم نے دیکھا نہیں اعلیٰ

تہذیب صرف چند لوگوں کو اچھے کتے پالنے کا موقع دیتی ہے۔ پھر عبداللہ کو ایسا لگا جیسے زلیخا کی کتیا اُسے دیکھ کر مسکرائی، بالکل اُس طرح جیسے زلیخا مسکراتی ہے پھر ویسے ہی لہجے اور اسی انداز سے اٹھلا کر بولی جیسے زلیخا بولتی ہے:

عبداللہ چچا کتیا ہونا کتنا اچھا ہے۔

تہذیب وتمدن، خوش حالی، آزادی اور انصاف۔ کتیا ہونے سے ہر لعنت سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔

عبداللہ میاں ادب کی چاہ نہ تو اس بات کی ضمانت ہے کہ انسان کے ضمیر کو ایک عظیم پیکر مل جائے گا اور نہ اس کی زندگی ظالموں کے قدموں تلے کچلنے سے چھٹکارا پائے گی۔

عبداللہ آنکھیں گڑو کر کتیا کو دیکھے جا رہا تھا اور وہ عبداللہ کو ویسے ہی دیدہ دلیری اور بے باکی سے دیکھ رہی تھی جیسے زلیخا دیکھا کرتی تھی۔ جب زلیخا اپنی کتیا کے ساتھ چلی گئی تو عبداللہ کو احساس ہوا کہ 5 لاکھ کے اعزاز کی خبر سے مارے خوشی کے ان کے حلق میں کانٹے پڑ گئے۔ چھوٹی موٹی رقموں کے کئی اعزازات پا چکے تھے مگر پانچ لاکھ کے انعام کا انھوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ انعام کی ساری رقم بیوی کے نام ایف ڈی کریں گے۔ اکلوتا لڑکا پانی کے جہاز میں چھپ چھپا کر مسقط چلا گیا تھا۔ پچھلے دو برس سے اس کی کوئی خبر انھیں نہیں ملی تھی۔

5 لاکھ کے انعام کی خبر کئی اعتبار سے ان کے لیے عجیب خبر تھی، دوستوں کی مبارکباد کے فون تھوڑی تھوڑی دیر بعد آتے، جنھوں نے اُن کی نیند غائب کر دی تھی، ان کا دماغ خون کی تیز گردش سے پک رہا تھا اور بار بار پوچھ رہا تھا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ تم اتنے بڑے ادیب کیسے ہو سکتے ہو؟

تمھاری مجموعی خدمات سات آٹھ افسانوی مجموعوں پر مشتمل ہیں، کیا یہ انعام تمھاری بیش قیمت خدمات کو دیکھ کر دیا گیا ہے یا تمھاری غربت، تنگ دستی اور بڑھاپے پر چند مہربان دوستوں نے ترس کھا کر دیا ہے۔

عبداللہ اداس تھا۔ ایک بات کا قلق اُسے ہو رہا تھا، جس رسالے کے مدیر نے کئی برس اسے نمایاں جگہ دے کر اس کے افسانے چھاپے تھے اور خود بھی ایک عمدہ فکشن نگار تھا اور جس کو موٹی موٹی رقموں کے بڑے بڑے قومی اعزازات بھی بجا طور پر مل چکے تھے، اسے مبارکباد دینے والوں میں آخر اس مدیر کا فون کیوں نہیں آیا۔ یا پھر اس مدیر کو یہ اچھا نہیں لگا کہ اس کے مقابلے میں چہ پدی چی پدی کا شوربہ کو اتنی موٹی رقم کا انعام دے دیا گیا۔

یکا یک اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف زلیخا تھی وہ بغیر کسی تمہید کے کہہ رہی تھی:

کتابوں میں بیان کیے جانے والے آدمیوں سے مشاعرہ گاہ کی صفوں میں پالتی مارے بیٹھے ہوئے عام زندگی گزارنے والے آدمی مختلف ہی نہیں بہت مختلف ہوتے ہیں۔ کتابوں میں انھیں بڑے سوچ بچار

کے بعد جس طرح نقلی بنایا جاتا ہے اس عمل کا نام فن ہے ہم مشاعروں کے شاعر ہلکا پھلکا کلام کہہ کر اور اسے گا کر عام آدمی کے مردہ احساس کو زندہ کرتے ہیں۔ مسقط میں مشاعرہ پڑھنے جانے سے پہلے آپ سے یہ پوچھنے آؤں گی کہ انسان کا احساس اگر مردہ ہو جائے تو علم اور دانشوری کس کام کی رہ جاتی ہے۔ میرا آپ سے جلدی ملنا ضروری ہے کیونکہ میں مسقط سے نیو جرسی چلی جاؤں گی تو بیس پچیس دن میں واپسی ہوگی۔ زندگی بھر کاغذ کالے کرنے کے عوض اعزاز کی جو رقم آپ کو قبر میں پیر لٹکاتے وقت ملی ہے اتنی تو ہم بیرونی ممالک میں پڑھے گئے دو مشاعروں سے کما لیتے ہیں۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا عبداللہ ملک کے تصور میں اعزازات تفویض کیے جانے والے جلسے کا منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ ادیبوں اور شاعروں سے بھرا ہوا سجا سنورا ہال بار بار اس کی نظروں میں گھومنے لگا۔ اس موقعہ پر خاص خاص اعزازات پانے والے ادیبوں کی قد آدم پینگوں پر بڑی بڑی تصویریں لگی ہوں گی۔ کیونکہ اس نے سب سے بڑا اعزاز پایا ہے اس لیے وہ ڈائس پر سب سے نمایاں نشست پر بٹھایا جائے گا، ہار پھول گلدستے آٹوگراف لینے والی طالبات کی ریل پیل مبارک سلامت کی آوازیں۔ جب صوبے کا چیف منسٹر مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر شال ڈال رہا ہوگا اور ساتھ ساتھ مائک پر اس کے کوائف پڑھے جا رہے ہوں گے اور فوٹوگرافروں کا ہجوم فلیش گن چمکا رہا ہوگا تو ہال تالیوں سے گونج رہا ہوگا مگر بہت سے جل ککڑے منافق بغل میں چھری اور منہ پر رام رام کے ساتھ اپنی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے خاک ہو چکے ہوں گے۔ اردو ادب کی دنیا کتنی مختصر اور محدود ہو گئی ہے اس میں مینڈکوں کی طرح سانس لے رہے جل ککڑے اپنے کو چھپا نہیں پاتے۔ عبداللہ ملک نے طے کر لیا کہ کچھ بھی ہو وہ انعام لینے جلسے میں ضرور جائے گا۔ دل کھول کر دیا جانے والا اتنا بڑا اعزاز ہر ادارہ کہاں دیتا ہے۔ شال، گلدستہ، ناریل، بروشر، مومنٹو اور انعام کا لفافہ۔ اچھا خاصہ سامان ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ اب کپکپانے لگے ہیں، اتنا سامان سنبھالنے کے لیے وہ کسی کو اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن جب وہ تنہائی میں رات کو اپنے بستر پر لیٹا تو اندھیرے میں مسہری کے پاس کچھ آہٹ سی ہوئی، اس نے دیکھنے کی کوشش کی، آنکھیں پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا مگر کچھ دکھائی نہ دیا۔ پھر ایسا لگا جیسے کسی نے دھیمے سے آواز دی:

عبداللہ ملک!

کون؟ عبداللہ نے چونک کر پوچھا۔

میں تمہارے دل کے اندھیرے کونے میں کبھی کبھی لہراتا ہوا ایک موہوم سا سایہ ہوں یا پھر پریشان کر دینے والا برق رفتار احساس ہوں۔ میں تم سے اکیلے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا شوق اکیلے میں بات کرتا ہے۔

''پوچھو''! جواب ملا۔

کیا جو لوگ انعام و اکرام پاتے ہیں، اخباروں میں تصویروں کے ساتھ جن کی خبریں چھپتی ہیں جو انعام پانے کے بعد جلسے میں اپنے لکھنے کا تحریر شدہ جواز پڑھ کر سامعین کو فخر سے سناتے ہیں اور تالیوں کی گڑگڑاہٹ بٹورتے ہیں کیا وہ انعام وہ اعزاز وہ تقریب وہ سپاس نامہ، وہ تہنیتی کلمات انھیں اور ان کے نام کو ادب میں لافانی بنا دینے کے پرمٹ کا کام کرتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا انعام اور اعزاز وجود میں لایا جاسکا ہے جو تمھارے سینے پر فوجی تمغے کی طرح ٹانک دیا جائے تو تم لافانی شاعر بن جاؤ؟ اس کے علاوہ ایک اور سوال میں تم سے اور پوچھنا چاہتا ہوں:

عبداللہ ملک! وہ سوال بھی اکیلے میں پوچھنے والا ہے۔

''پوچھو'' عبداللہ کپکپاتی آواز میں بولا۔

''دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دو گے نا؟''

''ہاں!''

''کیا تم کو یقین ہے کہ تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگلے پچاس برس بھی زندہ رہے گا؟''

عبداللہ ملک سوال کو غور سے سنتا ہے، لمبی سی ایک سانس لیتا ہے، چہرہ دھواں دھواں ہو جاتا ہے، دل کے اندھیرے سے ایک سسکی سی نکلتی ہے، عبداللہ کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، گلا رندھ جاتا ہے، باہر آنگن کی دیوار پر کسی جنگلی بلّی کے رونے کی منحوس آواز آتی ہے، عبداللہ کے سینے میں ایک تڑپن سی اُٹھتی ہے، وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں سختی سے سر کے نیچے رکھے تکیے میں گڑو دیتا ہے، ہلکی سی زخمی سی سسکی لیتے ہوئے کہتا ہے:

''میں صرف لکھتا ہوں۔ پیشین گوئیاں نہیں کرتا''۔

کمرے میں ہر طرف سناٹا ایک بار پھر سر اُٹھاتا ہے کہ دھیرے سے پھر وہ پُر اسرار آواز سنائی دیتی ہے:

''میز پر پڑا وہ بروشر اُٹھاؤ جس میں تمھارے صوبے کے سالانہ تقسیم انعامات کے موقعے پر اردو ادب کے نئے انعامات پانے والوں کے کوائف اور ان کی تصویریں چھپی ہیں۔ عبداللہ کانپتے ہاتھوں سے فولڈر اُٹھاتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کے سرہانے رکھا ٹیبل لیمپ روشن ہو جاتا ہے۔ پُر اسرار آواز آتی ہے:

''انعامات پانے والوں کے کوائف غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ اس میں ایسے انعام پانے والے ادیب اور شاعر کتنے ہیں جن کی تعلیم کا خانہ خالی ہے''۔

''چار نام ایسے ہیں جن کی تعلیم کے خانے میں کچھ نہیں لکھا ہے'' عبداللہ جواب دیتا ہے۔

سوال ہوتا ہے: ''کیا یہ بھی پتا نہیں کہ وہ پانچواں بھی پاس ہیں یا نہیں؟''

''نہیں'' عبداللہ جواب دیتا ہے، کمرے کی روشنی غائب ہو جاتی ہے، اندھیرا اور سناٹا گہرا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بڑی کوفت بھری خاموشی رہتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی پُر اسرار آواز خاموشی کو توڑتی ہے:

"اب ایک کام کرو۔ میں روشنی جلاتا ہوں غور سے دیکھ کر بتاؤ ایسے کتنے ادیب وشاعر ہیں جن کی تحریر کردہ کتابوں، مجموعوں یا تخلیقات کی تفصیل کا ان کے شائع شدہ کوائف میں کوئی ذکر نہیں ہے۔

عبداللہ پوری توجہ سے فولڈر کے صفحات کچھ دیر الٹ پلٹ کر کچھ دیر چھان بین کرتا ہے پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہے:

"تین نام ایسے ہیں جن کی ایک بھی تخلیق، تالیف، تدوین یا ترجمے تک کا بھی ذکر نہیں۔ جگہ بالکل خالی پڑی ہے۔

سوال ہوتا ہے: "یعنی انعامی کمیٹی نے ان لوگوں کو کس بناء پر اور ان کی کون سی لائق ستائش خدمات پر اعزاز کا مستحق سمجھا ہے، یہ پتا نہیں لگایا جاسکتا نا؟"

"نہیں"۔ یکا یک کمرے میں پھر اندھیرا ہوگیا، عبداللہ کو محسوس ہوا کہ اتنی دیر میں اُس اندھیرے کے اندر نوکیلے دانت اُگ آئے ہیں اور اندھیرے میں خطرناک حد تک زخمی اور لہولہان کر دینے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے، اور اندھیرا بڑے جارحانہ انداز میں رک رُک کر غرّا رہا ہے اور کہہ رہا ہے: "ابھی کیا ہے۔ کچھ دنوں بعد مونگ پھلی کا ٹھیلہ لگانے والے جاہل لٹھ کو اعزاز دینے کے لیے پکڑ کر لاؤ گے"۔ عبداللہ کچھ خوفزدہ ہوکر تھکی تھکی آواز میں بڑبڑایا:

"مجھے اکیلا چھوڑ دو، میں سونا چاہتا ہوں"

جواب آیا: "سو جانا، نیند تو ایک آسیب کے مانند چڑھی بیٹھی ہے تم پر، وہ لوگ اب کہاں رہ گئے ہیں جو دوسروں کو سلانے کے لیے خود مشکل سے چار گھنٹے بھی نہیں سو پاتے تھے۔ بس میرا آخری سوال، حالانکہ مجھے امید نہیں ہے کہ تم ایمانداری سے جواب دو گے پھر بھی ایک کوشش کرتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ اندھیرے میں اپنی جاگی جاگی نظروں سے عبداللہ کے سوئے سوئے سے چہرے کو کچھ دیر ٹٹولتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

"کیا تم کو یہ بات اچھی لگے گی کہ تم اعزاز کے مستحق تو ہو لیکن وہ تم کو نہ ملے۔ یا پھر یہ بات اچھی لگے گی کہ اعزاز تو تم کو مل جائے لیکن تم اُس کے مستحق نہ ہو"۔

عبداللہ اب آدھا سو رہا تھا اور آدھا جاگ رہا تھا۔ اس کو اندھیرے میں پریشان کرنے والا اب مینڈک کی طرح حقیر اور بدعقل لگ رہا تھا۔ عبداللہ چپ رہا اور بستر پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا۔

"بولو جواب دو" آواز نے اسے جھنجھوڑ دیا: "تمھیں کون سی بات اچھی لگے گی، مستحق ہوتے ہوئے بھی انعام نہ ملنا یا غیر مستحق ہوتے ہوئے بھی انعام پا جانا"۔

عبداللہ نے اپنی نیند کو بھگانے کی کوشش ذرا بھی نہیں کی۔ اونگھتے ہوئے سوئی سوئی سی ڈگمگاتی آواز میں بولا:

یار کس زمانے کی باتیں کر رہے ہو تم، کیسی بھی گالی دو میں ہاتھ آئی ہوئی رقم اور اعزاز واپس نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟" پُر اسرار آواز غرائی۔ پھر بے قابو ہو کر چیخی: "کیوں نہیں واپس کرو گے؟"

عبداللہ نے تب بھی نیند پر سے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں کی، اسے سینے سے چمٹائے بولا:

"میں واپس کروں گا تو کسی اور کو مل جائے گا، کسی ایسے کو بھی جس نے کبھی ایک لفظ نہ اُردو میں لکھا ہو، نہ ہندی میں۔ انعام دینے والوں نے جب دکان لگائی ہے تو مال بیچیں گے ہی!"

یہ کہہ کر عبداللہ ملک بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ دھوئیں میں بھرے دم گھٹا دینے والے کمرے میں ایک پل بعد وہ خراٹے لے رہا تھا، اس کی بیوی البتہ فجر کی اذان کے انتظار میں آنکھیں بند کیے جاگ رہی تھی۔

عبداللہ کو بار بار خیال آتا کہ پورے بنگال، بہار، مہاراشٹر اور یو پی کے اردو سماج میں اس کو ملنے والے اعزاز کے چرچے ہو رہے ہوں گے۔ اس نے مختلف ذرائع سے پتا لگایا کہ اعزاز دیئے جانے کی خبر کہاں کہاں چھپی ہے تو پتا لگا کہ یو پی کے چند اردو اخباروں نے انعامات کے اعلان کی خبر چھاپی تھی۔ عبداللہ کو حیرت تھی کہ کسی اخبار نے بھی عبداللہ کی تصویر حاصل کر کے خبر کے ساتھ چھاپنے کی کوشش نہ کی۔ انگریزی اخباروں نے اکیڈمی کے اس اعلان کو منہ بھی نہیں لگایا اور دو سطریں بھی کسی نے نہ چھاپیں۔

وہ لوگ جو عبداللہ کے گھر مبارکباد دینے آئے تھے ان کے چہرے عبداللہ کی نظروں کے سامنے بار بار گھوم رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں اندرونی خوشی کی کوئی چمک نہ تھی، آواز میں بھی جوش و خروش کے بجائے بے کیفی اور سپاٹ پن تھا۔ ایک صاحب نے مبارکباد دے کر مٹھائی کھا لینے کے بعد چلتے چلتے عبداللہ کو بتایا کہ ایک بزرگ نقاد کا کہنا ہے کہ: عبداللہ کے افسانے Meaningful Manupilations کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جب اُن نقاد سے پوچھا گیا کہ وہ عبداللہ کے فن پر کچھ کیوں نہیں لکھتے تو انھوں نے صاف کہہ دیا:

"عبداللہ کو چاہیے کہ وہ اپنا ناقد خود لیکر آئیں، اس کے بعد لکھنے کا کام کریں"۔

انعامات کے سرکاری اعلانات ہوئے تقریباً ڈیڑھ مہینہ جب گزر گیا اور اعزاز دہندگان کی جانب سے تقسیم انعامات کے اُس ہونے والے جلسے کی کوئی خیر و خبر نہ ملی جس کی عبداللہ کی آنکھوں میں بہت دنوں سے چکا چوندھ تھی تو اس نے ادارے کے حکام سے رابطہ قائم کیا اور معلوم کیا کہ تقسیم انعامات کا جلسہ کب ہوگا تو وہاں سے کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا۔

ایک دن عبداللہ کو زلیخا کی یاد آئی۔ وہ عبداللہ سے ملے بغیر بیرونی ممالک میں مشاعرے پڑھنے چلی گئی تھی جس کو مہینہ بھر سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ عبداللہ نے پتا لگایا تو معلوم ہوا کہ زلیخا چند روز پہلے ہی ہندوستان واپس آئی ہے۔ پھر خبر ملی کہ وہ صوبے کی اُردو اکادمی کی وائس چیئرمین بننے والی ہے، پھر ایک دن ایک اردو اخبار میں ایک بیان چھپا۔ اس نے کسی مشاعرے میں اپنا کلام سنانے سے پہلے مجمع کو مخاطب کر کے

کہا تھا: ''مجھے اردو کے پروفیسروں سے نفرت ہے۔ میرے شعری تجربے کو آپ آزادی سے محسوس نہیں کر پاتے کیونکہ پروفیسر اپنی تنقید کی تلوار سے پہلے ہی اسے لہولہان کر دیتا ہے۔ وہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ جس طرح اور جیسا وہ چاہتا ہے میں اُس طرح اور ویسا لکھوں۔ میری نظمیں اور میرا کلام جو میں آپ کے سامنے پڑھتی ہوں میرے پنجرے کی Love birds ہیں۔ چھوٹی چھوٹی معصوم چڑیاں۔ میں انھیں پنجرے سے نکال کر آزاد کر دیتی ہوں۔ سانپوں، شکروں اور بازوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے چھوڑ دیتی ہوں۔ میں شاعری میں Thought content ڈال کر اس کو بکواس نہیں بناتی۔ آپ مجھ سے کیسی شاعری چاہتے ہیں میں وہ لکھتی ہوں۔ جو آرٹ فلسفہ بگھارتا ہے اُپدیش دیتا ہے وہ آرٹ نہیں ہے، آرٹ میرے گیتوں کی طرح یا تو محبت کرتا ہے یا نفرت''۔

ایک موقع پر مقامی شاعروں کے جلسے میں زلیخا نے پروفیسروں کو کھری کھری سنائی۔ اس نے صاف کہا:

''میرا بس چلے تو میں ان کو گالیاں دوں، یہ بے سر پیر کے بے معنی اور چلتاؤ قسم کے کھوکھلے سیمینار کراتے ہیں اور مشاعروں کو گالیاں دیتے ہیں، میں نے چیف منسٹر سے بے لاگ اور لپٹ کے کہہ دیا کہ میں سیمیناروں کے بجائے مشاعرے کراؤں گی اور ہر شاعر کو پندرہ ہزار کا معاوضہ دلواؤں گی، جب دیکھو تب بڑے انعامات نثر اور افسانہ لکھنے والے ہی لے جایا کرتے ہیں، اب نثر پر انعام پانچ سال میں ایک بار ہی ہونا چاہیے۔ باقی سال شاعروں کو ہی انعامات دیا جانا مناسب ہوگا''۔

ایک دن عبداللہ کے گھر زلیخا آگئی، اس کی گود میں جولی بھی تھی۔

''یہ پھر تمھاری گود میں چڑھی ہوئی ہے؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

''محبت!''

''محبت تو تمھیں اپنے عبداللہ چچا سے بھی ہے لیکن جب سے آئی ہو تم نے خبر ہی نہیں لی ہماری۔''

''کیا خبر لوں؟ مجھے آپ کو انعام ملنے پر خوشی نہیں ہوئی ہے''۔

''کیوں؟''

''میں نہیں چاہتی کہ آپ آدمی کو ایمانداری سے سمجھنے اور پھر بیان کرنے کے خبط میں مبتلا ہوں اور بچوں کو ناداری اور بے کسی کی زندگی گزارنے پر مجبور کریں۔ ادیب بس ایک معمولی سا انسان ہوتا ہے، میں تو یہ مانتی ہوں کہ آپ کی لکھی کتابیں نہیں بلکہ زندہ رہنے کی چاہ آدمی کو بڑا بناتی ہے۔ آپ کو اپنی کتابوں پر اگر ناز ہے تو یہ آپ کی بھول ہے۔ انسان کی قسمت لکھنا کتابوں کے بس میں نہیں ہے، آدمی ایک جال سے نکلتا ہے تو دوسرے جال میں پھنس جاتا ہے''۔ زلیخا چپ ہوگئی، اپنی گود کی جولی کے سفید اور ملائم بالوں کو آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔ زلیخا کے پاس ایک گاڑی تھی۔ گاڑی کی چھت پر پیلے رنگ کی ایک بتی بھی لگی تھی۔ اس

نے عبداللہ کو بتایا کہ منصب ملنے کے بعد اس گاڑی کو لے کر سب سے پہلے وہ دیوئی شریف میں حضرت وارث علی شاہ کے مزار پر حاضری دینے گئی تھی۔ وہاں ایک چھولداری میں اس نے رات بسر کی تھی، جب آدھی رات کو ایک ٹٹو کی پیٹھ پر بیٹھا گلے میں موٹی موٹی مالائیں ڈالے، کندھوں پر لمبے لمبے بال بکھرائے ایک لمبا تڑنگا، بڑی بڑی آنکھوں والا فقیر آیا تھا۔ زلیخا کی چھولداری کے پردے سے لگ کر بلند اور کڑک دار آواز میں پکارا تھا:

''زلیخا'' اپنا نام سن کر چھولداری کے اندر زلیخا سہم گئی تھی۔ آس پاس درختوں کے جھنڈ تھے، اکا دکا گیس کے ہنڈوں کی روشنیاں ناکافی تھیں۔ چھولداری کے پردے سے لگ کر کھڑے ہوئے ملنگ کی آواز گونجتی ہے:

''اے عورت سن! جو ہو چکا وہ بھی ٹھیک تھا، جو ہو رہا ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ میں بھی پہلے لفظوں کے پیچھے بھاگتا تھا۔ رات رات بھر نہ سوتا تھا۔ سب کہتے تھے ادب فرد کے احساس کو تراشتا ہے۔ اسی تراش سے تہذیبیں سنورتی ہیں لیکن میں نے دیکھا کہ جو کام پانچ سو ادیب اور شاعر کاغذ کالے کر کے برسوں نہیں کر پاتے وہی کام چٹکی بجاتے میں منہ پر کالک پوتنے والے کر ڈالتے ہیں۔ تب سے ادب کی ریاضت کا کام چھوڑ کر فقیری لے لی۔ جانتی ہے! اس اولیاء کے پاس نہ موٹر تھی نہ لال پیلی بتی لیکن دیکھ اس کا آستانہ کیسی روشنیوں سے جگمگا رہا ہے۔

زلیخا پردے سے جھانکتی ہے، کچھ ہی فاصلے پر حضرت کے باغ کے اس پار مزار کی عمارت کا برقی چراغاں جھلملا رہا تھا۔ محفل سجنے کی آوازیں آتی ہیں۔ زلیخا دوبئی میں خریدی ہوئی سونے کی انگوٹھی جس میں قیمتی فیروزہ جڑا تھا فقیر کے کشکول میں ڈال دیتی ہے۔ عبداللہ کو یہ واقعہ سنا کر زلیخا چلی جاتی ہے۔

رات کا ایک بج جاتا ہے۔ عبداللہ کروٹیں بدلتا ہے، آنکھوں کے سامنے اُداس اور تھکی ہوئی بیوی کا چہرہ اُبھرتا ہے۔ بڑے جتن سے بیوی کتابوں کو عارضی طور پر اِدھر اُدھر جگہ بنا کر ایک کے اوپر ایک کر کے جماتی جاتی ہے اور روتی جاتی ہے۔ بیوی بڑی بیٹی کو فون کر رہی ہے۔ اس کو یاد دلا رہی ہے کہ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنے باپ کی انگریزی کتابوں کا ذخیرہ اپنے ساتھ لے جائے گی، لڑکی جواب دیتی ہے:

''امی میں نے ان کتابوں کی حالت دیکھی ہے، اُن میں ایسی چمک دمک نہیں ہے جو انھیں ڈرائنگ روم کی دیواروں میں سجایا جائے''۔

اس کی بیوی چھوٹی بیٹی کو فون کر رہی ہے:

''بیٹی تمھارے باپ نے تمھارے نام جو ناول معنون کی ہے اس کی پچاس کاپیاں رکھی ہوئی ہیں، گھر میں کتابیں رکھنے کی کہیں جگہ نہیں ہے، تم نے کہا تھا کہ کچھ تم لے جاؤ گی؟'' لڑکی بمبئی سے جواب دیتی ہے:

"ممی میرے ملنے والوں میں کوئی اردو پڑھ ہی نہیں پاتا۔ مسلمان لڑکیاں بھی مراٹھی اور ہندی پڑھتی ہیں"۔

عبداللہ بغیر پٹ کی کھلی الماریوں میں ٹھنسی ہوئی کتابوں کے پاس جاکر کھڑا ہوتا ہے، بعض کتابوں کو ہاتھوں میں لیکر کھولتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تو ان کتابوں کو چھاپنے والے چھاپے خانے ہی بے نام ونشان ہو چکے ہیں، بہت سی کتابیں ایسی تھیں جن کے مصنفین نے اپنے دستخط سے عبداللہ کو تحفے میں دی تھیں اور اب خود قبر میں سو رہے تھے۔ ایک شیلف میں اسے معصوم طبیعت مقامی شاعروں کے درجنوں شعری مجموعے ملتے ہیں، جن کے لیے عبداللہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ ان کا کیا کرے۔

ہر سال عبداللہ کی بیوی اُن کتابوں کو سیلن سے بچانے اور دھوپ دینے کی مشقت میں تھک کر اپنے دوپٹے کے کونے سے آنسوؤں کو پونچھتی اور برسات میں ان کی حفاظت کرنے کے لیے فکرمند رہتی ہے۔

برسات آتی ہے۔ عبداللہ کی کتابوں کی شیلف میں ٹپکتی چھت سے پانی پہنچتا ہے، عبداللہ کی بیوی جانتی ہے کہ شور مچانے اور واویلا کرنے کا موسم آگیا ہے، بھیگی کتابیں شیلف سے نکال کر بیٹھک کے فرش پر پٹکتی ہے۔ چیختی ہے۔ چوہا بل میں سمائے نا، دُم میں باندھے جھاڑ۔

عبداللہ حسرت سے بھیگی ہوئی کتابوں کو دیکھتا ہے۔ کتابوں کو سکھانے کے لیے کمرہ کا پنکھا کھولتا ہے، 'آثار الصنادید' کی موٹی جلد پوری بھیگ چکی ہے، کمرے کا فرش بھیگی کتابوں سے ڈھک گیا ہے، اسی ساعت زلیخا کی سرکاری گاڑی کا ہارن بجتا ہے، بیوی کسی خیال سے خوش ہو جاتی ہے۔ زلیخا گود میں اپنی کتیا کو لیے کمرے میں داخل ہوتی ہے، کتابوں کو فرش پر بکھرا دیکھ کر برا سامنہ بنا کر فرش پر پیر رکھتی ہے۔ عبداللہ کی بیوی بات کو بھول نہ جائے اس لئے فوراً کہہ دیتی ہے:

"بیٹی جگہ ہے نہیں اور میرے میاں روز بروز کتابیں بڑھاتے چلے جا رہے ہیں، تم اپنے یہاں کی لائبریری میں یہ کتابیں رکھوا سکتی ہو کیا؟ دوسروں کا بھلا ہی ہوگا"

زلیخا عبداللہ کی بیوی کو سمجھاتی ہے، وہاں بھی جگہ نہیں ہے، کتابیں بھوسے کی طرح ٹھنسی ہوئی ہیں، مانگنے جانے پر کتاب کا مل جانا اکثر ممکن نہیں ہوتا۔ یکبارگی زلیخا کی گود میں بیٹھی کتیا فرش پر چھلانگ لگاتی ہے، فرش پر پھیلی کتابوں کو سونگھتے ہوئے ڈھیر کے درمیان میں پہنچتی ہے پھر پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ جاتی ہے، زلیخا اسے دیکھ رہی ہے، عبداللہ دیکھ رہا ہے، عبداللہ کی بیوی دیکھ رہی ہے، آس پاس کی کتابیں بھی شاید دم بخود ہو کر دیکھ رہی ہیں۔ یکا یک زلیخا جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے کتیا کو گود میں اٹھا لیتی ہے، پھر پیار سے گود میں بٹھاتی ہے پھر دلار کے ساتھ ڈھیلے ہاتھ سے کتیا کو پیٹھ پر مارتے ہوئے کہتی ہے:

"بڑی بدتمیز ہو گئی ہے، کمبخت کتابوں پر ہی موتتی ہے۔ دفتر میں بھی یہی کر کے شرمندہ کرتی ہے نہ جانے کون سی بیماری ہے اس کو"۔

عبداللہ کچھ نہیں بولتا، اس کی آنکھیں بھی کچھ نہیں بولتیں، انھیں برسوں سے آنسو چھپانے کی مہارت ہو چکی ہے، زلیخا بتاتی ہے کہ یومِ اساتذہ کے موقعے پر راج بھون کے مشاعرے میں اسے جو نظم پڑھنی ہے اس پر عبداللہ ایک نظر ڈال لیں۔ عبداللہ نظم میں کھو جاتا ہے۔ عبداللہ کی بیوی زلیخا کو بتاتی ہے کہ کل ڈاکیہ 5 لاکھ کی انعامی رقم کا رجسٹرڈ لفافہ دے گیا ہے۔ تاکہ چیک منسوخ ہونے کی معینہ مدت سے پہلے انعام یافتگان اپنے کھاتے میں جمع کر سکیں مگر تقسیم انعامات کی تقریب فی الحال اس سال شاید نہ ہو پائے۔

زلیخا چیک آنے کی خبر سے خوش ہوتی ہے۔ اُچھل کر کھڑی ہو جاتی ہے:

''کہاں ہے وہ چیک مجھے دکھایئے۔ شہر میں افواہ ہے کہ انعام کی رقم عبداللہ نے بڑھا کر مشہور کی ہے، ۵ لاکھ کا کوئی انعام نہیں ہوتا''۔ عبداللہ انعامی چیک کی بات کو کسی بہانے سے ٹال دیتا ہے۔ زلیخا چلی جاتی ہے۔

رات پھر آتی ہے۔ بستر پر لیٹے لیٹے عبداللہ چھت کو دیکھتا ہے۔ وہاں بھی اسے زلیخا کی کتیا دکھائی دیتی ہے۔ وہ کسی کتاب پر پیشاب کر رہی ہے۔ عبداللہ اس وقت اپنے ایک پیتھالوجسٹ دوست کو فون کرتا ہے۔ پوچھتا ہے کیا وہ ایک ایسے قارورے کی جانچ کر سکتا ہے جس کی کچھ بوندیں کاغذ کے لفافے پر پڑی ہیں۔ پیتھالوجسٹ راضی ہو جاتا ہے۔ پیتھالوجسٹ کے دعوے کے مطابق اس کے پاس ایسی مشینیں بھی تھیں جو پیشاب کے ذریعے معلوم کی جانے والی عام بیماریوں کے علاوہ مریض کے کردار پر بھی روشنی ڈالتی تھیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی مشینیں خواب دیکھتی تھیں۔ کبھی یہ خواب ڈراؤنے ہوتے تو کبھی مزے دار۔ بعض لوگ ان کا مذاق اُڑاتے تھے اور بعض کوئی بھی رائے دیتے ہوئے کتراتے تھے۔ بہر حال لفافے پر پڑے جولی کی پیشاب کی جانچ کی گئی۔

عبداللہ کو دو روز میں رپورٹ بھی موصول ہوگئی۔ رپورٹ پڑھی تو عبداللہ کے ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ وہ اپنے بال نوچنے لگا۔ وہ عجیب و غریب رپورٹ اس طرح تھی :

نام: جولی۔

عمر: نامعلوم۔

پیشاب کا رنگ: ہلکا زرد۔

تیزابیت: شدید بھی اور معنی آفریں بھی۔ کیونکہ سب سے پہلے جو چیز ملی ہے وہ جاہ و حشم کی شدید چاہ ہے۔

☆ جنونی قوم پرستوں سے دوستی کرنے، ان کے قریب رہنے اور موقع ملنے پر ان سے دنیاوی فائدہ اُٹھانے کا شدید جذبہ۔

☆ یہ قارورہ اپنے حلوے مانڈے کے لیے خاموش تماشائی کی طرح قوم کو آمرانہ بدبختی کی طرف جاتے ہوئے دیکھتے رہنا اور چپ رہنا پسند کرتا ہے کیونکہ اس میں ضمیر کو طاقت دینے والے اجزا نہیں پائے گئے۔

☆مائکرواسکوپ سے دیکھنے پر قارورے میں نہ تو آدرشوں کے جراثیم پائے گئے اور نہ آدرشوں پر مرمٹنے کا کوئی جذبہ ہی نظر آیا۔

☆اس قارورے میں نہ کتابوں سے حاصل کردہ علم کا گاڑھا پن ہے نہ ادب کے مطالعے سے پیدا کردہ نظم وضبط ہے اور نہ دانشورانہ ریاضت کی متانت۔ اس لیے یہ قارورہ کتابوں پر موتے گا، لال پیلی بتیوں والی گاڑیوں پر گھومے گا اور آخر میں ایک بات اور۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ دعوتوں میں چقندر کھانے والوں کے چہروں پر سیاہی پوتے کیونکہ چقندر اس کو شدید ناپسند ہے۔

عبداللہ رپورٹ کو کئی بار پڑھتا ہے، اپنی بھویں سکیڑتا ہے۔ جھنجھلا کر پیتھالوجسٹ کو فون کرتا ہے۔ دوسری طرف سے ہلو کی آواز آتی ہے۔

''کیا تمھاری مشینوں کا دماغ خراب ہوگیا ہے؟''

''کیوں؟۔ کیا ہوا؟'' دوست پوچھتا ہے۔

''میں نے تم کو ایک کتیا کا قارورہ جانچنے کے لیے دیا تھا۔ تم نے مجھے یہ کس کی رپورٹ بھیج دی۔ جس میں تم کو آدرشوں پر مرمٹنے کا جذبہ نہیں، نل رہا۔ تصدیق کرنے کے بعد پیتھالوجسٹ فون پر عبداللہ کو بتاتا ہے کہ رپورٹ بالکل درست ہے۔ یہ کیس پیشاب میں Infection کا ہے۔ کتیا جس کی گود میں رہتی ہے اس کا انفکشن کتیا کے پیشاب میں آگیا ہے۔

☆☆☆

جب میں ہی نہ رہوں.....

• حسن منظر [پاکستان]

میں اس کے پاس تین مہینوں میں بس چھ سات دفعہ گیا ہوں گا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ دوسری ہی دفعہ میں وہ مجھے پہچان گئی اور بڑی اپنائیت سے پیش آئی۔ اس کی وجہ جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ تھی کہ: اس نے دیکھ لیا تھا میں سیدھا اس کے پاس گیا ہوں۔ اِدھر اُدھر چہروں کو جانچتا نہیں پھرا۔ یہی رویہ میرا بعد کے دنوں میں رہا۔ اور ہو سکتا ہے اس کے مجھے پہچاننے کی وجہ یہ ہو کہ میں اس سے عزت سے پیش آیا تھا، زرخرید لونڈیوں والا سلوک میں نے نہیں کیا تھا۔

ایک دفعہ اس کے لئے کیک لے کر گیا، بہت خوش ہوئی۔ دوسری دفعہ پیسٹری اور اس پر وہ اتنی خوش ہوئی کہ ایک پیسٹری کو میرے دانتوں سے کٹوا کر اپنے منھ تک لے گئی، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے تھوڑا سا کھایا اور دوبارہ میری طرف بڑھا دیا۔ لگا میں اس کی آنکھوں کے جادو میں آ گیا ہوں۔

آخری دو دفعہ خالی ہاتھ گیا تھا، ہوٹل میں شام کے کھانے کے پیسے بچا کر۔ دونوں دفعہ وہ پہلے کی طرح پیش آئی۔ ایک طرح سے میں وہاں جانے کے وقت کا انتظار کرنے لگا تھا، یوں بھی نئے شہر میں تنہائی کا شکار تھا، اور یہ بتانے پر اس نے کہا تھا وہ بھی میرا انظار کیا کرتی ہے۔

اَن پڑھ نہیں تھی لیکن زیادہ پڑھی لکھی نظر نہیں آتی تھی۔ عمر میں مجھ سے چھ سال چھوٹی ہوگی یا میری عمر کی۔ معصوم صورت کی تھی اور اس کی آواز میں جو سرور تھا وہ مجھے اس سے پہلے کسی اور لڑکی کی آواز میں نہیں ملا تھا۔ نہ بعد میں ملا۔

میری وہ نوکری عارضی تھی، ایک طرح سے Probation کی: یہ دیکھنے کے لیے کہ میں کیسا کام

کرتا ہوں، اُس بڑی تنخواہ کی نوکری کے لائق ہوں بھی یا نہیں۔ وہ لوگ مجھے بخیل لگے اور کام لینے میں شاہ۔ بہت جلد میں اس کمپنی کو اپنے Probation پر سمجھنے پر مجبور ہوگیا: آگے چل کر اچھے ثابت ہوئے اور کنفرم کیے جانے پر شرائط میرے پسند کی رکھیں تو کام کروں گا ورنہ...... ورنہ وہ جو میں نے کہا۔

گھر سے فون آنے پر کہ مجھے اس الیکٹرونس کمپنی نے اپوئنٹمینٹ لیٹر بھیجا ہے جس نے میرا انٹرویو اس شہر میں آنے سے پہلے لیا تھا اور چپ سادھ لی تھی۔ شرائط اچھی ہیں، تنخواہ، بونس، چھٹیاں میری مرضی کے مطابق۔ میں نے کمپنی سے اپنا بقایا طلب کیا، ہوٹل کا باقی بل ادا کیا اور ٹرین سے گھر کے لئے روانہ ہوگیا۔ اپوئنٹمینٹ لیٹر ابا کے پاس تھا۔ میں نے اس کے بس ضروری پوئنٹس سُنے پھر بھی مجھے وہاں سے بھاگنے کی اتنی جلدی تھی کہ اک آخری بار اس سے ملنے بھی نہیں گیا۔ اکیلے میں ملنے والی میری زندگی کی پہلی عورت۔ دراصل نئی نوکری کے حصول میں بزرگ وار کا بڑا ہاتھ تھا: ماں باپ دونوں ہی پردیس میں میرے تنہا رہنے سے خوش نہیں تھے۔ ہوٹل کا کھانا اس کی بڑی وجہ تھی۔

پہلی دو تنخواہوں کے بعد انھوں نے فیصلہ سنا دیا کہ اب تمھاری شادی ہو جانی چاہیئے۔ ابا نے لڑکی کے باپ اور بھائیوں کو دیکھ رکھا تھا اور یہ میں سمجھ رہا تھا اس سے زیادہ جاننے اور دیکھنے کا اُن کی نیت نہیں ہے۔ اماں نے اس کا ماں بہنوں کو پہلے کبھی کسی میلاد شریف میں دیکھا تھا اور جان گئی تھیں ان کے گھر میں شادی کے قابل ایک اور ہستی بھی ان کے مطلب کی ہے۔ بات چھڑنے پر خود اُسے بھی جا کر دیکھ آئیں۔ چھوٹی بہنیں اسی جانچ پرکھ کی ملاقات میں کسی طرح لڑکی کی بہنوں سے اس کی تصویر اُچک لائی تھیں اور اماں سے چھپا کر جب انھوں نے مجھے دکھائی تو میں نے ہاں میں سر ہلا دیا کیوں کہ میرے نزدیک اس چہرے کی لڑکی مزاج کی بس اچھی ہو سکتی تھی اور کچھ نہیں۔ جیسی اماں کو چاہیئے تھی۔

شادی کے بعد میں اپنی حرمزدگیوں سے تائب ہوگیا جو یوں بھی ایسی قابل ذکر نہیں تھیں۔۔۔ بس مارے باندھے کی نماز، قرآن نہ پڑھنا اور دکھاوے کا روزہ رکھنا۔ ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ شادی کے بعد بغیر جانے ہوئے میں آہستہ آہستہ مذہبی آدمی بنتا گیا۔ اور اس سے بھی عجیب بات جو میں نے اپنے بارے میں نوٹ کی یہ تھی کہ اُن دنوں جب نماز کے بعد میں اپنے اور اپنوں کے لیے دعائیں مانگتا تھا وہ بھی بغیر میرے ارادے کے اُن میں شامل ہونے لگی ہے۔ میرے ذہن میں ہوتا تھا 'اُسے کوئی بڑی بیماری نہ لگے'، ساتھ ہی کہتا: 'بلکہ نہ لگی ہو۔ آخر کو اس کا کام ہی خطرے کا تھا'۔ دعا مانگتا تھا: 'مجھ سے کوئی سوا ہمت اور قوی ارادے کا شخص اسے وہاں سے نکال کر لے گیا ہو اور زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنے کا موقع اُسے قدرت نے دیا ہو'۔

اسی لمحے دعا کے درمیان اندر سے ایک دھیمی آواز آئی: 'جیسے تمھیں دیا ہے'۔

میری دعا: 'گھر والی بن گئی ہو' پر ختم ہوئی۔

اس کے لیے میرے دل میں شکر اور احسان مندی کے جذبات تھے۔ وجہ وہی تھی جس کا ذکر کر چکا ہوں: اس سے ملنے والا اپنائیت کا سلوک، جس سے میں پہلے واقف نہ تھا۔ نہ اُن سے جو اپنی تھیں نہ اُن سے جو ساتھ پڑھی تھیں۔ اور جس کا احسان چکایا نہیں جا سکتا ہے۔ اس دعا سے مجھے ایک طرح کا سکون ملتا تھا۔

میں نے اس سے کبھی ذاتی نوعیت کے سوال نہیں کیے تھے: ماں باپ کون تھے، کہاں سے آئی تھی، نہ ہی اس نے مجھے کریدا تھا کون ہوں، کیا کرتا ہوں، کہاں سے آیا ہوں۔ لیکن جب میں اپنے اندر چھپی روحانی لطف کی دنیا سے آشنا ہو چلا، جو میرے لیے ایک بالکل نئی بات تھی، تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا خیال اکثر آیا کہ ہو سکتا ہے میری طرح وہ بھی مذہبی انسان کی روح رکھتی ہو اور صرف موقع ملنے کی دیر تھی وہ بھی عبادت اور تقویٰ کے ماٹ میں رنگ گئی ہوگی۔ ان خیالات کو میں باوجود کوشش کے جھٹک نہیں سکتا تھا، جو اکثر اوفس میں کام کے دوران آتے تھے اور ان کے آنے سے مجھے تھوڑی دیر کے لیے سکون مل جاتا تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ اُسے عزت دے کر میں اپنی عزت بحال کر لیتا تھا۔ لیکن کوئی اندرونی سینسر تھا جو مجھے بتلاتا تھا: مردِ خدا! تم دین کی زندگی اپنا چکے ہو۔ اس کا تو کیا اُن دنوں تک کا خیال اب نہیں آنا چاہیے جب اُس گلی میں جاتے تھے، کیوں کہ وہ تمھارے گناہ کے دن تھے اور مانو یا نہ مانو اس کا خیال لانے میں تمھیں لذت ملتی ہے۔

میں جان بوجھ کر اس کا خیال لاتا ہوں یہ میرا دماغ ماننے کو تیار نہ تھا۔ میرا ضمیر اُس سینسر کے خلاف تھا جو مجھ پر ظلم ڈھا رہا تھا۔ ضمیر میرا ساتھ دے رہا تھا، نہ دیتا تو میں عقل گم کر بیٹھتا۔

اُس کی نئی زندگی کا تصور جب بھی ذہن میں بنتا میرے دل میں یہی ہوتا تھا: خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو۔ آخر کو جب میں اپنی نجات کے لیے دعا مانگتا ہوں اُس کے لیے کیوں نہیں مانگ سکتا! مجھے بچپن سے درست طرح زندگی بسر کرنے کے لیے کچھ تھوڑی راہ نمائی ملی تھی۔ پڑھے لکھے ماں باپ ملے تھے، باعزت گھرانا، باعزت خاندان جس میں نیک و بد کا سب کو شعور تھا۔

بیچ میں سینسر بول اُٹھا: 'چاہے وہ اسے کام میں لاتے ہوں، نہ لاتے ہوں!'

'جانتا ہوں، اُن سے بھی بھول چوک ہوتی ہوگی۔ میری طرح'

'ہاں یہ ہوئی بات' وہ کہتا: 'اور پھر؟'

'راہِ راست پر آ جاتے ہوں گے۔'

'وہ چاہتی تو وہ بھی آ سکتی تھی'۔ میں اس کی بات سنی اَن سنی کر دیتا۔

میری بات جاری رہتی: کیا محلّہ، کیا اسکول کولج، ہر جگہ مجھے درست ماحول ملا تھا، ساتھ ہی دینی تعلیم اور اخلاقیات سے پُر کتابیں۔ اُسے کیا ملا ہوگا! قاعدہ بغدادی کے بعد شاید رنگین تصویروں والے فلمی رسالے۔ پھر وہ زیادہ بخشے جانے کی مستحق تھی یا میں؟ کون اس محلے میں یا اُسے دین کی درس دینے گیا ہوگا!

ایک اور نئی تبدیلی جو مجھ میں آئی یہ تھی کہ بغیر جانے ہوئے میری بول چال کی زبان میں تبدیلی

آتی جا رہی تھی۔ پہلے اگر خدا کا خوف اور نیکی کے کام کہتا تھا تو اب تقویٰ، اعمال صالح اور حق العبد منھ سے نکلتے تھے۔ اس تبدیلی کی طرف اشارہ پہلی دفعہ ایک پرانے دوست نے کیا تھا جس سے عرصہ بعد ملاقات ہوئی تھی۔ بیوی نے نہیں۔ وہ بے چاری اللہ میاں کی گائے ثابت ہوئی تھی۔ بہت کم بولتی تھی۔ گھر میں اب بس اماں، ہم دونوں اور میری ایک بیٹی رہ گئے تھے۔

نو سال بعد میرا دوبارہ اُس شہر میں جانا ہوا۔ وہ بھی وہاں کی سخت گرمیوں میں۔ صبح ٹرین سے پہنچا تھا، جس پارٹی سے ملنا تھا اُن سے ملا، کھانے کے بعد اُن سے یہ کہہ کر پیچھا چھڑایا کہ رشتے داروں سے ملنا ہے اور اس گلی کا رخ کرنے سے پہلے ایک ریسٹورینٹ میں بیٹھ کر ایک بڑا گلاس لسی کا پیا۔ لسی اس لئے کہ وہاں پہنچ کر پیاس نہ لگے۔ مجھے بھی اُس پورے علاقے کی کسی بھی دکان سے کھانے پینے میں عار تھا۔ گھن سے زیادہ وہاں کے گلاس اور چمچوں پلیٹوں سے ڈر لگتا تھا، جیسے اُن میں سے ہر ایک سے بیماری چمٹی ہو۔ اُن بیماریوں کے نام تک میں زبان پر نہیں لاتا تھا۔ وہ جھجک آج تک قائم تھی۔

اگر میرا ایشنر اُس وقت طنز سے پوچھتا: 'آج تشریف کیوں وہاں جا رہی ہے؟' تو میرے ضمیر کا جواب ہوتا: 'اپنی دعا کا اثر دیکھنے۔'

علاقہ اب بھی پہلے کی طرح مراتب کے اعتبار سے چار حصوں میں تقسیم تھا، جیسا پہلی دفعہ ساتھ لے جانے والے نے دکھایا تھا۔ سب سے چوڑی صاف ستھری سڑک پر، بلکہ چوک میں مشہور مغنیہ کا محل اسی طرح سر اٹھائے کھڑا تھا مع پیشانی کے پتھر کے پلاک plague کے جس پر اس کا نام کھدا تھا۔ اس کے دونوں طرف جو مکان تھے وہ بھی کم حیثیت کے نہیں تھے۔ کسی میں بھی باہر کے رخ دکانیں نہیں تھیں، ہر ایک کا کوئی نہ کوئی نام تھا، بعض ہر نام کے اوپر دعا کے طور پر بھی کچھ نہ کچھ منقش تھا۔ سب کی حفاظت پر دربان بیٹھے تھے۔

چوک ہی سے نکلنے والی کم چوڑی سڑک وہ تھی جہاں بڑی بڑی بیٹھکیں ہیں، جن میں کاروبار دن میں بند رہتا ہے اور جب شام کو ان کے پٹ کھلتے ہیں تو اُن میں زرق برق کپڑوں والی لڑکیاں عین سامنے قالین پر بیٹھی نظر آتی ہیں۔ ان کے رخسار گلابی ہوتے ہیں اور ہونٹ تیز سرخ ایسے کہ مینھ میں بھیگے ہوئے گلاب کو شرمائیں۔ بال لگتا ہے سیاہ گھٹا ہیں جن میں مقیش کی بجلیاں چمک رہی ہوتی ہیں۔ ان کے اِدھر اُدھر سازندے ہوتے ہیں۔ وہ سرعام نہیں ناچتی گاتی ہیں، شروع رات میں بس بیٹھتی سرعام ہیں۔ کوئی بڑھیا کپڑوں والا تو جوان یا جوان رک کر اُن کی طرف دیکھے تو ٹھوڑی سے اشارہ کرتی ہیں کہ وہاں کھڑے کیا کر رہے ہو اندر آؤ۔ اور جو پھر بھی وہ وہاں کھڑا اتکتا رہے تو اشارہ بدل جاتا ہے کہ ادھر آگے بس تکنے کو بھک منگے کہیں کے۔ پروگرام شروع ہونے پر دروازے بند ہو جاتے ہیں اور باہر بس طبلوں کی گمک اور ہارمونیم کی آواز پہنچ رہی ہوتی ہے، جسے میں نے پہلے دن کی سیر میں اوباشوں کو وہیں ٹھہر کر سنتے دیکھا تھا۔

ایک اور سڑک بھی ہے جہاں آنے والوں کی نظروں کو پرکھ کر اُس کوچے کے کارپرداز، جن کی آنکھیں کوؤں کی آنکھوں سے کم تیز نہیں ہوتی ہیں، کسی مکان کے اندر لے جاتے ہیں۔ تھوڑی سی دیر میں کارپرداز، وہاں کی زبان میں دلال، خود باہر آجاتا ہے اور باہر سے آنے والا اندر رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی دونوں ہی پل بھر میں باہر آجاتے ہیں اور دونوں ہی کے چہروں سے ناگواری ٹپک رہی ہوتی ہے۔ وہ سڑک بھی زیادہ تنگ نہیں ہے، صاف ستھری ہے اور اس کے دومنزلہ تمنزلہ مکان بھی اچھے خاصے ہیں۔

میں بس اُس تنگ گلی کا شناسا تھا جہاں آدمی کو شام کو خود اِدھر اُدھر نظر رکھتے ہوئے جانا پڑتا ہے، وہاں کے چند ایک چہروں کو پہچاننے لگا تھا جو گھروں کے دروازوں میں نظر آتے تھے۔ معمولی کرسیوں پر بیٹھی ہوئی معمولی میک اَپ میں بیماری عورتیں، چند ایک سگرٹ پھونکتی ہوئی، کوئی کوئی پان چباتی ہوئی اور وہ آنے والے سے خود سودا کرتی تھیں، اگر گرمی ہو تو وہیں سڑک پر، سردی ہو تو دروازے میں بیٹھے بیٹھے۔

ویسی ہی علاقے کی تقسیم آج بھی تھی سوائے اس کے کہ مین بازار میں دکانیں کھلی تھیں، باقی علاقے سنسان پڑے تھے — میری طرح دھوپ میں نہائے ہوئے۔ نان کباب والوں کے اپنا کام شروع کرنے میں ابھی دیر تھی۔ نہ کہیں پھول، گجرے اور بیلے موتیا کی پنچیاں بیچنے والے نظر آرہے تھے۔ میری جیب میں اتنے پیسے تھے کہ اگر شام کو آتا تو اونچے راگ رنگ کے کوٹھے میں جا سکتا تھا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ بیٹھ کر موسیقی سنتا، گانے والی جیسے بھی گلے کی ہوتی اُسے داد دیتا اور رات گئے وہاں سے اٹھ آتا۔

مگر میں گیا اُسی تنگ گلی میں جہاں بیٹھی قسمت والی عورتیں رہتی تھیں اور شام ہونے پر دروازوں میں آبیٹھی تھیں۔ اس وقت جو چند عورتیں نظر آئیں بغیر کسی قسم کی سج دھج کے اِدھر اُدھر آجا رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک کا بھی چہرہ میں نہیں پہچانتا تھا۔ ایک جوان عورت دھوپ سے اپنے بچے کو بچاتی میرے خیال میں شاید ڈاکٹر کو دکھانے لے جا رہی تھی۔ ایک کم عمر عورت ایک گھر سے نکل کر بغیر میری طرف دیکھے سامنے کے گھر میں چلی گئی۔ اس وقت پہلی بار ان کی روزمرہ کی زندگی میرے سامنے تھی۔ مرد کوئی نظر نہیں آیا۔ نظر آتا تو اُسے بتلاتا مجھے کس کی تلاش ہے۔ مکان پہلے سے بھی زیادہ خستہ حالت میں تھے۔ دروازوں کے پٹ نیچے سے بارش کے کھائے ہوئے سے تھے اور بدرنگے۔ بیچ بیچ میں اکا دکا کام چلاؤ نئی عمارتیں اُن پرانیوں کے شانہ بشانہ کھڑی تھیں۔ دونوں طرف چلنے والی نالیوں کی صفائی شاید برسوں سے نہیں ہوئی تھی۔ پانی نے ٹھہر کر جگہ جگہ کیچڑ کے سیاہ موٹے گچے سے بچھا رکھے تھے۔ دھوپ میں نالیوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی اور ہوا میں بھینی بھینی سی بو تھی جیسی ایسے کوڑے گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے آتی ہے جس کا کوڑا اُبل کر سڑک پر آگیا ہو۔ یہ سب رات کو کہاں نظر آتا ہے، تب خوش بو بدبو کا احساس کس کو ہوتا ہے۔

مجھے اس گھر کی صحیح لوکیشن یاد نہیں رہی تھی۔ شاید اندر جاتے ہوئے سیدھے ہاتھ پر گیارھواں بارھواں تھا۔ پہلے جس اُلٹے ہاتھ کے منزلے کی دیوار میں پیپل پھوٹ آیا تھا شاید وہی گھر تھا جو آج ڈھیا پڑا

تھا۔ وہ ہوتا تو میں کچھ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس وقت کہاں کھڑا ہوں۔ نو سال کسی کی رہائش گاہ کو بھول جانے کے لیے کم عرصہ تو نہیں ہوتا ہے۔ خاص کر جب کہ نہ گلی کا نام ہو، نہ مکانوں پہ نمبر—اور اس کا نام بھی صحیح طرح معلوم نہ ہو جس کی تلاش تھی۔ یہ میں بتانا بھول گیا تھا اس گلی میں سے چھوٹی چھوٹی اور گلیاں بھی دونوں طرف نکلتی تھیں۔ آخر میں نے ایک دروازے کو کھٹکھٹایا اور بے ارادہ اوپر کی طرف دیکھا— جیسا سب کرتے ہیں، وہاں اوپر کے کمروں سے بچیاں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ شاید حیران ہوں گی کہ یہ بے وقت آنے والا کون ہے۔ وہاں دھوپ میں کھڑے رہنا میرے لیے دشوار تھا، تیسرا پہر تھا مگر اس کی تیزی میں کمی نہیں آئی تھی۔ گردن اور کانوں پر چپکے لگ رہے تھے۔ ہوا کا بھی اس گلی میں گزر نہیں تھا۔ گرم بھی ہوتی تو تھوڑا بہت پسینہ خشک کرتی۔ میں رومال سے گدی پونچھ رہا تھا کہ اندر سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت نکلی اور اس نے قدرے بے زاری سے کہا: 'اب اس وقت؟'

'کسی سے ملنے یہاں آیا ہوں۔ اس کا پتہ پوچھتا ہوں'۔ وہ دلچسپی سے میرے چہرے کو دیکھنے لگی۔

'نو سال پہلے یہاں آیا کرتا تھا'۔ میں نے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

'اندر آجاؤ'۔ اس نے بھڑے ہوئے پٹ کو پورا کھولتے ہوئے کہا اور میرے اندر پہنچ جانے پر چھت کا پنکھا کھول دیا۔

اندر سے کھانا پکنے کی خوشبو آرہی تھی۔ ہو سکتا تھا دروازہ کھولنے والی ہی وہ کام چھوڑ کر آئی تھی۔

میں نے چوڑے پلنگ کے پاس رکھی ہوئی چھوٹی سی میز پر کچھ روپے رکھتے ہوئے کہا:

'کچھ دیر بیٹھوں گا'۔ میں بوکھلایا ہوا تھا۔

اس نے کہا: 'تو لیٹ جاؤ'۔

میں جھینپ گیا۔ جگہ ہی جھوٹ بولنے کی تھی پھر وہ کیوں میری بات کو جھوٹ نہ سمجھتی۔ میں ٹانگیں لٹکائے پلنگ پر بیٹھ گیا جو بیک وقت پلنگ بھی تھا اور صوفہ بھی۔ جیسا بھی اُسے سمجھا جائے۔ یہ چھوٹی میز رات کو شاید شراب کی بوتل اور گلاس رکھنے کے کام آتی ہوگی، میرے دماغ نے کہا۔

وہ جا کر اندر سے ایک گلاس پانی لے آئی۔ 'ہو سکتا ہے چولھے پر سے پتیلی بھی اتار آئی ہو' میرے دماغ نے کہا۔

گلاس کو میں نے میز پر رکھ دیا۔ پھر میں نے لڑکی کا نام بتایا جس پر اس نے کہا: 'اُس نام کی کوئی لڑکی یہاں نہیں رہتی ہے۔ نہ میرا خیال ہے پہلے کبھی رہتی تھی'۔

میرے دماغ نے کہا: 'یہ لوگ اپنا صحیح نام کسی کو نہیں بتاتی ہیں'۔

میں سوچ سوچ کر اس کی پہچان بتانے لگا: 'قد درمیانی ہے'۔ [اس نے ساتھ ساتھ کہا: 'وچولا']۔ 'بال لمبے' [وال تھے]، 'اور رنگت بہت صاف ہے'، [تے رنگ چٹا]۔ 'تھوڑی پر تل ہے'۔

وہ پہلے تو ہنس پڑی پھر سوچنے لگی۔ 'یہاں تو لوگ بدلتے رہتے ہیں۔ مجھے ابھی ادھر ایک سال ہوا' پھر جیسے چونک کر بولی: 'بات کیا ہے؟ کام کیا ہے؟'

میں نے گھبرا کر کہا: 'کام کچھ نہیں۔ بس اس کی خیریت معلوم کرنی تھی'۔

'خفیہ پولیس کے ہو؟' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

'میں نے پہلے سے بھی زیادہ گھبرا کر کہا: 'نہیں'۔ ساتھ ہی خیال آیا کہ بھگائی ہوئی تھی۔

اس کی آنکھیں تھوڑی پھیلیں اور وہ بولی: 'اس سے یارانا ہو گیا تھا؟'

میرے اندر خود اعتمادی کی لہر اٹھی: 'ہاں'۔

'اب بھی بس اسی سے ملو گے! تمھارا کام کوئی اور نہیں کر سکتا ہے؟'

'ہاں اسی سے'۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا: 'کسی اور سے نہیں'۔

وہ بولی: 'ٹھہرو'۔ اور بغیر دوپٹے کے جھنجھٹ میں پڑے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے اپنے خیال پر ہنسی آئی: دوپٹے کا خیال مجھے آیا ہی کیوں۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں نے چھت اور دیواروں پر نظر دوڑائی۔ کہیں یہی کمرہ تو نہیں ہے جس میں ہر بار آیا تھا۔ لیکن کمرے کی پہچان کے لیے میرے ذہن میں اس سے بھی کم تفصیل بچی رہ گئی تھی جتنی اس کے لئے جس کی تلاش میں یہاں آیا تھا اور جس کا نام تک پوری طرح یاد نہیں تھا، جس کے بارے میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے تو کس حال میں اور کہاں؟ یا اگر زندہ نہیں ہے، یہ خیال جیسے چور دروازے سے میرے دماغ میں داخل ہوا، تو کس حال میں دنیا سے رخصت ہوئی؟ یعنی میں چاہتا تھا پتہ چلے اس نے یہ زندگی چھوڑ دی تھی یا نہیں۔ کیا کوئی ایسا اس کی زندگی میں آیا تھا جو اُسے اس دنیا سے نکال کر کہیں پرلے گیا ہو؟ صرف اتنا، اس سے زیادہ نہیں۔ دعا میں اُسے شامل کر کے مجھے جو سکون ملتا تھا وہ اس زمانے میں پیدا نہیں ہوا تھا جب میں اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ اُس سکون نے اس وقت سینے میں اُبال کی شکل اختیار کر لی تھی۔ لگ رہا تھا ابھی ہنستی ہوئی دروازے میں آ کھڑی ہو گی۔ یا پتہ چلے گا یہاں سے جا چکی ہے۔ اس وقت تک میں اس حقیقت سے آشنا نہیں تھا کہ ان میں سے جو یہاں سے چلی جاتی ہے وہ جہاں بھی جائے وہاں رہنے کو اُسے ایسی ہی گلی میں پناہ ملتی ہے۔

کچھ ہی دیر میں وہ عورت لوٹ آئی اور پنکھے کے نیچے کھڑی ہو کر ہوا کے لئے اپنی قمیض کو سینے اور پشت پر سے اٹھا کر بولی: 'نیلم کو پوچھتے ہو؟'

مجھ میں جیسے جان آ گئی لیکن میرا 'ہاں' کا لفظ اس کے مُنھ کے دو لفظوں سے ٹکرا گیا: 'وہ مر گئی'۔

'ارے نہیں'، میں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی بات سن کر بھی میرے دل میں تھا اس سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔ میرے مُنھ سے نکلتے نکلتے رہ گیا: کیا قدرت اتنی بے رحم ہو سکتی ہے کہ کسی کو اپنی زندگی سنوارنے

کا موقع بھی نہ دے؟

'ماں اس کی ناچنے کا کام کرتی تھی کبھی یہاں کبھی قلموں میں۔ پھر کسی نے اپنے گھر بٹھا لیا۔' اس کی بات جاری تھی کہ دروازہ کھول کر کچھ اور عورتیں میری شکل دیکھنے کو آ گئی تھیں یا کیا۔ ان کے ساتھ دو کم عمر لڑکیاں بھی تھیں۔

'نیلم آخیر تک یہیں بیٹھی تھی، دو گھر آگے جس دن......'

'تو چپ کر۔' آنے والی عورتوں میں سے ایک نے کہا: 'مجھے ساری بات کا پتہ ہے۔ میں اس کے ساتھ تھی۔ میں نے بات کاٹنے والی کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ کافی موٹی بھدی بیستر عورت تھی۔ بال دو رنگ کے تھے۔ سر کے پاس سفید اس سے آگے مٹتے ہوئے خضاب میں رنگے ہوئے۔ سونے کی چوڑیاں پہنے تھی اور کانوں میں بُندے۔

میں نے مری ہوئی آواز میں کہا: 'کیا ہوا تھا اُسے؟'

'پانچ سال ہوئے چراغ کو کسی کی گولی لگی' [اس نے میری بات نہیں سنی وہ کون تھا؟] یہاں تو جی ایسے کام آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ بہت خون گیا۔ لالی بتی لے گئے، وہاں سے انھوں نے اندر علاج کے کمرے میں بھیجا۔ انھوں نے پوچھا کون ہے؟ ساتھ جو بھائی پولس تھا اس نے کہا: 'چراغ دین ہے دلا'۔ اس پہ ڈاکٹر، کمپوڈر اور وہاں جتنے بھی تھے سب ہنس پڑے۔ اچھا آدمی ہے ہمارا خون خشک ہو رہا تھا اور وہ ہنس رہے تھے۔ پھر جو ان میں سے ڈاکٹر تھا اس نے کہا: 'اسے خون چاہیے۔ ابھی اسی وقت'۔ ہم نے کہا: 'ہاں جی دو'۔ ان میں سے کسی نے کہا: 'ایسے نہیں۔ خون ہمارے پاس ہے لیکن اس کے بدلے میں اس کے رشتے داروں میں سے کسی کو خون کے بینک میں خون جمع کرنا پڑے گا۔' بات ہم میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے کہا: 'کوئی تمھارا بندہ اپنا خون دے وہ ہم یہاں جمع کریں گے، پھر جو ہمارے پاس ہے اس کے نمبر کا وہ اسے دیں گے۔ اس کے ساتھ جو آدمی سفید کوٹ میں تھا بولا: 'جلدی کرو نہیں تو یہ چلا۔'

'یہ سن کر سب سن گئے' اسپتال والوں میں سے بھی کوئی مدد کو آگے نہیں بڑھا۔ سب جانتے تھے ہم کون ہیں پھر کوئی کیوں ہماری مدد کو بڑھتا'۔

'پھر؟'

موٹی بھدی بیستر عورت نے گہرا سانس چھوڑتے ہوئے کہا: بدلے کا وہ خون نیلم نے دیا۔ اس کے لیے اسے وہ دوسرے کمرے میں لے گئے۔ اس کے ساتھ ہم سب تھے۔' کچھ دیر کے لئے کمرہ پھر خاموشی میں ڈوب گیا۔

'وہاں جو آدمی اس کا خون لے رہا تھا اس نے عجیب حرکت کی۔'

'کیا؟' میں نے کہا۔

'جس آدمی نے اس کا بلڈ پریشر لیا تھا، پھر خون نکالنے کی موٹی سوئی لگائی تھی۔ آخر کو جوان عورت تھی۔ وہ بلڈ پریشر کی پٹی باندھتے میں بھی اس کے بازو پر ہاتھ پھیر رہا تھا، سوئی لگاتے میں بھی۔ بے ضرورت اس کے منھ گردن پہ ہاتھ پھیرے جا رہا تھا۔ نیلم اس کی طرف شبہہ کی نظروں سے دیکھ رہی تھی لیکن بول نہیں سکتی تھی کہ اپنے کام سے کام رکھ۔ ڈاکٹر اور اس کا کمپوڈر جن آنکھوں سے اُسے دیکھ رہے تھے وہ ہماری لاکھ دفعہ کی دیکھی ہوئی آنکھیں تھیں۔' واقعہ سنانے والی بات کرتے کرتے خاموش ہو گئی جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا: 'پھر کیا ہوا؟'

اس نے چونک کر کہا: 'کچھ نہیں۔'

میں نے کہا 'نہیں تم کچھ کہنے والی تھیں۔'

'ہاں نیلم کو سب خون نکل جانے سے جیسے چکر آیا۔ بولی: 'سب خون مت لے لینا، تھوڑا میرے لیے بھی چھوڑ دینا۔ نہیں تو۔' اس پہ دونوں ہنس پڑے۔ شروع میں جو نرس وہاں تھی ان کی آپس کی چھیڑ چھاڑ کو دیکھ کے کب کی وہاں سے جا چکی تھی۔ ڈاکٹر نے جیسے انجان پنے میں چادر کے اوپر اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

'میں تیرے کام کے لیے بہت چھوڑ دیا ہے۔'

موٹی بھدی لیسٹر عورت نے مجھ سے کچھ فاصلے پر پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا: 'تم جانو عزت تو سب کی ہوتی ہے۔ نیلم نے اُسے غصّے سے گھور کر دیکھا لیکن منھ سے کچھ نہیں کہا کیوں کہ کام تو اپنا تھا۔ ڈاکٹر کمپوڈر میں جو مذاق چل رہا تھا رک گیا اور ڈاکٹر نے جو سوئی کھینچی تو خون کی پھوار سے چادر رنگ گئی۔ چپکانے والی پٹی لگا کر انھوں نے اُسے پہیوں والی میز سے اتر جانے کو کہا۔ اور جب وہ اتر کر کھڑی ہوئی تو چکرا کے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔'

دروازے کے پاس کھڑی ہوئی دوسری عورت بولی: 'ملیریا بخار سے اٹھے اسے ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا'

'خیر ہمارے آدمیوں نے اسے پھر سے میز پر لٹال دیا۔ اس کا حلیہ بگڑ رہا تھا۔'

'دونوں نے ہمیں خوش کرنے کو کہا: 'ابھی تھیلی چڑھائیں گے۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی'۔ ہمارے آدمیوں میں سے کسی نے کہا 'تو چڑھاؤ۔ دیر کیوں کر رہے ہو۔'

'پھر؟'

'پھر انھوں نے تھیلی چڑھائی لیکن دو بوندیں بھی اندر نہیں گئی ہوں گی کہ اُسے تھرتھری چڑھ گئی، منھ پھول کر ڈبل روٹی ہو گیا۔ دونوں کو یا تو مستی چڑھ رہی تھی یا ایک دم گھبرا گئے۔' کمپوڈر نے جلدی جلدی دو انجکشن بھر کے دیئے۔ ایک کے بعد ایک، اور تھیلی نکالی۔'

اب بولنے والی کی آواز بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
'ہتھیلی پلنے کو تھماتے ہوئے کہا: لو باقی اپنے محلّے میں چڑھوا لینا'
'محلّے کے لفظ پر نیلم نے آنکھیں کھول کر دونوں کو جس نفرت سے دیکھا وہ انھیں مرتے وقت تک یاد رہے گا۔ اور پھر جو اس نے آنکھیں بند کیں تو دوبارہ نہیں کھولیں۔ چراغ تو بجھ گیا، وہ رات بھر بخاری جلتی رہی۔ پتہ نہیں کاہے کا انجکشن تھا۔'
'زہر کا ہوگا' پہلی عورت نے کہا۔
حالانکہ میں اس سے زیادہ نہیں پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن بے دھیانی میں کہہ بیٹھا: 'پھر کیا ہوا؟'
'اگلی صبح بانگ کی آواز کے ساتھ وہ چل بسی۔'
تھوڑی دیر بعد آنسو پونچھتے ہوئے بشاشت سے اپنی بات اس نے پوری کی: 'بڑا اچھا جنازہ اٹھا۔ محل والی نے بھی ہزار دیے۔ بڑی دل والی ہے۔ یہاں والیوں نے بھی جس کا جتنا بس تھا دیا۔'
پہلی عورت بولی: 'میں ان دنوں اپنے شہر میں تھی، یہاں نہیں آئی تھی۔ اس کو دیکھنے کو تو میرا دل بھی کرنے لگا ہے۔' پھر مجھ سے بولی: 'تمھارے پاس اس کی کوئی فوٹو ہے؟'
میں ایسے بوڑھے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا جس کی کمر صدمے سے ٹوٹ گئی ہو۔ باہر جانے کے لیے اٹھا تو میزبان عورت نے پوچھا: 'ان پیسوں کا کیا کرنا ہے؟'
ایک خیال آیا کہہ دوں اس کی قبر پر اگربتیاں اور پھول بھجوا دینا۔ مگر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا۔

☆☆☆

بڑی حویلی

● اے خیام [پاکستان]

اب تک میرے سارے اندازے درست ہی ثابت ہوئے تھے۔ ان اندازوں کی بنیاد تھی ابو کی ڈائری یا پھر امی کی وضاحتیں۔ ڈائری بھی میں نے لاتعداد مرتبہ پڑھی تھی اور امی بھی بڑی وضاحت سے سارے احوال سناتی رہی تھیں۔ ٹرین سے اُترا تو ایسا لگا کہ میں واحد شخص ہوں اس اسٹیشن پر اُترنے والا۔ ٹرین بھی شاید ایک منٹ کے لیے یہاں ٹھہرتی تھی۔ ٹرین چلی گئی تو میں نے چاروں طرف دیکھا۔ پلیٹ فارم سے چند سیڑھیاں اُتر کر ایک سائیکل رکشا کھڑا تھا۔ ایک شخص میری طرف بڑھتا چلا آرہا تھا، شاید اس رکشے کا ڈرائیور تھا۔

نزدیک پہنچ کر اس نے میرے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

''بڑی حویلی جانا ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے مسکرا کر آہستہ سے سر ہلایا جیسے جانتا تھا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ بیگ اٹھا کر وہ رکشے کی طرف چل دیا۔

گاؤں کا فاصلہ زیادہ نہیں ہونا چاہیے...... میں نے سوچا۔

شام کا دھندلکا چھانے لگا تھا، سورج سرخ گولا بن کر زمین میں اُترتا جا رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر گاؤں کے مکانوں کی کھپریلی چھتوں سے دھواں اٹھ کر فضا کو مزید دھندلا رہا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے فضا خاصی سوگوار معلوم ہو رہی تھی۔

گاؤں پہنچنے میں شاید پندرہ بیس منٹ ہی لگے ہوں گے۔ سڑک سے ڈھلوان سا کچا راستہ گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک طرف مسجد تھی اور پھر میلوں تک کھیتوں کا سلسلہ۔ دوسری طرف مکانات کے سلسلے تھے، کچھ کھپریل کی چھتوں والے مکان تھے اور کچھ دو منزلہ پختہ مکانات۔ ابو کی ڈائری میں پختہ مکانات کا ذکر نہیں تھا، امی سنی سنائی بتاتی تھیں کہ گاؤں میں اب پختہ مکانات...... بلکہ دو منزلہ مکانات بننے لگے ہیں۔

رکشے سے اُتر کر میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ایک طرف تاحد نظر کھیت ہی کھیت تھے۔ آموں کا ایک گھنا باغ بھی نظر آرہا تھا۔ اُدھر سے نظریں ہٹا کر میں نے اپنے سامنے کے مکان کو دیکھا۔ بہت بڑا مکان...... میں نے رکشے والے کی طرف دیکھا جس نے آہستہ سے سر ہلایا جیسے کہہ رہا ہو، یہی ہے بڑی حویلی۔

مکان...... بڑی حویلی...... کافی اونچائی پر بنی ہوئی تھی۔ پانچ چھ سیڑھیاں چڑھ کر مکان میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ کچھ مکانوں میں بتیاں جلنے لگی تھیں۔ ایک شخص تیزی سے کہیں سے نمودار ہوا اور حویلی کے بڑے دروازے کا تالا کھول کر اندر داخل ہوا۔ حویلی روشن ہونا شروع ہو گئی۔ پھر باہر آ کر اس نے دروازے کے اوپر لگے ہوئے بلب کو روشن کیا۔

ابو کی ڈائری میں لکھا تھا کہ سر شام ہر کمرے اور برآمدے میں کیروسین آئل کے لیمپ یا لالٹین روشن کر دیے جاتے تھے اور باہر ایک پیٹرومیکس روشن کر دیا جاتا تھا تا کہ دور دور تک روشنی پھیلے اور راہ گزر تاریک نہ رہے۔

حویلی سے ملحق کئی کھنڈر نظر آ رہے تھے، شاید یہ بھی کبھی حویلی رہے ہوں گے۔ سب کہتے ہیں مکان تو مکینوں سے ہوتے ہیں...... لیکن میرے سامنے کی بڑی حویلی سے ایسے کوئی آثار ظاہر نہیں ہو رہے تھے جس سے پتہ چلتا کہ یہ حویلی غیر آباد ہے۔

باہر کی بتی جلا کر وہ شخص میری طرف بڑھا۔

''آپ خالد حسن خاں صاحب ہیں؟...... لیکن نہیں، آپ خالد حسن خاں کیسے ہو سکتے ہیں!''

اس نے خود ہی اندازہ لگانے کی کوشش کی اور کسی شش و پنج میں پڑ گیا۔

''آپ کا خیال صحیح ہے۔ میں خالد حسن خاں نہیں ہوں۔ میں شاہد حسن خاں ہوں۔ خالد صاحب کا بیٹا۔''

''ہاں، یہی ٹھیک ہو سکتا ہے۔ تو آپ بڑے سرکار عابد حسن خاں صاحب کے پوتے اور چھوٹے سرکار خالد حسن خاں صاحب کے صاحب زادے ہیں۔'' اس کا لہجہ کچھ طنزیہ سا تھا۔

''میرا نام شاہد حسن خاں ہے۔ اور آپ......؟''

''میں حبیب اللہ ہوں۔ آپ کے...... میرا مطلب ہے بڑے سرکار کے منشی محبوب الٰہی کا پوتا۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ حویلی پر نظریں دوڑاتا رہا۔ قریب کی عمارتیں ڈھہہ چکی تھیں، اینٹیں اور دروازے تک غائب ہو چکے تھے لیکن یہ حویلی پوری آب و تاب کے ساتھ ایستادہ تھی، لیمپ اور پیٹرومیکس کی

بجائے بجلی کے بلب جگمگا رہے تھے۔ رنگ و روغن سے اس کی دیکھ بھال ایسے کی گئی تھی جیسے یہ خوشحال مکینوں سے اب بھی آباد ہو۔

''آپ یہیں کھڑے رہیں گے یا اندر بھی جائیں گے...... اپنی حویلی کو اندر سے نہیں دیکھیں گے...... چھوٹے سرکار!''

میں نے حبیب اللہ کی طرف دیکھا، وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''میں نے آپ کو بتایا نا کہ میرا نام شاہد ہے...... شاہد حسن خاں۔''

اس نے میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

''میں پہلے بابا سے ملنا چاہوں گا، پھر یہاں آجاؤں گا۔ چند دنوں یہاں قیام کروں گا۔''

''بابا......؟'' اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں بابا۔ آپ کے دادا۔ میرے ابو انھیں اسی طرح پکارتے تھے نا!''

حبیب اللہ کی آنکھوں میں ایک چمک سی آگئی۔

''دادا یہاں نہیں آسکتے۔ وہ اب چل پھر نہیں سکتے۔''

''اگر وہ چل پھر سکتے، تب بھی میں انھیں زحمت نہ دیتا۔ میں خود ان سے جا کر ملوں گا۔ مجھے معلوم ہے وہ اس حویلی سے زیادہ دور نہیں رہتے۔''

''آپ کا خیال صحیح ہے۔ اس حویلی کی پشت پر ہی ہم رہتے ہیں۔''

اس نے میرا بیگ اٹھایا اور دروازہ کھول کر اندر رکھ آیا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ کر حویلی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

حویلی کی پشت پر مٹی کی موٹی دیواروں سے بنا مکان تھا جس کی چھت کھپریل کی تھی۔ چھت سے اٹھتا ہوا دھواں عجیب پُر اسرار منظر پیش کر رہا تھا۔

وہ مجھے دروازے کے پاس چھوڑ کر اندر چلا گیا، پھر ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

کمرہ خاصا وسیع تھا۔ مٹی کی دیواروں پر چونا گردانی کی گئی تھی۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ چارپائی پر ایک ضعیف شخص پڑا تھا، صاف ستھرا بستر تھا اور سینے تک اس نے چادر تان رکھی تھی۔ قریب ہی اسٹول پر قرآن شریف کے علاوہ دوا اور کتابیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔

''دادا! دیکھیے کون آیا ہے آپ سے ملنے......''

چارپائی پر تھوڑی ہلچل ہوئی اور منشی محبوب الٰہی نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے پہچاننے کی کوشش کی۔

حبیب اللہ نے ایک کرسی کھینچ کر چارپائی کے قریب کر دی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

محبوب الٰہی مجھے دیکھتے رہے، میری طرف دونوں ہاتھ بڑھائے تو میں نے بھی اپنا ہاتھ بڑھایا، لیکن انھوں نے میرے ہاتھ کو ایک طرف کر کے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا، ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے، پھر انھوں نے مجھے سینے سے لگالیا، ان کے جسم کی حرکت سے لگ رہا تھا کہ وہ سسک رہے ہیں۔

''بابا...... خود کو سنبھالیے...... میں......''

''مجھے نہ بتایئے آپ کون ہیں۔ خدا نے میری سن لی، ہمیشہ سُنی ہے میری۔ آپ بڑے سرکار کے پوتے ہیں نا؟'' ان کی آواز لرز رہی تھی۔

''آپ نے ٹھیک پہچانا بابا...... لیکن آپ نے تو مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا، پھر......''

''ہو بہو چھوٹے سرکار جیسے...... بالکل چھوٹے سرکار...... میں انھیں کیسے بھول سکتا ہوں، ہمیشہ میں نے ان کا انتظار کیا، ہر روز انھیں یاد کیا۔''

وہ میرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیے رہے۔

''حبیب میاں، میں کہتا تھا نا کہ کوئی ضرور آئے گا، صحیح وارث...... بڑی حویلی...... جاؤ چھوٹے سرکار کے کھانے پینے کا انتظام کرو۔'' انھوں نے قریب ہی کھڑے ہوئے حبیب اللہ کی طرف دیکھا۔

''نہیں، ابھی کچھ نہیں۔ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ سے بہت کچھ سننا چاہتا ہوں...... اور آپ مجھے چھوٹے سرکار نہ کہیں، میرا نام شاہد ہے، شاہد حسن خاں۔ دیکھیے نا، میں آپ کے حبیب میاں جیسا ہی تو ہوں نا!''

''خوش رہیے بیٹا...... اللہ آپ کی عمر دراز کرے۔ بالکل چھوٹے سرکار جیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔''

میں نے ان کے ہاتھ پر تھپکی دی۔

''آپ طویل سفر سے آئے ہیں، تھک گئے ہوں گے۔ آج آرام کریں، کل باتیں ہوں گی۔ مجھے بھی آپ سے بہت سے باتیں کرنی ہیں۔ اچھا ہوا آپ آگئے۔ اب مجھ میں اپنی ذمہ داری نبھانے کی صلاحیت رہی نہ طاقت۔ اور میں حبیب میاں کو بھی زیر بار کرنا نہیں چاہتا۔''

یہ سب میرے لیے بڑا بے ربط تھا۔ میں ان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

بابا سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو حبیب اللہ میرے ساتھ تھا۔

''کیا آپ حویلی میں قیام کا ارادہ رکھتے ہیں شاہد بھائی؟''

مجھے اس کا شاہد بھائی کہنا اچھا لگا، میں بیساختہ مسکرا اُٹھا۔

''ہاں حبیب میاں۔ میں اپنے دادا کو اور ابو کے بچپن اور نوجوانی کو محسوس کرنا چاہتا ہوں۔ چھوٹا سا تھا تو ابو بھی چلے گئے، بس ایک ڈائری چھوڑ گئے۔ میں نے اس ڈائری کو اتنی بار پڑھا ہے کہ سب کچھ ازبر ہو گیا ہے۔ کچھ باتیں امی نے بھی بتائی ہیں لیکن وہ بھی اُکھڑے ہوئے درخت ہی کی مانند ہیں۔ ان کے

والدین انگلستان جا بسے تھے۔ میرے نانا نے مشرقی مصنوعات کی درآمد کا کاروبار کر لیا تھا اور بہت کامیاب رہے تھے۔ میری امی بھی تو اسی گاؤں کی ہیں نا!"

"ہاں، دادا بتاتے ہیں۔ دادا تو گاؤں کے انسائیکلوپیڈیا ہیں۔" حبیب اللہ آہستہ سے ہنسا۔

"تمھارا مشغلہ کیا ہے حبیب میاں، کھیتی باڑی؟" میں نے پوچھا۔

"تھوڑے سے کھیت تو ہیں لیکن گزارے کے لیے ناکافی ہیں۔ میں اسکول ٹیچر ہوں۔"

میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔

"زمین کا ایک خطہ آپ کے دادا نے وقف کر دیا تھا تعلیم کی ترویج کے لیے۔ گاؤں والوں نے مل کر اسکول قائم کیا، حکومت نے اسے اپنا لیا۔ میں نے گریجویشن کر لیا تھا، سو یہیں ملازمت مل گئی۔"

"یہ اچھا ہوا۔ بابا کو تمھاری ضرورت بھی ہے۔"

حویلی کے دروازے پر پہنچ کر حبیب اللہ نے بڑے دروازے کا تالا کھولا اور ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔

"اس وقت میں ساری بتیاں بجھا دیتا ہوں، صرف باہر کا بلب ساری رات جلتا رہتا ہے۔"

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔

اندر پہنچ کر میں نے حبیب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک عجیب سحر سا مجھ پر طاری ہو رہا تھا۔ در و دیوار جیسے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ابو کی ڈائری کے الفاظ آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔ مجھے لگا کہ کچھ سائے سے میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ حبیب اللہ کے ہاتھ پر میرے ہاتھ کا دباؤ بڑھ گیا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں شاہد بھائی؟" اس نے تشویش سے مجھ سے پوچھا۔

اس کے ہاتھ پر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے ساتھ یہاں رات گزار سکتا ہوں۔"

"نہیں، اعتراض کی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں اکیلا ہی رہنا چاہوں گا یہاں...... کم از کم آج کی رات۔"

وہ شاید میرے محسوسات کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور دروازے کے قریب رکھا ہوا میرا بیگ لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھا۔

"یہ آپ کے دادا کا کمرہ ہے، بڑے سرکار کا۔ مجھے لگتا ہے آپ یہیں رات گزارنا چاہیں گے۔" بستر کی چادر ہر ہفتے بدل دی جاتی ہے۔" حبیب اللہ نے کہا۔

حبیب اللہ کے جانے کے بعد میں نے ایک سرے سے مکان کو دیکھنا شروع کیا۔ بڑا ہال نما کمرہ، قالین سے مزین۔ نشست کے لیے کرسیاں، تخت پر گاؤ تکیے۔ ملحقہ سونے والا حصہ، دوسرا کمرہ کتابوں سے بھرا ہوا، اردو، انگریزی، فارسی کی ضخیم کتابیں، اساتذہ کے دواوین، داستانوں پر مشتمل کتابیں، بعض اتنی

بوسیدہ کہ ورق الٹنے میں کاغذ جھڑنے لگتا...... میں ان کمروں میں چکراتے چکراتے تھک گیا تو بڑے سرکار کے کمرے میں آ گیا۔ ایک طرف کھڑا ہو کر جائزہ لینے لگا تو میرے دونوں ہاتھ ادب سے بندھ سے گئے، جیسے دادا سامنے بیٹھے ہوں اور میں جواب طلبی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔

میں بھی ایک اکھڑا ہوا درخت ہی تو ہوں، اپنے جڑ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ کہتے ہیں اکھڑا ہوا درخت دوبارہ جڑ نہیں پکڑتا، ساری عمر لڑھکتا ہی رہتا ہے۔

نہ جانے کب میں بستر پر بیٹھا، لیٹا اور پھر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو آنگن میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ میں تیار ہو کر نکلا تو تو حبیب اللہ موجود تھا۔

''ارے حبیب میاں، تم اندر کیوں نہیں آئے؟ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''میں نے آپ کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہیں سمجھا۔ آپ کے لیے یہیں ناشتہ لے آؤں؟''

''نہیں، میں چل رہا ہوں تمھارے ساتھ۔ چائے کی شدید طلب ہو رہی ہے۔ بابا سے باتیں کروں گا۔ لیکن پہلے مجھے قبرستان لے چلو۔''

آبائی قبرستان زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن قبریں بہت ترتیب سے تھیں۔ کچھ قبریں کچی تھیں، کچھ پختہ۔ حبیب اللہ سب کا تعارف کرواتا۔ دادا دادی کی قبر کے سامنے میں بہت دیر کھڑا رہا۔

واپس آیا تو کل ہی کی طرح وہ اندر چلا گیا اور بابا کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں بابا کو سلام کر کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک اسٹول پر حبیب اللہ نے پراٹھا، آملیٹ، سوجی کا حلوہ لا کر رکھ دیا۔ اس نے بتایا کہ دادا فجر کے وقت ہی ناشتہ کر لیتے ہیں۔ میں نے جی بھر کے سب چیزیں کھائیں تو چائے آ گئی۔

بابا مجھے مسکرا مسکرا کر دیکھتے رہے۔

''بہت دیر ہو گئی شاہد میاں آپ کے آنے میں۔ آپ اپنے دادا سے نہیں مل سکے۔ لیکن یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ جب اس گاؤں کے لوگ دوسری جگہ جا بسے تو آپ یہاں کیا کرتے۔ اور پھر رہ بھی کیا گیا تھا آپ کے لیے یہاں......''

''جی بابا۔ اب بتایئے۔'' میں نے چائے پیتے ہوئے پوچھا'' جب میرے بہت سارے رشتے داروں کے مکان کھنڈر بن گئے تو میری حویلی کیسے محفوظ رہ گئی؟''

بابا نے سیدھے بیٹھنے کی کوشش کی تو حبیب اللہ نے آگے بڑھ کر ان کی پشت سے تکیہ لگا دیا اور ان کے پائنتی بیٹھ گیا۔

''ملک تو آزاد ہوا شاہد میاں، لیکن میرے گاؤں کو ویران کر گیا۔ کانگریسی حکومت نے اپنے منشور کے مطابق زمین داریاں بحق سرکار ضبط کر لیں۔ اس گاؤں میں بڑے بڑے زمین دار تھے، سب آپ

کے رشتہ دار ہی تھے، بڑے سرکار کے علاوہ سب نے یہاں اپنی بساط لپیٹی اور پاکستان ہجرت کر گئے، اکثر کراچی جا بسے یا بڑے شہروں کا رخ کیا اور پھر پلٹ کر بھی ادھر نہ دیکھا۔ آپ کے نانا تو پہلے ہی انگلستان جا چکے تھے، وہ زیادہ دور اندیش تھے۔ بڑے سرکار کے دور کے رشتہ داروں میں تھے۔ چھوٹے سرکار کی اعلیٰ تعلیم کے لیے بڑے سرکار نے ان سے گفت وشنید کی اور ان کے پاس ہی قیام کے لیے بھیج دیا۔ مجھ سے لپٹ کر رو پڑے تھے چھوٹے سرکار......'' ان کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر کہنے لگے۔

''تین سال بعد چھوٹے سرکار چند دنوں کے لیے آئے۔ ان کی تعلیم ابھی مکمل نہ ہوئی تھی۔ ایک دن بڑے سرکار کے پاس حاضر ہوئے اور...... اور اپنی پسند کی شادی کی اجازت چاہی۔ پھر تو قیامت ہی آگئی شاہد میاں۔ میں نے اتنے غصّے میں بڑے سرکار کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے چھوٹے سرکار کو عاق کر دیا۔''

بابا پھر خاموش ہو گئے۔ کافی دیر خاموش رہے۔

''انھوں نے چھوٹے سرکار کو گھر سے چلے جانے کو کہا اور وہ خاموشی سے چلے گئے۔ بڑے سرکار نے بڑی بیگم کے گزر جانے کے بعد، بہت دباؤ کے باوجود دوسری شادی نہیں کی تھی۔ چھوٹے سرکار کے لیے انھوں نے بہت سے خواب دیکھے ہوں گے۔ شادی کی بات سُن کر انھیں بہت بڑا جھٹکا لگا تھا۔ اپنے غصّے میں وہ حق بجانب تھے لیکن عاق کر دینے کی بات بھی مناسب نہیں تھی۔ اس پر بات ہو سکتی تھی لیکن......''

کمرے کی فضا سوگوار تھی۔ حبیب اللہ اپنے دادا کے پائنتی بیٹھا تھا اور دھیرے دھیرے ان کے پاؤں داب رہا تھا۔

''چھوٹے سرکار چلے گئے۔ خاموشی سے چلے گئے۔ بڑے سرکار جس کیفیت سے گزر رہے تھے مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ ان کے دوستوں کی محفلیں اب بھی جمتی تھیں لیکن بڑے سرکار کی بذلہ سنجی رخصت ہو چکی تھی۔ کئی سال گزر گئے۔ ایک بار شاہ صدر الدین، جن کے سرکار مرید تھے، تشریف لائے، وہ آتے رہتے تھے اور بڑے سرکار ان کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ان کی اُداسی کی وجہ سنی تو مسکرائے، بڑے سرکار کو مخاطب کیا کہ میاں یہ سب تو دنیاوی باتیں ہیں۔ عاق کرنے کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں، عاق کرنے سے نہ رشتہ ختم ہوتا ہے نہ وراثت، یہ اللہ کے قانون کے منافی ہے۔ بڑے سرکار نے بڑی وضاحت سے ان سے بات کی۔ ان کی طبیعت ہلکی ہوگئی تھی۔ اب انھیں اپنی بات پر پچھتاوا ہونے لگا تھا۔ کئی دن کی کوششوں کے بعد انھوں نے ایک طویل خط لکھا چھوٹے سرکار کو۔ مجھے بھی اس کے مندرجات سے آگاہ کیا۔ میں نے ہی وہ خط ڈاک کے سپرد کیا تھا۔''

بابا کی سانس پھول رہی تھی۔ حبیب اللہ نے انھیں ایک گھونٹ پانی پلایا۔ انھوں نے میری طرف دیکھا، میں بھی انھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں نے وہ خط پڑھا ہے بابا۔'' میں نے کہا، ''لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ابوان کی طرف سے یا آپ کی طرف سے کچھ سننے کے منتظر رہتے تھے لیکن ہر روز انھیں مایوسی ہوتی تھی۔ وہ سرطان کے موذی مرض میں مبتلا ہو چکے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ دادا کو اس کی خبر ہو۔ اپنی دانست میں انھوں نے دادا کو بہت بڑے دکھ سے دوچار کیا تھا، وہ انھیں مزید دکھ نہیں دینا چاہتے تھے۔ انھیں دادا سے بچھڑنے کا بے حد دکھ تھا، زندگی کے آخری لمحات انھوں نے بڑی اذیت میں گزارے۔''

حبیب اللہ نے میری طرف دیکھا، پھر چادر بابا کے پاؤں پر پھیلا دیے اور کھڑا ہو گیا۔

''میں چائے لاتا ہوں آپ کے لیے۔'' وہ اندر چلا گیا۔

''گاؤں کے لوگ آپ سے ملنے آئیں گے شاہد میاں۔ ان میں سے اکثر لوگ بڑے سرکار کے احسانوں سے لدے ہوئے ہیں۔ بڑے سرکار سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے، انھوں نے کبھی کسی پر زیادتی نہیں کی۔ ان کی زندگی کے آخری لمحات بھی کچھ خوش کن نہیں تھے۔ شاید آپ نہ سمجھیں کہ اکلوتی اولاد، جس کے لیے انھوں نے اپنی تمام خوشیوں سے منھ موڑے رکھا، کے بچھڑنے کا، بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے علاحدہ کرنے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔''

میں نے بابا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔

''اپنی دانست میں خط لکھ کر انھوں نے چھوٹے سرکار کو منانے کی کوشش کی تھی۔ عاق کرنے کے الفاظ واپس لے لیے تھے لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ......''

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے لیکن چہرے کے تاثرات کو نہ چھپا سکا۔

''اچھا ہوا انھیں خبر نہ ہوئی، جانے کیا بیتتی ان پر۔'' بابا نے آہستہ سے کہا۔

میں حویلی میں چلا آیا۔ حبیب اللہ میرے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا، شاید اسی طرح، جیسے بڑے سرکار اور منشی محبوب الٰہی رہتے ہوں گے۔ ابو نے اپنی ڈائری میں ایسا ہی نقشہ کھینچا تھا۔

ملاقات کے لیے آنے والوں سے حبیب اللہ تعارف کرواتا اور میں ان سے بغل گیر ہو کر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ وہ بڑے سرکار کے گن گاتے، میرے احوال پوچھتے، پھر گلے مل کر چلے جاتے، کوئی اپنے گھر کھانے کے لیے بلاتا، کوئی بڑی لجاجت سے کچھ تحفے تحائف پیش کرتا اور میں ان کی خوشی کی خاطر اسے قبول کر لیتا۔ میرا زیادہ تر وقت دادا کے کاغذات اُلٹنے پلٹنے میں گزر جاتے یا پھر منشی محبوب الٰہی کے پاس، ان کی باتیں سنتے ہوئے۔

میری واپسی کے دن قریب آنے لگے تو ایک روز بابا نے پوچھا:

''شاہد میاں، میں نے حویلی کی دیکھ بھال میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ کو کوئی کمی تو نہیں نظر آئی نا؟''

''کیسی باتیں کرتے ہیں بابا...... میں خود بھی یہاں ہوتا تو ایسی دیکھ بھال نہ کر پاتا۔ اگر آپ

یہاں نہ ہوتے تو یہ حویلی بھی دوسری حویلیوں کی طرح کھنڈر بن چکی ہوتی۔ دادا کے وقت میں تو بجلی نہیں آئی ہوگی، ابو نے ڈائری میں کیروسین لیمپ وغیرہ کا ذکر کیا ہے، یہ تو آپ نے ہی کروایا ہوگا۔''

''ہاں، بجلی میں نے ہی لگوائی تھی۔ گاؤں میں بجلی نے سب سے پہلے بڑی حویلی کو منور کیا۔ ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔''

بابا کے چہرے پر روشنی بکھر گئی۔ پھر وہ کسی گہری سوچ میں چلے گئے۔

دادا کے کاغذات میں، میں نے کچھ ایسی چیزیں دیکھی تھیں جو مجھے اُلجھائے ہوئے تھیں۔ میں بابا سے اس پر گفتگو کرنا چاہتا تھا، لیکن ایک جھجک سی تھی کہ کہیں اس میں کسی ناگواری کا پہلو نہ نکل آئے۔

''زمین داری چھن جانے کا بڑے سرکار کو دکھ تو تھا لیکن جو کچھ بچا تھا وہ ناکافی بھی نہیں تھا۔ باغات حکومت نے اپنی تحویل میں نہیں لیے تھے لیکن زمانہ بدل چکا تھا، ہماری گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تھی، دوسری طاقتیں اپنے پاؤں پھیلا رہی تھیں اور پھر بڑے سرکار کی صحت بھی بہت گر چکی تھی۔ جب وہ گئے تو......''

بابا کی آواز حلق میں اٹکنے لگی، انھوں نے کئی بار کھانس کر اپنا گلا صاف کیا۔

''کچھ زمینیں کاشت کی بھی تھیں جنھیں حکومتی پالیسی کی وجہ سے تحویل میں نہ لیا جا سکا تھا۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ہاں۔ اپنی زندگی میں بڑے سرکار نے......''

''بابا، میرے جانے کا وقت قریب آ رہا ہے۔'' میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''میں چاہتا ہوں اس حویلی کو...... حویلی تو اب تک کسٹوڈین سے بچی ہوئی ہے نا؟''

''ہاں بیٹے، اب تک تو بچی ہوئی ہے۔'' بابا نے میری طرف دیکھا۔

''آپ بتائیں بابا، اس کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا شاہد میاں۔ یہ آپ کے خاندان کی سب سے اہم چیز ہے۔ آپ وارث ہیں، واحد وارث۔ لیکن آپ انگلستان میں مقیم ہیں۔ ظاہر ہے یہاں نہیں رہیں گے۔ عقل مندی کا تقاضا ہے کہ اسے یا تو فروخت کر دیا جائے یا......'' بابا کی آواز پھر گلے میں پھنسنے لگی، ''یا تو اسے فروخت کر دیا جائے یا پھر......'' وہ خاموش ہو گئے۔

''خود کو سنبھالیے بابا۔ ہمارے خاندانی معاملات آپ ہی نبٹاتے رہے ہیں۔ حویلی کے بارے میں بھی آپ ہی کچھ فیصلہ کریں۔''

بابا نے میری طرف دیکھا، ان کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔

''بابا، مجھے ان معاملات سے کوئی غرض نہیں۔ میں اپنے باپ دادا کی سرزمین دیکھنا چاہتا تھا۔ امی بھی چاہتی تھیں کہ ایک بار میں یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں۔ امی بہت معاملہ فہم ہیں بابا۔ ابو کے بعد

سب کچھ امی نے سنبھال لیا۔ انھوں نے وہیں تعلیم حاصل کی تھی، وہیں پلی بڑھی تھیں، لیکن مغربیت کبھی ان پر سوار نہ ہوئی۔ ان کے گھر کا ماحول مشرقی ہی رہا تھا۔ انھیں ہمیشہ یہ دکھ رہا کہ دادا نے انھیں قبول نہیں کیا تھا۔ دادا کے آخری خط ملنے کے باوجود وہ دادا کے پاس آنے کی ہمت نہ کرسکیں۔ وہ مجھ سے ہمیشہ ایسی باتیں کرتیں جن سے نہ دادا کی زیادتی کا کوئی تاثر ملتا نہ ابو کی نافرمانی کا کوئی پہلو نکلتا۔"

میں نے بابا کی طرف دیکھا، انھوں نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ میری باتیں سمجھ رہے ہوں۔

"ہاں شاہد میاں، مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔"

"زمین اور حویلی کے معاملات سے مجھے کوئی غرض نہیں بابا۔ لیکن اگر کوئی قانونی ضرورت ہو تو میں یہاں موجود ہوں۔ میں تو ایک دو دن میں چلا جاؤں گا اس لیے ایسی باتیں کر رہا ہوں۔"

"فیصلہ تو آپ کو کرنا ہے شاہد میاں، میں صرف مشورہ دے سکتا ہوں۔ چیزیں تو آپ کی ہیں نا!"

"کوئی چیز میری نہیں ہے بابا۔ صرف آپ لوگ میرے ہیں۔ میں وہاں خود کو بہت تنہا محسوس کرتا ہوں بابا۔ میں اور میری امی...... یہی خاندان ہے میرا۔"

میری آواز بھی رندھ گئی۔ حبیب اللہ اپنے دادا کی پائنتی سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور مجھے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ برداشت کرنے کے باوجود میں سسک پڑا۔

"تنہائی کے بہت بڑے عذاب سے میں دوچار ہوں بابا۔ ہر طرح کی معاشی فراغت کے باوجود میں تہی دامن ہوں۔ کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔" میں نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

"زمانہ بیٹے...... زمانہ...... یہ عجیب عجیب رنگ دکھاتا ہے۔ وقت کروٹ لیتا ہے تو سب کچھ تلپٹ ہو جاتا ہے۔ ساری زندگی انسان جدوجہد میں مصروف رہتا ہے۔ کبھی اس جدوجہد کا کوئی مقصد ہوتا ہے اور کبھی کوئی سمت متعین نہیں ہوتی...... بس لڑتا رہتا ہے......" بابا کی آواز سنائی دی۔

اپنے طور پر وہ مجھے دلاسا دے رہے تھے۔

میرے پاس وقت کم تھا۔ سارا دن ملاقات کے لیے آنے والوں کی محبت بھری باتوں سے سرشار ہوتا اور رات کا زیادہ تر وقت دادا کے کاغذات کو سمجھنے میں گزر جاتا۔ واپسی سے ایک روز پہلے میں بابا کے پاس بیٹھا تو حبیب اللہ کو بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

"بابا، میں نے سارے کاغذات دیکھے ہیں دادا کے۔ میری سمجھ میں زیادہ باتیں نہ آسکیں لیکن دو فائلیں ملیں جو مقدمے کی کارروائی پر مبنی ہیں۔ دو باغات پر غیر قانونی قبضہ ہو چکا تھا جسے واگزار کرانے کی دادا کوشش کر رہے تھے لیکن اسے منطقی انجام تک پہنچانے میں ان کی زندگی نے ساتھ نہ دیا۔ دونوں باغات حبیب میاں کے سپرد کرنا چاہتا ہوں......"

بابا نے ہاتھ اٹھا کر آگے کچھ کہنے سے روک دیا۔

''بیٹا، تمھاری محبت اپنی جگہ۔ لیکن وہ لوگ بہت طاقتور ہیں۔ وہ اپنے قبضے سے کبھی دستبردار نہیں ہوں گے۔ پھر یہ کہ مقدمہ لڑنے کے لیے ہمارے پاس وسائل نہیں۔ حبیب میاں اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔''

''بابا آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ سب کچھ میں خود کروں گا۔ میں اپنی حکومت کے متعلقہ اداروں سے تصدیق کرا کے سب کچھ حبیب میاں کے نام کروں گا۔ ہمارا سفارت خانہ اپنے طور پر یہاں کی حکومت سے گفت وشنید کرے گا اور جب تک یہ باغات قبضے سے باجگزار نہیں ہو جاتے میں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ آپ کی حکومت خود اسے باجگزار کرا کے حبیب میاں کے سپرد کرے گی۔''

بابا نے لمبی سانس لی۔

''بابا یہ میرا وعدہ ہے۔''

''نہیں بیٹا، آپ کوشش کرنے کی خواہش رکھتے ہیں تو ضرور کوشش کریں، لیکن وعدہ نہ کریں۔ اگر کام نہ ہو سکا تو خواہ مخواہ شرمندگی محسوس کریں گے۔''

''ایسا نہیں ہوگا بابا۔ مجھے تو ایسا لگے گا کہ اپنے خاندان کے لیے کچھ کرنے کے قابل ہوا۔''

بابا نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ ''اللہ آپ کو حوصلہ دے بیٹا اور طمانیت بخشے۔''

میں نے حبیب اللہ کی طرف دیکھا:

''حبیب میاں، چائے کی خواہش ہو رہی ہے۔''

حبیب اللہ اندر چلا گیا اور کچھ دیر بعد چائے لے کر آ گیا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے کہا، ''چالیس بیگھے زمین...... میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس سے اچھی گزر بسر ہو سکتی ہے۔ وہ تو دادا نے......''

حبیب اللہ نے کچھ کہنے کے لیے منھ کھولا تو بابا نے آنکھوں کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا، پھر بھی میں نے گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

''حویلی کو بیچنا، میں سمجھتا ہوں مناسب نہیں ہوگا۔ حبیب میاں جو مناسب سمجھیں کریں۔ لیکن آپ کا مشورہ ضروری ہوگا۔ چاہیں تو دادا کے نام سے اس میں اسکول قائم کر دیں یا کوئی تکنیکی ادارہ جہاں تربیت حاصل کر کے لوگوں کو روزگار مل سکے یا اور کوئی بہتر صورت ہو تو............''

''یہ بہت صائب رائے ہے شاہد میاں۔ اس سے بہتر صورت اور کیا ہو سکتی ہے۔ بڑے سرکار کا نام زندہ رہے گا اور وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

''میں ابتدا میں اس کے لیے کچھ فنڈ کا بھی انتظام کر دوں گا بابا۔ میری حکومت بھی مدد کرے گی، مجھے یقین ہے۔ پھر اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کی کوشش کریں۔'' میں نے حبیب اللہ کی طرف دیکھا۔

اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ بابا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''آپ بہت اچھے ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں شاہد میاں۔ بہت اچھی سوچ رکھتے ہیں۔''

اگلے روز میری واپسی تھی۔ بابا دیر تک مجھے سینے سے لگائے رہے۔ خود بھی روئے اور مجھے بھی رلایا۔

اسی طرح انھوں نے اپنے چھوٹے سرکار کو رخصت کیا ہوگا!

باہر بہت سے لوگ جمع تھے، سب گلے ملے، ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے رخصت کیا۔ حبیب اللہ نے رکشا منگوالیا تھا۔ یہ وہی رکشے والا تھا جو مجھے یہاں لایا تھا، اس کی آنکھوں نے بھی اپنائیت کا تاثر دیا۔ حبیب اللہ اسٹیشن تک میرے ساتھ ہی آیا۔ ٹرین آنے میں ابھی دیر تھی۔ مجھے لگا کہ حبیب اللہ کچھ کہنا چاہ رہا ہے۔

''کیا بات ہے حبیب میاں، کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟''

''دراصل دادا نہیں چاہتے تھے کہ یہ بات آپ کو معلوم ہو۔ آپ کا اندازہ صحیح ہے کہ چالیس بیگھہ زمین اچھی گزر بسر کے لیے کافی ہوتی ہیں بلکہ خوش حال زندگی بسر ہو سکتی ہے۔ بڑے سرکار نے کاشت کاری کی زمین دادا کے نام لکھ دی تھی۔ لیکن...... لیکن آپ نے حویلی کی چمک دمک تو دیکھی نا! بالکل ویسی ہی جیسے بڑے سرکار کے وقت میں رہی ہوگی!''

''ہاں حبیب میاں۔ بالکل آباد گھروں جیسی۔''

''دادا نے حویلی کو قائم رکھنے کے لیے سب کچھ اس پر لگا دیا۔ ساری زمین بک چکی ہے شاہد بھائی۔''

میرا دماغ سنسنا رہا تھا، میں نے حبیب اللہ کو غور سے دیکھا:

''اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ آپ اس حویلی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر جائیں۔ اب ان میں حویلی میں لگانے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مجھ میں اس کی استطاعت نہیں۔''

وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا لیکن میں کچھ بھی نہ سن پا رہا تھا۔

''اس حویلی کے لیے انھوں نے ساری زمین بیچ دی؟'' میں نے جیسے خود سے کہا۔

''جی شاہد بھائی...... وہ ساری زمین......''

حبیب اللہ نے بازو سے پکڑ کر مجھے ہلایا تو مجھے پتہ چلا کہ ٹرین آ کر رکنے والی ہے۔ اس نے مجھے لپٹا لیا اور دیر تک چمٹا رہا۔

مجھے یاد آیا کہ ٹرین تو یہاں بس ایک منٹ کے لیے ٹھہرتی ہے۔!!

☆☆☆

مری رات کھو گئی ہے ترے جاگتے بدن میں

● راجیو پرکاش ساحر

برف سے ڈھکے پہاڑ اس حرکت کو محسوس کر کے کچھ بے چین ہوئے جا رہے تھے، جو اس کے جسم کی پرتوں کے درمیان ابھرے کی قبا اوڑھے گہری خاموش وادی میں، اب جب تب ہونے لگی تھی مگر اس حرکت کے نمایاں ہونے سے پہلے کا منظر نامہ کچھ اور ہی تھا۔ عمرِ رواں اس کے احساس کی ڈھلانوں سے لڑھکتی ڈھلکتی وادی میں کسی اندھے غار میں کھوتی جا رہی تھی۔

سرد شبنمی مبہم ہریالی سے ڈھکی وادی کے جنگلوں میں بہت سی یادیں، اُمیدیں، حسرتیں یہاں وہاں بھٹک کر ایک ایک کر کے دم توڑ رہی تھیں۔ کرنوں کو وادی میں اُترنے سے روکتے اونچے گھنے سایہ دار اشجار کی شاخوں پر کئی شاہین گھات لگائے بیٹھے تھے اور جہاں کسی نرم نرم نازک لمحے کو دیکھتے، جھپٹ لیتے اور چٹ کر جاتے۔ سفید کوہساروں سے شدید ٹھنڈ اس کے اندر اُتر کر برفانی یگ کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ بلندیوں کا گھمنڈ توڑتی برفیلی پینی چوٹیوں نے علمِ تسخیر کی بدولت مبذول کر رکھا تھا اُسے۔ ان چوٹیوں کی قدیم سنگ مرمری سفیدیوں اور خاموشیوں کے چمکیلے امتزاج نے اسے ایسے زندان میں قید کر رکھا تھا جس کی سلاخیں غائب تھیں۔ وہ ہل ڈول بھی نہیں سکتا تھا اور وہ کچھ سوچ سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔

مگر موسموں کا کیا ہے؟ موسم تو بدلتے رہتے ہیں۔ اکثر سناٹوں سے طوفان نکل آتے ہیں۔ تو پھر کیا س کے اندر کوئی ناراض موسم آ گیا تھا جو یہ حرکت ہو گئی۔

اس سال کی شروعات سب سے گرم سال کے طور پر ہو رہی تھی۔ جہاں تہاں برف پگھلنے لگی تھی اور

پتھریلی زمین نظر آرہی تھی۔ دور دور تک پھیلے ہوئے پردوں کی اونچی چہار دیواریوں کے بیچ جو چینچل ریکھا ہوتی ہے نا، وہی ہوتی ہے زلزلوں کی وجہ۔ ایک انومان کے مطابق اس کے اعصابی نظام میں دو جنسی پلیٹیں چار کروڑ سال سے موجود تھیں۔ یہ پلیٹیں باری باری سے ایکٹیویٹ ہو جاتی تھیں۔ ان میں سے ایک پلیٹ سرد ستی کی علامت تھی تو دوسری پلیٹ گرما گرم سیکسوئلی موٹیویٹیڈ تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جب سرد سُست پلیٹ جنسی ہیجان کا شکار پلیٹ پر سوار ہو جاتی تھی تو اس کے اعصابی نظام کے برق ربا ریشے ہیجان، لاچار ہو جاتے تھے۔ مگر جب سیکسوئلی موٹیویٹیڈ پلیٹ سرد نامرد پلیٹ پر سوار ہو جاتی تھی تو اعصابی نظام کے یہ برق رُبا ریشے اس کے ذہن کے بیچوں بیچ سے ایٹمی رفتار سے اس کی جانگھوں کے بیچوں بیچ پیٹ کے دو اُنگل نیچے اتھل پتھل مچا دیتے تھے اور......

زلزلوں کے وقت جب پلیٹیں آپس میں ٹکراتی ہیں تب ان کے کمپن سے جھٹکے محسوس ہوتے ہیں، جھٹکے کب تک محسوس ہوتے رہیں گے یہ کہنا مشکل ہوتا ہے۔

جب اس کی جسمانی ضرورتوں کی وجہ سے اس کے جنسی حوالے سے سرگرم پلیٹ سرد سُست پلیٹ پر چڑھ جاتی تھی تو اس کے بدن میں زلزلہ آ جاتا تھا۔ بہت دیر تک ترنگیں اُٹھتی رہتی تھیں۔ جھٹکے محسوس ہوتے رہتے تھے۔ پہلے تیز تیز پھر ہلکے ہلکے۔ اس دن ہوا تو کچھ ضرور تھا جو یہ حرکت ہوگئی اور اس کے بدن کا موسم ناراض اور خراب ہو گیا۔ موسم کا بگڑنا، اندھڑ، وادی کا چٹانوں کے ٹکڑوں سے روند دیا جانا، تیز ہوائیں، بارش، موسلا دھار بارش، سرد شہاب ثاقب کے گولے جو ٹھنڈے مگر گرم ہیں، گرم مگر ٹھنڈے ہیں۔

یہ سب کیا کوئی فطری حقیقت ہے یا کوئی فطری چھلاوا یا پھر کہکشاؤں میں الجھی لامحدود خلا کی روداد۔ کیا اس کے اور کسی کے بیچ واقعی کوئی خلا تھی؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی خلا نہیں بلکہ چاہتوں کی سطح پر اس کے اور کسی کے درمیاں برقی مقناطیسی نخلستان جہاں پر جنون کی مختلف صورتوں کے اضطراب ہوں۔ جہاں پر اس کے اور کسی کے جسم کی ساری سرحدیں توڑ کر برہنہ ایک دوجے میں سما جاتے ہیں۔ کسی کی کومل کایا اس کے فولادی جسم سے لپٹ کر شعلہ بن جاتی ہو اور اس کے اور کسی کے روئیں چنگاریاں بن کر ایک دوجے کے تن من پر رینگ جاتے ہوں۔ اُف، یہ نرماہٹ، جب ایک دوجے کے ہاتھوں کے لمس خواہشوں کو بدمست کر دیتے ہوں۔

کسی کے لبوں کی نرمی سے بھیگی یہ وہ برقی مقناطیسی جسمانی وادی تھی جہاں اس کے کسی کے سنگ جنسی ملن سے حرارت پیدا ہو سکتی تھی۔ شاید ایسے ہی کسی مدھوش موسم کی تمناؤں سے نکلنے والی طبیعاتی موجوں نے برفیلے پہاڑوں پر صدیوں سے جمے گلیشیروں میں ہلچل پیدا کر دی تھی اور یہی ہلچل اس حرکت کی باعث بن گئی تھی۔

اس کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ نیم اندھیارے کمرے میں اس کی آنکھیں دوشیزہ کے حسن کو

اپلک نہار رہی تھیں۔ دوشیزہ کی دلکش مسکان اسے اُکسا رہی تھی۔ دوشیزہ کا ہلکا گلابی پن لیے گورا بدن کے پیراہن کو اُتار پھینکنے کے لیے جیسے کسمسا رہا تھا۔ دوشیزہ کی لمبی سڈول ننگی جانگھیں رنگ برنگی منی اسکرٹ کو لاپرواہی سے لانگھ رہی تھیں۔ اب اس سے اور برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ تپتی آنچ میں وہ اور اس کا کمرہ گرما اٹھا تھا۔ بس اب وہ چاہتا تھا کہ دوشیزہ فوراً اس سے کوآپریٹ کرے اور وہ دوشیزہ کو پا لے اور اپنی وہ پیاس بجھا لے جو وہ بجھا نہیں پا رہا تھا تمام کوششوں کے باوجود۔ وہ دوشیزہ کو گھورے جا رہا تھا مگر دوشیزہ تھی کہ اپنی طرف سے نہ کچھ کہہ رہی تھی نہ کچھ کر رہی تھی بس اسے دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی، جیسے کہہ رہی ہو۔

''کرلو تمھیں جو کرنا ہے، پر کیا کر پاؤ گے تم؟''

تناؤ سے جیسے اس کا سارا جسم ہی تن گیا، اس کے ذہن میں کئی برق رفتار ریشے بجلی کی تیزی سے اس کی گہرائیوں میں دوڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے خود کو ہی کس کے جکڑ لیا۔ مگر دوشیزہ پر اس کا کوئی اثر نہیں دِکھ رہا تھا۔ وہ تو اپنے دلفریب حسن کی نمائش سے اسے رجھا رہی تھی، اُکسا رہی تھی، اور شاید ستا بھی رہی تھی۔ ''بس، بس اب اور نہیں سہا جاتا''۔ اس نے کس کے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ سانسیں تیز اور تیز اور اُکھڑی اُکھڑی بھی، ہاتھوں کا کساو بڑھتا جا رہا تھا۔ اور پھر جیسے ایک جوالامکھی پھٹ پڑا، لاوا بہہ چلا، تنی نسیں ڈھیلی پڑ گئیں، ذہن کے دھماکے شانت ہو گئے۔ سانسیں جیسے تھک کر اپنی عمومی لے میں آنے لگیں۔ کمرے کی، اس کے بدن کی آگ جیسے کہیں اچانک غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ جیسے کمرے کے کونوں میں چھپی ٹھنڈ آہستہ آہستہ نکل کر چاروں طرف پھیلنے لگی اور اسے ڈسنے لگی۔ وہ اب کانپنے لگا تھا۔ ایک ٹھنڈا بوسیدگی بھرا لزلزا گیلا گیلا خالی پن اس پر طاری ہونے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا اور پھر بکنے لگا۔ ہر بار یہی ہوتا ہے، ہاں ہر بار۔ دوشیزہ کے گورے مکھڑے پر اب بھی وہی مسکان تھی، اس کے کسے فراک سے اس کا ابھرتا جوبن اب بھی لاپرواہی سے جھانک رہا تھا۔

یکا یک اس کے اندر ایک ناراض موسم آ گیا۔ وہ اُتیجنا میں بھر اٹھا۔ غصے سے اس کے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے، آنکھیں پھیل گئیں وہ بڑبڑایا:

''سالی، حرامزادی، یہ بھی بے وفا نکلی، فاحشہ، رنڈی۔ فٹ پاتھ پر کوڑیوں کے دام بک رہی تھی، دام دے کر لایا تھا اس کو''۔

اس نے سوچا تھا مسل کر رکھ دے گا، ساری پیاس بجھا لے گا، مگر نہیں یہ بھی اوروں کی طرح دور دور سے اسے للچاتی رہی، سالی سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ یہ اس کا کمرہ ہے کوئی رین بسیرا نہیں کہ جس کا جب جی چاہے چلا آئے اور جب چاہے تب چلا جائے۔ بیشک، بیشک وہ اس دوشیزہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گٹر میں بہا دے گا، وہ کسی اور کو لے آئے گا، بازار میں مال کی کوئی کمی تھوڑے ہی ہے۔ وہ دوشیزہ کی طرف قاتلانہ انداز سے بڑھ چلا۔

ہر حجرے میں ایک چھت ہوتی ہے، اس کے حجرے میں بھی ایک چھت تھی، چھت تو دنیا کی بھی ہے، یہ یہاں سے وہاں پھیلا آکاش دنیا کی چھت ہی تو ہے۔ آسمان کے پاس بہت کچھ ہے سورج، چاند، ستارے، دن رات اور کئی موسم اور شاید ایک خدا بھی۔ مگر اس کے حجرے کی چھت ایک حد میں بندھی چٹکی بھر رات تھی، نہ کوئی چاند، نہ ستارے، بس ایک رُسوا پریشان موسم۔

ہر حجرے میں چار دیواریں ہوتی ہیں۔ اس کے حجرے میں بھی چار دیواریں تھیں مگر اوبڑ کھابڑ آڑی ترچھی، اسے چاروں طرف سے گھیرے تھیں یہ دیواریں۔ اس کے جسم کی پرتوں کے درمیان ٹھہرے میں چھپی وادی میں کہیں گہرے پاتال کی بنیاد پر ٹکی ہوئی تھیں یہ چاروں دیواریں۔ فرش، ہاں فرش بھی تو تھا اس کے کمرے میں۔ فرش بالکل سپاٹ سمتل، شفاف، اتنا شفاف کہ زمین میں نیچے میلوں نیچے جلتی دوزخ کی آگ نظر آہی جاتی تھی۔ اس کے حجرے کے فرش میں ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ مخمس تھا اور اس کے پانچویں کون سے نیچے ناگ لوک میں جلتے نرک کی آگ کی لپٹیں اس کے کمرے کی مغربی دیوار پر ڈراونی پرچھائیاں بناتی بگاڑتی رہتی تھیں۔ اس کے اندھیرے کمرے میں انھیں پرچھائیوں سے بچتی بچاتی ہلکی بیمار سی پیلی روشنی مغربی دیوار پر انکا چھپی کھیلتی رہتی تھیں۔ کمرے میں روشنی کا بس یہی ایک انتظام تھا۔ کمرے کی مشرقی دیوار پر ایک دروازہ تھا جو اوھک تر بند ہی رہتا تھا یہ دروازہ تب کھلتا تھا جب وہ اپنے کمرے کی رات سے نکل کر شہر کی رات میں گم ہو جانے کے لئے باہر آتا تھا۔

اس کے کمرے کی تیسری دیوار پر ایک چٹکا آئینہ لگا ہوا تھا جو جالوں اور دھول کی تہوں کے تلے سے دیکھنے کی کوشش کرتا کرتا تقریباً نابینا ہو چلا تھا۔ آئینے کو لپیٹے جالے کسی مکڑی کی دین نہیں تھے بلکہ اس کے ذہن سے نکل کر آئینے پر تو کیا پورے کمرے میں پھیل گئے تھے۔ نا ہی آئینے پر جمی دھول کسی صحرا سے اڑ کر آئی تھی۔ یہ دھول نہیں اسکی جھلستی سانسوں کی راکھ تھی۔ اس کے کمرے کی چوتھی دیوار اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ ہزاروں سال پہلے یہ دیوار اس کے جسم کی وادیوں میں کہیں کسی اندھیری غار میں کھسکتی چلی گئی تھی شاید زلزلوں کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہو۔

اس نے کبھی چوتھی دیوار کو واپس لانے یا ڈھونڈھنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی، اب چوتھی دیوار کی جگہ تاریکیوں کا ایک لمبا سلسلہ تھا۔

اس نے اپنے ٹوٹے آئینے میں خود کو ڈھونڈا، کچھ دیر کھوجنے پر دور کہیں ایک دھندلا سا عکس دکھائی دیا، ہاں وہی تو تھا ایک دم وہی۔ بے رونق چہرے پر کھردرے تاثر جھنجھلاہٹ بن کر پسرے ہوئے تھے۔ ہونٹ تشنگی سے پست تھے مگر اس کی آنکھوں میں غضب کی جستجو کی چنگاریاں جل بجھ رہی تھیں۔ وہ ایک جھٹکے سے مڑا کمرے کے باہر آ گیا اور شہر کی بھیڑ میں کھو گیا۔

وہ ایک شہر تمنا تھا جہاں جھلمل روشنیاں رات سے اٹکھیلیاں کرتی رہتی تھیں۔ جہاں پریاں تتلیوں

کے رنگوں والے رنگین پروں سے بجی دھجی یہاں وہاں اُڑتی پھرتی تھیں۔ انکا لبھاونا من موہک رنگ روپ دعوت دیتا تھا۔

"آؤ ہمیں بانہوں میں لے لو، ہمارے رُخساروں کا بوسہ لے لو"

ان کی کمسنی ہواؤں کو مست اور خوشگوار بنا دیتی تھیں۔ اپنی لہراتی زلفوں، بل کھاتے چتون اور یودن کی گگری سے چھلکتی رس کی بوندوں سے بے نیاز وہ سلگتی تپش کے مانند بدن کے ریزے ریزے میں اتر جاتی تھیں۔ اُمنگیں بیتاب اور اُتاولی ہو جاتی تھیں۔

روک نہیں پاتا تھا۔ وہ خود کو آگے بڑھ کر کسی پری کو اپنی مضبوط گرفت میں جکڑ لینا چاہتا تھا۔ اس کے حسن و جمال کو جی بھر کے پی جانا چاہتا تھا اپنی پیاس بجھانے کے لیے۔ وہ پیاس جو وہ ہزاروں لاکھوں کروڑوں سال سے اپنے جسم میں لیے گھوم رہا تھا۔ تب سے جب سے خدا نے اسے جنت سے نکال دیا۔ ہاں تبھی سے یہ واسنا بھٹکتی لالسا بن کر ایک جاگتے بدن کی ہوس میں اس کی راتوں کو جگائے رکھتی تھی۔

وہ پیاسا ایک بار پھر حُسن کے بازار میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ روز کی طرح آج بھی بڈھا تاجر دکان سجائے بیٹھا تھا، ایک سے بڑھ کر ایک نازنین، شوخ، چنچل، مرگ نینی، مادکتا کی دیویاں، سندریاں۔ رات کی اُجلی رونق میں بڈھے کا مال کیا خوب روشن ہو رہا تھا۔ لمبی، منجھولی، دبے قد کی، پتلی، دبلی، دوہرے بدن کی، گدرائی، گوری، سانولی، سیاہ فام، ایک سے بڑھ کر ایک خاموشی سے اپنے گراہک کی راہ دیکھتی ہوئی اپنے اپنے ابھاروں کو دکھاتی ہوئی بھی اور چھپاتی ہوئی بھی۔ واہ کیا بات تھی بوڑھے تاجر کے کاروبار کی۔

اور وہ بڈھا تاجر، مکار چالاک کہیں کا، چال باز، چہرے مہرے سے چلتا پرزہ، منہدی سے رنگے بال، گورا چہرہ جھریوں سے پٹا ہوا، تکونی سی چھوٹی چھوٹی دو چوکنی آنکھیں، موٹی پھولی ناک کے نیچے پھیلی سفید مونچھیں، ہونٹ تمباکو سے سنے ہوئے، پوپلے منہ میں دو چار دانت، مگر قد کاٹھی گٹھی ہوئی پھرتیلی، ایک نگاہ ہر دم اپنے دلفریب اسباب پر۔ مجال ہے ان کو کوئی ہاتھ بھی لگا پائے۔ بس دور ہی سے دیکھو۔ دام دو اور لے کر چلتے بنو۔ ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھتا کہ ان کو لے جانے والا کون ہے؟ کیسا ہے؟ کہاں کا ہے؟ ایک بار بھی نہیں سوچتا کہ ان کا خریدار ان کے ساتھ کیا کرے گا یا کچھ کر بھی پائے گا یا نہیں؟ خود غرض کمینہ اسے تو بس اپنے پیسوں سے مطلب ہے اور کچھ نہیں۔ کتنی بار وہ اس بڈھے تاجر سے سودا لے گیا ہے، یقیناً بڈھا اسے پہچاننے لگا ہوگا۔

اسے لگا بڈھا اسی کی طرف دیکھ رہا ہے، شاید بڈھا جانتا تھا کہ وہ خریداری کرے گا ضرور۔ مگر اس نے آج ٹھان لی تھی کہ وہ ٹھونک بجا کر سودا لے گا، کسی ایسی کو لے جائے گا جو ہر حال میں اس کی پیاس بجھا دے۔

اسے جانے کیوں لگا کہ جیسے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ موہنی صورت، سانولا رنگ، آدھی سوئی سوئی آنکھیں جیسے یونہی کچھ نہار رہی تھیں شاید اسے ہی۔ ہونٹوں پہ سجی ہوئی ہلکی سی مسکراہٹ، رخسار بھولی بھالی شرم و

حیا کی جھلملاہٹ لیے ہوئے۔ اسے دیکھنے بھر ہی سے وہ بہت سکون محسوس کرنے لگا۔ اس نو یوونا کے گدرائے جسم پر کسے سلیولیس بلاوز سے جھانکتی دو ٹھوس گولائیاں جن کے درمیان کی سنگ مرمریں تراشی ہوئی گھاٹی بربس اس کا دھیان اپنی اور کھینچ رہی تھیں۔ دو بھری بھری گلابی رنگت لیے بانہیں جیسے اسے پکار رہی تھیں۔

''آؤ، بانہوں میں لے لو مجھے، لے چلو مجھے اپنے ساتھ، میں رہوں گی تمھارے حجرے میں، تمھاری بن کر''۔

اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اس کے خوابوں کی منزل ہے جس کی اسے تلاش تھی۔ اس کی اُمنگیں ایک بار پھر مچلنے لگیں، اس کی سانسیں رفتہ رفتہ پھر گرم ہونے لگیں۔ اس نے اپنی جیب اپنے سوکھے ہونٹوں پر پھرائی۔ بڈھے تاجر کی طرف دیکھا، بڈھا تاجر اسے ترچھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بڈھے کا چہرہ سپاٹ تھا کوئی تاثر نہیں لیکن بڈھے کی آڑی ترچھی آنکھیں جیسے سب سمجھ رہی تھیں کہ وہ کیا چاہتا تھا۔

ممکن تھا کہ بڈھا اس کو پہچاننے لگا ہو۔ وہ گاہے گاہے بڈھے کے یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ کل ملا کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بڈھے تاجر کا ریگولر کسٹمر تھا اسے بڈھے کا یوں دیکھنا اچھا نہیں لگا۔ اسے شک ہوا کہ کہیں بڈھے کو اندازہ تو نہیں ہو گیا کہ وہ جن کو اس کے یہاں سے خرید کر لے جاتا ہے ان کا کیا حشر کر ڈالتا ہے؟

ٹھینگے سے بڈھے سے مطلب ہی کیا ہے۔ وہ کوئی مفت میں تو لے نہیں جاتا، دام دے کر لے جاتا ہے۔

اس نے ہاتھ کے اشارے سے بڈھے کو اپنی پسند بتائی۔ بڈھے نے دوٹوک دام بتائے، اس نے پیسے دیئے اور اپنی سانولی سلونی کو لیکر وہاں سے چل دیا۔ وہ خوش تھا، ایک نشیلی رنگین رات کی امید میں مگن، وہ اپنے حجرے کی طرف بڑھ چلا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے قدم اندر رکھ دیئے، وہ اس کے ساتھ تھی اندر گھپ اندھیرا تھا، کمرہ برفیلی سیلن کی بو سے ٹھٹھر رہا تھا، اس نے دروازہ بند کر لیا، سانولی سلونی کی نزدیکیاں اس کو بے چین کر رہی تھیں۔ اس کی سانسوں کی گرمی سے کمرے کی برف پگھلنے لگی، وہ کمرے کے کانچ نما فرش پر سانولی سلونی کے ساتھ کھڑا تھا، اچانک نیچے، بہت نیچے دفن دوزخ کی آنچ جواب تک ندارد تھی اس تک پہنچنے لگی، نرک کے دہکتے انگاروں کی دہک میں نہائے شیطانی سائے مغربی دیوار پر رقص کرنے لگے۔ کمرہ اب دھیرے دھیرے تپنے لگا تھا، وہ سانولی سلونی کو مغربی دیوار کے قریب آہستہ آہستہ لے آیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر اسے بغور نہارنے لگا۔ وہ بیحد خوبصورت لگ رہی تھی، دیوار پر شمشیروں کی طرح لپلپاتی لپٹیں اس کے سرخ گہنوں سے لدے بدن اور لال ساڑی پر کرنوں کی طرح بکھر بکھر جا رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے لپٹیں اسے لیل جانا چاہتی ہوں۔

اس کے جسم میں موجود جنسی پلیٹیں ہائپر ایکٹو ہو چلیں، اب وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد سانولی سلونی کے پیراہن سے نکل کر ایک جاگتا برہنہ جوان بدن اس تک آ جائے جس سے وہ اپنی جنسی آسودگی حاصل کرے

۔جانے اس کی یہ کیسی جنسی ہوس تھی جو صدیوں سے انگنت نسوانی جسموں کو روندنے کے بعد بھی نہیں بجھ پا رہی تھی۔خدا نے جنت سے برخاست کر کے اس جیسے بے شمار بھوکوں کو غلام بنا کر زمینوں پر کیوں دھکیل دیا تھا۔

اب اس کا صبر کا مادّہ ختم ہوتا جا رہا تھا، وہ چاہتا تھا سانولی سلونی کا جاگتا ننگا بدن اس کی باہنوں میں آ کر ٹوٹ جائے، وہ مشتاق نظروں سے سانولی سلونی کو گھورنے لگا اس کی آتُر تا بڑھتی جا رہی تھی مگر وہ ایک دم چپ چاپ کچھ خاموش سی کچھ لجائی سی پر یقیناً کبھی کبھی سی اسے دیکھ رہی تھی۔یکا یک اس کے اندر کا موسم بگڑنے لگا وہ غصے سے آگ بگولہ ہو اٹھا، پھر وہی ناٹک پھر وہی نخرہ وہ زبردستی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ضرورت پڑنے پر وہ جبراً اپنی حسرت پوری کرنے سے گریز کرنے والا بھی نہیں تھا، اسے ایک جاگتا بدن درکار تھا۔وہ اس پر آمادہ تھا کہ وہ سانولی سلونی سے ایک جاگتا برہنہ جسم حاصل کر کے ہی رہے گا چاہے اس کے لئے اس لاجونتی سانولی سلونی کے ٹکڑے ٹکڑے ہی کیوں نہ کرنے پڑیں۔

پھر اس نے واقعی لاجونتی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، مگر افسوس صد افسوس ٹکڑوں میں سے بھی اسے کوئی جاگتا بدن نہیں ملا، آخر وہ کون سا جاگتا بدن تھا جس کی اسے یگوں یگوں سے آرزو تھی اور جس کے لئے اس نے بے شمار نسوانی جسم تباہ و برباد کر ڈالے تھے۔پھر ایک بار ٹھنڈی تنہائی اس پر حاوی ہونے لگی وہ پھر سر جھکا کر سسکنے لگا ہر بار ہاں ہر بار یہی ہوتا ہے۔کیوں نہیں پوری ہو پاتی اس کی ایک مکمل جاگتے بدن کی حسرت، کیوں نہیں بجھ پاتی کبھی اس کی یہ ہیبت ناک پیاس، بے شک کوئی کمی ہے کہیں جو وہ مکمل نہیں ہو پا رہا ہے۔ اس نے اپنے اول جلول حجرے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا، چوتھی دیوار، ہاں چوتھی دیوار برسوں برس سے اپنی جگہ پر نہیں ہے، شاید اس لئے کہ وہ مکمل نہیں ہو پا رہا ہے۔اس کا حجرہ بے ڈول بے ڈھنگا ہے، اسے چوتھی دیوار کو واپس لانا ہوگا اپنی جگہ پر۔چاہے اس کے لئے اسے میلوں نیچے دھرتی میں دھد ھکتے دوزخ تک ہی کیوں نہ جانا پڑے۔وہ تیزی سے اٹھا اور چوتھی دیوار والی اندھیاری لامحدود لافانیت میں گم ہو گیا۔

زمینوں کے شکم میں گہرے کہیں بہت گہرے دھد ھکتے دوزخ کے پاتا کنڈوں میں اچانک شعلے بھڑک اٹھے اور آواز سے تیز رفتار سے کانچ کے چکنے فرش کو توڑتے ہوئے مغربی دیوار پر رقص کرتی لپٹوں کی پرچھائیوں کو حقیقت میں تبدیل کر گئے۔فٹ پاتھ پر اسٹریٹ لائٹ کے نیچے دلفریب الہڑ حسیناؤں کے پوسٹر بیچنے والے بڈھے تاجر کو کیا پتا تھا کہ اس کا ایک گراہک لاپتہ ہو گیا تھا۔اگر اسے پتہ بھی چل جاتا تو کیا فرق پڑنے والا تھا کیوں کہ یہ تو بازار ہے۔یہاں تو لوگ آتے ہی ہیں کھو جانے کے لیے۔

☆☆☆

سُقُوط

• بلراج بخشی

گشت پر نکلی پلٹن پر اچانک باڑ ماری گئی تھی۔

'لیٹ جاؤ....لیٹو....اور پوزیشن لو....رینگو....آڑ لو....آڑ.... ' لیفٹیننٹ گاشل حلق پھاڑ کر چلایا اور خود بھی ایک پتھر کی اوٹ میں رینگ گیا۔

وہ چلا کر یہ کاشن نہ دیتا تب بھی اس کی پلٹن نے یہی کیا ہوتا۔ کیونکہ میدان میں اترنے سے پہلے اس قسم کی جنگی مشقیں فوجیوں کی فطرت بن چکی ہوتی ہیں۔

لیکن پہلے ہی ایکشن میں سینکڑوں گولیاں چل گئی تھیں۔ یہ اسپرے فائر تھا۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک خودکار رائفلوں کی ریٹ ٹیٹ مسلسل سنائی دیتی رہی۔ پھر فائرنگ بند ہو گئی اور جنگل کا سناٹا مزید گہرا لگنے لگا۔ لیفٹیننٹ گاشل نے اپنے ہانپنے پر قابو پاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی ہلچل نہیں تھی۔ اگلے چند لمحے فیصلہ کن ہو سکتے ہیں، اس نے سوچا۔ ابتدائی طور پر حیران کر دینے والا دشمن ان کے مکمل خاتمے کے لیے اب ان کی گھیرابندی تنگ کرے گا۔ گاشل نے سر اٹھا کر ہر طرف دیکھا لیکن کہیں کوئی حرکت نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے جنگل کا یہ ابدی سکون کبھی نہ ٹوٹا ہو۔ ایک ایک لمحہ ضروری ہے، اس نے سوچا اور پاس پڑا ہوا ایک پتھر اٹھا کر زمین کی سطح کے ساتھ ساتھ ہی ایک جانب نشیب میں اچھال دیا۔ جس جگہ پتھر گرا تھا وہاں کئی اطراف سے فائرنگ ہونے لگی اور پھر خاموشی۔

ہشیار ہیں، لیفٹیننٹ گاشل نے سر ہلایا۔ لیکن اس نشیب میں پتھر گرنے کی جگہ کو نشان زد کر لینے کا مطلب یہی تھا کہ دشمن ابھی combat زون میں نہیں بلکہ بلندی پر تھا۔ فوری طور پر کچھ کرنا چاہیے، اس

نے سوچا۔ لیکن دشمن کی پوزیشن کا اندازہ کیے بنا یہاں سے ہلنا بھی خودکشی ہوتی۔ اس نے ہیلمٹ اتار کر رائفل کی نال کے اگلے سرے پر رکھی اور دونوں ہاتھوں سے رائفل پکڑ کر کہنیوں اور گھٹنوں کے بل چڑھائی کی جانب رینگنے لگا۔ رائفل کی نال پر رکھی ہیلمٹ کی سطح اس سے کم سے کم ایک فٹ اونچی تھی۔ تقریباً دس منٹ تک وہ یوں ہی بلندی کی جانب رینگتا رہا اور ایک بڑی چٹان کے پیچھے رک کر سانسیں درست کرنے لگا۔ پھر اس نے غور سے گردونواح کا جائزہ لیا۔ دور دور تک چھدری جھاڑیاں تھیں اور کہیں کہیں چھوٹی سی چٹان کہلانے لائق بڑے بڑے پتھر جن کے پیچھے دشمن کے گھات لگائے بیٹھے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔

یہاں سے زندہ بچ نکلنا ممکن نہیں، گاشل نے سوچا۔ دشمن نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہوگا۔ لڑ مرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، یا پھر ہتھیار ڈال دو۔ لیفٹیننٹ گاشل نے فیصلہ کن انداز میں سر ہلا کر ٹرانسیور کا سوئچ آن کیا اور آہستہ سے بولا:

'ہیلو چارلی.....چارلی.....ڈو یُو ریڈی.....چارلی.....اوور......'

'یس آئی ریڈیُو.....ایلفا.....سر.....'

'گڈ.....ڈیمیج رپورٹ.....اینڈ گوئنگ.....'

'ہمارے نو آدمی ختم ہو گئے سر.....'

'اسکاؤٹ.....کہاں ہیں؟'

وہ تھوڑی دیر سنتا رہا اور اس نے اطمینان کی سانس لی۔ میمنہ سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا لیکن میسرہ کے دونوں جوڑے محفوظ تھے۔

'.....اوکے.....چارلی.....دشمن ہمارے دائیں طرف اونچائی پر ہے.....' اس نے کمر پر لگی بیلٹ پر ایک ہولسٹر سے سگنل پسٹل نکالا۔ '.....میں میکسیمم فلیئر فائر کر رہا ہوں.....انھوں نے ہمیں حیران کیا ہے تو کچھ ہم بھی انھیں حیران کریں.....اپنے آدمیوں سے کہو کہ فلیئر کو دیکھتے ہی دائیں طرف چڑھائی پر رینگیں .....لیکن نو فائرنگ.....یہ چارج ایکشن ہوگا.....فلیئر ختم ہوتے ہی رک کر پوزیشن لے لیں.....اور اگلے فلیئر کا انتظار کریں.....ہر فلیئر تیس سیکنڈ کا ہوگا.....کوئی شک؟'

'نو سر.....'

'اوکے.....یہ ہدائتیں پہنچا کر رپورٹ کرو.....اوور.....'

تھوڑی دیر بعد چارلی نے رپورٹ دی تو گاشل نے ٹرانسیور میں کہا:

'اوکے.....چارلی.....بیس سیکنڈ.....نو و و و.....فائرنگ.....اینڈ.....ریڈی فار چارج ایٹ کمانڈ.....اوور اینڈ آؤٹ.....'

لیفٹیننٹ گھوشل نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر سگنل پسٹل کا رخ آسمان کی جانب کر کے فائر کر دیا۔

روشنی کی ایک پتلی سی لکیر بلندی کی جانب بڑھی اور پھر ایک جھماکے کے ساتھ چاروں اطراف میں نیلے رنگ کی تیز روشنی پھیل گئی۔ گاشل نے زیادہ احتیاط کو طاق پر رکھا اور تیزی سے رینگتا چڑھتا چلا گیا۔ یہ وقت زیادہ احتیاط کا تھا بھی نہیں۔ فلیئر کی روشنی تیس سیکنڈ تک فضا میں معلق رہی اور پھر معدوم ہو گئی۔ گاشل نے چند سیکنڈوں بعد ہی ایک اور فائر کیا اور بڑھتا گیا۔ دشمن کی حیرت کا فائدہ اٹھانے کا یہی موقع تھا۔ تیسرے فلیئر کی نیلی چکا چوند ختم ہوتے ہی گاشل نے آڑ لے لی اور سانسیں درست کرنے لگا۔ اس نے گھڑی دیکھی، ایک منٹ ہو چکا تھا۔ اس کے جوان بھی سانسیں درست کر چکے ہوں گے، اور اس سے زیادہ اب پرے باندھنے کا نہ تو وقت تھا نہ گنجائش۔ اس نے رائفل پر سنگین چڑھایا۔ فیصلے کی گھڑی، لیفٹیننٹ گاشل نے سوچا۔

'چا آ آ آ ر ج......' وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور پوری قوت سے چلاتے ہوئے جھک کر فائرنگ کرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کے جوان بھی چارج کا آوازۂ جنگ لگاتے ہوئے فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لیکن یہ کوئی طویل جھڑپ نہیں تھی۔ دراصل گاشل کی اس گستاخانہ حکمت عملی نے دشمن کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ مگر صاف طور پر اب مبارزت کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ گرنے لگے۔ ہر طرف سے چیخ و پکار، آہوں اور کراہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گولیوں کی ٹھائیں ٹھائیں بھی سنائی دے رہی تھی اور سنگینوں کی چھنا چھنچ بھی۔ اب پھر خاموشی چھانے لگی جسے کوئی تھکی تھکی سی کراہ مجروح کر دیتی تھی۔

لیفٹیننٹ گاشل ہانپتے ہوئے جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اسے ایک جانب سے اسے ہلکی سی آواز سنائی دی اور وہ جھٹکے سے ادھر مڑا۔ تقریباً تیس گز کے فاصلے پر ایک مسلح دشمن اسے رائفل کی زد پر لیے کھڑا تھا۔ گاشل کے کچھ کرنے سے پہلے ہی دشمن نے وقت ضائع کیے بغیر ٹرائیگر دبا دیا۔ لیکن خالی آواز آئی، میگزین خالی ہو چکی تھی۔ گاشل نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی رائفل کی نال سیدھی کی۔ یہ الوداعی تقریر کا وقت نہیں تھا اس لیے رائفل کی نال سیدھی کرنے، دشمن پر شست باندھنے اور ٹرائیگر دبانے کا عمل ایک ہی تسلسل میں تھا۔ لیکن صرف ٹرائیگر کی خالی آواز ہی آئی۔ اس کی میگزین بھی خالی تھی اور اب میگزین لوڈ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہولسٹر سے اعشاریہ پینتالیس کا ریوالور نکالنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس کا ہاتھ بے سوچے ہی بلٹ پروف جیکٹ کے اندر جھپٹا اور ایک ہینڈ گرنیڈ کے ساتھ سرعت سے باہر آ گیا۔ گاشل کا ہاتھ منہ کے پاس آیا۔ اس نے دانتوں کے ساتھ سیفٹی پن کھینچ کر گرنیڈ کو مسلح کیا اور جیسے تھرونگ کی پوزیشن میں ہاتھ پیچھے گیا اس نے دیکھا کہ دشمن کا ہاتھ بھی گرنیڈ کے ساتھ اسی پوزیشن میں تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ گاشل کا دماغ تیزی سے تخمینہ لگانے لگا۔ اگر کسی نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تو دوسرا گرنیڈ لانچ کر دے گا۔ اور کسی نے بھی گرنیڈ پھینکنے کی کوشش کی تو دوسرا بھی پھینک دے گا اور اس طرح دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بچے گا۔ دونوں کے لیے راہِ بے مفر کی صورت تھی۔ دشمن بھی اسی نتیجے پر پہنچ گیا لگتا تھا کیونکہ

اب اس کے ہونٹ ایک تلخ مسکراہٹ کی شکل میں کھنچ کر اس کے دانتوں پر پھیل گئے تھے۔

'کوئی بھی نہیں بچے گا....' دشمن اونچی آواز میں چلایا۔ اس نے تیزی سے نیچے جھک کر کچھ اٹھایا اور اسے غور سے دیکھتا ہوا اس کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔

گاشل نے آہستہ سے سر ہلایا۔ اس کا انگوٹھا سختی کے ساتھ گرنیڈ کے لیور پر جما ہوا تھا۔ جب تک انگوٹھا لیور پر تھا گرنیڈ پھٹ نہیں سکتا تھا اور لیور پر سے انگوٹھا ہٹاتے ہی گرنیڈ آٹھ سیکنڈ کے اندر پھٹ جاتا۔ اگر وہ لیور پر سے انگوٹھے کا دباؤ ہٹا کر پانچ سیکنڈ کا انتظار کرے تو آخری تین سیکنڈوں میں وہ اسے دشمن پر اچھال سکتا ہے، اس نے سوچا۔ لیکن دشمن بھی اس امکان کو سمجھ گیا تھا اور جلد ہی اس نے مزید قریب آ کر درمیانی فاصلہ بہت کم کر لیا تھا۔ گاشل نے دل ہی دل میں دشمن کے اس فعل کی تعریف کی۔ اب ان کا درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ کوئی بھی گرنیڈ استعمال کرتا تو دونوں کا خاتمہ یقینی تھا کیوں کہ گرنیڈ کا حلقۂ مار آٹھ نو میٹر تو ہوتا ہی ہے۔

'کوئی فائدہ نہیں دوست....' دشمن مزید قریب آ گیا '....میں حساب کر چکا ہوں....کوئی راستہ نہیں ہے....'

اب ان کے درمیان چھ سات فٹ کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔

'کیا خیال ہے....' دشمن نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا '....دونوں کے مر جانے کا کیا فائدہ.....فتح کا جشن منانے کے لیے ایک تو زندہ رہے....'

گاشل کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

'میرا خیال ہے کہ......سیفٹی پن گرنیڈ میں واپس ڈال دوں تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔' دشمن نے کہا

'اوں.....ہوں.....ابھی نہیں.....اپنی رائفل زمین پر ڈال دو.....' گاشل نے کہا۔

دشمن نے کچھ سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے رائفل زمین پر ڈال دی۔ گاشل نے بھی اس کی تقلید کی اور بولا:

'ریوالور بھی.....'

دونوں نے بیلٹ سے اپنے ہولسٹر ہی کھول کر پھینک دیے۔ دشمن نے گرنیڈ کے لیور سے انگوٹھا ہٹایا اور سیفٹی پن واپس ڈال کر گرنیڈ واپس جیب میں ڈال دیا۔ گاشل اس کی کارروائی دیکھتا رہا اور پھر کچھ دیر بعد اس نے بھی ویسا ہی کیا اور دشمن نے طویل سانس لی۔

'میں زوگو واڈی ہوں.....ایم اے اکونومکس.....'

'ایم اے اکونومکس ہونے سے تمھارے جرم کم ہو جاتے ہیں کیا؟' لیفٹیننٹ گاشل کا لہجہ خشک

تھا۔
'نہیں..... تمھیں پتہ ہونا چاہیئے کہ ہماری صفوں میں خاصے تعلیم یافتہ لوگ بھی شامل ہیں..... محض گنوار نہیں..... ویسے ے ے ے.....' وہ خشخشی داڑھی کو سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا' ..... تمھارا ایکشن غیر متوقع تھا..... لیکن قابل تعریف ..... you took me by surprise..... ورنہ تم سب کا مرنا طے تھا..... لیکن تمھارے ایکشن سے میرے تمام لوگ بھی ختم ہو گئے ....daring..... تمھارے سرمایہ دار آقا اپنے کارندوں کو اچھی ٹریننگ دیتے ہیں.....'
'میں پیشہ ور سپاہی ہوں.....'
'اور میں پیشہ ور انقلابی.....' ویسے لیفٹیننٹ ..... یہ کمال کی چچوئشن ہے..... اگر ہم ایک دوسرے سے ساتھ رہیں تو ہمیں ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں..... لیکن یہ..... یہ چھ سات فٹ کا فاصلہ درمیان میں رکھنا ہوگا تا کہ ہم میں سے کوئی دوسرے پر اچانک حملہ نہ کر دے.....'
'مرنے سے ڈرتے ہو؟' گاشل کی پیشانی پر استفہامیہ بل پڑ گئے۔
'نہیں..... ایک اور لڑائی کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں.....'
اچانک گاشل کے ٹرانسیور پر آوازیں آنے لگیں:
'ہیلو..... زیرو نائن..... کالنگ ایلفا..... زیرو نائن کالنگ ایلفا..... اوور.....'
گاشل نے سوئچ آن کیا اور دشمن پر سے نظر ہٹائے بغیر صرف یہ کہا:
'اِن گیجڈ..... آؤٹ.....'
سوئچ آف کر کے وہ جھٹکے سے اٹھا اور بولا:
'یہاں سے نکلو..... اور کوَر ڈھونڈو..... کچھ ہی منٹوں میں ریکی کے لیے جہاز یہاں مکھیوں کے طرح بھنبھنانے لگیں گے..... ان جنگلوں سے واقف ہو؟'
'اچھی طرح.....'
'چھتاروں کی طرف چلو..... گھنے درخت..... جن میں شاخیں اور پتے گھنے ہوں.....'
زوکوواڈی نے سر ہلایا اور پھر دونوں تیز قدموں سے ایک جانب چلنے لگے۔ لیکن ان اطراف میں گھنے درخت نہیں تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی گھنی بانسواڑی میں چھپے رہے۔ جہاز آئے بھی اور چلے بھی گئے ۔ دونوں نے اپنا اپنا لایا ہوا کھانا کھایا اور بیٹھ گئے۔
'کیا پروگرام ہے؟' گاشل نے پوچھا۔
'پروگرام؟..... اس نقصان کے..... باوجود..... ہماری جدوجہد جاری رہے گی.....'
'میں تمھارے اس وقت کے پروگرام کے بارے میں پوچھ رہا ہوں..... مستقبل کے تمھارے

قاتلانہ منصوبوں کے بارے میں نہیں....'

'قاتلانہ منصوبے؟' واڈی نے مجروح لہجے میں کہا'.....ہم لوگ ایک مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں لیفٹیننٹ....'

'بالکل.....بہت بڑا مقصد....' گاشل نے زہریلے لہجے میں کہا'.....اور یہ مقصد صرف سرحدی ریاستوں میں نظر آتا ہے.....'

'کیا مطلب؟'

'صرف وہ ریاستیں.....جو ملک کی سرحدوں پر واقع ہیں.....صرف وہاں کے باشندوں کے ساتھ ہی ناانصافیاں، ظلم.....انسانی حقوق کی پامالی.....اور نہ جانے کیا کیا ہوتا رہتا ہے.....اتنے بڑے ملک میں.....کہیں اور.....کچھ نہیں ہوتا.....کیوں؟'

'یہ تو ہر جگہ ہو رہا ہے....' زوکو واڈی آہستہ سے بولا' مگر تمھیں نظر نہیں آتا.....تمھارے آگے کچھ ٹکڑے پھینک کر تمھیں اس نظام کا محافظ بنا دیا گیا ہے اور بس.....یہ جو تم نے لیفٹیننٹ کی وردی پہن رکھی ہے.....کبھی کسی سیاستدان کے بیٹے نے پہنی ہے؟.....یا کسی سرمایہ دار کے بیٹے نے؟.....تم نے کبھی دیکھا کہ کسی لیڈر یا سرمایہ دار کا بیٹا.....پولیس یا فوج کا لیفٹیننٹ.....یا.....چیف آف آرمی اسٹاف بنا ہو؟.....نہیں نا.....وہ نہیں بنتے.....وہ سب عام لوگ ہوتے ہیں تم جیسے.....جو سستے میں مل جاتے ہیں اور جنھیں وطن پرستی کا سبق پڑھا کر بندوق تھما دی جاتی ہے کہ ان کے دشمنوں کو مارو.....یا خود مر جاؤ.....آج تم وہی تو کر رہے تھے.....'

'لیکچر مت دو ....' گاشل کا لہجہ خشک تھا'.....سرمایہ داروں کو ختم کر کے ان کی دولت غریبوں میں تقسیم کریں گے.....پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہو تم لوگ.....ابھی تم نے کہا کہ پولیس اور فوج میں عام آدمی ہوتے ہیں.....تمھیں پتہ ہے کہ دشمن کی گولی سے جب ایک فوجی مرتا ہے تو بھرتی ہونے کے لیے دس لوگ آ جاتے ہیں.....گاؤں کی زمینیں بیچ کر پچاس پچاس ہزار کی رشوت لے کر.....کب تک مقابلہ کر سکو گے؟.....ہم ہیں نا ان کی حفاظت کے لیے.....اور.....تم ہو ہی کتنے؟'

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

'یہاں سے فوراً نکلنے کی کوشش کرو.....' لیفٹیننٹ گاشل بولا'.....انکوائری کے لیے کوئی فوجی ٹکڑی آ رہی ہو گی.....'

'ایک دو دن تو کوئی نہیں آئے گا.....' زوکو واڈی نے کہا'.....انھیں پتہ ہے کہ ہم یہیں کہیں گھات لگائے چھپے ہوں گے.....مزید شکار کے انتظار میں.....ویسے بھی یہاں سے نکل کر کہاں جاؤ گے لیفٹیننٹ؟'

'کیا مطلب؟'

'تمھارے تمام آدمی ختم ہو گئے.....مگر تم نے اپنے کمان افسر سے رابطہ نہیں کیا.....مر گئے ہوتے تو

کوئی بات نہیں تھی.... تم بچ گئے.... لیکن ہیڈ کوارٹر کو رپورٹ نہیں کیا.....'

گاشل اسے کچھ دیر تک متفکرانہ نظروں سے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا:

'ہوں ں ں ں... شاید تمھارا خیال ٹھیک ہے.... مجھ سے رپورٹ مانگی جائے گی.... کورٹ آف انکوائری ہوگی..... مجھ پر مجرمانہ غفلت کا الزام لگایا جائے گا....'

اچانک ایک تیز رفتار جیٹ طیارہ فائرنگ کرتے ہوئے ان کے سروں پر سے گزر گیا۔ دونوں زمین پر اوندھے منہ گر گئے اور سرعت سے رینگتے ہوئے چٹانوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ جیٹ طیارے نے تین بار پھر لوٹ کر اسی محدود رقبے میں مشین گن سے فائرنگ کی۔ ان کے آس پاس کی مٹی اچھلتی رہی یا گولیاں چٹانوں سے ٹکراتی رہیں۔ جیٹ طیارہ چلا گیا۔

'تم نے دیکھا لیفٹیننٹ..... فائٹر جیٹ نے اسی علاقے میں فائرنگ کی.... یعنی اسے ٹارگٹ ایریا دیا گیا تھا..... کیسے؟' زوکوواڈی نے زمین پر چت لیٹے لیٹے کہا۔

'اوہ.....اوہ.....' کچھ دیر بعد گاشل کے منہ سے بے اختیار نکلا' ....اسکاوٹ ..... میری بائیں جانب والے اسکاوٹ نشیب میں تھے.....وہ تو محفوظ تھے... یقیناً انھوں نے ریکی کی ہوگی.....اور ہم دونوں کو سکون سے باتیں کرتے دیکھ کر رپورٹ دے دی ہوگی.....او مائی گاڈ.....وہ تو مجھے واجب القتل قرار دے چکے ہوں گے.....اوہو.....تو.....میرا کورٹ مارشل طے ہے....'

'میں نے غلط نہیں کہا....' زوکوواڈی نے آہستہ سے کہا' .....مجبوری کی حالت میں بھی دشمن کے ساتھ بات کرتے دیکھ کر تمھارے سرمایہ دار آقا غداری کا الزام لگا دیں گے....'

'لیکن.....میرا خیال ہے کہ..... تمھارا بھی کچھ کچھ یہی حال ہے.... گھاتی حملے میں پیشگی گاڑا لگائے بیٹھا دشمن ہمیشہ ابتدائی فائدے میں رہتا ہے..... تمھارے پاس اس کا کیا جواب ہے کہ گھات لگانے کے باوجود تمھارے تمام آدمی کیسے کھیت رہے..... کیا تم نے حکومت کے ساتھ اپنے جنگجوؤں کو مروانے کا سودا کیا تھا؟.....کیا تم بک گئے تھے زوگو؟'

زوگو کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ گاشل نے قہقہہ لگایا۔

'میرے سامنے تو جیل ہے.....اور طویل قانونی لڑائی..... لیکن تمھارے مددگار پڑوسی ملک کے گر گئے تو تمھیں..... تمھارے ہی گاؤں کے لوگوں کے سامنے..... تمھارے دونوں ہاتھ پشت پر.....اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر..... فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیں گے..... تاکہ آئندہ کوئی غداری نہ کرے.....'

'تم ٹھیک کہتے ہو.....' اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

'تو پھر..... مسٹر زوگوواڈی..... ایم اے اکونومکس..... اب.....ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے..... کیا خیال ہے؟'

'کیا کرنا چاہیے؟ جلدی کرو..... ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے.....' زوگو بولا۔
'وہیں چلتے ہیں جہاں ہم ملے تھے..... اور وہی کرتے ہیں جو ہم کرنے لگے تھے..... کیوں؟'
زوگو نے کچھ دیر سوچا اور پھر گاشل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
پندرہ منٹوں میں وہ دونوں وہاں پہنچ گئے جہاں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔
'گرنیڈ..... یا..... ریوالور؟' زوگو نے پوچھا۔
'میرا خیال ہے..... ریوالور مناسب رہے گا.....' گاشل نے زہریلے لہجے میں کہا' .....لاشیں قابلِ شناخت تو رہنی چاہییں..... گرنیڈ سے ہونے والے چیتھڑے کون اکٹھا کرے گا.....'
ریوالوروں سمیت دونوں کے ہولسٹر وہیں پڑے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور جھک کر اپنا اپنا ہولسٹر اٹھا کر بیلٹ سے باندھا۔
'مسٹر زوگو واڈی..... ایم اے اکونومکس.....' لیفٹیننٹ نے پریڈ گراؤنڈ انداز میں کاشن دیا۔
'یس..... لیفٹیننٹ گاشل..... آؤ..... پہلی..... اور آخری بار ہاتھ ملالیں.....'
دونوں نے آگے بڑھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کیا پھر دونوں کئی قدم پیچھے ہٹ گئے۔
'یس..... زوگو واڈی..... گولی دل پر لگنی چاہیے..... سر پر نہیں..... لاش کی شکل خراب ہو جاتی ہے.....'
دونوں کے ہاتھ ہولسٹر کی جانب لپکے اور اگلے ہی پل دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور نظر آئے جن کے سیفٹی کیچ وہ ہٹا چکے تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے پر ریوالور تان لیے۔
'مسٹر زوگو واڈی..... ایم اے اکونومکس.....' گاشل نے چلا کر کاشن دیا' .....ون..... ٹو..... تھری.....'
دو دھماکے ہوئے اور دونوں لاشیں زمین پر گر گئیں۔
[لیفٹیننٹ گاشل کو بعد از مرگ بہادری کا تمغہ دیا گیا۔ زوگو واڈی کے گاؤں میں اس کا مجسمہ لگایا گیا تا کہ وہاں کے لوگوں کو انقلاب کے لیے ہتھیار اٹھانے کی تحریک ملے۔]

☆☆☆

اندھیر نگری

• ظہیر عباس [پاکستان]

اس نے ایک دو کروٹیں لے کر باقی ماندہ نیند پوری کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن ہر سو سر سراتے سناٹے سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ بازاروں میں دور تک کوئی نہیں تھا۔ گھروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ سورج سوا نیزے پر ہی تھا اور یہ وہ وقت ہوتا تھا جب گلی میں مزدور اور آنے جانے والے شور شرابا کرتے گزرتے اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی انھی کا حصہ بن جاتا لیکن اب ایسا کچھ نہیں تھا اس کے دماغ میں خیالات نے دھما چوکڑی مچا دی۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ اچانک یہ کیا ہو گیا؟ وہ بازار کے عین درمیان کھڑا تھا جہاں دن میں اگر کوئی ایک لمحے کو رک جاتا تو آنے جانے والوں کے پاؤں تلے کچلا جاتا۔ جتنا وہ اس معاملے پر غور کرتا الجھ جاتا۔ وہ سر پکڑ کر زمین پہ بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ جب اس کے ہوش بحال ہونے شروع ہوئے تو اس کے دماغ میں ساتھی مزدوروں کی سرگوشیاں گونجنے لگیں جو وہ کئی دنوں سے کر رہے تھے۔ بھوک کی وبا نے ہولے ہولے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا تھا۔ قحط غیر محسوس طریقے سے ہر گھر میں سرایت کر رہا تھا۔ چند اموات بھی ہوئی تھیں لیکن لوگوں کو خبر نہیں ہونے دی گئی۔ وہ ساری باتیں سنتا ضرور تھا لیکن کبھی اسے مخاطب کر کے کسی نے کوئی بات نہیں کہی، اس وجہ سے اسے یہ خبر نہیں ہوئی کہ شہر میں بھوک کہاں ہے؟ وہ تو روز کھانا کھاتا تھا۔ اس نے دور بازار میں دیکھا، سوائے اس کے کوئی نہیں تھا۔ ممکن ہے شہر میں اس کے علاوہ اور لوگ بھی ہوں، اس خیال نے اسے کچھ حوصلہ دیا۔ ہمت کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دروازوں کی چٹخنیاں ابھی تک ہل رہی تھیں جیسے لوگ ابھی ابھی نکل کے گئے ہوں۔ وہ کافی دیر کسی دوسرے انسان کو ڈھونڈتا رہا لیکن اسے کوئی نظر نہ آیا۔ اب تھکاوٹ کے ساتھ ساتھ اسے بھوک اور پیاس بھی ستانے لگی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک دو گھروں میں جھانکا۔ سوائے خالی پن کے اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ پھر ہمت کر کے وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہو گیا جہاں کام کے سلسلے میں اکثر اس کا جانا رہتا تھا۔ اسے نظریں اٹھائے بغیر ہی اندازہ ہو گیا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ جس گھر کے دروازے سے آگے جانے کی نہ کبھی اسے اجازت ملی تھی اور نہ ہی حوصلہ، آج وہ وہاں بے خوف و خطر کھڑا تھا۔ کمروں میں پھرتے پھراتے وہ ایک ایسے کمرے میں جانکلا جہاں گھر کے مالک کھانا بنانے کا اہتمام کرتے تھے۔ رسوئی پر کپڑے میں ڈھانپی ہوئی بھاپ اڑاتی چپاتیاں پڑی تھیں، جیسے ابھی ابھی کوئی پکا کے چھوڑ گیا ہو۔ چولھے میں آگ پورے جوبن پر تھی۔ اس نے ہنڈیا کا ڈھکن اٹھایا ابلتے ہوئے گوشت کو دیکھ کر اسے شدت سے اپنے بھوکے ہونے کا احساس ہوا۔ پاس پڑے ہوئے برتن میں اس نے جلدی سے سالن نکالا اور مزے سے کھانے لگا۔ وہ کھائے جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ بھی یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے آخری بار کب گوشت کھایا تھا؟ اس نے تو سنا تھا کہ قحط سالی کو طول پکڑے کافی عرصہ ہو چلا ہے، لوگ گھاس کھانے پر مجبور تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس گھر میں کوئی گوشت پکا کے چھوڑ گیا تھا۔ اس نے جی بھر کے اشتہا مٹائی اور کافی دیر پھرتا رہا لیکن کوئی ذی روح اسے نظر نہ آیا۔

سناٹے میں اپنے قدموں کی دھمک سے وہ کانپ کانپ اٹھتا جو اسے اپنے وجود کی گہرائیوں تک محسوس ہو رہی تھی۔ اب وہ دبے پاؤں چل رہا تھا۔ کوئی ہے، کوئی ہے؟ اس نے چیخ چیخ کر آوازیں دیں لیکن کوئی ہوتا تو اس کی آواز کا جواب بھی دیتا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اضطراب اس کے گلے کو آ رہا تھا۔ دیواروں اور خالی مکانوں کا آسیب اس کے وجود میں سرایت کر رہا تھا۔ شام ڈھلنے سے پہلے اسے کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ رات اگر وہ شہر میں رہتا تو سناٹا اس کا گلہ گھونٹ دیتا اور اگر شہر سے باہر جاتا تو کدھر جاتا؟ وہ اس طویل اور کشادہ بازار میں تھا جہاں سارا دن کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ اپنے سائے کی رہبری میں مغرب کی سمت چل پڑا۔ اس کے کانوں میں دکانداروں، گاہکوں اور چلتے ہوؤں کی آوازیں گونج رہی تھیں جو بازار سے گزرتے ہوئے وہ روز سنتا تھا۔ اتنی دیر مارا مارا پھرنے کے بعد اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس وقت وہ شہر میں اکیلا ہے۔ کچھ خالی مکانوں سے ہو آنے کے بعد خوامخواہ اس کا جی لوگوں کے گھروں میں جانے کو چاہ رہا تھا۔ تجسس نے اس کے دل میں ان گھروں اور خفیہ جگہوں میں جانے کی خواہش پیدا کی جہاں جانے کا وہ صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔

اس کے دل میں فوراً جس گھر میں جانے کی امنگ بیدار ہوئی، وہ اس لڑکی کا گھر تھا جس سے وہ یکطرفہ محبت میں مبتلا تھا۔ اس کا گھر دو تین گلیاں چھوڑ کے تھا۔ جب وہ ہوا کھانے کے لیے اپنے گھر کی عقبی

کھڑکی کھولتا تو ایک بہت اونچا مکان تھا جس کی تیسری یا چوتھی منزل کی بالکونی سر اٹھاتے ہی نظر آجاتی۔ ایک روز جب صبح اٹھ کر اس نے کھڑکی کھولی تو ایسا منظر دیکھا کہ اس کے دل میں گدگدی ہونا شروع ہوگئی۔ دور سے اسے صرف سفید رنگ ہی نظر آیا۔ چہرہ تو دکھائی نہیں دیا لیکن یہ اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں تھا کہ وہ جو کوئی بھی تھی، تھی بہت خوبصورت! بس وہ دن اور آج کا دن، وہ ہر صبح کھڑکی کھول کے بیٹھ جاتا، سوائے ایک دو مواقع کے، وہ نظارے سے ہمیشہ محروم ہی رہا۔ دو تین بازار چھوڑ کے وہ گھر تھا۔ پہچاننے میں اسے دقت پیش نہیں آئی۔ آس پاس کے مکان اتنے بلند نہیں تھے۔ کافی دیر دروازے پر کھڑا وہ حوصلہ اکٹھا کرتا رہا، بالآخر ہمت کر کے اندر داخل ہو ہی گیا۔ بہت کھلا گھر سارے کمروں میں اس نے گھوم کے دیکھا، اب وہ اس بالکونی میں کھڑا تھا جہاں ایک بار اس لڑکی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہاں سے اس کا مکان اور ارد گرد دوسرے مکان اسے ڈربوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنی کھڑکی کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا سر جھکانے سے قاصر تھا کہ کھڑکی دکھائی دے جاتی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اتنی اونچائی سے وہاں دیکھنا ممکن نہیں تھا، اگر کوئی دکھائی دے بھی جائے تو بہت مضحکہ خیز اور حقیر دکھائی دے۔ بلندی سے دیکھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا۔ چند لمحے اس نے نظر آنے والے مکانوں کا جائزہ لیا اور نیچے اتر آیا۔ اب وہ مطمئن تھا۔ اسے یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ وہ اس سے اتنی بے خبر کیوں تھی۔ وہ سمجھتا تھا شاید وہ اسے جان بوجھ کے نظر انداز کرتی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔

لوگوں کے شہر چھوڑ جانے کی وجہ سے خوب مشغلہ اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ اب وہ بے خوف و خطر کہیں بھی کسی بھی وقت آجا سکتا تھا۔ ہوش سنبھالنے سے اب تک اپنی مرضی سے اس نے کوئی کام نہیں کر کے دیکھا تھا۔ اپنے ہونے کا اولین احساس اب بھی دھند میں لپٹی تصویر کی طرح اس کے ذہن پر نقش تھا۔ اس کا باپ بیدردی سے اسے ٹھوکریں مار رہا تھا "حرام زادے تم کوڑیوں کے بھاؤ کے ہو لیکن مزے سے یوں پڑے ہو جیسے کہ کوئی پارس پتھر ہو"۔ وہ دن اور آج کا دن اس کی قیمت بڑھتی چلی گئی۔ مزدور منڈی میں اس کی دھوم تھی۔ ہر کوئی اسے رشک سے دیکھتا اور اس جیسا بننے کی خواہش کرتا۔ وہ نہ صرف اندھی طاقت کا مالک تھا بلکہ بہت بہادر بھی تھا۔ سارے مزدور اس کے غصے سے ڈرتے تھے۔ جتنا وزن وہ اکیلا با آسانی اٹھا لیتا تھا، چار آدمی مل کر بھی نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اس کی تعریف میں کوئی اسے گدھا، کوئی گھوڑا، کوئی سانڈ تو کوئی کچھ کہتا۔ مزدوروں میں سب سے چھوٹا ہونے کے ناتے ہر کوئی اس سے شفقت سے پیش آتا اور جواباً وہ بھی ہر کسی کی بات مانتا تھا۔ مالک کا حکم بجالانے میں کوئی سدھایا ہوا جانور بھی کہاں اس کا ثانی ہوگا۔ بوجھ اٹھا اٹھا کر اس کی گردن جھک گئی تھی۔ اس نے کبھی نگاہ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں کہ اس کے گرد کیا ہو رہا ہے۔ اب جبکہ وہ اکیلا تھا اور کوئی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا، وہ حیرت سے ایک ایسے شخص کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا جو پیدائشی نابینا ہو اور معجزاتی طور پر اسے بینائی مل گئی ہو۔ یہ سوچ بہت مسحور کن تھی کہ وہ اس شہر کا اکیلا

وارث ہے۔ ذہن میں یہ خیال آتے ہی اس نے ماہر درزی کی دکان کا رخ کیا جہاں ایک دفعہ اس نے قیمتی کپڑے کا ایک گٹھر پہنچایا تھا۔ دوسرے مکانوں کی طرح اس دکان کا دروازہ بھی کھلا تھا جیسے اسی کا منتظر ہو ۔ دکان رنگ برنگے ملبوسات سے اٹی پڑی تھی ۔ اپنے ناپ کا ایک قیمتی جوڑا زیب تن کر کے وہ نکل کھڑا ہوا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ کیوں نہ شہر کے ہر گھر میں جا کر دیکھا جائے لیکن پھر ارادہ بدل لیا اور صرف انھی جگہوں کا انتخاب کیا جہاں جانا عام حالات میں ممکن نہیں تھا۔ ایک چوراہے پہ چند لمحے رک کر اس نے کچھ سوچا اور چل پڑا۔ اس کے قدم خود بخود اٹھ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک بہت بڑی دیوار کے سائے میں تھا۔ کئی فٹ اونچے اور بھاری بھرکم دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ یہ شہر کی مرکزی عدالت کا احاطہ تھا جہاں لوگوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے تھے۔ یہ اب بالکل سنسان پڑا تھا۔ کاغذات ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کچھ دیر وہ کمرۂ عدالت میں کھڑا خالی کرسیوں کو گھورتا رہا اور پھر قاضی کی کرسی پر جا بیٹھا۔ ابھی وہ بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ اسے عقبی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ملازم نے ایک کتاب لا کر اس کے سامنے رکھی اور الٹے پاؤں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ہتھکڑی لگے ملزم کو کٹہرے میں لا کھڑا کیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کمرۂ عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ وکیل صفائی اور استغاثہ بھی فائلیں اٹھائے آن پہنچے۔ کافی دیر بحث چلتی رہی لیکن وہ سب سے بے خبر اونگھتا رہا۔ غنودگی کے عالم میں اس نے مقدمے کی کارروائی سنی اور فیصلہ دے دیا۔ کوئی جرم ہوا بھی تھا کہ نہیں، قصور کس کا تھا، حق پہ کون تھا! اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسے تو بس فیصلہ صادر کرنے کی جلدی تھی۔

ایک بار پھر وہ شہر کے بازاروں میں یہ سوچتا ہوا جا رہا تھا کہ مقدمے نپٹانا اور فیصلے کرنا تو انسان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کمرۂ عدالت میں قاضی کی کرسی پر بیٹھتے ہی شاید اسے اونگھ آ گئی تھی۔ جو کچھ وہاں ہوا، وہ زندگی میں اس نے کسی سے نہیں سنا تھا اور عدالت میں وہ پہلی بار ہی آیا تھا۔ ایک بار پھر وہ ویسے ہی تنہا تھا جیسے کمرۂ عدالت میں آنے سے پہلے تھا۔ اپنی نوعیت کا یہ عجیب خواب تھا۔ خیر ایک بات جو بہت مسرت کا باعث تھی کہ ملزم کو سزا سنانے اور اس کے چہرے پہ رقصاں موت کو دیکھنے سے زیادہ دلکش نظارہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

اس کے دماغ میں اپنے ساتھی مزدوروں کی وہ لذیذ سرگوشیاں گونج رہی تھیں جن کا تبادلہ وہ اس وقت کیا کرتے تھے جب وہ دن بھر کی تھکن اوڑھ کر بستروں پر دراز ہوتے۔ یہ اکثر درباری حرم کی دوشیزاؤں طوائفوں کے رقص اور ان کے حسن کے بارے میں ہوتی تھیں۔ شہر میں کوئی ایک عورت بھی ایسی باقی نہیں بچی تھی جسے قبول صورت کہا جا سکتا ہو۔ شاہی کارندے ہر گھر کی خبر رکھتے۔ جس گھر میں کوئی جواں سال خوبصورت لڑکی دکھائی پڑتی، اگلی رات وہ شاہی حرم کی زینت بن چکی ہوتی۔ شروع میں ایک دو گھروں سے دبا دبا سا احتجاج ہوا تھا۔ صدائے احتجاج اٹھانے والے خبر نہیں پھر کہاں چلے گئے؟ اب تو جس گھر سے لڑکی

جاتی، اس گھر کے وارے نیارے ہو جاتے۔ روزی روٹی کی فکر ہمیشہ کیلئے ختم ہو جاتی۔ اناج اور دوسری ضروریات زندگی کی اشیا شاہی خزانے سے پوری ہونے لگتیں۔ لوگ دعا کرتے کہ ان کے گھروں میں نہ صرف لڑکیاں پیدا ہوں بلکہ خوبصورت بھی ہوں۔ جس گھر میں پرکشش لڑکی پیدا ہو جاتی، وہاں جشن کا سماں ہوتا اور پھر بے صبری سے شاہی کارندوں کا انتظار شروع ہو جاتا۔ اگر کسی کے ہاں بدصورت بیٹی یا بیٹا پیدا ہو جاتا تو وہاں صفِ ماتم بچھ جاتی۔ شہر بھر میں شاہی عنایات سے محروم صرف وہی لوگ تھے جن کے گھروں میں بدصورت بیٹیاں پل رہی تھیں یا پھر بیٹے۔ وہ انھی لوگوں میں سے تھا جنھیں اپنے پیٹ کا سامان خود کرنا پڑتا تھا۔ بچپن سے اب تک اس نے سینکڑوں مرتبہ یہ باتیں سنی تھیں لیکن غور کرنے کا موقع اب ہاتھ آیا تھا۔

ان دیکھی جگہیں سارا دن اسے اپنی طرف کھینچتی رہیں۔ اسے گمان تک نہ ہوا کہ وہ ان مکانوں میں بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔ ڈھلتے سورج نے جب اونچے نیچے مکانوں اور درختوں کے سایوں کو پھیلا پھیلا کر دوگنا چوگنا کرنا شروع کیا تو اسے احساس ہوا کہ رات ہونے کو آ گئی ہے۔ وہ جو شہر کا واحد وارث بنا پھرتا تھا، شام کے سائے لمحہ لمحہ اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں وہ کھڑا تھا وہ جگہ اس کے گھر سے کافی فاصلے پر تھی۔ اسے سورج ڈوبنے سے پہلے ہر صورت اپنے ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔ وہ تیز تیز چلنا چاہتا تھا لیکن اپنے قدموں کی دھمک سے بچنے کے لئے اسے پنجوں کے بل چلنا پڑ رہا تھا۔ سارے مکان جیسے اس کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے اور آپس میں کچھ سرگوشیاں بھی کر رہے تھے۔ گھورتی اشیا سے آنکھیں چرا کر وہ جلد از جلد اپنے کمرے میں پناہ لینا چاہتا تھا۔ وہ جس مکان کے قریب سے گزرتا وہ دیر تک اسے مڑ مڑ کر دیکھتا رہتا۔ شہر، جس میں اس کی زندگی گزر گئی تھی، اب اسے بھوت نگر دکھائی دے رہا تھا۔ یہ پہلا دن تھا جب اس نے کوئی کام نہیں کیا ورنہ رات گئے تک اس کی گردن بوجھ تلے دبی رہتی۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کوئی ایسا بھی دن اس کی زندگی میں آیا تھا جب اس نے سارا دن آرام کیا ہو یا آوارہ گردی میں دن ضائع کر دیا ہو۔ آج اس کی ٹانگوں سے جیسے کسی نے جان نکال لی ہو۔ وہ اپنی ٹانگیں بے بسی سے دیکھ رہا تھا جو آگے بڑھنے میں اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ وزن اٹھانے میں جس کا کوئی ثانی نہیں تھا، آج پہلی بار جب اسے اپنا بوجھ اٹھانا پڑ گیا تو جان کے لالے پڑ گئے۔ بالآخر وہ ہانپتے کانپتے اپنے مکان تک پہنچ ہی گیا جو شام کے دھندلکے میں بے صبری سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس نے کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ عقبی کھڑکی جسے وہ رات رات بھر کھلا رکھتا تھا، آج اسے بہت کمزور سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کو بھی بند کیا۔ ایک بھاری ٹرنک کھڑکی کے آگے کھینچ کر اس طرح لگا دیا کہ اگر کوئی بہت زور بھی لگائے تو اسے کھول نہ پائے۔ سارا انتظام کر کے وہ بستر پر لیٹ گیا۔ وہ سارے مزدور جو پچھلی رات اس کے پاس لیٹے تھے اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ سارے کے سارے آج اس کے ساتھ نہیں ہیں اور وہ بالکل تنہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ وہ تو شہر میں اکیلا

ہے، اسے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ڈر کا لفظ ذہن میں آتے ہی وہ تھر تھر کانپنے لگا، اس نے اٹھ کر کمرے میں چہل قدمی کرنا شروع کر دی، کبھی دروازے کے ساتھ جا کر کھڑا ہو جاتا تو کبھی ٹرنک کو ہلا کر دیکھتا۔ کبھی اس کا جی چاہتا کہ دروازہ کھول کر باہر دیکھے کہ کوئی ہے یا نہیں پھر خود کو کوستا کہ دن بھر تو وہ شہر میں اکیلا پھرتا رہا ہے، جب کہیں کوئی نہیں تھا تو اب کہاں سے آجائے گا؟ اس نے کھڑکی اور دروازہ کیوں بند کر رکھے ہیں؟ اندھیرے کمرے میں پہلی بار اسے خدا کا خیال آیا۔ وہ جو سارا سارا دن جانوروں کی طرح کام کرتا اور رات بستر پر گرتے ہی نیند کی وادی میں غرق ہو جاتا، اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ مذہب اور خدا کسے کہتے ہیں ۔اس نے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ کوئی ایسی ہستی بھی ہے جو مشکل گھڑی میں انسانوں کے کام آتی ہے۔ اس کی زندگی میں تو آج سے پہلے کوئی کٹھن وقت آیا ہی نہیں، اس لئے اسے خدا کو یاد کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب اسے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اس سے مدد کیسے مانگی جائے؟ شہر میں عبادت گاہیں بھی تو بہت سی تھیں ۔ پتہ نہیں کون سا خدا ایسا تھا جو اس طرح کے اوقات میں مدد کو آتا ہے؟ اس نے بڑی مشکل سے خود کو روکا ورنہ وہ تو اونچی آواز سے کسی خدا کو آواز دینے ہی والا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، اس کی آواز سن کر کوئی اور ہی آجائے۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کو پکارنے کی کوشش کی لیکن صورت حال پہلے سے بھی بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے جب وہ سوتا تھا تو ایک بار دن چڑھے ہی اٹھتا تھا لیکن آج وہ کھڑکی کھول کر دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ رات کتنی باقی ہے؟ اندھیرے میں مختلف شبیہیں اسے بنتی بگڑتی دکھائی دے رہی تھیں۔ آنکھیں بند کر کے اس نے خود کو محفوظ کرنے کی کوشش بھی کی لیکن نتیجہ جوں کا توں رہا۔ سناٹا گھوں۔۔ گھوں۔۔ گھوں کرتا اس کے کانوں میں گھستا چلا آرہا تھا۔ جو بات اس سب سے زیادہ خوف زدہ کر رہی تھی وہ اس کے دل کی دھڑکن تھی۔ ٹھک۔۔ ٹھک۔۔ ٹھک۔۔ ٹھک کی آواز تھی جو دل کے اندر سے آرہی تھی۔ اسے پل پل یہ مغالطہ ہو رہا تھا جیسے کوئی ہولے ہولے اس کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے اور مایوس ہونے پر کھڑکی کی طرف آجاتا ہے۔ کھڑکی حالانکہ زمین سے کافی بلند تھی، سیڑھی لگائے بغیر اسے باہر سے نہیں کھولا جا سکتا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ باہر جو کوئی بھی ہے وہ حسب ضرورت اپنا قد بڑھانے اور کم کرنے پر قادر ہے۔

پھر دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی، وہ لیٹا کافی دیر تک سوچتا رہا کہ جو واقعات اس کے ساتھ پیش آرہے ہیں، حقیقی ہیں یا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ دروازہ کھول کے اس نے باہر دیکھا ہر سو ہو کا عالم تھا، صورت حال پچھلے روز جیسی ہی تھی۔ لیکن آج وہ سنبھل چکا تھا۔ کھڑکی کے آگے سے ٹرنک ہٹاتے ہوئے اسے اپنی بزدلی پر غصہ بھی آرہا تھا۔ کھڑکی کھول کر سامنے بالکونی کی طرف سر اٹھائے کچھ دیر دیکھتا رہا۔ سورج بالکل سر کے اوپر تھا۔ کافی دیر نہانے کے بعد وہ تازہ دم ہو کر باہر نکلا۔ اس نے پختہ ارادہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ رات سہم سہم کر نہیں گزارے گا۔ اور جہاں رات ہو جائے گی وہیں سو جائے گا۔ اپنے گھر کی طرف بھاگنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جب تک لوگ واپس نہیں آجاتے۔ حیرت انگیز طور پر کل صبح سے جو واقعات

پیش آرہے تھے، وہ اسے حقیقی، جبکہ سابقہ مزدوروں والی زندگی اسے ڈراؤنے خواب کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ رات اس کے ذہن میں جب خدا سے مدد لینے کا کمزور سا خیال ابھرا تھا تو ایک نامحسوس خواہش نے اس کے دل میں انگڑائی لی تھی کہ اگر صبح ہوئی تو وہ عبادت گاہوں میں جا کر ضرور دیکھے گا۔ شہر کی عبادت گاہوں کے دروازے مزدوروں پر بند تھے۔ ویسے بھی مزدور کا مالک اور مددگار تو اس کا آقا ہوتا ہے جو اسے کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑے دیتا ہے۔ تو پھر یہ خدا کون ہے جو آقاؤں کا بھی آقا ہے؟

جن مکانوں میں اس نے جا کر دیکھا تھا، وہاں تو کھانے کو کافی کچھ موجود تھا اور وہ حیران تھا کہ لوگ تو دو لقموں کو ترس رہے تھے۔ وہ کس قسم کا قحط تھا جس نے انھیں شہر سے نکلنے پر مجبور کر دیا؟ چند مکانوں میں تو غلہ اتنی مقدار میں تھا کہ ایک خاندان عرصہ تک گزارا کر سکتا تھا۔ بلکہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کہ لوگوں نے آنے والے وقت کے لئے بھی ذخیرہ اندوزی کر رکھی تھی۔ البتہ کچھ مکان ایسے بھی ضرور تھے جن میں غربت کی حکمرانی تھی۔ ایسے گھروں کے مکینوں کی شہر چھوڑ جانے کی وجہ تو سمجھ آرہی تھی لیکن سب کے سب کے شہر سے کوچ کر جانے کی وجہ کم از کم بھوک نہیں تھی۔ دوسرا کوئی سبب اس کی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ یہ معاملہ ہوتا تو لوگ یوں اچانک راتوں رات نہ چلے جاتے۔ اور پھر اس کا شہر میں اکیلا رہ جانا، کچھ بھی تو سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے ساتھی جن کے ساتھ وہ ایک عرصہ سے ایک ہی مکان میں رہ رہا تھا وہ اسے ساتھ کیوں نہیں لے کر گئے؟ کیا کوئی ایسا خزانہ دریافت ہو گیا تھا جسے لوٹنے کی فکر میں سب لوگ منہ اندھیرے نکل گئے؟ اب وہ آہنی سلاخوں والے دروازے کے عین سامنے تھا، جو عبادت گاہ کی طرف کھلتا تھا۔ چند لمحے خالی نظروں سے اندر جھانکنے کے بعد دروازہ کھولنے کے لئے اس نے اندر کی طرف ہلکا سا زور لگایا۔ خاموشی میں لوہے کا دروازہ یوں چرمرایا جیسے ہاتھ لگانے پر خفگی کا اظہار کر رہا ہو اور ایک طرف کو ہو کر اسے اندر جانے کو راستہ دے دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو دروازہ پہلی حالت پر ویسے ہی چلا گیا جیسے گہری نیند میں اچانک کسی کی آنکھ کھل جائے اور وہ کروٹ بدل کر دوبارہ سو جائے۔

یہ عبادت گاہ ایک دیدہ زیب باغ کے احاطے میں واقع تھی، جس کے گرد پتھر کی دیوار تھی جس نے مکانوں کو عبادت گاہ کی طرف بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ عبادت گاہ کے احاطے میں داخلے کے لئے چار راستے تھے، جنھوں نے باغ کو چار مساوی حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ باغ میں چار بڑے درخت تھے جن میں سے ہر ایک ہر حصے کے عین درمیان میں تھا۔ چھوٹے مختلف رنگوں کے پودے ہر درخت کو گھیرے ہوئے تھے۔ ایک راستے سے داخل ہونے والے کو دائیں بائیں کے دونوں راستے عبادت گاہ کی طرف بڑھتے دکھائی دیں گے۔ چوتھا راستہ عبادت گاہ کے عقب میں تھا جسے وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتا تھا۔ اس سارے منظر میں کھویا ہوا وہ عبادت گاہ کی عمارت کے قریب تر ہو رہا تھا۔ عمارت کے گرد ایک بڑا سا چبوترا تھا، جہاں آکر راستے اپنی پہچان کھو دیتے۔ اتنی خوبصورت جگہ اس نے پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ ایک دو مرتبہ وہ کسی کام کے

سلسلے میں اس کے قریب سے گزرا تھا۔ تب یہاں کوئی مذہبی تہوار تھا، لوگ آ جا رہے تھے اس لئے وہ جانتا تھا کہ یہاں کوئی عبادت گاہ بھی ہے۔ جس راستے پر چلتے ہوئے وہ وہاں تک پہنچا تھا اس راستے کا اختتام عبادت گاہ کی پشت پر ہوا۔ عقبی سمت میں دروازہ تھا، باقی تین اطراف میں کھڑکیاں تھیں۔ کھلے دروازے میں اندر دور تک ایک بہت بڑا کمرہ دکھائی دے رہا تھا جو سورج کی روشنی کی وجہ سے چند قدم تک تو روشن تھا لیکن آگے اندھیرا تھا جس سے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کی کمرہ کتنا بڑا ہے۔ قدم بڑھانے سے پہلے وہ ٹھٹکا، اگر خدا نے مجھے یوں اندر گھستے دیکھ کر دبوچ لیا تو؟ اور کیا خبر اندھیرے میں اندر کون ہو؟ ارد گرد پھیلی روشنی اور رنگا رنگی میں اندھیرا کچھ زیادہ ہی گہرا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ایک دو بار اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن کچھ دکھائی نہیں دیا۔ اس نے اک نظر اٹھا کر مکانوں کی جانب دیکھا جو اسے تماشائیوں کی طرح دکھائی دیئے۔ اونچے مکان با آسانی اسے دیکھ سکتے تھے جبکہ چھوٹے دیوار کے اوپر سے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مکانوں کی موجودگی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ ہمت کر کے عبادت گاہ میں داخل ہو گیا۔

چند لمحے اسے کچھ نظر تو نہیں آیا البتہ مختلف قسم کی مسحور کن خوشبوؤں نے اس کا استقبال ضرور کیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے خود بخود دکھائی دینے لگا۔ کمرے میں اندھیرا اتنا نہیں تھا جتنا باہر سے محسوس ہو رہا تھا۔ خوف اندھیرے کے چھٹتے ہی غائب ہو چکا تھا۔ کمرہ اس کے کمرے سے کئی گنا زیادہ کشادہ اور اونچا تھا۔ اس نے غور سے نیچے اوپر، دائیں بائیں، آگے پیچھے دیکھا، کمرے میں سوائے اس کے کوئی نہیں تھا۔

عبادت گاہ میں کسی کو نہ پا کر اسے مایوسی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ پتھروں سے بنی دیواروں کو تراش تراش کر انسانوں اور جانوروں کی شبیہیں بنائی گئی تھیں، اور کچھ لکھا ہوا بھی تھا۔ سامنے کافی اونچا چبوترا تھا اوپر جانے کے لئے آٹھ نو سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ یہاں ایک بیش قیمت قالین بچھا تھا وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ خدا یقیناً یہاں بیٹھ کر لوگوں سے ہمکلام ہوتا ہوگا اور لوگوں کی مدد بھی کرتا ہوگا۔ اس کے دماغ میں خدا کی عجیب عجیب شبیہیں بن، بگڑ رہی تھیں لیکن کوئی حتمی تصویر نہیں بن پا رہی تھی۔ اس نے دیواروں پر موجود تصویروں کو غور سے دیکھا لیکن کوئی ایسی تصویر نہیں تھی جسے دیکھ کر وہ کہہ سکتا کہ خدا اس طرح کا ہوگا۔ اس نے خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے یقین سا تھا کہ وہ ان جیسا نہیں ہو سکتا۔ یہ سارا قضیہ اتنا پریشان کن نہیں تھا جتنا یہ کہ خدا بھی کیا لوگوں کے ساتھ ہی شہر چھوڑ گیا ہے؟ جو اس نے سن رکھا تھا کہ مشکل وقت میں وہ سب کے کام آتا ہے تو وہ کیا ماجرا ہوا؟ کیا لوگوں کے معاملات سے وہ بے خبر تھا یا اسے کسی نے آ کے بتایا ہی نہیں کہ شہر میں لوگوں کو اس کی کتنی ضرورت آن پڑی ہے؟ لیکن یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ پکارنے پر وہ خود ہی مدد کو آ جاتا ہے تو کیا کسی نے اسے پکارا ہی نہیں؟ شہر بھر میں بھوک، بھوک ہو رہی تھی اور اسے خبر ہی نہیں ہوئی؟ وہ یہ سب سوچ سوچ کے حیران ہو رہا تھا۔ ممکن ہے بھوک ایسا مسئلہ ہو جسے خدا بھی حل نہ کر سکتا

ہو۔ اگر خدا خود ہی بھوکا رہے تو لوگوں کی بھوک کیسے مٹا سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اب وہ بھی لوگوں کے ساتھ شہر چھوڑ کے چلا گیا ہے۔ خدا کے شہر چھوڑنے کی وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی کچھ گھروں میں تو کھانے کو بہت کچھ تھا لیکن خدا کا گھر تو اناج سے بالکل خالی تھا؟ تو کیا خدا بھی غریب ہو سکتا ہے؟ پھر لوگوں نے اسے اتنا طاقتور کیوں مشہور کر رکھا ہے؟ دیر تک وہ ان امکانات پر غور کرتا رہا۔ اس نے یوں سر ہلایا جیسے مسئلے کی تہہ تک پہنچ گیا ہو اور اٹھ کھڑا ہوا۔

☆☆☆☆
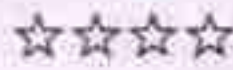
وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا، پہلے پہل تو اسے گھر گھر جھانکنے کا شوق برقرار رکھتا لیکن اب صورت حال بدلنا شروع ہو گئی تھی۔ وہ کئی کئی دن ایک ہی مکان میں پڑا رہتا۔ شام ڈھلتے ہی ہر سو اندھیرا چھا جاتا اور وہ کسی کونے میں دبک جاتا۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ پڑاو کے لئے انھی جگہوں کا انتخاب کرے جنھیں وہ ہمیشہ سے جانتا تھا۔ شروع کے دنوں میں شہر کے بھید جاننے کی خواہش کے ہاتھوں وہ مغلوب ہو گیا تھا۔ اب اس خواہش کی کوئی رمق بھی اس کے دل میں باقی نہیں بچی تھی۔ وہ محض زندگی کے دن پورے کر رہا تھا بلکہ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے ہی اس شہر میں اکیلا ہے۔ کبھی یہ احساس اسے تقویت بخشتا تھا کہ ایک روز شہر کے سارے باسی واپس آ جائیں گے لیکن اب وہ مایوس ہونا شروع ہو گیا تھا۔

ایک روز جب وہ اٹھا تو پہلا خیال اس کے دماغ میں یہی آیا کہ سب لوگ تو عرصہ ہوا جا چکے، میں کب تک یہاں اکیلا رہوں گا۔ اگر یہی صورت حال رہی تو پاگل ہو جاؤں گا۔ کیوں نہ خود بھی شہر سے نکل کر قسمت آزمائی کی جائے، ممکن ہے کوئی جاننے والا ہی مل جائے۔ اگر نہ بھی ملا تو کم از کم کسی ہم جنس کو تو دیکھوں گا۔ ہم جنس کا خیال آتے ہی اسے اپنے اکلاپے کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اسے خود پر بہت حیرت اور افسوس بھی ہوا کہ اسے آج تک یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور نکل کھڑا ہوا۔ شہر سے نکلنے کا خیال ذہن میں آتے ہی مکان اسے آسیب زدہ دکھائی دینے لگے۔ ورنہ تو صورت حال یہ ہو چلی تھی کہ وہ بھی چپ چاپ اسی شہر میں منہدم ہو جاتا۔ اس نے ارادہ تو کر لیا تھا لیکن وہ راستے سے واقف نہیں تھا۔ کبھی باہر جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے نزدیک شہر سے باہر کی دنیا کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ اس بات پہ بھی حیران تھا کہ اس کے دماغ میں شہر سے باہر جانے کا خیال آیا بھی کیسے؟ ایک وہ وقت تھا جب وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہی ہے۔ سب لوگ اس سے محبت ضرور کرتے تھے لیکن کبھی کسی نے اس سے بات چیت کر کے اسے احساس نہیں دلایا کہ وہ بھی دوسروں کی طرح ایک انسان ہے۔ وہ اسے اب بھی بچہ ہی سمجھتے تھے حالانکہ وہ ساری باتیں غور سے سنتا تھا یہ اور بات ہے کہ کسی سے مکالمہ نہ ہونے کی وجہ سے جلد ہی وہ اس کے ذہن سے نکل جاتی تھیں۔ اب ہر لمحہ اس کے دماغ میں نت

نئے سوالات جنم لے رہے تھے۔ دماغ میں اٹھنے والے سوالات کی نوعیت پر غور کرتے ہوئے وہ ایک ایسے راستے پر نکل کھڑا ہوا جو اس کے گمان میں اسے شہر سے باہر لے جا سکتا تھا۔

خیالات کا ربط تب ٹوٹا جب وہ گہرے پانی میں گرتے گرتے بچا۔ اس نے اب بھی سر جھکا کر چلنے پر اپنے آپ کو کوسا۔ اسے خبر ہی نہیں ہوئی کہ وہ کن راستوں سے ہوتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ ایک بہت اونچی دیوار تھی جس کے وہ عین نیچے تھا۔ درمیان میں ایک بہت گہرا شفاف پانی سے بھرا ہوا نالہ تھا، جو دیوار کے ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ اس نے کنارے کنارے چلنا شروع کر دیا۔ وہ جو مزدور منڈی کے مخصوص علاقے سے واقف تھا اس کے لئے یہ اور ہی دنیا تھی۔ شہر میں اتنا بڑا نالہ اور دیوار بھی ہے اور اسے خبر ہی نہیں؟ اگلے ہی لمحے اس نے سر پر اک دھول جما کر خود کو ڈانٹا کہ وہ ان چیزوں سے کیسے واقف ہوتا، وہ تو کبھی شہر سے باہر گیا ہی نہیں۔ شام ہونے کو آ گئی لیکن دیوار اور پانی کا فاصلہ ختم نہیں ہوا۔ اس نے جگہ جگہ پتھر پھینک کر گہرائی ناپنے کی کوشش کی۔ گڑوم، گڑوم کی کثیف آواز سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ گہرائی بہت زیادہ ہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شہر کے چاروں طرف یہ دیوار ہے۔ کس مقصد کے لئے ہے یہ وہ بہت سوچنے کے باوجود نہیں سمجھ سکا۔ اس امید پر کہ کہیں تو باہر جانے کا راستہ ملے گا وہ چلتا رہا۔ اس کے دائیں ہاتھ مکان اور بائیں گہرا پانی اور اس کے ساتھ ساتھ دیوار تھی جو آہستہ آہستہ پیچھے سرکتی جا رہی تھے۔ شام کے سائے گہرے ہونا شروع ہو چکے تھے اور وہ مکمل اندھیرا ہونے سے پہلے بہر صورت شہر سے نکلنا چاہتا تھا۔

سورج کب غروب ہوا اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا، پانی اور دیوار بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چلتے ہوئے اسے ایک بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ اندھیرا اتنا نہیں تھا جتنا پہلے ہوا کرتا تھا۔ اک لمحے کو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو گھپ اندھیرا تھا لیکن سامنے کا منظر یوں تھا جیسے وہ اندھیری رات سے صبح کاذب کے اجالے کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اس اجالے کا منبع کہیں شہر کے عقب میں تھا، وہ سحر زدہ سا آگے بڑھتا رہا۔ روشنی مدھم سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے روشنی پانی میں منعکس ہو کر دیوار پر پڑ رہی ہو۔ دیواریں کانپ رہی تھی جیسے اپنی جگہ سے حرکت کرنا چاہ رہی ہو۔ تعجب انگیز بات یہ تھی کہ پانی تو نیچے، بہت گہرائی میں تھا، اس پر روشنی کیسے پڑ سکتی تھی؟ روشنی جہاں سے آ رہی ہے ہو سکتا ہے وہاں پانی کا کوئی تالاب ہو؟ وہ جلد از جلد مکانوں سے آگے بڑھ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ روشنی کہاں سے آ رہی ہے جس نے تاریکی کو دن میں بدل دیا ہے۔ وہ جس نے ایک عرصہ اندھیرے کی ہمراہی میں گزار دیا تھا اب اسے وہ اپنی پشت پر اژدھے کی طرح غار سا منہ کھولے قریب تر محسوس ہو رہا تھا۔ جو کسی بھی لمحے اسے ہڑپ کر سکتا تھا۔ جونہی وہ آخری مکان کے سائے سے آگے بڑھا تو دائیں رخ سامنے شفاف پتھروں سے بنا فرش تھا جسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل تھا کہ روشنی اس کے اندر سے پھوٹ رہی ہے یا اس کا سرچشمہ کچھ فاصلے پر پرشکوہ عمارت ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ عمارت سے آنے والی روشنی ساکن تھی جبکہ فرش پر پڑنے والی

روشنی یوں ہلتی تھی جیسے ساکت کھڑے پانی کو ہوا چھو چھو کے گزر جاتی ہو۔ تو روشنی کے انعکاس کی یہ صورت ہے۔ اس نے سکھ کا سانس لیا، جیسے کوئی بہت بڑی الجھن حل ہو گئی ہو۔

سمت کا تو اسے اندازہ نہیں تھا البتہ اب وہ شہر کی ایک حد پہ کھڑا تھا۔ دیوار اس کے بالکل سامنے اندھیرے میں خبر نہیں کہاں تک جاتی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ شہر سے باہر نکل آیا ہے یا ابھی اندر ہی ہے؟ کیونکہ دیوار روشنی کے پیچھے دائیں مڑنے کی بجائے کہیں بائیں طرف کو مڑ رہی تھی جیسے کسی اور شہر کو اپنے حصار میں لے رہی ہو۔ اس نے شہر میں صرف مٹی کے چراغوں کو جلتے دیکھا تھا اور لوگوں کے جانے کے بعد تو اجالے کا تصور صرف دن کے ساتھ ہی منسوب ہو گیا تھا۔ شام ہوتے ہی بیکراں اندھیرا اسے اپنی آغوش میں لے لیتا۔ اس کے دل میں اگر کبھی چراغ جلانے کی موہوم خواہش پیدا ہو بھی جاتی تو وہ بیدردی سے اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ وہ جان گیا تھا کہ اگر گھٹا ٹوپ اندھیرے کو مدھم روشنی سے پاٹنے کی کوشش کی جائے تو وہ غضبناک ہو جاتا ہے۔ چراغ اندھیرے کی آنکھ بن جاتا ہے جس کی خونخواری کی تاب کوئی اکیلا انسان کسی صورت نہیں لا سکتا۔ یہ اندھیرے کا اندھا پن ہی تھا جس نے ہر رات اس کی حفاظت کی۔ اب وہ روشنی کے فشار کے سامنے مبہوت کھڑا تھا۔ اندھیرے کے دودھیا ہالے نے روشنی کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ روشنی کا منبع کچھ فاصلے پر کھڑی پر شکوہ عمارت تھی جس کے سامنے شہر کی اونچی سے اونچی عمارت بھی ہیچ دکھائی دے رہی تھی۔ اب تک اس کی محبوبہ کے گھر کا رعب اس کے دل پر باقی تھا لیکن اس عمارت کو دیکھ کر اسے پورا شہر نہایت کمتر محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ عبادت گاہوں کا شہر کی عمارتوں میں اپنا رعب وجلال تھا لیکن اس عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بھٹک کر کسی طلسمی دنیا میں آ نکلا ہو۔ وہ آبی پتھر پر احتیاط سے پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

وہ جو بار بار گردن اٹھانا بھول جاتا تھا، جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا اس کی گردن اکڑتی چلی جاتی تھی۔ کچھ فاصلے پر جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا تو شہر کی وہ عمارتیں دکھائی دیں جو روشنی کے عین سامنے جگمگا رہی تھیں۔ ان کے پیچھے لامتناہی اندھیرا دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جس راستے سے وہ آیا تھا وہ تاریکی میں کہیں کھو گیا تھا۔ آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے محل اس کے اوپر جھکتا چلا آ رہا ہو۔ روشنی کی کشش تھی یا عمارت کی دہشت، خوف سے پھیلی آنکھیں وہ لمحے بھر کو بھی نہیں جھکا سکا۔ دیر تک اندھیرے اور اجالے کے درمیان معلق رہ کر اب وہ ایسی جگہ پر پہنچ چکا تھا جہاں سے روشنی آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔ شہر کا شہر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ یہاں رات میں بھی دن کا سماں تھا۔ اس نے مہیب عمارت سے نظریں چرا کر اس کے خدوخال پر غور کرنے کی کوشش کی لیکن بری طرح ناکام ہوا۔ روشنی اتنی تیز تھی کہ اس کے لئے غور سے دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ ہر سو پھیلے سناٹے سے وہ جلد ہی اس نتیجے پہ پہنچ گیا کہ محل بھی شہر کی طرح انسانوں سے خالی ہے۔ شہر تو پتہ تھا کہ اناج کی فکر میں چلا گیا لیکن شاہ اور شاہ کے مصاحب کہاں چلے

گئے؟ کافی دیر وہ سوچتا رہا کہ شہنشاہ ہی وہ ہستی ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ خدا کے گھر میں تو دن کے وقت بھی اندھیرا تھا لیکن یہاں رات بھی جگمگا رہی تھی۔ اس وقت وہ عین شہر اور محل کے درمیان کھڑا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ قدم آگے بڑھائے یا واپس چلا جائے۔ یہ پہلا موقع تھا جب اس نے رات کے وقت روشنی دیکھی تھی اور روشنی بھی اندھیرے کو شکست دیتی ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شہر کے تاریکی میں ڈوبے ہوئے مکان اس پر پیچ وتاب کھا رہے ہوں، اس بات کے منتظر، کہ کب وہ پلٹے اور وہ اس کا تکہ بوٹی کر دیں۔ اندھیرے کا خوف اسے عمارت کی طرف دھکیل رہا تھا جبکہ محل اسے قبول کرنے سے انکاری تھا۔ اس کا سایہ عقب میں دور دیوار کے ساتھ چپکا ہوا اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچتا ہے۔

روشنیوں کے پیچھے محل کی اوٹ سے کوئی اسے گھور رہا تھا، یہ محسوس کر کے اسے جھرجھری آ گئی۔ زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لیے۔ کبھی وہ شہر کی طرف تو کبھی محل کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شہر اگرچہ اس کا دیکھا بھالا تھا لیکن وہاں اندھیرا تھا اور روشنی کو چھوڑ کے وہاں وہ جا نہیں سکتا تھا۔ اندھیرا لباس کی طرح تھا جسے وہ اوڑھ لیتا تھا اور یہاں روشنی نے اسے برہنہ کر دیا تھا۔ ایک انجانا خوف بھی ذہن کے کسی کونے میں ہولے ہولے پھنکار رہا تھا کہ اگر محل میں کوئی ہوا تو۔۔۔؟ کسی نے اسے دیکھ لیا تو وہ خود کو کہاں چھپائے گا۔۔۔؟ روشنی میں ڈوبے محل کے اس پار ٹکٹکی باندھے وہ یوں دیکھتا رہا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔۔۔

☆☆☆☆

دوسرا فرمان جو دربار سے جاری ہوا وہ اس کی گردن زدنی کا تھا۔ آج سے پہلے کسی کی جراءت نہیں ہوئی تھی کہ وہ شاہی دربار کی حدود میں قدم رکھ سکتا۔ شاہی جلاد کی تلوار جب ٹوٹ کر دور جا گری تو شہنشاہ بھی بے ساختہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ آدمی اپنی جگہ جوں کا توں کھڑا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اسے اس جگہ سے اٹھوا کر شہر سے باہر پھینکنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن کوئی کوشش کارگر نہیں ہوئی۔ لوگ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے پوچھتے اب کیا ہوگا؟ شہنشاہ کے خوف کی وجہ سے اس انہونی پر ہر کوئی خود کو مجرم سمجھ رہا تھا۔ کسی کا خیال تھا کہ یہ آسمانی طاقتوں کی طرف سے شہنشاہ کے لئے کوئی خفیہ اشارہ ہے، کوئی کہتا تھا کہ کسی دشمن ملک کی سازش ہے، کوئی کچھ کہتا تو کوئی کچھ۔ جتنے منہ اتنی باتیں لیکن اصل بات کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ پورا شہر جانتا تھا کہ ایک رات پہلے یہ آدمی یہاں نہیں تھا اور سب سے زیادہ دہلا دینے والی بات یہ تھی کہ جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں شاہی محافظ تمام رات پہرہ دیتے تھے۔ وہ سب بھی بضد تھے کہ انھوں نے کسی کو یہاں آتے نہیں دیکھا۔ لیکن یہ آیا کس راستے سے، ہر راستے پر تو مسلح سپاہی کھڑے تھے؟ اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کوئی انسان چلتے چلتے پتھر بن گیا ہو۔ اس کے چہرے پر تحیر اور ہیبت کے رنگ عیاں تھے جو دیکھنے والے کو بھی اسی کیفیت میں مبتلا کر دیتے تھے۔ گھورتی آنکھیں اس سمت کو اٹھی ہوئی تھیں جہاں سامنے قصر شاہی تھا۔ سپاہیوں کے حلفیہ بیان اور دربار میں اپنی صفائی کے لیے گڑگڑانے کے باوجود، شہنشاہ نے فی الفور اس عظیم

کوتاہی پر ان سب کو پھانسی کا حکم دے دیا جو اس رات حفاظت پر مامور تھے۔ اجتماعی گردن زدنی کے بعد ایک عرصہ تک لوگ سہمے سہمے رہے کہ پتہ نہیں اب کیا ہوگا؟۔ درباری نجومی، شاہی جاسوس، ذہین فطین وزیر مشیر عرصہ تک اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔ اطلاع دینے والے کے لیے باقاعدہ انعام کا اعلان بھی کیا گیا لیکن نتیجہ پھر بھی صفر ہی رہا۔ جب سب تھک ہار کے بیٹھ گئے تو اسے قدرت کی طرف سے کوئی معجزہ سمجھ کر سب نے ہار مان لی۔

اس کے ارد گرد چھوٹی سی دیوار بنا دی گئی تا کہ دیکھنے والے قریب نہ آسکیں۔ جو بھی شاہی حدود کے قریب پھٹکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اب انھیں بھی دربار کی طرف سے خصوصی اجازت تھی کہ وہ جب جی چاہے اس عجوبے کی زیارت کر سکتے ہیں۔ خود بادشاہ بھی عام لوگوں کی طرح اندر سے خوفزدہ ہو چکا تھا، اگر یہ عقدہ حل ہو جاتا تو صورت حال یقیناً مختلف ہوتی۔ اس واقعہ کو رونما ہوئے جب ایک سال گزر گیا تو اسے باقاعدہ ایک تہوار کے طور پر منایا گیا۔ پھر تو یہ رسم ہر سال دہرائی جانے لگی، بت بنے اس آدمی کی حیثیت ایک دیوتا کی ہوگئی تھی۔ ہر کوئی دیوتا کے قریب تر بیٹھنے کی خواہش میں منہ اندھیرے ہی گھروں سے نکل کھڑا ہوتا شہر میں خالی مکان ہی رہ جاتے۔ ہر تہوار پر پورے شہر کے لئے قیام وطعام کا اہتمام دربار کی طرف سے ہوتا۔ شاہ سے لے کر گدا تک سب یہاں حاضر ہوتے اور اپنا سینہ کھول کر اس کے قدموں میں رکھ دیتے۔ اگر چہ وہ دنیا سے بے نیاز وسعتوں میں کہیں گھورتا رہتا لیکن سب یہی سمجھتے کہ وہ سب سے باخبر ہے۔

ایک تہوار کے موقع پر جب سارا شہر مجسمے کے قدموں میں پیشانی رگڑ رہا تھا۔ مزدور منڈی میں کام کرنے والا اپنے بدصورت بچے کی انگلی پکڑے فصیل اور خندق کے ساتھ بنے ہوئے راستے پر چلتا ہوا ویران شہر میں داخل ہو رہا تھا۔

بابا! یہ سب لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ وہ آدمی جس کے ارد گرد سارے لوگ بیٹھے ہیں، وہ کون ہے؟" بچے نے حیرت اور معصومیت سے باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ کھل اٹھی اور وہ اپنے بچے کو اس آدمی کی کہانی سناتا ہوا مکانوں کی اوٹ میں گم ہو گیا۔

☆☆☆

ٹھہری ہوئی اک زندگی

● فاروق راہب

وہ خود کو مکمل نہ کر سکا اور وہ بھی اسے نامکمل چھوڑ گئی۔

اپنی جستجو میں لگے آتے جاتے لمحوں کے اضطراب اور بے چینیوں سے نکل کر وہ اچانک نمودار ہوئی اور سمندر کی مضطرب سر پٹکتی لہروں کی مانند ابھری اور پھر سمندر میں غائب۔۔ اندھیرے سے اجالے کی اور جانے والی تمام رکاوٹیں جب ہٹیں، قلب کی دھڑکنوں میں قید پنچھی سانسوں میں پے بہ پے ہونے والے دھماکوں کے ساز پر مچلتے ہوئے ایک ایک کر کے محو پرواز ہوئے۔ وسیع آکاش کی حدیں ناپنی تھیں مگر زمین سے ناطہ ٹوٹے نہیں اس لئے اس کی پکار جاری تھی۔

وہ تو امریکہ میں مست و شاد زندگی گزار رہا تھا، مگر ماں نے بلا لیا۔

''بس بہت ہوا۔ وہاں کے آٹھ سے یہاں کا دو لاکھ بہتر ہے۔ اب لوٹ آؤ۔''

''مگر۔!''

''روشنی یہاں بھی ہے، وہاں بھی۔ لیکن یہاں شناخت کمزور نہیں پڑتی۔''

''سنپولے لمحوں کے تنگ ہوتے گھیرے سے آسمان چھوٹا نہیں ہوتا۔''

''لیکن رشتے بکھر جاتے ہیں۔''

''اشتعال انگیز امواج سے مقابلے کے لئے اسے دریا میں اترنا تھا۔

ماں نے ہیجانی موسم کا انتظام بھی کیا تھا۔ وقت کی پُر حیرت ساعتیں اس کے استقبال میں تھیں۔ ۔۔ آتشیں سوچ کی کائنات اس میں جذب ہونے کو بیقرار تھی۔ غالب و مغلوب کی جنگ کی ابتدا ہونے کو تھی۔ مگر

جسمانی تشنگی کو انجام تک پہنچانے کے لئے سنگھرش گا تھا کے بیان کی خاطر خود کو تیار کرنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔

محدود سے لامحدود کی پیمائش کٹھن تھی۔ وجود کے گم ہونے کا خوف لرز رہا تھا۔

کھلی فضا میں اڑان بھرتے پرندے قید و بند کی صعوبتوں سے دور دنیا پسند کرتے ہیں۔ ہوا دریا پہاڑ جھرنے کی طرح وہ خود کو آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ مگر ماں! ماں کو سمجھانا ممکن نہیں تھا۔ اس کے مطابق جیون روپی گاڑی کے لئے دو چکوں کا ہونا ضروری تھا اور وہ اپنے اس فرسودہ خیال پر اڑی ہوئی تھی۔ ماں سے وہ ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ وہ ابھی ناسمجھ معصوم تھا اور ٹھیک سے کھڑا ہونے کی صلاحیت بھی نہیں تھی۔ تبھی ماں کی گاڑی کا ایک پہیہ اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا اور اس کڑے اور آزمائش بھرے دور میں ماں نے اپنے حوصلے کو کم نہیں ہونے دیا اور کامیابی کی ہر دہلیز سے گزار کر اسے بلندیوں تک پہنچایا۔ وہ نافرمان کیسے ہوتا! ممتا کے اتنے احسانات تھے کہ وہ اپنی چمڑی سے اس کے لئے جوتیاں بھی بناتا تو کم ہوتیں۔ اس کا دائرۂ افکار بڑا نہیں تھا اور جنون و خواب کے درمیان کا فاصلہ ماں ایک جست میں طے کر لینے کی حمایتی تھی۔ اس کی ضد کے آگے وہ اپنے معز اخیالات کا ترجمان نہ بن سکا اور وہ اس کے لئے دھند سے ایک مہتاب ڈھونڈ بھی لائی۔

''دیکھو اور دھیان سے جائزہ لو۔ اس کی نیلگوں آنکھوں سے آسمان جھلکتا ہے اور اس میں کہانیوں کی سبز پریاں رقص کرتی ہیں''۔

''دل اپنے اندر ڈھونڈتا ہے یا اس میں؟''

''ہر موڑ پر یہ تمھارے ساتھ ہوگی اور ہم خیال بھی۔ یہ تعلیم یافتہ ہے اور نئے زمانے کی سمجھ رکھتی ہے۔''

''عورت اور مرد کے انگنت رشتوں میں بس یہی ایک رشتہ پناہ کے لئے رہ جاتا ہے۔''

''کردار کو بہالے جانے والے سیلاب کی روک تھام کے لئے بند ضروری ہے۔ اس کے علاوہ خالق اور تخلیق کے سمبندھ کو دوام بخشا ہوتا ہے تاکہ افزائشِ نسل کا سلسلہ برقرار رہے۔''

''عہد کے ساتھ بے شمار خوشگوار اور ناخوشگوار تبدیلیاں ہوئیں، مگر کچے دھاگے کا بندھن نہ ٹوٹا اور نہ بدلا۔''

''سوچو یہ کڑی کتنی مضبوط ہے۔''

''اور کمزور بھی۔ یہاں سب کچھ اپنا نہیں ہوتا۔''

ملن تو ہوا، مگر اپنی تقسیم سے گزرنا دونوں کو گوارا نہیں تھا۔ اس لئے شرارہ چمکا اور پلک جھپکتے راکھ ہوا۔ اسے بھی بندھن سے الرجی تھی اور چھٹکارہ کی کوئی صورت تلاش رہی تھی۔ ایک ہی راہ پر یکساں رفتار سے چلتے جانا، بار بار وہی جسم، انھی سانسوں سے ٹکرانا، وہی مہک، وہی بے مزہ مسکراہٹ، کھوکھلے قہقہے، روٹین ورک۔ کوئی اتار چڑھاو نہیں۔ نہ کوئی واقعہ، نہ حادثہ، نہ تازگی، نہ فرحت۔ ٹی وی کے اشتہارات کے سمان جینا جو صبح سے رات تک ایک ہی سُر میں بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ یہ سسٹم اسے بالکل ناپسند تھا۔ سات برس

سات یگوں کی مانند گزرے۔ سینے پر لدا بوجھ اتار پھینکنا تھا۔ باہر کا چمکیلا جہاں، متعدد خوشبوؤں سے بھرے درخشاں اجسام، رنگ برنگی محفلیں، جنونی رقص، دیوانے رقاص، عجیب سی بو، عجیب سا نشہ —— اور ان کے درمیان سمٹتے اور پھیلتے جانا۔ کوئی ابتدا، نہ انتہا۔ اپنی خبر سے بے خبر۔ موج انبساط پر ہچکولے کھانا اور بے خودی کے سرور میں ڈوبتے جانا۔

ماں نے بڑھتی دراڑ کو بھانپ لیا تھا۔ وہ ان کے لئے متفکر تھی۔ انھیں سمجھانے کی کوشش بھی کی۔

''ہر تعلق میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ہوتی ہے۔ نظریاتی اختلافات ہوتے ہیں۔ سمجھوتہ سے انھیں حل کیا جاتا ہے''۔

مگر یقین و اعتماد کی بنیاد متزلزل ہو چکی تھی۔ دوریاں بڑھیں تو بڑھتی ہی گئیں اور آخر کار فیصلے کی گھڑی بھی قریب آ گئی۔

عمل کے بغیر بھی شدید ردعمل —— اور ماں روشن اندھیرے سے ڈری سہمی انھیں اداس نگاہوں سے تک رہی تھی۔ اس نے جوڑنے کی پھر سعی کی۔

''اپنے باطن میں جھانکو اور ٹٹولو خود کے اندر ارض و سماں کی سرحدیں نہیں ہوں گی اور تم ایک دوسرے میں موجود ملو گے۔''

''بھیتر کی چوٹ کا احساس دیر سے ہوتا ہے اور اس کا درد دنوں قائم رہتا ہے اور برسوں تڑپاتا ہے۔''

''اپنے گھسے پٹے مشورے اپنے پاس رکھو۔'' جھنجھلائے ہوئے لہجے میں وہ بولا ''اس بار تم تنہا نہیں ہو۔ ہمارا وجود تمھارے پاس بطور امانت رہے گا۔''

دونوں اپنے اپنے کنبے کے ساتھ باہر نکلے، ذرا تھمے۔ ایک دوسرے پر الوداعی نظر ڈالی۔ ہاتھ ملایا اور بائی کہتے ہوئے اپنی اپنی سمت جانے کے لئے مڑ گئے۔

مگر وہ —— !

چند رنگین راتوں میں ٹپکے چند قطرے سے جنما وجود ان کی جانب تیزی سے دوڑا تھا —— اور اب ہانپتا ہوا ان کے بیچ کھڑا سوچ رہا تھا:

دائیں جائے یا بائیں؟

آگے یا پیچھے؟؟

یا یونہی ایستادہ پتھر بن جائے —— ؟؟؟

☆☆☆

منڈیر

● ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ [پاکستان]

وہ اپنے گھر کی منڈیر پر ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے اسے گھر کا صحن، دونوں کمرے اور باورچی خانہ صاف دکھائی دیتے تھے اور یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ وہ صبح سویرے اڑان بھرتا اور گھر کی منڈیر پر آن کر بیٹھ جاتا۔ پھر رات گئے جب تک سب لوگ سو نہ جاتے، وہ منڈیر پر بیٹھا رہتا۔ افرادِ خانہ کے دن بھر کے معمولات کو دیکھتا رہتا، اہلِ خانہ کی خوشیوں اور دکھوں میں شریک ہوتا، وہ ہنستے تو یہ بھی ہنس پڑتا، وہ آزردہ ہوتے تو وہ بھی افسردہ ہو جاتا۔ اس کا گھر کے سبھی افراد سے عجیب طرح کا تعلق تھا مگر گھر کے افراد کی نظروں میں اس کے وجود کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ منڈیر پر بیٹھا بھی ہوتا تو سب لوگ اس کو یوں نظر انداز کر دیتے جیسے وہ وہاں نہیں ہے۔

اس گھر کے تین فرد تھے، ایک والد جو زندگی کی چھ دہائیاں پوری کر چکے تھے، دوسری ان کی بیوی، اور تیسرا ان کا بیٹا بکل تین نفوس پر مشتمل یہ گھرانہ زندگی کے معمولات کو روٹین سے نبھا رہا تھا۔ گھر کا چوتھا فرد، ان کا بڑا بیٹا، شہر میں پھیل جانے والی وبا کے ہاتھوں زندگی کی بازی ہار گیا تھا تب سے اس گھر کی دیواروں سے ہنسی کی آوازیں نہ ٹکرائی تھیں۔ ماحول پر مستقل ایک سنجیدگی اور کچھ کھو جانے کی کیفیت طاری تھی۔ اُس کو کسی نے کبھی اہم بھی نہ جانا تھا۔ اس سے قبل بڑے بیٹے کی بیوی اور اس کا چار سال کا بیٹا اسی گھر کا حصہ تھے۔ بڑے بیٹے کی جدائی کے بعد حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ بہو اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر خود ہی ناراض ہو کر یہاں سے اپنے میکے چل گئی تھی۔ ایک گھر جو محبت کا مرکز و محور تھا، جس کے افراد کے باہمی تعلق اور محبت کی خوشبو ساری برادری میں پھیلی رہتی، ایک فرد کے رخصت ہو جانے سے وہ خوشبو اور تعلق کا وہ تانا بانا ٹوٹ گیا تھا۔ کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، ایک فرد کسی گھرانے میں کیا ایسا اہم بھی ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ اہلِ خانہ کو اس کے مرنے کے بعد ہی ہوا۔

شہر میں ایسی ہوا چلی کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سیکڑوں لوگ لقمۂ اجل بن جائیں

گے۔ اموات کا تناسب پہلے بھی کچھ کم نہ تھا مگر اس وبا کے پھوٹ پڑنے کے بعد تو جیسے زندگی بہت مہنگی اور موت بہت سستی ہو گئی تھی۔ شہر میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ اس سے پہلے لوگ اتنی تعداد میں بیمار نہ ہوئے تھے اور نہ ہی اتنی اموات ہوئی تھیں۔ اب تو ہسپتالوں میں ایسے مریضوں کی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ لوگوں کو یہ معلوم کرنے کیلئے کہ کیا وہ واقعی اس مرض میں مبتلا ہوئے ہیں، قطاروں میں گھنٹوں کھڑا ہونا پڑتا۔ سرکاری اور پرائیویٹ ہسپتالوں میں اتنی تعداد میں مشینیں نہ تھیں کہ وہ اتنے ہجوم کو پلک جھپکتے بتا سکتیں کہ ان کے خون کے اندر وہ وائرس موجود ہے یا نہیں۔ کیا یہ بیماری اس وائرس کے سبب تھی، لوگوں کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا۔ ایسی بے چینی، بے یقینی، زندگی کی اتنی بے اعتباری، موت کا اس سرعت سے بڑھتے چلے آنے کا تجربہ اس شہر کے لوگوں کیلئے نیا تھا۔ کئی صدیوں سے یہاں کوئی ایسا موذی مرض پھوٹا نہیں تھا لہٰذا ایسی کوئی ہنگامی صورتحال پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ حکومت کیلئے یہ الگ چیلنج بنا ہوا تھا۔ ہسپتالوں کا عملہ رات دن جاگ جاگ کر خود بیمار ہو گیا تھا۔ شہر میں اور کوئی سرگرمی ہی نہ تھی، گھروں میں دفتروں میں بازاروں میں، غرض ہر جگہ جہاں انسان تھے، اسی نامعلوم بیماری کا تذکرہ چل رہا تھا۔ حکومت، ڈاکٹر اور لوگ اپنے اپنے مفروضوں کے ساتھ زندہ تھے اور دوسروں کو ان مفروضوں کو یقین سے بیان کر کے قدرے تسلی آمیز جملے کہتے ہوئے خود ڈرے ہوئے تھے۔ مگر شہر میں یہ صورتحال بہت بعد میں پیدا ہوئی تھی۔ وہ اس کا اولین شکار تھا۔

اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ وہ اس موذی مرض کا شکار ہونے والا پہلا شخص تھا۔ اس کے اہل خانہ اب بڑے فخر سے یہ اعزاز لوگوں کو بتاتے تھے۔ وہ تو مر گیا مگر اہل خانہ نے اس کے مرنے میں اول آنے کو بھی اپنے لئے اعزاز سمجھ لیا تھا۔ وہ رات باقی راتوں جیسی تھی۔ اس کا سر قدرے بوجھل ہو رہا تھا، ہلکی پھلکی فلو کی شکایت بھی تھی۔ مگر یہ تو معمول کا حصہ تھا، چند ہفتوں بعد ایسا ہو جاتا تھا لہٰذا اس نے اس کیفیت کو کوئی اہمیت نہ دی، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کو اپنی آنکھوں کے پچھلے حصے میں ایک نئی قسم کا درد محسوس ہو رہا تھا، آنکھیں بند ہوتیں یا کھلی، اس کو درد محسوس ہوتا رہتا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے بھی آنکھوں پر مارے، مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ قدرے سردی بھی محسوس ہوئی، جسم تپنے کے ساتھ دکھنے بھی لگا تھا۔ مگر ایک بالکل الگ قسم کی کیفیت یہ تھی کہ جسم کی ہڈیاں درد کرنے لگی تھیں۔ بخار ہو جانے پر جسم درد کرتا ہے مگر ہڈیوں کا یہ درد بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ ہاتھ کو گھماتا تو ہڈیوں اور ان کے جوڑوں میں سخت درد محسوس ہوتا۔ اس نے صبح ناشتہ کرنے کے بعد ڈاکٹر سے رابطہ کیا اور اس کی تجویز کردہ ادویات استعمال کرنا شروع کر دیں۔ ڈاکٹر بھی قدرے کنفیوژن کا شکار ہو گیا، علامات بالکل ملیریا جیسی تھیں، مگر بخار ایسا ہی تھا جیسے عمومی طور پر ہو جاتا ہے۔ دو دن اسی صورتحال میں گزرے۔ بہت تکلیف دہ کیفیت سے وہ گزر رہا تھا، دوبارہ ڈاکٹر کے پاس گیا، اس نے کہا کہ کچھ دن تو دوا کو بیماری پر قابو پانے میں لگ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر نے دوا میں تبدیلی بھی کر دی مگر رات بہت تکلیف میں گزری، جو کچھ کھاتا تھوڑی دیر بعد الٹی ہو جاتی، پانی پیتا تو گھونٹ بھرنے کے بعد باقی منہ میں

رہ جاتا، حلق سے نیچے نہ اترتا، پیٹ کے اندر کچھ بھی غذا نہ جانے کے سبب کمزوری الگ ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس گیا اس نے خون کا نمونہ حاصل کیا، اور اگلے دن آنے کو کہا، مگر ایک دن اور ایک رات کیسے گزرے گی؟ وہ یہ سوچ کر رہ گیا، اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

گھر والے الگ پریشان ہو رہے تھے، بیوی کے مزاج میں تو ایک چڑچڑاپن آنے لگا تھا۔ اس کو مسلسل چارپائی پر لیٹے دیکھ کر اس کا بیٹا رونے لگ پڑتا تھا۔ اس کی ضد تھی، بابا اٹھ کر مجھے ساتھ لو اور باہر چلو، مگر اس کی جسمانی حالت ایسی نہ تھی بیماری کنٹرول ہی نہ ہو پا رہی تھی۔ والد اور والدہ بھی بے حد پریشان ہو گئے۔ چھوٹا بھائی بھی نوکری سے گھر جلدی آنے لگ گیا۔ اور پھر شام تک ڈاکٹروں اور ان کے کلینک کے بارے میں تبصرے ہوتے رہتے، مگر بخار کے مسلسل رہنے، آنکھوں کے پیچھے درد اور ہڈیوں کے جوڑوں میں ایک تکلیف دہ احساس، اور مزید یہ کہ الٹیاں کر کے ہمت ہی نہ رہتی کہ وہ سیدھا ہوتا۔ اسی طرح دوہرا ادھ موا ہو کر چارپائی پر پڑا رہتا۔ ڈاکٹر نے انٹی بائیٹکس تبدیل کر کے دی تو اس سے بیماری کی صورتحال اور بھی بگڑ گئی۔

خون کی ٹیسٹ رپورٹ کا رزلٹ آیا تو معلوم ہوا خون میں سفید جسیموں کی تعداد بہت کم ہوتی جا رہی ہے۔ ڈاکٹر نے ہی اسے بتایا کہ سفید جسیمے ہمارے جسم کا دماغی نظام ہوتا ہے اور جسم کے اندر ہونے والی کوئی بھی انفیکشن اور بیرون جسم لگنے والا کوئی بھی زخم ان سفید جسیموں کی مدد سے ہی مندمل ہو پاتا ہے۔ مگر جسم میں ان سفید جسیموں کو مزید کم ہونے سے روکنے کے لئے کیا کرنا چاہیے، اس بات کا جواب ڈاکٹر نے نہیں دیا اور اس کو ہدایت کی کہ وہ جسم میں پانی کی مقدار کم نہ ہونے دے۔ کھانا کھانے سے اگر اسے قے ہو جاتی ہے تو اسے مختلف پھلوں کے جوس وغیرہ استعمال کرنا چاہیے۔ پھل تو اسے نصیب نہیں ہوا تھا، پھلوں کا جوس کہاں خرید سکتا تھا۔ والد کے تھوڑے بہت پس انداز کیے ہوئے پیسے بھی ختم ہو گئے۔ اب تو پرائیویٹ کلینک کے بارے میں اس کے سوچنا بھی ناممکنات میں سے تھا، لہٰذا سرکاری ہسپتالوں کا رخ کیا۔ کون سا ڈاکٹر کسی ہسپتال میں بیٹھتا ہے، یہ بات بتانے والے تو بہت تھے، مگر ان ہسپتالوں میں اس کی باری کب آئے گی، اس کے بارے میں کوئی معاونت نہ کرتا تھا۔ ایک ایک دن کئی صدیوں پر بھاری محسوس ہوتا تھا۔ بخار ٹوٹنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ ہڈیوں کے اندر شدید درد نے اس کیلئے ناقابل برداشت صورتحال پیدا کر دی تھی مگر کسی طور سکون نہ آتا تھا۔ اس اذیت ناک بیماری سے تو کہیں بہتر تھا کہ وہ مر جائے، وہ بھی سکون کی نیند سوئے اور گھر والوں کی پریشانی بھی ختم ہو، مگر موت اس گھر کی منڈیر سے نیچے اتر نہیں رہی تھی۔

بیماری کی پانچویں ساری رات وہ سخت تکلیف میں رہا اور ایک لمحہ بھی سو نہ سکا۔ کھانسی کا دورہ پڑتا، ریشہ کے ساتھ قے بھی آنے لگی تھی۔ کمرے میں ہر طرف تعفن پھیلا ہوا تھا۔ صبح فرش پر پڑے تھوک کو دیکھا تو اس میں خون کے ریشے نظر آئے تو گھر والے اور پریشان ہو گئے۔ یہ پہلی قیامت تھی جو اہل خانہ پر ٹوٹی

تھی۔ اس روز اس کی نازک صورتحال دیکھ کر چھوٹے بھائی نے کام پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ چھوٹا بھائی ایک پرائیویٹ کمپنی میں ڈرائیور تھا، مالک کے پاس گھر صبح کے وقت پہنچنا ہوتا تھا، پہلے اس کے بچوں کو سکول چھوڑ کر آتا، پھر مالک کو دفتر اور اس کے بعد بیگم صاحبہ کی کوئی مصروفیت نکل آتی تو دن میں وہ اسے نبھاتا رہتا۔ مالک کو فون پر بھائی کی بگڑتی ہوئی صورتحال سے اس نے آگاہ کیا تو اس نیک بخت نے کہا کہ میری گاڑی میں بھائی کو ہسپتال لے جاؤ۔ وہ مالک کا بہت شکر گزار ہوا۔ بچوں کو اسکول اور مالک کو دفتر چھوڑ کر گھر پہنچا، بھائی کو گاڑی میں ڈالا اور پھر ہسپتال چلا گیا۔ ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال، ایک ڈاکٹر سے دوسرے اور پھر تیسرے ڈاکٹر کے پاس سے ہوتا ہوا نہ جانے وہ کتنی صدیوں کا سفر طے کر گیا۔ سڑک پر پہلی مرتبہ اسے معلوم ہوا کتنا ہجوم ہوتا ہے، لوگ کتنے سکون اور سست رفتاری سے جانب منزل رواں ہوتے ہیں، چوک کا اشارہ کئی کئی گھنٹوں کے بعد سبز ہوتا ہے، اور بعض سڑکوں پر تو دوسری جانب واقع ہسپتال تک پہنچنے کا رستہ ہی نہیں ملتا۔ ڈاکٹر کے کمرے کے باہر مریضوں کی اتنی لمبی قطار ہوتی ہے کہ باری آتے آتے مریض دم توڑ جاتا ہے اسے یوں لگا جیسے کئی مریض اس کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ گئے ہیں۔ ایک ہسپتال سے دوسرے ہسپتال تک جاتے ہوئے اسے کئی سال بیت گئے، درد سے یوں دہرا ہوتا تھا، جیسے اب واپس پہلی حالت میں آئے گا ہی نہیں۔

چھوٹا بھائی اس کو گاڑی میں ڈالے سارا دن یونہی پھرتا رہا، کسی ڈاکٹر یا ہسپتال سے رہنمائی نہ ملی۔ گاڑی میں لیٹے لیٹے اس کی حالت جب زیادہ خراب ہونے لگی، تو اس نے نہایت بے چارگی سے گاڑی نہر کے کنارے کھڑی کرنے کیلئے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے خواہش ظاہر کی کہ وہ نیچے اترنا چاہتا ہے مگر کمزوری اتنی تھی کہ اس نے اپنا ارادہ موقوف کر دیا اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے نہر میں نہاتے ہوئے بچوں کو دیکھنے لگا۔ اس کو وہاں اپنا وجود بھی نظر آیا اور چھوٹا بھائی بھی، دونوں بچپن میں اس نہر میں ڈبکیاں لگانے آتے تھے، وہ کافی دیر وہاں کھڑا رہا۔ کوئی بات نہیں کی۔ بھائی کو کہا: مزید کوشش بے فائدہ ہے، مجھے گھر لے چلو، میں بیٹے سے ملنا چاہتا ہوں، والد کے قدموں میں سر رکھ کر ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں، میں بڑا ہونے کے باوجود کچھ نہ کر سکا۔ مجھے ماں کے ہاتھوں کی جھریوں بھری ہتھیلیوں سے سکون کے لمحات چرانے ہیں۔ اتنی لمبی بات کر کے اس کا سانس اکھڑ گیا، چھوٹے بھائی کا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا تھا، اتنے بڑے شہر میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا کہ جس کے پاس وہ جا کر وہ اپنے درد کا درماں کرتے، سرکاری ہسپتالوں میں داخلے پر تو کوئی پابندی نہ تھی مگر ڈاکٹر کے کمرے میں جانے کیلئے بڑی سفارش کی ضرورت تھی، جو ان کے پاس نہیں تھی۔

گھر پہنچنے کی دیر تھی سب کچھ چند لمحوں میں ہی ہو گیا۔ اس کے چہرے پر جو اذیت کئی دنوں سے نقش ہو کر رہ گئی تھی، بارش کے بعد جیسے درختوں کے پتے دھل کر نکھر جاتے ہیں، اس کا چہرہ بھی ایسا ہی پر سکون

ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک طویل اذیت ناک سفر کے بعد کوئی منزل مقصود پر پہنچ کر سکون کی نیند سو یا ہو۔ تکفین و تدفین کے مراحل طے ہو گئے۔ اس زمین پر اس کا وجود محض مٹی کی ایک ڈھیری کی صورت میں رہ گیا تھا جس پر گلاب کے پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں، ان پتیوں نے بھی خشک ہو کر اس کی طرح مٹی میں مل جانا تھا، اس قدر مشترک کے احساس نے اس کے اندر زندگی کی حقیقت کو قبول کرنے کا حوصلہ پیدا کیا تھا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔

اس کے ماں باپ کو احساس ہوا جیسے شہر میں یہ پہلی موت ہوئی ہے، اس سے پہلے تو جیسے کوئی مرا ہی نہیں تھا۔ چھوٹا بھائی چند دنوں میں کتنا بڑا ہو گیا۔ اگلے چند روز تک شہر میں قبروں کی تعداد میں نہایت تیزی سے اضافہ ہونے لگا، یوں لگتا تھا سارا شہر ہی بخار میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ہڈیوں کے درد کے سبب مریض انتہائی تکلیف دہ حالت سے گزرتے۔ ڈاکٹر صاحبان ٹیلی ویژن اسکرین پر اچانک پھوٹ پڑنے والے اس مرض کے بارے میں لوگوں کو ابتدائی معلومات فراہم کر رہے تھے، ہر روز ان کے بیانات میں تبدیلی آ جاتی۔ اس بخار کا سبب انھوں نے ایک ایسے مچھر کو گردانا جو اپنے اندر ایسے وائرس کی پرورش کر رہا تھا جو یہاں کا تھا ہی نہیں، ایک تھیوری یہ تھی کہ درآمد ہونے والے ٹائروں کے توسط سے یہ مچھر اور وائرس کسی دوسرے ملک سے اس شہر میں پہنچا ہے۔ کوئی کہتا دشمنوں کی سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت یہ بیماری اس شہر میں پھیلائی گئی ہے۔ ڈاکٹروں نے کسی بھی قسم کی اینٹی بائیوٹکس لینے سے منع کر دیا۔ خون میں کم ہوتے ہوئے سفید جسیموں میں اضافہ کیلئے انار اور سیب کے جوس کے استعمال پر زور دیا گیا۔ کسی نے پپیتے کے پھل کو مفید پایا تو کوئی اس کے پتوں کو توڑ لایا۔ لوگ گھروں میں نہ بیٹھتے تھے کہ یہ مچھر گھروں میں ہو سکتا ہے۔ کسی نے کہا اس کی افزائش صرف صاف پانی میں ہوتی ہے، کسی نے بیان دیا کہ یہ مچھر صرف صبح اور شام طلوع و غروب کے وقت کاٹتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی تھیوریاں۔ میڈیا نے شہر میں ایسا ہراس پھیلا دیا کہ حکومت کو براہ راست اپنا کردار ادا کرنا پڑا۔ جو لوگ بیماری میں مبتلا تھے ان کیلئے فری دوائیاں اور ٹیسٹ اور جو مر رہے تھے ان کیلئے پانچ لاکھ روپے، جب پانچ لاکھ روپے کی بات شروع ہوئی تو اس کے والد نے بھی اس کے خون کی ٹیسٹ رپورٹ متعلقہ ہسپتال میں دکھائی تو انھوں نے اس موت کو بھی اسی بیماری کا سبب جانا اور تصدیق نامہ جاری کر دیا۔

یہ خبر اس کی بیوی تک بھی پہنچی، اور بیوی کے ماں باپ تک بھی۔ ابھی اس کی قبر کی مٹی سوکھی نہ تھی، پھولوں کی پتیاں مٹی میں ملی نہ تھیں کہ گھر اجڑ گیا۔ والد کا خیال تھا، چونکہ اس کا بیٹا تھا، اور اس کے علاج کے لئے اس نے جمع پونجی خرچ کر دی تھی لہذا اس پانچ لاکھ پر اس کا حق تھا۔ حکومت نے یہ چیک والد کے نام کا جاری کیا، اس نے اس میں سے معقول رقم اپنی بہو کو دینے کی کوشش بھی کی مگر بہو کی ماں نے انکار کر دیا۔ کچھ دن اسی گرما گرمی میں گزرے، حالات کچھ معمول پر آئے تو والد نے اس رقم سے اپنی بیوی کے ہمراہ عمرہ پر جانے کی تیاری کر لی۔ چھوٹے بھائی کو ایک پرانی پک اپ خرید دی اور اس نے ڈرائیور کی نوکری چھوڑ کر

بیکری کی اشیاء کو دکانوں پر پہنچانے کا کام شروع کرلیا۔ چند مہینے گزرے، اس کی بیوہ نے دوسری شادی کرلی ،اس کا بیٹا نانا نانی کے پاس رہنے لگا، یہ تمام تبدیلیاں چند مہینوں میں ہی ہوگئیں۔ وہ کئی سال کی انتھک کوشش کے باوجود بھی گھر میں کچھ تبدیل نہ کرسکا مگر اس کی آنکھیں بند ہونے کے ساتھ ہی یوں لگا ہر شے جیسے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی ہو، جیسے اسی کے سبب یہ سب کچھ رکا ہوا تھا۔

صبح جب اس کا چھوٹا بھائی پک اپ وین نکال کر کام پر جاتا ہے، تو ہر روز گھر کے دروازے سے نکلتے ہوئے پیچھے مڑ کر منڈیر کی طرف خالی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اسے شدید احساس ہوتا ہے کہ وہاں کوئی بیٹھا اس کو دیکھ رہا ہے مگر منڈیر خالی پا کر وہ خالی آنکھوں سے گھورتے ہوئے باہر نکل جاتا ہے۔ اس کا والد اور والدہ دن کے اوقات میں کئی بار چونک کر گھر کی منڈیر کی جانب دیکھتے ہیں، کبھی کبھی ان کو ہیولہ سا نظر آتا ہے، مگر نظریں جما کر دیکھنے پر وہاں کوئی نہیں ہوتا۔ والدہ رات کی بچی ہوئی روٹی کے چھوٹے ٹکڑے کرکے اوپر چھت پر پھینک دیتی ہے، پرندوں کو بھی تو چوگا چگنا ہوتا ہے۔ والدہ سہ پہر کے وقت چھت پر رکھے پیالے میں پانی ڈال آتا ہے، فضاؤں میں پرواز بھرنے والے پیاسے پرندے چھت پر اتر آتے ہیں، اپنی پیاس بجھاتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ اسے حیرت ہے کہ وہ بھی منڈیر پر بیٹھا ہوا ہے مگر نہ تو والد اس کو دیکھ پاتا ہے اور نہ ہی والدہ کی آنکھوں میں اس کا عکس اترتا ہے۔ بھائی بھی صبح گھر سے نکلتے ہوئے خالی خولی آنکھوں سے منڈیر کی طرف دیکھتا ہے مگر کچھ دیکھ نہیں پاتا۔ دن میں کچھ وقت کیلئے وہ اڑان بھر کر اپنے بیٹے کو دیکھنے اس کے نانا، نانی کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ بیٹا اس کی جانب دیکھ کر خوش ہوتا ہے، چھوٹے چھوٹے نامکمل جملوں میں اس سے باتیں کرتا ہے۔ نانا، نانی اکیلے میں اسے باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ اس کے اردگرد کوئی نہیں ہوتا مگر نانا نانی کو بیٹے کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ کوئی اس کمرے میں موجود ہے مگر وہ کون ہے، اس کا کسی کو علم نہیں مگر ماں کی ممتا سے محروم بیٹا، پدری شفقت کے سائے میں دن بدن بڑا ہو رہا ہے۔

☆☆☆

شہرِ اشتراک (۱) ایک طویل پنجابی نظم

آؤ راس رچائیں!

●تخلیق و ترجمہ: رتن سنگھ

میں ہی وہ پہلا
مرد۔ ماں ہوں
جس کی کوکھ سے پیدا ہوئی
دنیا ساری
میرے اندر
میرے تن کا حصہ بن کر
رہ رہی ہے میری ناری

جیسے میرے ہاتھ پاؤں میں
میرے تن کے رنگ
اسی طرح ہی
دوسرے رنگوں کی بھانتی
میری ناری۔ میرے سنگ۔

ناری۔ مرد کی ساری کریا
اندر ہی اندر ہوتی ہے
چُپ چپیتی۔
اپنے آپ ہی
ایسے جیسے سانس لینے کا پتہ نہیں چلتا

ویگ پیار کا میرے اندر
متواتر بہتا
آدِ کال سے۔

یہ پیار ہے بڑا نیارا
بڑا جوشیلا
میرے خون میں رچا ہوا ہے
جیسے پانی بہتا بہتا
کل کل کرتا، سَر سَر کرتا
میرا پیار بھی میرے اندر
ایسے لگتا
جیسے کوئی ساز ہے بجتا
یہ ساز ہے میٹھا، میٹھا
بڑا سُریلا۔
ہمیشہ، متواتر
میرے وجود کو بھرتا
میں خوش خوش سا رہتا ہوں
پیار کا سچا سُکھ لیتا ہوں

میں ہی وہ پہلا
مرد ماں ہوں
جس نے پیدا کی ۔ کل سرشٹی
اپنے اندر سے
مجھے کوکھ کی ضرورت نہ کوئی
خود ہی میں نر ہوتا ہوں
خود ہی میں ناری ہوتی

میرے تن کا بستر ایسا
یہ ایسا نیا ہوا ہے
میرے وجود کا انگ انگ جیسے
کوکھوں سے بھرا ہوا ہے
میرا تن بھی کوکھ
میرا من بھی کوکھ
اسی لیے ہے میرے اندر
دنیا پیدا کرنے کی بھوک
میرا تن، برہمانڈ ہے پورا
اِس کے اندر، لاکھ کروڑوں کن ہیں بستے
اِک دوجے کے ساتھ سٹ کر بیٹھے
جیتے ہیں وہ ہنستے ہنستے
ہر اک کن کی پوری بستی
اس بستی میں دو جن رہتے
اک نر، اک مادہ
اک کاہن اک رادھا

لاکھ کروڑوں، کنوں کے اندر
کاہن بھی لاکھ کروڑوں
جتنے کاہن، اُتنی رادھا
گوپیاں اور میں جوڑوں
لاکھ کروڑ بانسُریاں بجتیں
لہر لہر سُر سُر کرتی
سب کی سب دِشائیں ناچیں
ہواؤں میں ہے مِٹھت بھرتی
لہر لہر ہے سر سر کرتی
تن کی دوتی سج کر بیٹھی
بانسری کی دھن اتنی بھینی
اس کو سُن سُن جان نکلتی
رادھا کی تو پوچھو نہ کوئی
سُن سُن بنسی بے کل ہوئی
گوپیوں کے من پنچھی بنتے
آجاتے ہیں اُڑتے اُڑتے
لہک لہک کر بنسی باجے
تھرک تھرک کر رادھا ناچے
گوپیوں کو تو چاؤ چڑھا ہے
اور کانھا کو گھیر لیا ہے
ناچتا ناچتا نٹ کھٹ کانھا

لاکھوں کروڑوں روپ دھار کے
ایسی راج رچاوے
تن کی دھرتی ہنستی ہنستی
یہاں متھرا بن جاوے

اس راس کی کیا بات بتاؤں؟
اس راس کی کیا گاتھا گاؤں؟
کیسے حال سناؤں؟

پانچوں اجزا وید میں آکر
گھومتے ہیں برہمنڈ کے اندر
برہمنڈ کے ہر اک کھنڈ کے اندر
دھمال ناچتے
گگن سے واپس آتے آتے
چن چن کر چاند اور تارے
توڑ توڑ کے ہاتھ سے لاتے

میرے تن کی دھرتی کے اندر
جگ مگ جگ مگ ہوتی
ایسے میں ہے کاہن کی لیلا
نئی کہانی کہتی

موہ میں بھیگے سب کے من
بچے اور بچے سب کے تن
کون ہے گوپی کون ہے رادھا

کون ہے آن میں کانھا
راس رچاتے اک ہو جاتے
کیا تانا کیا بانا
سب گوپیاں، رادھا ہو جاتیں
اور رادھا کانھا ہوتی
سب کے اندر کاہن سمایا
بھید رہے نہ کوئی۔
قطرہ قطرہ مل کر جیسے
بن جاتا ہے ساگر
ایسے ہی تب تن بھی میرا
بن جاتا رتناگر
یہ تن ہے رتنوں کا ساگر
عجب ہے راس کی نہجر
سمجھ نہ پایا خود دھنونتر
دیکھنے میں یہ مٹی کی کایا
ہارمانس میں بندھی ہے مایا
کہتے ہیں کہ اب کے اس کو
اپنا ہی ہم شکل بنایا
اپنے گن، اپنی اچھائی
ساری کی ساری اسی میں دکھائی

پتہ نہیں اس میں کتنی سچائی
یہ بات لیکن ہر اک ہے کہتا
کہ رب ہے اس میں خود ہی رہتا

یہ بات بھی گر ہو نہ سچی
اتنی تو لیکن سچی کی سچی
یہ بات تو ہر کوئی کہتا
کہ اس کے اندر مَن بھی رہتا

مَن کا تو ہے عجب ہی لیکھا
رب کی بھانتی، روپ نہ دیکھا
یہ مَن؟
میرا سب سے بڑا دھن
کیا گُن گاؤں اس کے.... ولآ
یہ بھی میرا...... اللہ
اللہ کو جیسا سُہا آیا
ویسا ہی سنسار بنایا
ایک بار سب پیدا کر کے
بیٹھا اپنی رچنا کو دیکھے

میرے مَن کے لیکن لاکھوں لیکھے
لاکھوں لیکھے، کس نے دیکھے؟

اس مَن کی مایا
آج تک کوئی سمجھ نہ پایا
دھرتی کے اُوپر آکاش ہے جیسے
ہر وقت ہی
چھتری بن کرتا ہے رہتا
مَن بھی میرا بت نرنتر

اپنا سا رَب بنا ہے رہتا
میرے تن پر راج ہے کرتا۔

رَب کا پھرنا
ایک ہی بار
مَن کے پھرنے
بڑا وِستار
کہ کوئی آر
نہ کوئی پار
ہر وقت چڑھے گھوڑے اَسوار
جدھر کو چاہے اُدھر کو جائے
جدھر کو چاہے مجھے لے جائے
کس کی ہمت جو اِسے روک پائے
سَمے کی سیما
قدروں کے تالے
عقلوں کے بندھن
اِس نے توڑے سارے کے سارے
اِتنا تیز بہاو ہے اس کا
پہاروں جیسی شکلوں کو بھی
تنکوں جیسا بہا لے جائے

یہ کبھی آرام نہیں کرتا
سدا جاگتا
کبھی نہیں سوتا
جیون کے آرمبھ سے لے کر
انتم سانس تک

پتہ نہیں یہ کیا چاہتا
پتہ نہیں یہ کیا ڈھونڈے
ہر وقت رواں ہیں رہتے
اس کے چنتن کے گھوڑے
لاکھوں راہیں اس نے روندیں
لاکھ دشائیں اس نے ڈھونڈیں
آسمان سے اُوپر جا کر
پتہ نہیں کون کون سی جگہ پر
اپنے ہونے کی، لکیریں کھینچیں
پلک جھپکتے بھر میں ہی تو
رستے نئے تراشے جاتے
کتنی دنیاؤں کے نقشے
بناتے جاتے، مٹاتے جاتے۔

کیسے بتاؤں اس کی کرتوت
چھل دار ہے اس کا سوت
کوئی سرانہ اس کا ملتا
یہ حال ہے میرے اس رب کا
ہر اک قصہ لمبی تانی
ہر گاتھا ہے رام کہانی
سیوا، سچ، ستکار، مریادا
اِن گنوں کے ہوتے ہوتے بھی
چھل، کپٹ میں اور زیادہ
دونوں میں گھمسان ہے مچتا
رام، راون کا بدھ بھی کرتا
مرا ہوا جی جاتا ہے راون

ہنستا ہنستا
یہی بکھیڑا
یہی جھگڑا
آئے کوئی بالمیک تو کرے فیصلہ

من کی مایا
بڑی نرالی
بڑی انوکھی
ہر بانگی الگ الگ سی

ستیم، شِوم، سُندرم
کے گُن جو سارے
اِس کے اندر چمکتے
جیسے چمکیں تارے
چوتھا گُن ہے من کے اندر
موہ کی مایا
آج تک میں تو خود بھی اس کو
سمجھ نہ پایا۔
میرے سارے وجود کے اوپر
اِس کا سایہ
ہر دوسرے گُن کے اُوپر
اس نے اپنا رنگ چڑھایا
بادل کی پرتوں کے پیچھے
کبھی تو چاند ہے سندر لگتا
من موہنا لگتا
کسی وقت پورا چھپ جائے

اپنا سارا رُوپ گنوائے
اور کا اور ہو جائے

اسی طرح ہے موہ کی مایا
لالے، سب گنوں کی کایا
اس کے تیز بہاو کے آگے
ستاروں کی تو اوقات ہی کیا ہے
بڑے بڑے سورج نہیں ڈھلتے
اس نے ایسے چاند چڑھائے
ساری کی ساری دنیا
ہونٹوں پہ اُنگلی رکھ کر
دیکھتی رہ جائے
کچھ کہنے کی گنجایش نہ رہتی
اپنے میں ہی گم ہو جاتے
دیکھتی دیکھتی
موہ کی مایا
ایک طرح گر، سوچ کے دیکھو
اسی سے سب کچھ ہوا ہے پیدا
کبھی کبھی تو ایسے ہے لگتا
موہ کے بس میں ہو کر رَب نے
کائنات کا کھیل رچایا

موہ کیا ہے؟
اچھا لگنا۔
اچھا لگا ہو گا رَب کو
اپنا سپنا۔

دیکھا ہو گا
اندھیرے کے ہم پربت سے
گومکھ کو پھوٹتے
گومکھ جس سے بہہ نکلی تھی
کل کل کرتی جیون گنگا۔

اپنے نور کی جھلک دیکھ کر
نہیں دبا ہو گا
اپنی قدرت کی شان دیکھ کر
اپنے موہ میں
خود ہی رَب پھنس گیا ہو گا

اپنے آپ سے موہ ہونے کی
بڑی خماری
اس سے رَب بھی بچ نہ سکا ہے
باقی دنیا کون بے چاری۔
اس موہ کے نشے میں ڈوبے
رَب نے نظر لہر کی ماری
برہمنڈ نور، نور ہو گیا
جگ رچنا کی ہوئی تیاری
نور نور نظر کا
ایک ہی بڑا اجھلکارا
جگ مگ جگ مگ ایسی ہوئی
گگن بن گیا، سارے کا سارا
ٹم ٹم کرنے لگے ستارے
چاند اور سورج چمکے

برہمنڈ نور نور ہو گیا
کن کن اس کے دمکے

اس نور نے چھوا دھرت کو
پوری گئی شنگاری
پلوں میں بن گئی کنواری کنیا
نئی بیاہی لاڑی

مول پڑا انگ انگ دھوتی کا
کن کن بن گیا کُکھ [کوکھ]
ہر اِک کن سے پھوٹ پڑا پھر
جیون نام کا برکھ [پیڑ]
پربت اُونچے اُونچے ہو گئے
چوٹیوں پر وہ ڈھکے برف سے
ڈھلانوں سے بہہ نکلیں ندیاں
اور پہاڑوں سے جھرنے
دریاؤں میں آئی روانی
دریا! جنھوں نے
جیون کے ساگر میں بھرنے۔
ہوا اُگی اور بنسپت مہکی
دھرتی نے لی انگڑائی
جی سجائی لگتی ہے یہ
دُلہن نئی بیاہی۔

اس گوری کی کیا بات بتاؤں
لاکھ کروڑوں رُوپ ہیں اس کے
لاکھ کروڑوں ادائیں
لاکھ کروڑوں رنگ ہیں اس کے
لاکھ کروڑوں رُوپ
ہر رُوپ کے رنگ انوکھے
ایک سے ایک انوپ۔

اس گوری کا رُوپ تھا ایسا
رَب بھی اس پر ہوا آکرشت
مایا جال میں پھنس گیا تھا۔
سُورگوں کے سب سُکھ پسارے
لاکھ کروڑوں رُوپ رَس دھارے
کن کن میں پھر رچ گیا وہ
دھرتی پر آکر بس گیا وہ
موہ کی منتھت
لذت ہی لذت
سواد سواد کن کن ہو جائے
میٹھا میٹھا من ہو جائے
تن بن جائے سریلا ساز
لاکھ سُروں کی اک آواز
اس کے کسی تاروں کے اُوپر
جب پیار کا گز ہے چلتا
کچھ نہیں رہتا اس کے من کا
ایسی تیکھی، موہ کٹار
اس سے گھائل سب سنسار

بندے کی تو بات نہ پوچھ

یہ تو سارا جگ ہے جانتا
دیو گن بھی جھیل سکے نہ
اس کی مار۔

برہما جیسے مہادیو بھی
موہ کے ہاتھوں چھلے گئے تھے
اندر جیسے مہابلی بھی
اس سانچے میں ڈھلے پڑے ہیں۔

قدرت کا تو کھیل ہی سارا
موہ مایا پہ ٹکا ہوا ہے
سارا جگ ہی اسی ہاٹ پر
اونے پونے بکا ہوا ہے
اسی وجہ سے گگن کے اوپر
دنیا دیکھے
اس دنیا کے موہ میں پھنس کر
سورج نے تن کو آگ لگائی
اور اسی سے طاقت لے کر
جیون پائے، کُل خُدائی
چاند، تارے اور سیارے
موہ کے مارے، سارے کے سارے
اک دوجے کے اردگرد
سب گھوم رہے ہیں
اک دوجے سے جُڑ کر بیٹھے
کبھی کبھی تو ایسا لگتا
اک دوجے کو چوم رہے ہیں !!

موہ مایا کی پٹی پڑھ کر
گگن کے اُوپر چل رہی ہے
پیار کہانی
پیار کہانی، بڑی لاثانی

اسی موہ مایا کا سایا
گگن سے اُتر دھرتی پر آیا
یہاں آ کر اس نے
رُوپ بدلایا
اپنا نام ہے عشق دھرایا
اپنی چوسر ایسے ہے بچھائی
پہلے پیار کی چناب بہائی
میٹھی بانسری، آپ بجا کر
ہیر رانجھے کا رُوپ بنا کر
جوڑی ایسی پریت
چل دی پیار کی ریت
ان دونوں کے وصل کا صدقے
ساری خلقت ہوگئی پیدا
بڑھا پریوار موہ مایا کا
جتنے بھی ہیں نقش جیون کے
دھرم، ارتھ، سب اس کے لیکھے
سب سنسار ہے موہ کا جایا
موکش کا بھید ہے، کس نے پایا !

سب سے پہلے
سر شٹی کے رچیتا
برہما جی کو اس نے بس میں کیا
سرسوتی جی کی سندر مورت
برہما جی نے خود ہی بنائی
خود ہی اُس پر موہت ہو کر
دیوتا والی آب گنوائی

کام دیو نے وار کیا تو
ہر اک تیج پست ہو گیا
مایا کے مُکھ منڈل کی چمک دیکھ کر
وشنو کا سورج است ہو گیا
مانا کہ رام رُوپ میں
راج موہ کا تیاگ کیا تھا
چودہ برس بن باس لیا تھا
سُرپ نکھا کے رُوپ کو اُس نے
آک کیا تھا
رام بھی لیکن، رام راج کے لالچ میں
مَن موہ میں پھنس گیا تھا
سیتا کو بن باس بھیج کر رویا تھا وہ
سارا جگ اُس پر ہنس رہا تھا
دُوا پر یگ تک پہنچ کر
موہ مایا نے
اپنا رُوپ بدلایا
سولہ سنگار کر کے، وہ بچی
رادھا نام دھرایا۔
پھر خود ہی بنسی بنی کرشن کی
اُس میں مٹھت ملائی
گوپیوں کے سنگ مل کر اُس نے
ایسی راس رچائی
وشنو رُوپ کانھا کے اُوپر
جادو ایسا چلایا
اُس کو تگنی ناچ نچایا
رَب کو ایسا دیکھ ناچتے
جگت تماشے آیا۔
یہ ہے موہ مایا کی گاتھا
چھپتی نہیں چھپائی
دیکھے، کُل لوکائی

ایک تھی مینکا ایک اُروَشی
چلو اور بھی گن لو
رمبھا جیسی ایک اور سہیلی
ان کی بھی ہے عجب پہیلی۔
رشی کی رَب سے لَو لگی۔
تپسیا پوری ہونے والی ہے۔
اَنہد کی دُھن بس بجی کہ بجی۔
اِتنے میں ہی آئی اُروشی
کرنے رشی سے ٹھگی
کالے کالے بادل گھر آئے
ٹھنڈی ہوائیں ساتھ میں لائے
سفید سے پنچھی گگن میں اُڑتے

درشن ہوگیا من موہنا
باقی کی بات سب جانتے
آگے کیا ہے ہونا۔

اِکا گرچت رِشی کے من میں
ایک اونکار، ایک اونکار
اِتنے میں ہی کانوں میں پڑگئی
اُروشی کی میٹھی میٹھی
جھانجھر کی جھنکار
اِدھر رِشی نے آنکھ کھولی
دیکھا رُوپ کا جلوہ
ایک عمر کی تپسّیا کا پھل
پل میں ہوگیا کڑوا۔

رِشیوں مُنیوں کی کٹھن ریاضت
پلوں میں ہوگئی غارت
اپنے پورے ہوش حواس میں
رِشی مُنی سب
ان کا رُوپ ہی دیکھتے رہ گئے
بس اتنے میں ہی
بھگتی کے سب رنگ کمائے
پھیکے سے بھی پھیکے رہ گئے
مایا، اتنی بڑی سچائی
اِس کی تھاہ ہے کِس نے پائی
کئی سیانے ایسا کہتے
سَو یوجن گگنوں کے اوپر
اِس کی اُونچائی
سَو یوجن ساگر کے نیچے
اِس کی گہرائی
دھرتی پر اِس کا کتنا پھیلاؤ
اِس کی بات نہیں ابھی بتائی۔

اِیک اُروشی، اِیک مینکا
موہ مایا کے کام کاج میں
اِن کی ہے بڑی بھومِکا۔

یہ ہوتی ہیں لاکھ کروڑ
دھرتی پر ان کا ناچ ہے ایسا
جیسے باغ میں ناچے مور۔
بڑے رنگین ہیں ان کے پنکھ
رُوپ رنگ تو گِنے نہ جاتے
یہ تو ہیں اَسنکھ
رُوپ رنگ کے پہن کے زیور
دلہن جیسا سنگار بناکر
میرے کن کن میں ہیں رہتیں
کِھل کِھل ہنستیں
کرتی رہیں کِلول
میٹھے اِن کے بول
نشہ تو رہتا ہے چڑھا ہی رہتا
اسی لیے تو میں ہوں کہتا
میں ہی وہ پہلا مرد — ماں ہوں
جس کی کوکھ سے پیدا ہوئی دنیا ساری

میرے اندر
میرے تن کا حصہ بن کر
رو رہی ہے میری ناری۔
لاکھ کروڑوں گنوں کے اندر
کاہن بھی لاکھ کروڑوں
جتنے کاہن، اتنی رادھا
گوپیاں الگ سے جوڑوں

نٹ کھٹ کانہا
لاکھ کروڑوں رُوپ دھار کر
ایسی راس رچاوے
تن کی دھرتی
ناچتی ناچتی
مہا متھرا بن جاوے۔

مہان متھرا ہے ایسی بستی
جس کی حدیں
ساری دھرتی
سارے دیش محلّے اس کے
چھوٹی بڑی سی گلیاں
اس باغ کے پھول ہیں سارے
اس باغ کی کلیاں۔

کیا گورے کیا کالے لوگ
سارے کے سارے
اس مہان متھرا کے
گھر والے لوگ۔

سب لڑکیاں رادھا، گوپیاں
لڑکے بال گوپال
جمنا کنارے، راس رچاتے
ناچتے رہیں دھمال
جمنا ہی ہے، ٹیمز بن گئی
ٹیمز بنی جھناں [چناب]
لہر لہر ہے لہر پیار کی
ساگر کی طرف رواں
پیار کا ساگر ٹھاٹیں مارے
چاروں طرف ہے گھیرا
ساری دھرتی متھرا بن گئی
بنی پیار کا ڈیرا۔

کرشن کنہیا کی بنسری بولے
گوربانی کا فرمان
''ایک نور تے سب جگ اُپجیا''
اِس کے معنی ہی ہیں ہوتے:
ایک سے، سب انسان

اتنے میں مکّے سے گونجی
سریلی میٹھی سی اذان
اُونچی آواز میں وہ ہے کہتی:
''یہی تو کہے قرآن''
کلیسا نے بھی بھری ہے حامی

''ہو کے ایک زبان
ایک کی ہی سنتان سبھی ہیں
باپو ہے بھگوان''
ساری بات کا ایک نچوڑ:
بنسی کی تان
بائبل اور قرآن
گوربانی کا فرمان
کرتے ہیں اعلان
ایکو
سب ایکو
سب ایکو تیں انسان
نویگ کا آرنبھ ہو گیا
جاگ پڑا انسان

نئی رُت ہے دھرت پر آئی
بنسپتی نے لی ہے انگڑائی
خوشبو اس کی پہنچ گئی ہے
گگنوں کی انگنائی۔

جیون کے گھر خوشیاں آئیں
قدرت شگن منائے
ہنستا کھیلتا جیون شالا
یگوں کی عمر اپائے

پورب سے آئی ہوا
اچھائی کے گھر ورشا ہوئی

موسم تیور بدلا

پورب سے آئی ہوا
بُرائی کے اونچے برج تھے جتنے
سارے دیئے گرا
کنسوں کے گھر سوگ ہے چھایا
رات اندھیری آئی
لنکا جلتی دیکھ کے راون
ہے بیٹھا مونہہ چھپائی
اُس کا اُگلا انش ہے جتنا
سُوکھے اُس کے پران
ڈرتی ڈرتی تھر تھر کانپے
کیسے بچاوے جان
ایسے لوگوں کو جگہ نہ دیتی
دھرتی ہو گئی تنگ
مانوتا کے دشمن سارے
ہار گئے ہیں جنگ۔

چل، بہہ رہی ہے پُروائی
جیون کا رُکھ مؤل پُرا ہے
جڑوں نے ناپی پلوں کے اندر
پاتالوں کی گہرائی
چلتی ہے پُروائی
پھلتے پھولتے شاخوں نے چھو لی
گگنوں کی اونچائی
دیکھ پھول کو کھل کھل ہنستے

پتی پتی مسکائی
چلتی ہے پروائی
جیون دُکھ کچھ خلقت جھیکے
اَنہد اَنہد بولے
سُنتے سُنتے اس بانی کو
سارا برہمنڈ موَلے

وسّے رسّے متھرا نگری
سدا سدا ہی جیوے
سکھوں کا جیون جیتے جیتے
سدا سہاگن تھیوے

جمنا دریا ٹیمز بن جائے
ٹیمز بنے جھناں [دریائے چناب]
پیار کے دریا رہیں سدا ہی
دھرتی پر رَواں
میرے تن کے سب ہیں جائے [پیدا ہوئے]
ہر اک میری راہ اپنائے
میرے تن کے کنوں کے جیسے
جیون پتھ پہ چلتے چلتے
ہر اک نَر..... کانھا ہووے
ہر اک مادہ۔ رادھا
جیون پتھ میں بنے سارتھی
یہ ہے اک مریادا۔
ساری خلقت اکٹھی ہو کر
ایسی راس رچاوے

ہنستے، ہنستے، ناچے دھرتی
مہان متھرا بن جاوے
یہ ہے میرے من کا سپنا
یہ ہے میرے من کی چاہ
سارے بھید مٹا کے خلقت
چلے پیار کی راہ

مہاں متھرا ہے ایسی بستی
بسی بسی سی
ساری دھرتی
نہ کوئی حدیں نہ کوئی روک
سب کہیں، سب اپنے لوگ
ایک نور کے رنگ میں رنگے
سارے بندے یہی کہیں کہ:
سارے مذہب اچھے لگتے
رنگ نسل کے بھید مٹا کر
مہکے یہ پھلواری
جیون پہ ایسا کھیڑا آئے
دھرتی جائے شنگاری

میں ہی وہ پہلا
مرد۔ ماں ہوں
جس کی کوکھ سے پیدا ہوئی
دنیا ساری
نئی بیاہی لاڑی!

☆☆☆

(۲)

غزل

● خورشید اکبر

● ترجمہ: ایم اے کریمی

قیامت ہے غزل، پردہ نشیں دلدار آنکھوں میں
اَدا انکار لہجے میں، حیا اقرار آنکھوں میں

What a pity! a veiled woman in amatory verse vibrates love to sweetheart transpires from eyes
Refusal in tone & tenor but acceptance with shyness transpires from eyes

قضا پرور علاقے میں خرام زندگی تنہا!
تصور پھول سا چہرہ شفا بیمار آنکھوں میں

In death inviting domain life traveres lonely
The budding face of a love lorn soul fancies succour transpires from eyes.

بہت سنجیدہ، پیچیدہ، شگفتہ خوش بیانی ہے
کہانی، سادگی، شبنم، صبا رفتار آنکھوں میں

There is very cultured, complicated, cheerful and eloquent speech
These is a tale, Simplicity, dewiness With breezy speed transpires from eyes

سفر آساں نہیں جذبوں کی لمبی شاہراہوں پر
سزا مفہوم چوراہے، خطا بازار آنکھوں میں

Journey is not easy traversing on emotionally longer path
Punshment evident for guilt On crossroads transpires from eyes.

● خورشید اکبر

● ترجمہ: ایم اے کریمی

ترنم ہے، تکلم ہے، تبسم اشک سامانی
سجایا ہے جدائی نے عجب دربار آنکھوں میں

These is singing conversation,
smile and shedding tears
Separation presents a peculiar
gruesomeness transpires from
eyes

سنا ہے دو بدن احساس کی لہروں پہ ملتے ہیں
چمک اُٹھتا ہے رہ رہ کر وصالِ یار آنکھوں میں

It is learnt two bodies
consummated Perceptively
The memory of Union of souls
reverberates at intervars
transpires from eyes

وہی خورشید ہوں لیکن شہیدِ حسرتِ جاں ہوں
مری سُرخی امانت ہے تری تلوار آنکھوں میں

Same! I am the 'Khursheid' but I
am the victim of wistfulness
Redness of my blood stands
deposited transpires from your
sword-like eyes.

☆☆☆

• علیم اللہ حالی (۳) •ترجمہ: ایم اے کریمی

گزرا ہر ایک شخص مجھے دیکھتا ہوا
گویا میں آدمی نہ ہوا آئینہ ہوا

Everyone passed by gazing at me
It seemed as if I was not a man
but a mirror

وہ دھند تھا دھواں تھا کہ ظلمت کہ روشنی
اب یاد بھی نہیں ہے کہاں تو جدا ہوا

Was the phenomenon charged
with fog, smoke or the light
Now I don't recollect where did
you desert me

جب کوئی شعر ہو تو اسی کا خیال ہو
جب راہ گم ہوئی تو وہی رہنما ہوا

Whenever a verse was composed
that was attributed to him
When I was led astray He
became path finder

نکلی ہی تھی کہ شاخِ طلب خشک ہو گئی
ہر بار ہم نے ہاتھ سمیٹا بڑھا ہوا

The advancement in the realm
of mutual relation was nipped
in the bud
On every occasion I drew
back my Stretched hand being
spurned away

اب اپنی رسم وراہ نئے موسموں سے رکھ
وہ سایہ دار پیڑ خزاں آشنا ہوا

Now establish relation with
new entrants
The old patron has turned
unbenignant

ان پر نئی رُتوں کے نشاں بن چکے ہیں آج
جن پتھروں پہ نام تھا اپنا لکھا ہوا

Today they are emblematised
with new seasons
Those stones on which my
name stood engraved

ہم کھل کے رو لیے تو کچھ ایسا لگا مجھے
برسوں کا کوئی قرض تھا جو اب ادا ہوا

Having shed overwhelming
tears over my
unrequisitedness I could
realise 'Aleem'
That the lingering loan of
yester years has now been
paid off

☆☆☆

(۴)

غزل

• شاکر خلیق

• ترجمہ: ایم اے کریمی

تیرا رُتبہ مسلّم ہے اے عاشقی، کارِ طفلاں نہیں دل کی سوداگری
تجھ میں روپوش ہے عظمت و سروری، تجھ میں پوشیدہ ہے سرِّ شاہنشہی

Trading of heart is not an exercise in puerility

O' love admitted is thy eminence!

The greatness and sway lie concealed within thee!

میکشی تو مری گرچہ فطرت نہ تھی بہرِ تسکینِ دل آ پلا ساقیا
عمر بھر گرچہ شعلہ بداماں رہا، پھر بھی باقی رہی میری تشنہ لبی!

I never felt naturally inclined to wine,

O' cup bearer but now a little

The fiery grown the thirst lips require thy grace

میں ازل سے ہی اس طرح مجبور ہوں، اعترافِ جنوں کی بھی ہمت نہیں!
میں تو آشفتہ سر تھا بھٹکتا رہا، کیا ہوئی آپ کی وہ میانہ روی!

In the desert of quest a reckless wanderer

like me can't even confess his own madness!

But tell me of your balanced moves,

What marvels could they achieve?

غم کی چادر میں ، میں اپنے ناموس کو اس طرح سے لپیٹے پھرا دربدر
زخمِ سینہ کے اندر ہی رستا رہا اور فطرت رہی محوِ پردہ دری

I preserved the honour of my grief in my wandering

The nature preserved a bleeding heart

میں تو لب بستہ بھی اور پریشان بھی ، میری حالت ہے مثلِ چراغِ سحر
میری روداد غم سن سکو تو سنو، قلبِ مضطر کی دھڑکن ہے یہ شاعری

I shiver, like the morning star

waxing and wanning

Ah! Could you hear the throbbing

of heart in my poerty

فکر کس طرح مائل بہ پرواز ہو ، نوچ ڈالے گئے ہیں سبھی بال و پر
کیسے دوں شعر کا برگزیدہ لقب، کیسے کہیے اسے جزوِ پیغمبری

How thoughts can Soar high as they

Have been deplumed.

How chosen appellation can be conferred

on the verses, how can it be called part of prophethood?

آہ ! شاکرؔ متاعِ جگر لٹ گئی، یادِ ماضی ہی بس ایک پونجی رہی
جب بھی سوچا کہ اس سے سبک دوش ہوں، دل کی بڑھنے لگی اور بھی بے کلی!

Ah! 'Shakir' ! cherished possessions of heart,

are lost, only the past memory remained enshrined.

Whenever I tried to get rid of it, the hear became uneasy

☆☆☆

چراغ دل کے جلاؤ بہت اندھیرا ہے

● انور امام

[شام کا منظر ہے۔ بوڑھا رامو ایک طرف ٹوکرے سے ڈھکا ہوا مرغ نکالتا ہے اور اسے چارہ دیتا ہوا]

بوڑھا رامو: لے کھالے بیٹے، تو بھی کھالے... رات کے وقت بھوکا نہیں سویا جاتا.... سمجھے!

[مرغ دانا کھاتا ہے۔ بوڑھا اسے ٹوکرے میں بند کر دیتا ہے اور اندر سے سیاہ لالٹین لا کر اس کا شیشہ صاف کرتا ہوا] اُف! شیشہ کتنا کالا ہو گیا ہے.... جیسے کسی نے سارے جہان کی کالک اس پہ پوت دی ہو.... ارے اب تو انسان کا دل اس سے بھی اُدھک کالا ہو گیا ہے [پبلک کی طرف دیکھ کر]۔

قیامت قریب ہے.... تھوڑے دن اور موج کر لو بھیا.... پھر وہی اندھیری رات.... وہی سب کچھ.... [لالٹین صاف کر کے اسے روشن کرتا ہے کہ اسی وقت باہر سے بوڑھے کا چھوٹا بیٹا رویندر معمولی کپڑوں میں ملبوس، کندھے پر ایک تھیلا لٹکائے ہوئے اندر داخل ہوتا ہے۔ اور بہت ہی مایوس کن انداز میں چارپائی پر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بے حد اداس ہے۔]

بوڑھا: کیا ہوا بیٹے؟ تو اتنا اُداس کیوں ہے؟ کیا نوکری کی پریکشا [امتحان] اچھی نہیں ہوئی؟

رویندر: [جھنجھلا کر] باپو تم تو ہمیشہ ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوال کر ڈالتے ہو.... بھلا میں کیا جواب دوں؟

بوڑھا: ناراض کیوں ہوتا ہے بیٹے.... ہر کام کا ایک وقت بھگوان نے طے کر رکھا ہے.... جو بھی ہوتا ہے.... وہ سمے پر ہی ہوگا.... اپنے آپ پر کھیجنے سے کچھ نہیں ہوتا۔

رویندر: کیا کروں باپو؟ نا چاہتے ہوئے بھی تمہیں بہت کچھ کہہ دیتا ہوں۔

بوڑھا: میں تیری حالت سمجھتا ہوں بیٹے... مجھ سے کیا چھپا ہے۔

رویندر: باپو یہ روز روز انٹرویو دے دے کر میں تھک گیا ہوں.... کہیں کوئی امید ہی نظر نہیں آتی... اور تم

نے... تم نے مجھے پڑھانے لکھانے کے لیے اپنی زمین تک بیچ دی... کیا کچھ نہیں کیا... اور ایک میں ہوں جو اس بڑھاپے میں بھی تمھارے سر پر بوجھ بنا بیٹھا ہوں... دھتکار ہے ایسی زندگی پر...

بوڑھا: [تڑپ کر] نہیں بیٹے... ایسا نہیں کہتے... ایسا نہیں کہتے... وہ اپرم پار ہے... وودھاتا ہے ...انتریامی ہے... کب اس کی نظر تم پر ہو جائے کہنا مشکل ہے... اس کی دیا سے ناامید ہونا پاپ ہے۔

روبندر: امید... امید... امید... باپو میں کب تک اس امید کے پھندے سے لٹکا ہوا، مر مر کر جیتا رہوں گا... میں اور برداشت نہیں کر سکتا... میں اور برداشت نہیں کر سکتا... نہیں کر سکتا [سسک کر رونے لگتا ہے۔]

بوڑھا: رونے پیٹنے سے کچھ نہیں ہوتا بیٹے... جو قسمت میں لکھا ہے اسے پورا ہونا ہی ہے۔ یہی قدرت کا قانون ہے۔ [اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا ہے] چل منہ ہاتھ دھو کر کچھ کھا لے... صبح اٹھ کر بھوکا ہی پر یکچھا دینے چلا گیا تھا... جانے وہاں بھی کچھ کھایا یا نہیں... ارے کم سے کم کچھ گڑ چوڑا ہی باندھ لیا ہوتا۔

روبندر: باپو تم نے مجھے ایک روپیہ دیا تھا نہ... میں بھلا کیوں بھوکا رہتا... پورے آٹھ آنے کا ستو لیا تھا۔

بوڑھا: آٹھ آنے کا؟

روبندر: ہاں... دکاندار سے ایک مرچ اور تھوڑا سا نون بھی... ستو سان کر خوب کھایا... خوب کھایا... اور اوپر سے ایک لوٹا پانی پی لیا... واہ مزہ آگیا۔

بوڑھا: اچھا لا اپنی قمیض مجھے دے... اور منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے آ... میں کھانا پروستا ہوں۔

روبندر: باپو، تمھیں ہم لوگوں کے لیے کتنی تکلیف کرنی پڑتی ہے... کتنا کشٹ اٹھانا پڑتا ہے... کاش آج ماں زندہ ہوتی [چند لمحہ رک کر اندر کی طرف بڑھ جاتا ہے۔]

بوڑھا: اپنی ایسی قسمت کہاں، جو بھاگتی اپنا بھاگ سنوارتی... کہتی تھی زندگی کی آخری سانس تک میرا ساتھ نبھائے گی... اچھا ساتھ نبھایا تم نے... خوب سزا دی مجھے... میں اپنا دکھ بھی سہوں اور اپنے بچوں کا دکھ بھی سہوں... میں اپنا دکھ بھی اور اپنے بچوں کا دکھ بھی [بڑبڑاتا ہوا اندر جاتا ہے اور ویسے ہی اندر سے چیختا ہوا اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ میں ایک روپے کا سکہ اور دوسرے ہاتھ میں قمیض۔]

بوڑھا: روبندر... روبندر...

روبندر: آیا باپو [کمرے میں تولیے سے منہ ہاتھ صاف کرتا ہوا داخل ہوتا ہے] کیا ہے باپو؟

بوڑھا: [ایک روپے کا سکہ چھپاتا ہوا] پہلے تو میرے سر پر ہاتھ رکھ [رندھی ہوئی آواز میں]

روبندر: (پیچھے ہنستا ہوا) کیوں؟... کیوں باپو؟

بوڑھا: تو اگر مجھے دل سے چاہتا ہے تو میرے سر پر ہاتھ رکھ۔ [روبندر جھجکتا ہوا سر پر ہاتھ رکھ دیتا ہے]

بوڑھا: بیٹے تو جھوٹ بھی بولتا ہے؟

روبندر: میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا؟ [سوچتا ہوا] میں کچھ سمجھا نہیں؟

بوڑھا: [روتا ہوا سکہ رویندر کے ہاتھ پر رکھ کر] یہ کیا ہے؟ بول.... بولتا کیوں نہیں؟

رویندر: یہ.... یہ.... [ہکلاتا ہوا] میں.... مم

بوڑھا: اب تو کیا کہے گا بیٹے؟ اس ایک روپے کے سکے نے سب کچھ کہہ دیا کہ تو دن بھر بھوکا رہا ہے... پانچ میل پیدل گیا اور آیا... ستالو بیٹے... اور ستالو... چند دنوں کی زندگی ہے... میرا کیا ہے...؟

رویندر: باپو ایسا مت کہو... ایسا مت کہو... باپو اس ایک روپے کو خرچ کرنے سے میری آتما مجھے روکتی رہی.... میں چاہ کر بھی اسے خرچ نہ کر پایا... کیا کروں... تمھارے اوپر اور کتنا بوجھ بنوں؟

بوڑھا: بیٹے... اولاد کبھی بھی اپنے ماں باپ پر بوجھ نہیں ہوتی۔ [اس وقت باہر سے کسی کی آواز آتی ہے]

آواز: ارے او رامو بھیا کا ہوت ہے؟ ای کا کھٹر پٹر لگا وا ہے؟

بوڑھا: [ونگ کی جانب دیکھ کر] کون احمد بھیا؟... ابھی آیا [رویندر کی جانب دیکھ کر] اچھا تو اندر چل، میں آتا ہوں [رویندر کمرے میں چلا جاتا ہے۔ بوڑھا ونگ کے پاس جا کر] کچھ نہیں بھیا۔ بس ذرا رویندر سے باتیں کر رہا تھا۔

احمد: او ہم تو ای سمجھے رہے کہ کونوں بات ہوئی گئی... اچھا ہم چلت ہیں... کونوں ایسی ویسی بات ہو تو ہم سے نہ چھپاوا.... سمجھا... ارے... ڈرا... رارا... ڈرارا... ڈرارا... را... ڈرارارا... ارے ڈرارارا... ڈرارا... ڈرارارا... را [آواز دھیرے دھیرے دور ہو جاتی ہے]

بوڑھا: [ایک ٹک ونگ کی طرف دیکھتا ہوا] احمد بھی کتنا زندہ دل آدمی ہے... دکھ تو جیسے اسے دور سے بھی چھو کر نہیں گزرا... ایسے ہی بھلے مانس سے یہ سنسار چل رہا ہے... ورنہ کب کی قیامت آجاتی [اندر سے رویندر کی آواز آتی ہے]:

رویندر: باپو... کون؟... احمد چاچا تھے؟

بوڑھا: [پیلک کی طرف دیکھ کر] ہاں احمد ہی تھا۔

رویندر: کیا کہہ رہے تھے؟

بوڑھا: کچھ نہیں... ایسے ہی خیر خیریت پوچھ رہے تھے... ارے میں تو تیرا کھانا پروسنا ہی بھول گیا۔

[بوڑھا اندر لپکتا ہے۔ اس وقت اندر سے رویندر اسٹیج پر آتا ہے]

رویندر: [پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا] میں تو کھا چکا۔

بوڑھا: بہت زور کی بھوک لگی ہوگی تب ہی تو... اب ذرا سریندر آجائے تو چین آئے۔

رویندر: باپو تم نے بھی کس راکشش کا نام لے لیا۔

بوڑھا: بیٹے آخر کو وہ تیرا بڑا بھائی ہے... ایسی غلط بات نہ کہا کر۔

رویندر: ہونہہ، بڑا بھائی... یہی تو افسوس ہے باپو کہ کبھی اس نے ایسا محسوس ہی نہیں ہونے دیا... ہمیشہ

لوٹ کھسوٹ... جوا چوری... گھر کی ایک ایک چیز بیچ ڈالی اور تم کہتے ہو بڑا بھائی... کیسا بڑا بھائی؟... آئے دن تم خود اس کے ظلم وستم کا شکار ہوتے رہتے ہو اور پھر بھی کہتے ہو......

بوڑھا: ہے تو اپنی ہی اولاد... بیٹے جسم کے کسی حصے میں گھاؤ نکل آئے تو اسے کاٹ نہیں دیا جاتا بلکہ اس کا علاج کیا جاتا ہے... سمجھے۔

رویندر: [انگڑائی لیتا ہوا] مجھے تو نیند آرہی ہے... میں تو چلا سونے... تم بیٹھے بیٹھے بھیا کی راہ تکتے رہو۔

بوڑھا: اپنا ہی خون ہے... اسے کچھ تکلیف ہوگی تو کیا مجھے چین آئے گا، میرا دل شانت رہے گا... جا تو اندر سو جا... مجھے تو ایسے بھی نیند نہیں آتی۔ [رویندر اندر سونے چلا جاتا ہے۔ بوڑھا بیڑی جلا کر پینے لگتا ہے۔ روشنی دھیمی ہو جاتی ہے۔ دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ جھینگروں کی آوازیں بھی آرہی ہیں۔ بوڑھا بیڑی پینے کے بعد بیٹھا بیٹھا چارپائی سے ٹیک لگایا ہوا ہی سو جاتا ہے۔ اسٹیج اندھیرے میں ڈوب جاتا ہے۔]

[وہی پہلا منظر معمولی سی تبدیلیوں کے ساتھ۔ روشنی اسٹیج پر پھیل جاتی ہے۔ بوڑھا چارپائی کس رہا ہے۔ اسی وقت باہر سے بوڑھے کا بڑا بیٹا سریندر کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ بوڑھا اسے دیکھتا ہے اور حقارت سے منہ موڑ لیتا ہے۔]

سریندر: کیوں باپو، مجھ سے کچھ ناراض ہو گیا؟

بوڑھا: میں کون ہوتا ہوں تجھ پر ناراض ہونے والا؟

سریندر: ارے باپو، تم تو سچ مچ ناراض ہو گئے۔

بوڑھا: وہ سب چھوڑ پہلے تو بتا رات بھر کہاں رہا؟

سریندر: باپو، تم تو اچھی طرح جانتے ہو... میں راج نیتک آدمی ہوں... جنتا کے کاریہ میں بھاگ لینا ہمارا کرتویہ ہے... ان کے دکھ درد کو ہم نہیں دیکھیں گے تو اور کون دیکھے گا؟

بوڑھا: بس بس بڑا آیا جنتا کا ہمدرد... جنتا کا رکھوالا... قاضی جی دبلے کیوں ہیں؟ تو شہر کی فکر ہے؟... ارے پہلے گھر کی خبر لے... گھر میں کھانے کو نہیں اور سرائے میں ڈیرہ۔

سریندر: کسی نے ٹھیک ہی کہا ہے باپو... گھر کی مرغی دال برابر... تم کیا جانو... باہر جب میں جنتا کے سامنے بھاشن دیتا ہوں تو لوگوں کی تالیوں کی گڑگڑاہٹ سے سارا علاقہ گونج اٹھتا ہے... اور تم کہتے ہو......

بوڑھا: میں صاف بات کرتا ہوں... برا لگے یا بھلا... مجھے لگائی لپٹائی کی عادت نہیں۔

سریندر: باپو تم نہیں جانتے... میں اب راج نیتی میں قدم جما چکا ہوں... وہ دن دور نہیں جب روپیہ میرے قدم چومے گا... ہر طرف میرا بول بالا ہوگا اور...

بوڑھا: بس کر بس کر، ہونہہ، تیرا بول بالا ہوگا... اور دیش کی غریب جنتا کا منہ کالا ہوگا... آخر کب تک

تم لوگ جنتا کے شریر سے گدھ کی طرح ماس نوچتے رہو گے؟

سریندر: تم نہیں سمجھو گے باپو۔

بوڑھا: اور میں سمجھنا بھی نہیں چاہتا۔ [چارپائی کسنے لگتا ہے۔ اور اندر سے بستر وغیرہ لینے کے لیے کمرے میں جاتا ہے۔]

سریندر: بڑھاپا بری چیز ہے... بہت بری چیز... لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں... بڑھاپے میں انسان کی مت ماری جاتی ہے... آج میں کسی دوسرے گھر کا دیپک ہوتا تو لوگ میرا آدر کرتے، عزت کرتے... اس گھر میں جنم لے کر تو میں نے اپنی مٹی پلید کر لی۔

بوڑھا: [بستر ہاتھ میں لئے ہوئے کمرے سے باہر آتا ہے اور بستر چارپائی پر ڈال کر] مٹی تیری نہیں... مٹی پلید تو میں نے تیری جیسی اولاد پیدا کر کے خود اپنی کر لی ہے... جانے وہ کون سا سمے تھا [تھوڑی دیر کا وقفہ] تیرے جیسے نکھٹو اور کام چور اولاد کے کارن ہی محلے کے سارے لوگ مجھ سے ٹھٹھول کرتے ہیں... میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ بیٹا ہو تو سریندر جیسا... گھر کا روپیہ، گھر کا سامان برباد کر کے نیتا بننے چلا ہے۔ واہ رے کلجگ! باپ نہ جانیاے بی سی ڈی اور بیٹا مانگے انگلینڈ کی بیوی... ارے اب بھی اپنے باپ کی عزت کا خیال ہے تو کچھ ہاتھ پیر مار... کچھ محنت مزدوری کر... یہ کھادی کا نقلی چولا اتار پھینک... جس سے مکاری کی بو آتی ہے... محنت کر محنت... محنت سے انسان چھوٹا نہیں ہوتا۔

سریندر: [تالی بجا کر] بس بس بس، تمھیں تو کوئی نیتا ہونا چاہئے تھا۔ کیا دھانسو بھاشن دیتے ہو، باپو تمھارے اس دو ٹکے کے بھاشن سے دیش میں تو انقلاب آنے سے رہا... ہاں دو چار اس محلے کے سر پھرے واہ واہ ضرور کریں گے... کچھ تو اپنی عمر کا خیال کرو باپو اور عقل کے ناخن لو۔

بوڑھا: [آنکھیں نکال کر] او تو اب تو مجھے عقل سکھائے گا... ارے اپنے ہوش کی دوا کر... تو جس کھائی کی اور جا رہا ہے نہ... وہاں سے گر کر دوبارہ نہیں اٹھ پائے گا۔

سریندر: [زور سے ہنس کر] گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں، وہ طفل کیا گرے کہ جو گھٹنوں کے بل چلے۔

[اسی وقت باہر سے بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز...]

ایک پارٹی ورکر: نیتا جی... نیتا جی! [ایک آدمی زخمی حالت میں کمرے میں داخل ہوتا ہے۔]

سریندر: [اسے سنبھالتا ہوا] کیا بات ہے؟... یہ... یہ کیا ہوا؟

پارٹی ورکر: میں تو کسی طرح بچ نکلا... لیکن سرجو، برجو اور موہن کو مار مار کر لوگوں نے بے حال کر دیا ہے... اور ہمارے پروپیگنڈہ کیمپ کو آگ لگا دی ہے۔

سریندر: [چیخ کر] کس نے... کس نے ایسا کیا؟

ورکر: دوسری پارٹی والوں نے۔

سریندر: پولیس ابھی تک نہیں آئی۔ [بوڑھا اس بیچ اپنا بستر بچھا کر لیٹ جاتا ہے۔]

بوڑھا: پولیس کی کیا ضرورت... تو تو خود میدانِ جنگ کا سپاہی ہے... جا جا دو چار ہاتھ دکھا۔

ورکر: جلدی چلیے نیتا جی... جو بچا ہے وہ بھی برباد ہو جائے گا۔

سریندر: [غصے سے] باپو، یہ اپنی کینچی کی طرح چلتی زبان تو روکو... کبھی تو سیدھی طرح بات کیا کرو... تمھارے منھ سے تو صرف کڑوی بولی ہی نکلے گی۔

بوڑھا: ارے تو نے بھی تو آج تک ہمیں کڑوا کسیلا ہی دیا ہے... بول کڑوی نہیں تو کیا میٹھی نکلے گی؟

سریندر: [اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر)] بس کرو باپو... بس کرو... تمھیں تو میری ارتھی دیکھ کر ہی چین ملے گا۔ [زور سے پیر پٹک کر]

بوڑھا: [چیخ کر] سریندر!

[سریندر ورکر کے ہمراہ باہر نکل جاتا ہے]

بوڑھا: [کانپتا ہوا، سسکتا ہوا] ہاں میں تو یم دوت ہوں نا... جب اتنے اتنے سے تھے... اور بھاگتی کا سورگ باس ہو گیا تھا... اس سے اپنے سینے سے لگا کر میں نے ہی تو پالا تھا، میں نے ہی تم لوگوں کے لئے میں نے اپنی ہستی مٹا ڈالی... اور آج... آج اس کا یہ بدلہ دیا ہے... ہے بھگوان، یہ سب سننے کے لئے اور کب تک جیوت رکھے گا تو؟ [بوڑھا زور زور سے سسکنے لگتا ہے۔]

[روشنی مدھم ہو جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ باہر سے مینڈک کے ٹرٹرانے اور جھینگروں کی جھائیں جھائیں کی آواز ابھرتی ہے۔ ان آوازوں کو دباتی ہوئی ایک کرخت آواز ابھرتی ہے چوکیدار کی۔]

چوکیدار: جاگتے رہو... جاگتے رہو... جاگتے رہو... [بوڑھے کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔]

آواز: کاکا... ارے او راموکاکا!

بوڑھا: [آنکھیں مَل کر اٹھتا ہوا] کون... کون ہے بھائی؟

چوکیدار: ارے میں ہوں کاکا... بھورے لال... کا سو گئے؟

بوڑھا: [دروازہ کھولتا ہوا] ارے نہیں... بس ذرا آنکھ لگ گئی تھی... بیٹھو... اور کہو کیا حال ہے؟

چوکیدار: کاکا سب ٹھیکئی ہے... پر کا کہوں... اس دنیا کا حال بہت خراب ہے... روج روج ہر سہر ماں دنگا ہوئی رہا ہے... کہیں سنو کہ اوکی لڑکی بھاگ گئی، کہیں ساس سسر نے دہیج کے لالچ ما بہو کا جندہ جلائے دیا... واہ رے کلجگ۔

بوڑھا: ارے کیا کہو گے بیٹا، اس سنسار میں سب راکھس ہو گئے ہیں، راکھس۔ اب ان سے دیا کی امید کرنا ہی بے وقوفی ہے... ارے بیٹا، جب ست یگ میں پاپ کو نہیں روکا جا سکا جو بھگوان اور دیوی دیوتاؤں کا یگ تھا... پھر یہ تو کلجگ ہے، کلجگ۔ [اور اپنی کمر سے کھینی نکال کر اسے دیتا ہے] لو سورتی کھاؤ بیٹا۔

چوکیدار: [ہاتھ پھیلا کر] ہاں لاؤ کاکا [منھ میں ڈال کر] وہ مزہ آئی گوا... کاکا تمرے ہاتھ کی کھینی کا جواب ناہی۔ [اسی وقت باہر سے کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آواز ابھرتی ہے۔ چوکیدار چونک کر اٹھتا ہوا]

چوکیدار: اچھا ہم چلت ہیں کاکا [باہر چلا جاتا ہے۔ اور باہر دور سے آواز آتی ہے] جاگتے رہو... جاگتے رہو۔ [اندھیرا بڑھ جاتا ہے۔ بوڑھا چارپائی پر لیٹ جاتا ہے۔]

[منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی ایک اتھاہ بھیڑ ہے اور اسٹیج پر ایک نیتا جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسٹیج کے پیچھے سے ہی لوگ نعرہ لگا رہے ہیں۔]

آواز: نیتا جی سریندر بھائی کی جے... جے جے جے... نیتا جی کی جے... نیتا کی جے...

[جے جے کی آوازیں دھیمی ہو کر رک جاتی ہیں۔ اسٹیج کی ایک طرف نیتا جی سریندر بھائی سر پر کانگریسی ٹوپی، کھادی کے کرتے پاجامے میں ملبوس، بڑے رعب سے کھڑے ہوئے ہیں۔ اس درمیان ایک آواز ابھرتی ہے۔]

آواز: بھائیو، بہنو، بزرگو اور میرے بچو... آج کا دن بہت ہی شبھ دن ہے... آج ہماری برسوں کی منو کامنا مکمل ہوئی ہے... آج ہمارے بیچ کا ہی وہ غریب آدمی، جسے ہم سریندر بھائی کے نام سے جانتے ہیں، ہمارے سامنے ہے... الیکشن قریب ہے اور ہم نے بہت سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہے کہ اس بار اپنا قیمتی ووٹ اس غریب بھائی کو دے کر کامیاب بنانا ہے... ہمیں دوسرے کی چالبازیوں میں نہیں آنا ہے... اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنے برسوں کے سپنے کو ساکار ہوتا دیکھ سکیں، آیئے ایک بار پھر میری آواز میں آواز ملا کر نیتا جی سریندر بھائی کی ایک زوردار جے جے کار لگا کر ہم یہ ثابت کر دیں کہ ہم سریندر بھائی کے ساتھ ہیں... نیتا جی سریندر بھائی کی...

آوازیں: جے... جے... جے

آواز: نیتا جی سریندر بھائی کی...

آوازیں: جے... جے... جے

آواز: نیتا جی سریندر بھائی کی...

آوازیں: جے... جے... جے

[جے جے کی آوازیں دھیمی ہوتی ہوتی کہیں کھو جاتی ہے]

آواز: اب آپ بھائیوں کے سامنے نیتا جی سریندر بھائی اپنے شبھ وچار پرکٹ کریں گے... آیئے نیتا جی!

[نیتا جی مائیک کے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک مرتبہ لوگوں کی بھیڑ کو دیکھتے ہیں اور پھر]

سریندر: [تھرتھراتی ہوئی آواز میں اپنے سکریٹری سے] ارے باپ رے باپ... یہ تو لاکھوں کا مجمع ہے، میری تو آواز نہیں نکل رہی ہے... بھلا میں کیا بولوں... سکریٹری صاحب... سکریٹری صاحب... [مری ہوئی آواز میں]۔

سکریٹری: آپ نے مجھ سے کچھ کہا کیا سر؟

سریندر: ارے بھائی، یہ کس مصیبت میں ڈال دیا؟... میں جنتا سے کیا کہوں؟... مجھے تو کچھ کہنا ہی نہیں آتا... ایسا کیجئے آپ ہی ہمارے بدلے میں کچھ کہہ دیجئے نا...

سکریٹری: سر، آپ نے اس قدر گھبرا کیوں رہے ہیں... یہ ہماری غریب بھولی بھالی جنتا ہے... اسے جس طرح چاہیں آپ بے وقوف بنا سکتے ہیں۔

سریندر: وہ تو ٹھیک ہے... پر کہوں کیا؟

سکریٹری: [دھیمی آواز میں] ارے بات سے بات جوڑیے سرکار

سریندر: [کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے] بھائیو، بہنو اور میرے بچو... آپ سب کو بہت بہت نمسکار... بہت بہت پیار... اور بہت بہت...

آوازیں: [زور زور سے ٹھٹھا لگا ہنستے ہوئے] ارے، یہ تو کوئی چڑی کا غلام ہے... چہرے پر ساڑھے بارہ بج رہے ہیں...

سریندر: جی!... بارہ... جی نہیں... ابھی شام کے چھ بجے ہیں...

سکریٹری: نیتا جی، جنتا سے بات مت کیجئے... جنتا کے سامنے تقریر کیجئے... بھاشن دیجئے...

سریندر: [گھبرائی ہوئی آواز میں] دیتا ہوں... دیتا ہوں... بھائیو، اب بھاشن سنئے...

آوازیں: اتنی دیر سے کیا راشن دے رہے تھے [زوردار ٹھٹھے کی آوازیں]

سریندر: [گھبرا کر] میں ایک پردیسی نیتا... جی معاف کیجئے گا... دیسی نیتا ہوں... دیش کے لئے کام کروں گا... دیش کا اونچا نام کروں گا... پریشانیوں سے نہیں ڈروں گا... نہیں ڈروں گا... نہیں ڈروں گا...

آوازیں: ارے تو ڈرنے کے لئے کس نے کہا ہے؟ [زوردار آواز]

سکریٹری: بھائیو!... شانت... شانت... شانت... ذرا شانتی بنائے رکھیے... ایسا نہ ہو کہ دوسری پارٹی کے لوگ آپ کو بہکا کر غلط راستے پر ڈال دیں... اور آپ سریندر بھائی کے قیمتی بھاشن سے ونچت رہ جائیں... ہاں تو سریندر بھائی...

سریندر: دیکھیے بھائیو... ہر پارٹی اپنے اپنے طریقے سے کام کرتی ہے، بڑے بڑے دعوے کرتی ہے، پرنتو میں بہت بڑا دعویٰ نہیں کروں گا۔ ارے صاحب میں اس الیکشن میں کھڑے ہونے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا... پرنتو یہ ہمارے ودے بھائی سکریٹری صاحب کے کہنے پر...

سکریٹری: [دانت دبا کر] کیا کہہ رہے ہیں آپ؟... کہیے دکھی جنتا کا کشٹ دیکھ کر کھڑا ہو گیا ہوں...

سریندر: [نروس ہو کر] کہیے دکھی جنتا کا کشٹ دیکھ کر کھڑا ہو گیا ہوں... میں کھڑا ہونا نہیں چاہتا تھا... پر کیا کروں... اپنے سبھی ساتھی کھڑے ہو گئے تو میں بھلا کیسے بیٹھا رہتا... بولئے... آپ ہی بولیے...

ایک آواز:　　ارے بھائیو، یہ تو کوئی کاٹھ کا الو ہے [بہت زور زور سے ہنسی ٹھٹھے کی آواز]
دوسری آواز:　　ارے تو دیکھتے کیا ہو؟... مارو... مارو...
[جنتا پتھر پھینکنے لگتی ہے۔ نیتا جی پتھر کھاتے ہوئے زور سے چیخ کر بولتے ہیں]
سریندر:　　ارے باپ... بچاؤ... بچاؤ... یہ غریب بھولی بھالی جنتا ہے یا راون کی اولاد؟ [ایک پتھر اور آکر لگتا ہے۔ نیتا جی ٹیبل کے نیچے چھپتے ہوئے] ارے باپ رے...
آواز:　　مارو سالے کو... بچ کر نہ جانے پائے... یہ کوئی پاکھنڈی ہے... ارے دیکھتے کیا ہو... انڈال پنڈال سب جلا ڈالو...
[اسی وقت کوئی دوڑ کر آتا ہے اور نیتا جی کو ایک طرف گھسیٹ کر لے جاتا ہے۔ بھاگ دوڑ، ہنگامہ، چیخ و پکار اور اس کے بعد آواز دور ہوتی ہوئی ختم ہو جاتی ہے۔ اسٹیج پر اندھیرا اچھل جاتا ہے۔]
[وہی پہلا منظر۔ سب کچھ ویسا ہی ہے۔ رویندر پولیس کی وردی میں ملبوس گھر میں داخل ہوتا ہے۔ وہ بے حد خوش ہے۔ گھر میں آتے ہی زور زور سے آوازیں دیتا ہے]
رویندر:　　باپو... باپو... ارے او باپو!...
بوڑھا:　　[گمبھیر آواز میں بے حد ٹھہراو کے ساتھ] کیا ہے رے؟... کیوں چیخ رہا ہے؟
رویندر:　　باپو مجھے نوکری مل گئی... میں پولیس میں نوکر ہو گیا ہوں...
بوڑھا:　　[اندر آتا ہوا] کیا؟ [اور گھبرا کر چیختا ہوا ایسے دو قدم پیچھے ہٹتا ہے جیسے اس نے زہریلے ناگ کو اپنے سامنے دیکھ لیا ہو] نہیں... نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا... ایسا نہیں ہو سکتا... ہے بھگوان یہ تو نے کیا کیا... [سسکتا ہوا] یہ کس پاپ کی سزا دی تو نے... پھر وہی وردی... نہیں نہیں... میں اور برداشت نہیں کر سکتا... اور برداشت نہیں کر سکتا... اور برداشت... [پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے]
رویندر:　　[باپو کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوا] کیا ہوا باپو؟ کیا ہوا تمھیں؟
بوڑھا:　　یہ پوچھ کیا نہیں ہوا... تو نے پھر سے میرے گھاو کو ہرا کر دیا [اوپر آویزاں بھگوان کی تصویر کی طرف دیکھ کر] ہے بھگوان! میں نے تو نیم کا پیڑ لگایا تھا ٹھنڈی شیتل چھاؤں کے لئے... یہ ببول کیسے بن گیا... بولو پربھو... بولو... اب خاموش کیوں ہو... اور کب تک مجھے تماشے بناتے رہو گے... کب تک میرے جیون میں زہر گھولتے رہو گے... بولو بھگوان... بولو...
رویندر:　　[بھرائی ہوئی آواز میں] تمھیں میری قسم باپو... صاف صاف بولو... میں اب تمھارا دکھ سہن نہیں کر سکتا... بولو باپو بولو...
بوڑھا:　　[رک کر سرد آہ کھینچتا ہوا] اُتار کے پھینک دے اس وردی کو بیٹے... اتار دے اس خونی وردی کو... اس پہ تیری بہن کی آتما کی چیخیں چپکی ہوئی ہیں... میری تمناؤں کا خون لگا ہوا ہے اس پہ... پھینک

دے میرے لعل، پھینک دے... کہیں یہ ناگ بن کر تجھے بھی نہ ڈس لے... کہیں تیرے شریر میں بھی زہر نہ بھر دے... اور پھر میری آنکھوں کے سامنے وہ خونی درشیہ نہ ابھر آئے... پھینک دے... [سسکنے لگتا ہے۔]

رویندر: [روہانسا ہو کر، بوڑھے کو جھنجھوڑتا ہوا] باپو صاف صاف کہو... پہیلیاں مت بجھاؤ... بولو باپو...

بوڑھا: [خلا میں گھورتا ہے۔ دور سے گھنٹی کی مدھم مدھم آواز آ رہی ہے] آج سے برسوں پہلے کی بات ہے۔ جب تم دونوں بھائی چھوٹے سے تھے... بہت چھوٹے... اور اسی ورش تمھاری ماں کا سورگ باس ہوا تھا... شاید وہ بھادوں کی اماوسیہ کی رات تھی... بے حد کالی... بے حد بھیانک بالکل میرے بھاگیہ کی طرح... تم دونوں بھائی کو جنسی کی گھروالی بہلانے کے لئے اپنے گھر لیتی گئی تھی... باہر زوروں کی ورشا ہو رہی تھی... رات بے حد طوفانی تھی.. ایسا لگتا تھا جیسے ہزاروں بھوت پریت ادھر ادھر دوڑ رہے ہوں... چاروں طرف موت کا سناٹا تھا... اور اس دن میری طبیعت بھی کچھ خراب تھی... گھر میں میں اور تیری جوان بہن رما اکیلے تھے... میں کھانا کھا کر ابھی چارپائی پر ہی بیٹھا تھا کہ زور زور سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آنے لگی... اور پھر دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز میرے دروازے پر آ کر رک گئی... کوئی زور زور سے دروازہ پیٹنے لگا۔

[بوڑھا خلا میں گھورتا ہوا خاموش ہو جاتا ہے۔ رویندر بھی بت کے سمان اس کی اور تک رہا ہے۔ بیک گراؤنڈ سے آواز ابھرتی ہے]

آواز: [گھبرائی ہوئی سی] دروازہ کھولو بھائی... دروازہ کھولو...

بوڑھا: کون... کون ہے...؟

آواز: میں ایک مصیبت کا مارا انسان ہوں... کھولو... دروازہ کھولو [زور زور سے دروازہ پیٹنے کی آواز ابھرتی ہے]

بوڑھا: [آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے۔ ایک لمبا تڑنگا انسان اندر آ جاتا ہے] کون؟... کون ہو تم؟

جگیرا: میں ہوں جگیرا ڈاکو...

بوڑھا: [کانپتی آواز میں] تم... اس نردھن کے گھر کیا لینے آئے ہو بھائی...؟

جگیرا: کسی سے کچھ نہیں لینا بھائی... بس میری تھوڑی مدد کرو... پولیس پاگل کتوں کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہے... میرے سارے ساتھی پولیس کی گولیوں کے شکار ہو گئے... اور میں در در بھٹکتا، پولیس سے چھپتا چھپاتا... تمھارے پاس آیا ہوں بھائی...

بوڑھا: میں تمھاری کیا مدد کروں؟

جگیرا: میں بھوکا ہوں... کئی دنوں کا بھوکا... دانے دانے کو ترس رہا ہوں... بس مجھے تھوڑا سا کھانا کھلا دو... تا کہ میں اپنی ہمت جٹا پاؤں... اور اپنی منزل پر پہنچ کر اپنی دیوی سمان پتنی کے چرنوں میں اپنے پاپوں کی چھما مانگ کر... اس کلنکت جیون کا انت کر سکوں [سسکنے لگتا ہے]

بوڑھا: روتا کیوں ہے رے... جب تو نے مجھے بھائی کہا ہے تو کیا ایک بھائی کا یہی کرتویہ ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے گھر سے بھوکا لوٹا دوں... رما... رما
...اری او رما...!

رما: [اندر آ کر] آئی باپو... کیا ہے باپو...؟

بوڑھا: جا اپنے چاچا کو کھانا پروس دے۔ [جگیرا کی طرف دیکھ کر] جاؤ... جاؤ... اندر جاؤ... میں دیکھتا ہوں۔
[بوڑھا ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جگیرا کھانا کھا کر باہر آتا ہے]

جگیرا: بھائی تمھارے اس احسان کا بدلہ نہیں اُتار سکتا [آواز بھرّا جاتی ہے]

بوڑھا: چل بدھو کہیں کا... بھلا بھائی بھی بھائی پر احسان کرتا ہے۔

جگیرا: بھیا، اگر اس زندگی نے ساتھ دیا تو تمھارے آڑے وقت میں ضرور کام آؤں گا... بس اب چلتا ہوں... سے بہت کم ہے۔ [بوڑھے کے ہاتھوں کو چومتا ہے... رما کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے] اچھا چلتا ہوں۔

بوڑھا: [اسے لڑکھڑاتا ہوا دیکھ کر] پیروں میں کیا ہوا؟... لڑکھڑا کیوں رہے ہو؟

جگیرا: کچھ نہیں، ذرا پولیس کی گولی لگ گئی ہے۔

بوڑھا: ایسی حالت میں کیسے جا سکو گے؟

جگیرا: میں چلا جاؤں گا۔ [باہر کی طرف بڑھتا ہوا] آپ چنتا نہ کریں۔ [اور باہر چلا جاتا ہے]

بوڑھا: بیچارہ دُکھی انسان... ایسی دشا میں اپنی منزل تک پہنچ بھی پائے گا یا نہیں۔

رما: ہاں... بیچارے چاچا جی... بھگوان ان کی رکچھا کرے...

[اسی وقت باہر سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز جو اب قریب آجاتی ہے۔ ورشا اب رک چکی ہے۔ دو آدمی دوڑتے ہوئے گھر میں گھس آتے ہیں۔]

بوڑھا: کون... کون ہو بھائی؟

آدمی: تمھارا باپ...

بوڑھا: کیا بولتے ہو بھائی؟

آدمی: میں داروغہ دلدار سنگھ تیرا باپ... اور یہ سپاہی کرم سنگھ تیرا باپ... سمجھا!

بوڑھا: بھائی صاحب آپ پولس کے آدمی ہیں... کیا پولیس والے انسانیت کی بھاشا نہیں جانتے...؟

دلدار سنگھ: [بوڑھے کو زور سے مار کر زمین پر گرا دیتا ہے] چپ کر حرام کی اولاد... بہت بڑ بڑ کرتا ہے۔

[گرے ہوئے بوڑھا کے سینے پر پیر رکھ دیتا ہے اور سپاہی ٹارچ لے کر ادھر ادھر زمین پر کچھ دیکھتا ہے۔ گھر میں جاتا ہے اور پھر واپس لوٹ آتا ہے۔]

بوڑھا: [کراہ کر] یہ کیا کر رہے ہو بھائی؟

دلدار سنگھ: سالے ایک ہی رول میں بھائی... اب بتا وہ تیری بہن کا کھسم کہاں گیا؟
بوڑھا: کون؟.. آپ کس کی بات کرر ہے ہیں؟
سپاہی: ابے اسی کی جو تیرا مہمان بن کر گیا ہے۔
بوڑھا: کون مہمان؟... کس کی بات کرر ہے ہیں آپ لوگ؟
سپاہی: اسی کی جو تمھارے یہاں آیا... تمھارے باورچی خانے میں کھانا کھایا... اور نو دو گیارہ ہو گیا...
بوڑھا: یہاں تو کوئی بھی نہیں آیا...
دلدار سنگھ: [دو تین رول مارتا ہے۔ بوڑھا کراہنے لگتا ہے] کوئی بھی نہیں آیا... یہ خون کے دھبے کیا تیرے باپ کے ہیں؟
بوڑھا: آہ... آہ... آہ...
دلدار سنگھ: [غرّا کر] ابے حرام کے پلّے، سچ سچ بول... نہیں تو جان سے مار ڈالوں گا۔
[رما دوڑ کر باپو کے سینے سے لگ جاتی ہے۔]
رما: [رندھی ہوئی آواز میں] باپو... باپو... باپو!
دلدار سنگھ: [غور سے رما کی طرف دیکھ کر مسکراتا، اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہے اور سپاہی کی جانب دیکھ کر] تو اس گدھے کو سنبھال... میں ذرا اس پکے ہوئے پھل سے منھ کا مزہ بدل لوں... اے لڑکی چل اندر...
سپاہی: [مسکرا کر] داروغہ جی، اکیلے اکیلے ہضم نہیں ہوگا۔
بوڑھا: [گڑگڑا کر] نہیں نہیں... ایسا مت کرو... میں سب کچھ بتا دوں گا... بھگوان کے لئے میری عزت سے مت کھیلو... بھگوان کے لئے [ہاتھ جوڑتا ہے]
دلدار سنگھ: اب تو کیا بتائے گا... اب تو میں اس من پیاری سے پوچھوں گا اکیلے میں... رہی بات اس ڈاکو کی تو سن، پولیس چاروں طرف سے اس علاقے کو گھیری ہوئی ہے... چوہا خود بخود جال میں پھنس جائے گا... اور میں ذرا اس دیسی امرود کا آنند لوں... اے لڑکی چل اندر [اسے اندر دھکیلتا ہے۔ لڑکی چیختی ہے]
رما: باپو... باپو...
بوڑھا: نہیں... نہیں... داروغہ جی... داروغہ جی... ایسا مت کرو...
سپاہی: [ایک زوردار لات مار کر دوبارہ بوڑھے کو زمین پر گراتا ہوا] ابے چپ چاپ پڑا رہ... نہیں تو ایک گولی کھوپڑی میں اتار دوں گا سمجھا...
[اسی وقت اندر سے رما کے زور سے چیخنے کی آواز ابھرتی ہے۔ روشنی اسپارک کرتی ہے۔]
بوڑھا: [زور سے چیختا ہے] نہیں! [ماضی سے حال میں لوٹ آتا ہے۔]
رویندر: باپو، کہہ دو... کہہ دو... یہ سب جھوٹ ہے... یہ سب جھوٹ ہے [روتا ہوا۔ روشنی میں دونوں

اسٹل ہو جاتے ہیں۔]

[وہی منظر، سب کچھ ویسا ہی ہے۔ شام کے جھٹپٹے کا
وقت ہے۔ گھر کے اندر سے بوڑھے کی زور زور سے
کھانسنے کی آواز اُبھرتی ہے۔ بیمار بوڑھا لڑکھڑاتا
ہوا، جھکا جھکا سا اسٹیج پر نمودار ہوتا ہے اور
بڑبڑاتا ہے۔]

بوڑھا: رویندر بھی بڑا بھولا ہے بیچارہ... ڈاکٹر کو بلانے گیا ہے... اب بھلا ڈاکٹر آ کر کیا کرے گا... ارے یہ تو صرف آتی جاتی سانسیں ہیں... جانے کب ان کا ساتھ چھوٹ جائے... کتنا نادان ہے رویندر... ارے جس پیڑ کی جڑ ہی مر چکی ہو اسے جل دینے سے کیا وہ جیوت ہو جائے گا...؟ (پھر زور زور سے کھانسنے لگتا ہے۔ جیسے اندر سے کلیجہ ہی نکل پڑے گا۔ آنکھیں کسی حد تک پھٹی پھٹی سی ہیں اور پھر اسی حالت میں لڑکھڑاتا ہوا سا مرغ کے ٹوکرے کے پاس جاتا ہے۔ ٹوکرا کھول کر مرغ کو ہاتھ میں لے کر بڑے پیار سے کہتا ہے: کیوں رے تجھے بھی کسی نے کچھ نہیں دیا نا... بہت بھوکا ہے تو... اچھا چل تجھے کچھ کھانے کو دے دیتا ہوں [اور اسے ساتھ لیے ہی اندر چلا جاتا ہے اور واپس لوٹ کر اسے ٹوکرے میں بند کرتا ہوا] اچھا، اب تو آرام کر... میں بھی ذرا اس چارپائی پر آرام کر لوں... اندر بڑی گھٹن لگ رہی ہے۔

[بوڑھا چارپائی پر لیٹ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اندھیرا پھیل رہا ہے... خاموشی... چند لمحوں کا وقفہ... اسی وقت کہیں دور سے کتوں کے رونے کی آواز ابھرتی ہے جو رفتہ رفتہ قریب آجاتی ہے۔ بوڑھا گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔ آواز کچھ دھیمی ہو جاتی ہے۔]

بوڑھا: اُف کتنا بھیانک سپنا تھا... ابھی تک کلیجہ کانپ رہا ہے... رویندر ابھی تک نہیں آیا... بھگوان اس کی رکچھا کرے... جانے کیوں آج بھاگمتی کی بے حد یاد آ رہی ہے... دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا ہے [کتوں کے بھونکنے کی آواز پھر تیز ہو جاتی ہے۔ یہ بھیانک آواز فضا کو اور بھی خوفناک بنا رہی ہے۔ اسی وقت زوردار آواز سے دروازہ کھلتا ہے۔ کوئی تیز قدموں سے لڑکھڑا کر اندر آتا ہے۔ وہ سریندر ہے جس کے بال بکھرے ہوئے ہیں۔ کپڑوں کی حالت بھی ابتر ہے۔ وہ شراب کے نشے میں دھت ہے۔]

بوڑھا: کون... سریندر؟

سریندر: اور کون ہو سکتا ہے بابو؟ [نشیلی آواز میں انگلی نچاتا ہوا]

بوڑھا: [چونک کر گھبرائی ہوئی آواز میں] تو... تو نے شراب پی ہے رے؟ [بوڑھا اٹھ کھڑا ہوتا ہے]

سریندر: [ہاتھ نچا کر] ہاں، شراب ہی پی ہے... کسی کا خون تو نہیں پیا...

بوڑھا: تو نے آج اپنا اصلی روپ دکھا ہی دیا۔

سریندر: ارے باپو، ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے؟ ناٹک تو اب شروع ہوا ہے۔

بوڑھا: دور ہو جا کمینے [ہانپتا ہوا] تو نے سارے خاندان کا نام مٹی میں ملا دیا... آج تک کسی نے میری طرف انگلی نہیں اٹھائی تھی... آج... آج تیری اس حرکت نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا... میرے تنے ہوئے سر کو جھکا دیا [مجمع کی جانب دیکھ کر یہ مکالمے بولتا ہے۔]

سریندر: ہاں ہاں، جیسے تمھاری عزّت کا ڈنکا سارے شہر میں بجتا ہے، ارے تمھارا سر تنا ہی کب تھا... زندگی بھر اس ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں، گندی نالیوں میں رینگنے والے کیڑوں کی طرح تم نے زندگی بسر کی ہے۔

بوڑھا: [بھرائی ہوئی آواز میں)] میں غریب ضرور تھا بیٹے... پر حقیر اور ذلیل نہیں... اتنا میں کبھی نہیں گرا جتنا تو آج گر گیا ہے۔

سریندر: بس بس اپنی یہ بکواس بند کرو... میں تمھارا بھاشن سننے نہیں آیا۔

بوڑھا: تو کیا اپنی یہ منحوس صورت مجھے دکھانے آیا ہے۔

سریندر: [زور سے چیخ کر] باپو...

بوڑھا: گلا مت پھاڑ... اور اپنی یہ منحوس صورت لے کر دور ہو جا... یہ شریفوں کا گھر ہے... سمجھا [کھانستا ہے]

سریندر: [لہرا کر] میں نے پہلے ہی کہا ہے، مجھے تمھارا یہ بھاشن نہیں سننا... مجھے پیسے چاہئے... پیسے...

بوڑھا: یہاں کوئی پیڑ لگا ہے کیا... جب جی چاہا توڑ لیا... میرے پاس کوئی پیسے ویسے نہیں ہیں...

سریندر: [بوڑھے کی قمیض پکڑ کر] تمھارے پاس پیسے ہیں... اور تم دو گے...

بوڑھا: تیرے شراب پینے اور رنڈی کے کوٹھے پر جانے کے لئے میرے باس پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہے۔ سمجھا...

سریندر: [اسے مارتا ہوا] نکال پیسے...

بوڑھا: [مار کھا کر بھی)] نہیں دوں گا کمینے... چاہے تو مجھے جان سے مار ڈال...

سریندر: نہیں دو گے؟

بوڑھا: نہیں دوں گا... نہیں دوں گا... نہیں دوں گا۔

سریندر: [بوڑھے کا گلا دباتا ہوا)] تو لے تیرا قصہ ہی ختم کیے دیتا ہوں۔

[اسی وقت باہر سے رویندر اندر آتا ہے۔]

رویندر: باپو، ڈاکٹر تھوڑی دیر میں... [اندر آ کر باپو اور سریندر کو ایسی حالت میں دیکھ کر وہ چیخ پڑتا ہے] چھوڑ دے کمینے باپو کو... چھوڑ دے [سریندر ہڑبڑا کر گلا چھوڑ دیتا ہے۔ بوڑھا اپنا گلا سہلانے لگتا ہے] آج تک بڑا بھائی سمجھ کر تجھے چھوڑتا آیا... آج نہیں چھوڑوں گا... آج نہیں چھوڑوں گا [وہ

اندر سے دوڑ کر لاٹھی لے آتا ہے اور سریندر تیزی سے چاقو نکال لیتا ہے۔]
سریندر: آج میں بھی تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ تو نے ہی باپو کا دماغ خراب کیا ہے... باپو کو بہکایا ہے میرے خلاف...
[رویندر لاٹھی لاکر زور سے سریندر پر چلاتا ہے اور سریندر اس پر چاقو سے وار کرتا ہے۔ دونوں کو روکنے کے لئے بوڑھا بیچ میں آجاتا ہے۔]
بوڑھا: ارے یہ کیا کررہے ہو؟ [چاقو بوڑھے کے پیٹ میں اتر جاتا ہے اور اوپر سے لاٹھی بھی اسی کے سر پر پڑتی ہے۔ منظر تھم جاتا ہے۔ سرخ روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ چند لمحوں کے وقفے کے بعد بوڑھا لہرا کر زمین پر گرتا ہوا] ہے رام...!
دونوں بھائی: [ایک ساتھ چیخ کر] باپو...!
[منظر تھم جاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے۔]

☆☆☆

سہ ماہی 'آمد'

کے

لیے

صرف اپنی تازہ، معیاری، غیر مطبوعہ

اور urdu Inpage میں کمپوزشدہ

تخلیقات رمضامین

ہی درج ذیل ای میل آئی ڈی پر

ارسال فرمائیں :

khursheidakbar@gmail com

☆☆☆

آخری کہانی

[سوانحی ناولٹ]

• قاضی عبدالستار

عزیز القدر
راجہ وھیریندر پرتاپ سنگھ کے نام

آخری کہانی

پورے میدان میں شامیانوں خیموں چھولداریوں اور قناتوں کا ڈھیر لگا تھا۔ کئی آدمی کرگھے کے کپڑوں کی شکلیں نکالنے والے دیو قامت برش سے صفائی کر رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء کی ہولی کا زمانہ تھا۔ چوراسی کوس کی پریکرما شروع ہو چکی تھی۔ ان کے ہجوم مچھر ہٹہ سے گزرنے لگے تھے۔ ہمارا افسانہ ''اندھا'' لکھنؤ سے نکلنے والی میگزین 'جواب' میں اس کے مدیر شارب لکھنوی کے آدھے صفحے کے تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہو چکا تھا۔ ہم سیتاپور کے راجہ اسکول کے آٹھویں درجے میں پڑھتے تھے۔ اسکول میں ہماری شناخت کا آغاز ہو چکا تھا۔ خاندان میں بھی ہمارا افسانہ مشہور ہو چکا تھا۔ ہم مسرکھ کے ہولی کے میلے میں شرکت کیلئے مچھر ہٹہ آتے تھے۔ ہمارے چچا قاضی اختر علی علالت کے باوجود ہماری والدہ کی ہدایت پر میلے میں ہمارے کیمپ کے لگنے کا انتظام کر رہے تھے۔ ہم اپنے چچا کے ساتھ دالان میں بیٹھے تھے کہ گھنگھروؤں کے چھنکنے کی تیز آواز آئی ساتھ ہی شور مچا کہ راجہ صاحب آنت آ گئے۔ نیل گھوڑوں پر لدا ہوا لبڑو پھاٹک کے سامنے آ گیا۔ دو آدمیوں نے نیل گھوڑوں کی ناتھیں پکڑ کر سنبھالنے کی کوشش کی لیکن دونوں نیلے پوری قوت سے لبڑو جھنجھکو رہے تھے۔ اب راجہ کا ہاتھی اور دونوں سیاہ گھوڑے آ چکے تھے۔ راجہ لبڑو سے اترے پھاٹک کے دونوں طرف بندھے ہوئے کالے جھبرے جھبرے کتوں کے پاس کھڑے ہو گئے ہمارے چچا چھوؤں والی آرام کرسی سے اٹھ چکے تھے۔ راجہ نے عیادت کے بعد حیرت سے سوال کیا: 'قاضی صاحب یہ افغان ہاؤنڈ آپ نے کہاں سے برآمد کر لیے۔'' یہ بھیا۔ لائے ہیں۔'' * چچا جان نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ راجہ نے آگے بڑھ کر میرے سر پر ہاتھ رکھا: '' بیٹے یہ آپ کو کہاں سے مل گئے۔''

'یہ ہم لکھنؤ سے لائے ہیں۔'

"لکھنؤ سے؟" راجہ نے سوال کیا۔

"مندرداد کی جان کو مہاراجہ چیتم گڈھ نے دیئے تھے، ان سے ہم مانگ لائے۔"

راجہ، چچا جان سے ان کی بیماری کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ہم دنیا کے واحد ایسے لہڑو کے پاس کھڑے ہوتے تھے جس میں نیل گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ راجہ نیل گھوڑے کے دودھ پیتے بچے اٹھوالیتا انہیں گائے کے تھنوں سے لگادیتا۔ جب بچے سال بھر کے ہوجاتے تو ان کے نتھنوں میں ریشم کی پتلی سی ناتھ ڈال دی جاتی۔ اور ایک بچے کو ایک بچھڑے کے ساتھ ماچی میں جوڑ دیا جاتا اور مہینوں ان کو اسی طرح دوڑایا جاتا۔ جب وحشت ذرا کم ہوجاتی تو دونوں بچوں کو ایک ایک بچھڑے کے ساتھ گڑارے میں جوڑا جاتا۔ گڑارہ ایک چھوڑا سا تختہ ہوتا جس میں چار چھوٹے چھوٹے لوہے کے پہیئے جڑے ہوتے، ایک مضبوط آدمی گڑارے پر کھڑا ہوتا۔ ماچی میں بندھے ہوئے نیلے اور بچھڑے کو دوڑاتا۔ دونوں نیلے دونوں بچھڑوں کے ساتھ دوڑنے کے عادی ہوجاتے۔

یہ مشکل مرحلہ ہوتا لیکن پوری پابندی اور پامردی کے ساتھ اس پر عمل کیا جاتا۔ جب دونوں عادی ہوجاتے تب دونوں نیلوں کو ایک ہی ماچی میں جوڑ کر گڑارے میں باندھ کر دوڑایا جاتا۔ جب مہینوں اس طرح دوڑنے کے بھی عادی ہوجاتے تب نہر روڈ پر ان کو لہڑو میں جوڑا جاتا۔ چونکہ نہر روڈ سواریوں سے خالی ہوتی اس لئے بے خوف ہوکر ان کو دوڑایا جاتا۔ جب ان کی وحشت ایک حد تک دور ہوجاتی تب وہ میرزا مشتاق راجہ صاحب آنٹ کی سواری میں آتے اور راجہ خود ان کو ہانکتے۔ ہماری بیتابی دیکھ کر راجہ نے حکم دیا کہ بھیا کو بٹھا کر تھوڑی دور ٹہلا لاؤ۔ ایک گھوڑ سوار کو آگے چلنے کا حکم ہوتا کہ سڑک صاف ملے۔ دو مضبوط آدمی نیلوں کی ناتھیں تھام کر تھوڑی دور چلے۔ جب نیلے رفتار پر آگئے تو الگ ہوگئے۔ دونوں جنگلی جانور ہرن کی طرح چاروں پیروں سے اچھل رہے تھے۔ میل دو میل کا چکر لگ کر جب ہم واپس آئے تو راجہ چائے پی رہے تھے ہم کو اپنے پاس بلا کر فرمایا:

"ہمارا کیمپ خالی پڑا رہتا ہے، ہم صرف دو دن افتتاح اور اختتام پر آئے ہیں۔ آپ کیمپ کا جھگڑا کیوں پال رہے ہیں۔ ہمارے کیمپ میں ٹھہریئے۔ جتنے آدمیوں اور جانوروں کے ساتھ جی چاہے۔ باورچی خانہ قائم ہے، سواریاں موجود ہیں، ٹھاٹھ سے گھومیے پھریئے، چھٹیاں انجوائے کیجئے۔"

"ان کو نوتنکی دیکھنے کا شوق ہے مغرب بعد کھانا کھاتے ہیں دو بندوقیں اور چار آدمی لہڑو پر بٹھاتے ہیں اور صبح آتے ہیں۔ بھابھی صاحب رات کے سفر کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں اس لیے کیمپ۔۔۔" چچا جان نے فرمایا۔

"نہیں نہیں کیمپ لگانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ کل کتنے بجے سوار ہونا چاہتے ہیں۔" راجہ انکل نے

پوچھا۔ ''دو بجے کے بعد۔''

رلبہ انکل نے سامنے کھڑے ہوئے مسلح آدمیوں کی طرف نگاہ اٹھائی:

''کل دس بجے ہاتھی لگ جائے۔ دوپہر کا کھانا ہم بھیا کے ساتھ کیمپ میں کھائیں گے۔''

ہم خوش خوش اماں کے پاس گئے۔ پوری بات سنی۔ ذرا سا تامل کیا اور اجازت دے دی۔

کیمپ کے چھوٹے سے خیمے میں قالین پڑا تھا۔ مسہری بچھی تھی۔ صوفہ سیٹ لگا تھا۔ ایک طرف سامان رکھنے کے لیے اسٹول پڑے تھے۔ ضرورت کا ہر سامان موجود تھا۔

ہم گدگدے بستر پر لیٹے ہی تھے کہ خدمتگار حاضر ہوا:

''سرکار نے آپ کو کھانے کی میز پر یاد کیا ہے۔''

شامیانے کے ایک طرف کھانے کی میز پر رلبہ انکل کھڑے تھے۔ پورا قد، بھرا ہوا بدن، گندمی رنگ، روشن چہرہ، ترشے ہوئے خدوخال، سفید قمیص، سفید برجس، سرخ ساق پوش، سرخ جوتے پوری شخصیت پر تمکنت برس رہی تھی۔ مسکرا کر سلام کا جواب دیا: ''آیئے بیٹے کھانا کھایئے''۔ کنارے چوکی پر لوٹا صابن وان اور تاش رکھا ہوا، تاش میں گھاس بھری ہوئی تھی۔ ایک ملازم نے ہاتھ دھلائے۔ پوری میز مرغن کھانوں سے سجی ہوئی تھی۔ ہم لوگ پلاؤ کھا رہے تھے کہ ایک لانبا ادھیڑ شخص ریشمی کرتا اور مہین بنگالی دھوتی باندھے سامنے آیا۔ رلبہ کی نگاہ اٹھتے ہی کمر تک جھک گیا۔

'جمنا پرشاد......اس نے ہاتھ جوڑ لیے۔ کیمپ تمھاری نگرانی میں دیا گیا؟ میری طرف دیکھا۔

'بھیا......ہمارے مہمان ہیں۔ خبردار جوان کو تکلیف ہوئی۔'

'کیا مجال سرکار۔'

ہاتھ دھو رہے تھے۔ حکم دیا:

'گھوڑی لگاؤ'

سیاہ گھوڑی سرخ چمڑے کی زین اور چاندی کے رکاب پہنے قناتوں کے اندر آ گئی۔ ایک خدمت گار نے ہاتھ بھر کا آئینہ اور کنگھا پیش کیا۔ بائیں طرف نکلی ہوئی مانگ درست کی۔ سپاہی کے ہاتھ سے ریوالور لے کر داہنی جیب میں لگایا۔ ایک لحیم شحیم سپاہی جو پستول پہنے ہوئے تھا رلبہ کے نکلتے ہی گھوڑی کی داہنی رکاب تھام کر کھڑا ہو گیا۔ رلبہ اُچھل کر سوار ہوا۔ ہمارے سلام کا ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ باقی سلام نگاہ نے قبول کیے۔ ہم بھی گیٹ تک گئے۔ دونوں طرف مسلح دو گھوڑ سوار کھڑے تھے آہستہ آہستہ رلبہ کے پیچھے چلنے لگے اور ہجوم میں غایب ہو گئے۔

ہر چند کیمپ میلے کے باہر لگایا گیا تھا لیکن پھر بھی میلہ وہاں تک پہنچ گیا تھا۔ ہم ناگا باباؤں کا جلوس دیکھ رہے تھے کہ کسی نے ہماری آنکھیں بند کر دیں:

'کون'؟

'پہچانو!'

بھانو پرتاپ سنگھ ٹھاکر ہم سے سینئر تھے اس لیے جب ہم چھٹے درجے میں تھے تب بھی ٹھاکر آٹھویں درجے میں تھے اور اب ہمارے ساتھ بھی آٹھویں درجے میں تھے۔ ہم دونوں ہاکی بہت اچھی کھیلتے تھے۔

''ابے سلام کر تیری بھابی ہیں۔'' ہم نے چونک کر دیکھا۔ ابتدائی تاریخوں کے چاند کی طرح نازک نازک سنہری سنہری چودہ پندرہ برس کی ایک لڑکی بنارسی ساڑی اور ہلکا جڑاؤ زیور پہنے مسلح سپاہیوں کے ہجوم میں کھڑی تھی۔ ہمارے سلام کے جواب میں سونے کا کنول تصویر سا ہاتھ پکھراج سی پیشانی پر پہنچا۔ یاقوت کے ترشے ہوئے ہونٹوں سے کندنی آواز میں سجا ہوا 'آداب' اس طرح نکلا جیسے کسی ملکہ نے موتیوں کا لچھا نکال کر ڈال دیا ہو۔ چہرہ مونالیزا کی مسکراہٹ سے دمک رہا تھا۔

'یہ تم راجہ آنٹ کے کیمپ میں کیسے کھڑے ہو۔ 'تمھارا کیمپ کہاں ہے؟'

''امسال ہمارا کیمپ نہیں لگا۔ راجہ انکل چچا جان کی عیادت میں مجھر ہٹہ گئے۔ رہیں بہت اصرار سے ہم کو اپنا مہمان بنالیا۔ تمھارا کیمپ کتنی دور ہے یہاں سے''۔ وہ اُداس ہو گیا: ''بپا [والد] کے بدھن کے کی وجہ سے دادوں میں تیوہار نہیں منایا گیا۔ ہم رانی کو درشن کرانے چلے آئے۔'' ہم نے ٹھاکر صاحب دادوں کا ہاتھ تھام لیا: ''آؤ میرے ساتھ اندر آؤ'' وہ ستاروں کے دیس سے اتری ہوئی کامنی سی لڑکی مغرور رانیوں کی طرح میلہ کمیٹی کے چیئرمین اور تحصیل مسرکھ کے سب سے بڑے تعلقہ دار راجہ مشتاق کے سب سے بڑے اور سجے ہوئے کیمپ کو اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں سے سرفراز کرتی آرہی تھی۔ ٹھاکر کے مسلح سپاہی گیٹ پر ہی بکھر گئے۔ ہم اپنے شامیانے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ جمنا پرشاد نے روک دیا:

''بھیا راجہ آپ وہاں کہاں جا رہے سرکار کے شامیانے میں تشریف لے چلیے۔''

سارے میں قالین پڑے تھے۔ بھاری مسہری کے ایک طرف مرصع صوفہ سیٹ لگا تھا اور دوسری طرف کا مدار دیوان کے سامنے نقشیں کرسیاں بچھی تھیں۔ ٹھاکر میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ٹھکرائن برابر کے پیس پر سج گئیں۔

''ٹھاکر تم نے بھابھی جان کا نام نہیں بتایا۔''

''ان کا نام شانتی دیو سنگھ ہے۔ ہم شنو کہتے ہیں اور شنو یہ قاضی عبدالستار ہیں عرف چھبن تم ان کو بھیا کہا کرو۔''

''بھیا کیوں کہا کریں؟ ہم دیور ہیں۔ بھیرن تھوڑی ہیں۔''

مرجان کے ہونٹ دراز ہوئے گوہر دانتوں کی ذرا سی آب چمکی۔ اور لعل و جواہر برسنے لگے:

''بھیا..... ہمارے یہاں دیور کو بھی بھیا کہتے ہیں، ہم ان کی چمک دمک میں کھوئے ہوئے تھے

کہ جمنا پرشاد آئے ذرا سا خم ہوئے: "{ کھانا تیار ہے راجن لوگ کا حکم ہو تو میز لگائی جائے۔"
"نہیں۔ ہم کھانا کھا کر نکلے ہیں۔" ٹھاکر نے سختی سے کہا۔ جمنا پرشاد اور جھک گئے:
"چائے۔ کافی۔ ٹھنڈا۔ کچھ تو۔۔۔"
"ٹھیک ہے چائے لے آؤ!" ٹھاکر نے حکم دیا۔
چاندی کی ٹیچ سے گولڈن لپچو کو ٹرانسپیرینٹ پیالیوں میں ڈھالتے ہوئے لانبی مخروطی انگلیوں کے ناخن ناچ رہے تھے، ناخن کہاں تھے چھوٹے چھوٹے گول گول لال جڑے ہوئے تھے جو رقص کر رہے تھے۔ تین پیالیاں اس طرح رکھی تھیں جیسے شراب طہورہ سے چھلکتے ہوئے آسمانی آبگینے رکھے ہوں اور جنت الفردوس کی کوئی حور گنہگار بندوں کو اپنی عطائے خاص سے مشرف کرنے والی ہو!
"تمہارا پروگرام کیا ہے؟"
"ہم شنو کو درشن کرا کے واپس چلے جائیں گے۔ ہمارا ہاتھی راجہ بنیامو کے کیمپ میں کھڑا ہے"۔
میں نے ہاتھ تھام لیا: "تم ٹھہرو میرے پاس۔ کوئی تکلف مت کرو۔ راجہ انکل کے مزاج سے واقف ہوں۔ تمہارا کیمپ ہوتا تو میں سوچتا بھی نہیں، لیکن تم خود۔۔۔"
"فضول باتیں مت کرو۔ آدمیوں کو حکم دو کہ تمہارا سامان لیکر آ جائیں۔"
دونوں راجہ کے کیمپ میں ٹھہر گئے۔ شام کی چائے ایک ساتھ پی گئی۔ جب برتن اٹھنے لگے تو میں نے بھانو سے کہا: "مجھے بھابھی جان کہتے اچھا نہیں لگتا میں ان کو رانی کہوں گا"۔ دونوں مسکرا دیئے۔ ہم لوگ مزے مزے کی باتیں کر رہے تھے کہ بھانو اٹھ پڑے۔ اور ایک چکر لگا کر شامیانے سے نکل گئے۔ رانی اُن کو دیکھتی رہی پھر کھڑی ہوگئی۔ میرے قریب آئی:
"بھیا؟......" بھیا تو مجھے بہت سے لوگ کہتے تھے لیکن رانی نے اس طرح کہا کہ پوری سماعت سرخ پھولوں سے مہک اُٹھی۔
"آپ جانتے ہیں کہ ٹھاکر شراب پیتے ہیں؟"
"آج سے پیتے ہیں؟.........دو برس سے پی رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو اسکول بھی پی کر چلے آتے ہیں۔"
"کوئی ایسی صورت نہیں کہ۔۔۔۔"
"آپ تو جانتی ہوں گی کہ ٹھاکر کے فادر کا سب سے بڑا دکھ ٹھاکر کی شراب تھا۔ جو کچھ وہ کر سکتے تھے سب کر چکے لیکن شراب نہیں چھوٹی۔ تو ہم لوگوں کی کیا حقیقت؟" ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ پیٹرومیکس جلائی جا رہی تھیں کہ بھانو آگئے۔ صوفے پر رانی کے پاس بیٹھ گئے۔
"سنو۔ یہ ہمارا دوست ہے یار ہے۔ یہ شاعر بھی ہے افسانہ نگار بھی ہے یہ تم کو کہانیاں سنائے گا شاعری سنائے گا۔ ٹھیک ہے"۔ شنو کا جواب سنے بغیر شامیانے سے نکلتے نکلتے بولے" میں راجہ بنیامو کے کیمپ

جا رہا ہوں ابھی آتا ہوں: اور تیز تیز قدموں سے نکل گئے۔ رانی نے میری طرف خاص انداز سے دیکھا:

''آپ کچھ سمجھے؟''

''میں سب سمجھ گیا۔ ایک بات پوچھوں آپ ناخوش تو نہیں ہوں گی؟''

''نہیں آپ کچھ بھی پوچھ سکتے ہیں''۔

''آپ کے فادر کو تو معلوم ہوگا کہ بھانو شراب پیتا ہے۔''

''ہاں معلوم تھا لیکن انھوں نے کچھ زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ ماماں نے ناگواری کا اظہار کیا تو جواب ملا: 'ٹھکرائی ہے، لڑکیاں ہے، شادی بیاہ ہوگا سب ٹھیک ہو جائے گا'۔ ہمارے پاپا اور بھانو کے پاپا دونوں کالون تعلقدار کالج میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ دونوں میں بہت دوستی تھی جیسی آپ میں اور بھانو میں ہے۔ ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا کھانا پینا سیر و شکار سب کچھ ایک ساتھ۔ کسی سے ایک کی لڑائی ہوتی تو دوسرا خفا ہو گیا۔ کسی کی کسی سے دوستی ہوتی تو دوسرا جان چھڑکنے لگا۔'' وہ خاموش ہو گئی دیر تک ایک ناگوار خاموشی طاری رہی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں اس کے کلام کی غیر معمولی لذت سے محروم ہو جانے پر رضامند نہیں ہوں:

''آپ تو لا مارٹینز، کی اسٹوڈنٹ تھیں۔''

''تھیں نہیں۔ میں آج بھی ہوں۔ پچھلے سال جب میری میرج ہوئی' تو میں آٹھویں میں تھی اب نویں میں ہوں۔''

''یعنی آپ ہم دونوں سے ایک درجہ آگے۔''

''جب شادی کی بات چلی تو میں نے ماماں اور پاپا دونوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں میرج چھوڑ سکتی ہوں ایجوکیشن نہیں''۔

''آپ کتنے بھائی بہن ہیں؟''

''میں اکلوتی ہوں۔ میرے سات بھائی پیدا ہوئے لیکن کوئی سات مہینے بھی نہیں جیا۔''

''راجن لوگ کھانا کتنے بجے کھائیں گے؟'' ایک شخص نے قریب آکر سوال کیا۔

''کسی آدمی کو راجہ بنیا مو کے کیمپ بھیجو اور بھانو پرتاپ سنگھ سے پوچھو کہ وہ کھانا کتنے وقت کھائیں گے''۔

''آپ کے ملازمین میں کوئی عورت نہیں ہے؟''

''کیوں؟''

''بھانو......نوٹنکی دیکھنے ضرور جائیں گے تو آپ تنہا۔''

''اس کی فکر نہ کریں۔ پردے پر دو چار سپاہی لیٹ رہیں گے۔ میں نے پوری عمر میں پہلی بار اتنا لمبا سفر کیا ہے ہاتھی پر آپ کو معلوم ہے میں ٹھیک سات بجے سوار ہوئی تھی اور بارہ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے جب کیمپ پر اتری ہوں۔ سارا بدن چور چور ہو گیا ہے۔ کیمپ پر اترتے ہی میں نے کہہ دیا تھا کہ میں درشن کو

آج نہیں جاؤں گی۔"

"پھر آپ کیمپ سے نکلیں کیوں"۔

"وہ تو ہم دونوں آپ کا کیمپ ڈھونڈھنے نکلے تھے۔"

"ایک بات میری مانیں گی؟"

"فرمایئے۔"

"آپ بستر پر لیٹ جائیے یہ چادر اوڑھ لیجیے۔ میں کرسی پر بیٹھ کر آپ کو کہانیاں سناؤں گا"۔

"اور میں سو گئی تو؟"

"میں اپنے شامیانے میں چلا جاؤں گا۔"

"تھوڑی دیر لیٹنے سے آرام تو مل جائے گا۔ اُٹھیے۔ اُٹھ پڑیے نا۔"

"بھیا۔ مجھے آپ کے سامنے لیٹتے اچھا نہیں لگتا۔"

"میں آپ کا بزرگ نہیں ہوں"۔ میں اٹھ پڑا

"تو اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں۔ وہ کسمساتی رہیں پھر اٹھیں اور مسہری پر بیٹھ گئیں۔ میرے اصرار پر لیٹ گئیں۔ میں نے چادر پیروں پر ڈال دی۔ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور کہانی سنانے لگا۔ وہ روایتی 'ہوں' اور 'جی' کہتی رہیں اور تھوڑی ہی دیر میں سو گئیں۔ میری آنکھ بھی جھپک گئی۔ آنکھ کھلی تو بھاتو رانی کو اٹھا کر بٹھا چکا تھا۔ اور راجہ انکل کا خدمت گار کھڑا تھا۔

"راجن لوگ کا حکم ہو تو میز لگائی جائے۔" میں نے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔ ٹھاکر نے گردن ہلا دی۔ ٹھاکر اور رانی میز کے ایک طرف پاس پاس بیٹھے تھے۔ میں سامنے تھا۔ ٹھاکر کیفیت میں تھے، دو لقمے اپنے منھ میں رکھتے تو ایک چھوٹا سا نوالہ رانی کے منھ کی طرف بڑھاتے۔ وہ شرماتیں۔ مجھے دیکھ کر اور شرماتیں۔ لیکن ٹھاکر کے گھڑکنے پر منھ کھول دیتیں۔

"آپ کو شرم نہیں آتی بھیا کے سامنے۔" شیریں ناگواری سے کہا:

"شرم اور اس سے؟ ارے یہ یار ہے۔ یار جانی۔" ٹھاکر نے بہت جما کر جواب دیا۔

"یار جانی سے بھی شرم کی جاتی ہے۔"

"تمھارے یہاں کی جاتی ہوگی ہمارے یہاں نہیں کی جاتی" اور نوالہ منھ میں رکھ دیا۔ کھانے کی میز پر ہی ٹھاکر نے اعلان کر دیا کہ آج وہ نوٹنکی دیکھنے نہیں جائیں گے اور آرام سے سوئیں گے۔

صبح میں فریش ہونے کے لیے باہر نکلا تو غسل خانے کی چھولداری پر ایک سپاہی کندھے پر بندوق رکھے کھڑا تھا۔ میں نے اشارے سے پوچھا، معلوم ہوا رانی نہا رہی ہیں۔

ناشتے کے لیے شامیانے میں قدم رکھا تو رانی میز کے پاس کھڑی تھیں چھینٹ ساری میں بجی ہوئی۔

کمر تک بال کھلے ہوئے میرے سلام کے جواب میں مسکرا کر اس طرح ہاتھ جوڑے جیسے پوری دنیا ہاتھوں میں سمیٹ کر نذر کر دی ہو۔ ٹھاکر کی پلیٹ کی طرح میری پلیٹ بھی منہدی سے آراستہ تصویر ہاتھوں کی خدمت سے مشرف ہوئی۔ چائے خود بنائی، پہلی پیالی ٹھاکر کو دوسری مجھے پیش کی اس طرح خم ہو کر ایسی ادا سے پیش کی جیسے آسمان سے اُتاری ہوئی کوئی نعمت ہے جو مجھے صرف مجھے پیش کی جارہی ہے۔

ہم لوگوں نے چائے ختم کی تھی کہ جمنا پرشاد آ گئے۔ ہاتھ جوڑ کر میز کے پاس کھڑے ہو گئے:

''راجن لوگ دوپہر کے کھانے میں؟''

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دوپہر کا کھانا ہم لوگ 'دھندھاری' کے جنگل میں کھائیں۔'' ٹھاکر نے کہا

''کیوں نہیں ہو سکتا مالک۔ شکار کا انتظام فورن''۔

''نہیں ہم لوگ پکنک پر جائیں گے اور لہڑو پر جائیں گے۔''

''سرکار کا لہڑو موجود ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ راجن لوگ اس پر سوار ہوں۔ چار بندوقیں پیچھے سائکلیں اور بارہ سپاہی ساتھ جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔ کتنی دیر میں سوار ہوں گے؟ ٹھاکر نے گھڑی دیکھی ''دس تو بج ہی جائیں گے''۔

''غلام ابھی انتظام کرتا ہے۔''

لہڑو ریشمی رسیوں سے بُنا ہوا اور پیتل سے ڈھکا ہوا کھڑا تھا۔ بڑے بڑے بے نظیر بیل پھنپھنا رہے تھے مخملی قالین پر چھوٹے چھوٹے تکیے رکھے تھے۔

''پہلے رانی بیٹھ جائیں پھر بیل جوڑے جائیں۔۔۔۔۔۔ اور لہڑو میں ہانکوں گا''۔ میں نے کہا۔

''بیل بہت سرکش ہیں۔ آپ سے سنبھلیں گے نہیں''۔ راجہ انکل کے خاص الخاص ملازم نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ ''میں شکار کے بیل دوڑاتا ہوں یہ تو سواری کے ہیں''۔ خالی سڑک ملتے ہی میں نے بیلوں کو چھیڑ دیا۔ بیل تو ڈوری کے اشارے پر چل رہے تھے بھڑک گئے اور ڈکی چلتے چلتے اُڑنے کے لیے دُمیں اٹھائی تھیں کہ ٹھاکر نے میرے کان پر منہ رکھ دیا: ''تمھاری بھابھی پرگنینٹ ہیں سنبھل کر چلو۔'' میں سر سے پاؤں تک جھنجھنا گیا۔ جنگل میں داخل ہوتے ہی دلارے سنگھ نے سائیکل کے کیریئر سے دوسرے کو اُتارا اور لپک کر میرے قریب آ گئے:

'میرے پیچھے پیچھے آئیے تو بہو رانی کو جنگل کے تماشے دکھاؤں۔'' دلارے سنگھ دھندھاری جنگل کی دائی کہے جاتے تھے اور عمدہ شکاری تھے۔ مجھے رکنے کا اشارہ کیا بیلوں کی گردنوں سے چاندی کے گھنگھروؤں کی ہمیلیں اتار کر تھیلے میں رکھ لیں اور لہڑو کے آگے آگے چلنے لگے۔

بہت آہستہ سے لہڑو کھولا گیا۔ بیلوں کو پہیوں میں باندھ دیا گیا۔ میں نے رانی سے پوچھا آپ کو پیدل چلنے میں تکلیف تو نہیں ہوگی۔ انھوں نے گردن ہلا دی اور ٹھاکر کے آگے آگے چلنے لگیں۔ تھوڑی دور چل کر دلارے نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ ڈھاک اور کروندے کی جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے ایک مقام

پر پہنچے۔ سامنے بالکل گول تالاب تھا اور اس کا چاندا آبی پرندوں سے پٹا پڑا تھا۔ یہ وہ چڑیاں تھیں جو کارواں سے بچھڑ گئیں تھیں۔ اپنی پُرخوری اور عشرت پسندی کی بنا پر سینکڑوں ہزاروں کوس اُڑنے سے عاجز تھیں۔ بیمار کاہل اور جاہل قوموں کی طرح طاقت کا شکار ہونے کے لیے زندہ تھیں۔ سرخابوں کی ایک ڈار ہمارے بہت قریب آ گئی تھیں۔ رانی مبہوت کھڑی دیکھ رہی تھیں: ''حکم ہو تو بندوقیں حاضر کی جائیں'' کوئی پھسپھسایا۔

''نہیں''۔

ہم تینوں نے سختی سے منع کر دیا۔ رانی دیر تک کھڑی ان کی اٹکھیلیاں دیکھتی رہیں۔ پھر چلنے کا اشارہ کیا۔ کوئی سائیکل لیکر اُڑا اور ذرا سی دیر میں لہڑو لے آیا۔ ٹھا کر نے رانی کو سہارا دے کر بیٹھا دیا۔

''سامنے جو برگد ہے وہاں چلنا ہے مور کا ناچ دیکھنے''۔ دلارے نے کہا۔ رانی بیقرار ہو گئیں۔

ایک جگہ لہڑو سے اترے کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتے بچاتے چھوٹے سے آم کے پیڑ کے نیچے آ گئے۔ دلارے نے کمر سے چادر اکھولا اور گھاس پر بچھا دیا۔ رانی کے بیٹھنے کے بعد ہم لوگ بھی بیٹھ گئے۔ پتوں کی آڑ سے ڈھیروں مور نظر آ رہے تھے۔ نر مادہ بچے اور بچے کھیل رہے تھے۔ دیر تک بیٹھے رہے اور دیکھتے رہے۔ بڑی دیر بعد ایک بڑا مور برگد کی جڑ کے پاس سے نکلا اور صاف ٹکڑے میں کھڑا ہو گیا اس کے پیچھے پیچھے چار مادائیں نیم دائرہ بنا کر کھڑی ہو گئیں۔ مور نے داہنے بائیں پر پھیلاتے اپنی لانبی گردن سے بائیں بازو کو کھجایا۔ خاموش کھڑا ہو گیا۔ رانی اُوبنے لگیں۔ دلارے نے اشارے سے تسلی دی اچانک طاؤس نے داہنا پیر باہر نکالا بدن کو دھیرے سے جھٹک کر پر کھولنے لگا چاروں مورنیاں کنیزوں کی طرح ادب سے کھڑی تھیں۔ اب چھتر کھل گیا تھا اس کے پیر شاہانہ انداز میں بہت آہستہ سے ذرا سا داہنے ذرا سا بائیں۔ پھر آگے اور پیچھے جنبش کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کبھی کبھی ناچتے ناچتے طاؤس کی آنکھ سے آنسو بہتا ہے جو مورنی پی لیتی ہے اور حاملہ ہو جاتی۔ طاؤس جوڑا نہیں کھاتا۔ ناچ ختم ہوتے ہی ہم لوگ آہستہ آہستہ جھاڑیوں سے باہر نکل آئے تھوڑی دور چلے تھے کہ لہڑو آ گیا۔ پھر ایک سائیکل سوار نے اطلاع دی کہ پکے کنویں کے پاس کھانے اور چائے کے سامان سے لدا دوسرا لہڑو کھڑا ہوا ہے۔ ٹھا کر نے گھڑی دیکھی دو بجنے والا تھا۔

کنویں کی جگت پر سوتی قالین بچھا تھا۔ ہم تینوں بیٹھ گئے۔ ہماری دوری کھولی گئی۔ پراٹھے کباب قلاقند اور بھرے مرچے ڈھیر تھے سفالی پیالے اور طشتریاں اور کوزے دھلے رکھے تھے۔ ایک پورا چھابا پوریوں اور ترکاریوں سے بھرا تھا۔ رانی نے بہت احتیاط سے سب کے حصے لگا کر تقسیم کر دیے۔ کھانا کھا چکے تو بھانو نے چائے کی فرمائش کی۔ انگیٹھی دہکائی گئی۔ ہم تین آدمیوں کے لیے چائے بنائی گئی۔ اٹھتے اٹھتے تین بج گئے۔ ہم نے دلارے سنگھ کو بلایا اور کہا کہ ایک بار ہم یہاں شکار کھیلنے آئے تھے تو بہت سے پھول دیکھے تھے۔ اس نے خوش ہو کر کہا 'میرے ساتھ سائیکل پر چلیے تو میں پھول دکھاؤں'۔ میں دو آدمیوں کے ساتھ سائیکلوں پر سوار ہوا۔ ایک مقام پر سائیکلیں چھوڑنا پڑیں۔ کروندے اور ڈھاک کی جھاڑیوں سے نکلے تو نشیب میں دور تک

پھولوں کے تختے نظر آئے۔ میں بیتاب ہو کر چل پڑا کانٹوں کی پرواہ کیے بغیر چُن چُن کر سرخ پھول توڑنے لگا۔ پورا ایک انگوچھا بھر گیا۔ لیکن دو انگلیاں زخمی بھی ہوئیں جن پر مٹی چڑھا دی گئی خون بند ہو گیا۔

دوسرے لہڑو کے قالین کو موڑ کر گاؤ تکیہ بنا دیا گیا تھا۔ رانی اس سے ٹیک لگائے نیم دراز تھیں شاید آنکھ جھپک گئی تھی۔ میرے پکارنے پر آنکھیں کھولیں۔ مسکرائیں تو ہونٹ اُودے نظر آئے۔ وہ پیر سمیٹ کر احتیاط سے بیٹھ گئیں۔

''کرونڈے خوب کھائے گئے۔'' ہم نے پوچھا

''ہاں بھیا۔ یہ جامن کے پیچھے بہت مزے کے تھے۔''

ہم نے پھولوں سے بھرا پورا انگوچھا ان کے سامنے انڈیل دیا۔ انھوں نے پھولوں سے دونوں مٹھیاں بھریں اور چہرے کے قریب لائیں تو تمام پھول مرجھا گئے۔ ٹھاکر کسی طرف سے آئے ایک پھول چن کر رانی کے بالوں میں لگانے لگے۔ وہ شرما گئیں۔

''کیا کر رہے ہیں۔ کیمپ میں لگا دیجئے گا۔'' رانی نے روٹھتے ہوئے کہا۔

''ہم اپنی دولھیا کے بالوں میں پھول لگا رہے ہیں۔ لیکن لگا نہیں پا رہے ہیں اس لئے کہ ہم ٹھاکر ہیں اور ٹھاکر یہ کام کر نہیں پاتے۔ میرے یار جانی کچھ تو ہی مدد کر''۔ بھانو نے مجھ سے کہا۔

''یار ٹھاکر ہم نے بھی کسی کے بالوں میں پھول نہیں لگایا کبھی۔ تمھاری طرح کوشش کر سکتے ہیں۔'' ایک بڑا سا سرخ پھول لگ گیا۔

''ارے یار تو تو بڑا کلاکار نکلا۔ شنو ذرا سر ہلاؤ۔ پھول نہیں گرا۔ زور سے ہلاؤ پھول نہیں گرا، کمال ہو گیا۔''

''مالک بادل گھر رہے ہیں ہولی کے میلے ماں پانی جرور برستا ہے''۔ کسی ملازم نے کہا۔

''لہڑو لگاؤ'' ٹھاکر نے حکم دیا۔ ''گھنگرو باندھو''۔ ہم نے کہا

''بھیا کو گھنگرو بہت پسند ہیں۔'' رانی نے کنکھیوں سے دیکھ کر کہا۔

''ارے یہ گلاب جان کا عاشق ہے یہ نوٹنکی نہیں دیکھتا ہے گلاب جان کا ناچ دیکھتا ہے۔'' ٹھاکر نے بہت جما کر کہا۔ ''تم نہیں دیکھتے ہو؟'' ہم نے کہا۔

''ہم دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن دادوں سے سر کھ ناچ دیکھنے نہیں آئے ہیں یہ تو مجھر ہٹہ سے سر کھ ناچ دیکھنے آتا ہے۔ سورج بیٹھتے کھانا کھاتا ہے، دو بندوقیں اور چار آدمی لیتا ہے اور سر کھ۔ گلاب جان کا ناچ ختم ہوا۔ چار بجے صبح لہڑو تیار اور مجھر ہٹہ۔''

کیمپ کے دُوارے گھوڑے مکھیاں اڑا رہے تھے اندر سناٹا تھا۔ معلوم ہوا کہ راجہ انکل آ گئے ہیں اور ملاقات کے شامیانے میں تشریف رکھتے ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ خوابگاہ میں ٹھاکر کا قیام ہے تو قدم نہیں

رکھا۔ ہم لوگ آنگن میں پہنچے تھے کہ راجہ انکل باہر آگئے۔ اونچا چھریرہ جسم، گندمی رنگ روشن خدوخال سلک کی قمیض سفید برجس سیاہ ساق پوش شان وشکوہ کی مورت بنے کھڑے تھے۔

''ہم کو بتلایا گیا کہ ہماری بہورانی نے ہمارے کیمپ میں ٹھہرنے میں بہت تکلف کیا۔ ہمارے پاس آئیے آپ کے فادر ٹھاکر گجراج سنگھ تعلقدار جمال پور ہمارے کلاس فیلو ہیں۔ اور آپکے خسر ٹھاکر رام پرتاپ سنگھ تعلقدار ارداؤں ہمارے ساتھ میلہ کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے تھے جب انکا انتقال ہوا ہم راج میں نہیں تھے ورنہ ہم داؤں ضرور جاتے۔'' رانی بیر بہوٹی بنی سر پر آنچل ڈالے ادب سے خاموش کھڑی تھیں۔

آج درشن کے بعد بھگدڑ میں دو آدمی مر گئے۔ بیگ ڈپٹی کمشنر اور فرگوسن سپرنٹنڈنٹ پولس سیتاپور نے دورہ کیا تو میلہ کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے ہم کو بھی آنا پڑا۔ آپ ٹھاٹ سے قیام کیجئے بھانو کے ساتھ گھومیے۔''

''جمنا پرشاد۔''

''سرکار!''

''ہماری بہورانی کو کوئی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔ گھوڑی لاؤ۔''

سرخ مخمل کا ساز اور چاندی کے رکاب پہنے سفید گھوڑی اندر لائی گئی۔ رانی آگے بڑھی۔ ہاتھ جوڑے: ''راجہ انکل ایک پیالی چائے پی لیجیے ہمارے ساتھ۔''

''ہم ضرور پیتے۔ لیکن بادل لدا کھڑا ہے ہماری موٹریں بیگ مانگ لے گیا۔ ہم کو نزلہ ہے ہم بھیگنا نہیں چاہتے۔ اس لیے آپکی چائے اُدھار رہی۔''

گھوڑی کی طرف بڑھے کسی سپاہی نے رکاب پر ہاتھ رکھ دیا۔ راجہ اُچھل کر سوار ہو گیا۔ رانی نے آئینے کی طرح چمکتی پیشانی پر سونے کا ہاتھ رکھ کر یاقوت کی آواز میں آداب کیا۔ راجہ نے مسکرا کر جواب دیا اور کیمپ سے نکل گئے۔ ہم شامیانے میں داخل ہوئے۔ ایک تپائی پر گراموفون رکھا تھا۔ اس کے پاس بڑا سا ناشتے دان اور تھیلا دھرا تھا۔ ناشتے دان میں کئی قسم کے حلوے اور تھیلے میں میوے بھرے تھے۔ بستروں پر ہلکی رضائیاں رکھی تھیں۔ رانی ریکارڈ چن رہی تھی کہ میز لگ گئی۔ چائے ڈھالتے ہوئے رانی نے پوچھا:

''بھیا.........راجہ انکل نے شادی کیوں نہیں کی؟''

مشہور ہے کہ کالون تعلقدار کالج لکھنؤ میں جب پڑھتے تھے کسی انگریز لڑکی پر عاشق ہو گئے۔ وہ ہندوستان میں رہنے پر رضا مند نہ ہوئی۔ راجہ انگلینڈ نہیں جا سکے۔ جا کر کرتے بھی کیا۔ سب ختم ہو گیا ٹھاکر [بھانو] چائے کی پیالی ختم کرتے ہی بولے: ''شنورانی.........ہم ابھی آتے ہی۔''

''سنیئے بادل گھرا ہوا ہے۔ نہ جائیے۔ جو کچھ کرنا ہے یہیں کر لیجئے۔'' ٹھاکر باہر نکل گئے۔ رانی نے مجھے مخاطب کیا: ''آپکو معلوم ہے ٹھاکر کہاں گئے ہیں۔ ڈرنک کرن؟''

''ہم کو کیا سب کو معلوم ہے۔'' اور زہرہ بائی انبالے والی کا ریکارڈ سننے لگے۔

رات میں آنکھ کھلی۔ سخت سردی تھی۔ میں بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہلکی سی رضائی کے باوجود سردی لگ رہی تھی۔ سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ ایک بج رہا تھا۔ آخر آخر دری جو خاصی ملائم اور موٹی تھی اوڑھ لی بہت آرام ملا۔ اچانک پانی برسنے لگا اور شاید پتھر بھی گرنے لگے۔ تین بجے کے بعد میں سو گیا۔ صبح کسی نے جگایا تو ساڑھے نو بج رہا تھا۔ چائے کی کشتی اسٹول پر رکھ دی۔ ''ناشتہ یہیں پر کریں گے؟''

''ہاں۔ ناشتہ یہیں لے آؤ۔''

چھتری لگا کر ٹھاکر کے پاس پہنچا تو گیارہ بج رہا تھا۔ گراموفون بج رہا تھا۔ انگیٹھی دہک رہی تھی۔ دونوں رضائیاں اوڑھے مسہری پر بیٹھے تھے۔ رانی چلغوزے چھیل رہی تھیں، ٹھاکر کھا رہے تھے۔ ٹھاکر نے اپنے قریب ہی مجھے بٹھا لیا۔ رانی نے ایک چلغوزہ چھیل کر مجھے بھی دیا۔

''میں چھتری لگا کر آپ کے پاس گئی تھی۔ لیکن آپ غافل سو رہے تھے۔''

''چپ رہو گانا سننے دو۔'' گراموفون پر ریکارڈ چڑھا تھا۔ ٹھاکر نے حکم دیا۔

'ندیا دھیرے بہو۔ سیاں جی اتریں گے پار۔ روپا دوں گی، سونا دوں گی۔ دوں گی چندن ہار، ندیا دھیرے بہو، سیاں جی اتریں گے پار!'' جمنا پرشاد آ گئے: ''راجن لوگ کے لیے کشمیری چائے بن رہی ہے۔ گلاوٹ کے کباب تلے جا رہے ہیں۔''

ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ رانی نے جو ڈھڈ ہاتی سرخ ساری باندھے بڑی سی سرخ بندی لگائے تھیں بڑی لگاوٹ سے کہا: ''بھانو۔ ایک بات کہوں؟''

ٹھاکر نے پیالی رکھ دی گھور کر دیکھا۔ ابرو اُچکا دیئے۔

''ہم اور بھیا [یعنی میں] پچھلے جنم میں ایک ہی کوکھ سے جنمے ہیں۔'' رانی نے بہت جما کر کہا۔

ٹھاکر نے مجھے دیکھا: ''سُن رہے ہو۔ یہ تم سے روپیہ اینٹھنے کا ڈول ڈال رہی ہے''۔ ٹھاکر نے کہا

''ارے واہ۔ روپے سے اس کا کیا تعلق''۔ رانی نے اٹھلا کر پوچھا۔

''بے شنو رانی۔ اب کی رکھشا بندھن میں تم راکھی باندھو گی اور دس بیس پچاس جھپٹ لو گی۔''

''وہ تو میں ویسے بھی باندھ سکتی ہوں''۔ رانی نے شیریں ناگواری سے جواب دیا۔

''کچھ منھ سے پھوٹو یار......... یہ تمھیں بوٹ بنا رہی ہے۔ سوچ لو تم 'بیرن' بنتے ہو یا دیور ہی رہتے ہو؟''

''جب رانی مجھے بھیا کہتی ہیں تو ہم آدھے بیرن تو ہو ہی گئے۔ اب وہ اگر چاہیں تو ہم پورے بیرن بھی بن جائیں گے۔'' میں نے آہستہ آہستہ کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جب تم اپنی جیب کٹوانے پر خود تُلے ہوئے ہو تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ بانٹری

ہے ہمارے تمھاری طرح۔ کوئی بھائی وائی نہیں ہے اس کا۔ بس خیریت یہ ہے کہ تم چھوٹے بھائی ہو ورنہ۔''
''ورنہ کیا؟ بھیا! مجھے راکھی بندھوائی پر ایک پیسہ دیں گے تو وہ میرے لیے سیکڑہ ہوگا سیکڑہ۔''
وہ عجیب صبح تھی: غمناک، رنجور، صبا کے کاندھے پر سر رکھے بال کھولے بین کر رہی تھی اس کی آستینوں سے آنسو ٹپک رہے تھے اور دامن پر لہو کے دھبے چمک رہے تھے۔ رانی اور ہم دھندھاری کے جنگل میں پکنک منانے جانے کے لیے تیار تھے۔ ٹھاکر کے انتظار میں رکھی ٹھنڈی کافی پی رہے تھے۔ ابڑو لگا ہوا تھا۔ آدمی تیار تھے۔ لنچ کا آرڈر دیا جا چکا تھا۔ اطلاع آچکی تھی کہ ٹھاکر درشن کر کے چل چکے ہیں۔ بس آنے ہی والے ہیں۔ کہ کیمپ کے گیٹ پر شور اٹھا دادوں راج کے سپاہی بہت سے آدمیوں کے ساتھ چیختے چلاتے کیمپ میں داخل ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ٹھاکر درشن کے بعد بھگدڑ میں گر پڑے ہیں، زخمی ہو گئے اور سفری ہسپتال میں داخل ہو گئے۔ رانی کرسی سے اچھلی اور گیٹ کی طرف دوڑی۔ میں نے جمنا پرشاد کو حکم دیا کہ رانی کے خیمے پر پہرہ قائم کر دو۔ میں رانی کے پیچھے پیچھے آدمیوں کے ریلے میں بہتا ہوا ہیلتھ سنٹر یا سفری ہسپتال پہنچا تو آدمیوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ ٹھاکر خون میں لت پت ایک بیڈ پر پڑے تھے۔ رانی ٹھاکر پر گر پڑیں اور بیہوش ہو گئی۔ میں بڑی مشکل سے انچارج ڈاکٹر تک پہنچ سکا۔
''ان کو فوراً سیتا پور لے جایئے۔ ہم جو کر سکتے تھے کر چکے۔'' جمنا پرشاد نے میلہ کمیٹی کے دفتر سے ایک موٹر سائیکل سوار کو آنٹ دوڑا دیا تھا۔ آناً فاناً اطلاع آئی کہ راجہ جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی سوار ہو گئے۔ لیکن ایک ایک لمحہ ایک ایک صدی معلوم ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے نرسوں کی مدد سے رانی کو بیڈ پر لٹا دیا تھا اور ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔
راجہ انکل تینوں گاڑیوں کے ساتھ بارہ بجنے کے بعد آگئے۔ سیتا پور پہنچتے پہنچتے دو بج گئے۔ انگریز سیول سرجن نے Brought dead 'مردہ لایا گیا' کا حکم لگا دیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے رانی کو میڈیکل کالج لکھنؤ ریفر کر دیا۔ راجہ انکل نے بہت احتیاط اور اہتمام کے ساتھ رانی کو دو بیگمات کے ساتھ لکھنؤ روانہ کر دیا۔ دادوں راج کے ایک آدمی نے رانی کے والد کو فون کر دیا تھا۔ ٹھاکر کی لاش لے کر ہم لوگ دادوں روانہ ہو گئے۔
دادوں کی گڑھی کا منظر ناقابل بیان تھا۔ ٹھاکر کی والدہ نے جوان بیٹے کی لاش دیکھی تو اپنے آپ سے گزر گئیں اور دیوانوں کی طرح لاش کے پلنگ کی پٹی پر سر پٹخنے لگیں۔ راجہ انکل نے گڑھی کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ عورتوں کو حکم دیا کہ ٹھکرائن کو اندر اٹھا لے جاؤ۔ یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ راجہ انکل کے دس بیس آدمی لاری میں سوار ہو کر آگئے اور ان کے احکامات کی تعمیل میں مصروف ہو گئے۔ لاری کو حکم ملا کہ سیتا پور جائیے اور برف کے کارخانے سے برف کی سلیاں بھروا کر لے آیئے۔
دادوں کے حلوائیوں کو حکم ہوا کہ چائے ناشتے اور کھانے کا انتظام کریں۔ توشہ خانہ کھولا گیا۔ تمام بستر نکال لیے گئے۔ جس کو جہاں جگہ ملی پڑ رہا۔ صبح ہوتے ہوتے بھانو پرتاپ سنگھ کے خسر تعلقدار جمال پور

ٹھاکر گجراج سنگھ اپنے کنبے کے ساتھ تین موٹروں پر سوار ہو کر آگئے۔ نو بجتے بجتے آخری رسوم ادا کر دی گئیں۔ راجہ انکل کے ساتھ میں بھی مسرکھ کے کیمپ میں آگیا۔ جب تک ہم لوگوں نے منہ ہاتھ دھویا لباس تبدیل کیا کھانا لگ گیا۔ تین بجے پھر سوار ہوئے اور میڈیکل کالج لکھنؤ کے آئی سی یو کے دروازے پر پہنچ گئے۔ صرف دو آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت ملی، راجہ انکل کے ساتھ میں بھی داخل ہو گیا۔ رانی کو ہوش آچکا تھا۔ وہ سفید ریشم کی ساری پہنے بیڈ پر پڑی تھیں۔ ایک نرس موجود تھی۔ راجہ انکل نے آہستہ سے آواز دی: 'بھورانی.......' آنکھیں کھل گئیں مجھ کو دیکھا اور سسکنے لگی۔ رانی کا علاج حاملہ ہونے کی وجہ سے بہت پیچیدہ ہو گیا تھا۔ انتہائی احتیاط برتی جا رہی تھی۔ پانچ منٹ کے بعد ایک اینگلو انڈین نرس نے ہم کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ ٹھاکر گجراج سنگھ نے راجہ انکل کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ بارہ بجے تک ہم لوگ مسرکھ کیمپ میں داخل ہو چکے تھے۔

صبح ناشتے کی میز پر میں نے راجہ انکل سے کہا کہ میں مچھریٹہ جانا چاہتا ہوں انھوں نے اصرار کیا لیکن میں رضامند نہیں ہوا۔ گیارہ بجے میرا الہڑ ولگ گیا۔ میں نے راجہ انکل سے پوچھا کہ اب آپ لکھنؤ رانی کو دیکھنے کب تشریف لے جائیں گے۔ جواب ملا کہ میلے کے بعد تم سیتا پور کی کوٹھی پر آکر ملو ہم جب بھی جائیں گے تم کو بلا لیں گے۔

پورے پچیس دن ہو چکے تھے جب ایک سینیئر راجہ انکل کا ملازم آیا کہ ہم کو طلب کیا گیا ہے۔ ہم فوراً حاضر ہوئے مرغن ناشتے اور چائے کے بعد ارشاد ہوا کہ کل اتوار کو دس بجے ہم لکھنؤ کے لئے سوار ہوں گے ماموں صاحب قاضی جمیل الدین نے بڑی مشکل سے اجازت دی ایک نوکر ہم کو آنٹ ہاؤس پہنچا گیا اور اسوقت تک کھڑا رہا جب تک موٹریں روانہ نہ ہو گئیں۔

بارہ بجے جب ہم لوگ پہنچے تو جمال پور ہاؤس میں سناٹا تھا۔ گھنٹی کی آواز پر کتوں کی بھوں بھوں کے ساتھ ایک بوڑھے ملازم نے دروازہ کھولا۔ راجہ انکل کے مختار نے اس کو بتلایا کہ مہمان کون ہے اور کیوں آیا ہے۔ ڈرائنگ روم کھولا گیا۔ ہم لوگ بیٹھے ہی تھے کہ ایک بھاری بھرکم خاتون چند عورتوں کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ اور آداب کر کے بہت ادب سے فرمایا: ''رانی میری بیٹی ہے ٹھاکر اسٹیٹ پر گئے ہوئے ہیں۔ ایک ملازمہ چاندی کی کشتی میں تین گلاس پانی لیکر حاضر ہوئی۔ پھر رانی کھڑی ہوئیں ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: ''آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے......... ٹھنڈا یا گرم؟ راجہ نے کھڑے ہو کر سلام کیا گلاس قبول کیا اور آہستہ سے کہا: ''ٹھکرائن صاحبہ میں صرف بھورانی کو دیکھنے حاضر ہوا ہوں۔ کچھ پینے کی خواہش نہیں ہے۔''

''راجہ صاحب میں نے تو صرف یہ پوچھا ہے کہ آپ ٹھنڈا پینا پسند فرمائیں گے یا گرم''۔

''اگر آپ کا اصرار ہے تو شربت منگوا لیجیے''۔

ایک خادمہ نے ٹھکرائن کے کان میں کچھ کہا وہ کھڑی ہو گئیں: ''راجہ صاحب اندر تشریف لے چلئے''۔

پورا صحن پار کر کے ہم لوگ۔ دوہرے دالان میں داخل ہوئے۔ بہت بھاری چوکا لگا تھا۔ مسند بچی ہوئی تھی۔ ایک کاؤچ کے سامنے صوفے کے پاس سلک کی ساری پہنے غم کی تصویر بنی رانی کھڑی تھیں۔ راجہ انکل کو بہت خم ہو کر آداب کیا اور بیٹھنے کی گزارش کی۔ رانی کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ چہرہ ستُ گیا، آنکھیں اور بڑی ہو گئی تھیں۔ راجہ انکل نے سر پر ہاتھ رکھا تو سر اور جھک گیا آنکھیں بھیگنے لگیں۔ راجہ نے اپنے پاس ہی صوفے پر بیٹھا لیا۔ ٹھکرائن کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کئی عورتیں منڈلا رہی تھی۔ راجہ نے جھک کر چہرہ دیکھا۔

''ہمارا بیٹا اب کیسا ہے؟'' ایک خادمہ پھلوں کا ٹوکرہ لیکر حاضر ہوئی اور صوفے کے پاس رکھ دیا رانی سسکنے لگی۔ راجہ نے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

'بُری بات.... بہادر بیٹے رویا نہیں کرتے۔'' سر اپنی طرف جھکا لیا۔ کوٹ کی جیب سے رومال نکالا آنسو خشک کیے۔ رانی نے اپنی ماں کو دیکھا: ''ماماں چائے بنوایئے انکل شربت پیتے ہیں نہ بھیا شربت پیتے ہیں۔ پہلی بار ٹھکرائن نے مجھے غور سے دیکھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ کئی ملازم عورتیں کھڑی ہوئی تھیں لیکن ناشتے کی پلیٹ پہلے رانی راجہ کی خدمت میں پیش کرتی، پھر مجھ سے اصرار کرتی۔ چائے خود بنائی: ''بھیا آپ تکلف کر رہے ہیں شیرینی لیجئے۔ آپ کو پسند ہے'' ٹھکرائن نے پھر مجھے دیکھا راجہ نے جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ رانی نے ایک عورت کو دیکھا اس نے لپک کر ایش ٹرے سامنے رکھ دیا۔ راجہ نے جیب سے ماچس نکالی رانی نے چپکے سے اپنے ہاتھ میں لے لی جیسے ہی راجہ نے سگریٹ منھ میں لگائی رانی نے بہت نفاست سے تیلی روشن کی اور شعلہ پیش کیا۔ راجہ نے ایک کش لیا۔ رانی کی طرف خم ہوئے: ''ہماری دعا ہے ہمارے بیٹے کی بیماری اس دھوئیں کی طرح اُڑ جائے، پھر راجہ اٹھے اور ٹھکرائن کے قریب ہی اتنی جلدی سے بیٹھ گئے کہ ٹھکرائن اٹھ نہ سکیں۔ ''بھابھی صاحب...... بیٹے کو کیا پرہیز بتایا ہے؟''

''کوئی خاص نہیں لیکن ہلکی اور سادہ غذا پر زور ہے۔ جوس اور سوپ کی ہدایت ہے۔''

''بھابی صاحب، جب ٹھاکر صاحب تشریف لائیں تو بنا بنا کر عرض کر دیجئے گا کہ ہم بہت عجلت میں تھے ورنہ ان کی آمد کا انتظار کرتے۔'' اور کھڑے ہو گئے۔

''انکل آپ ایسے کیسے جا سکتے ہیں۔ لنچ لیے بغیر نہ میں آپ کو جانے دوں گی نہ بھیا کو جانے دوں گی۔''

'ہمارا پیارا پیارا بیٹا ہماری بات تو سنے۔ ہم پر ایک مقدمہ ہے۔ قتل کا۔ بیرسٹر سے وقت مقرر ہے اس لئے ہمارا جانا ضروری ہے۔ ہاں ہم یہ وعدہ کرتے ہیں کہ اگلی بار جب آئیں گے تب اپنے پیارے پیارے بیٹے کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔''

''انکل پرامز ہے؟''

''بالکل پرامز ہے۔'' رانی پہلی بار میرے قریب آئیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں:

'بھیا، آپ ہی رُک جایئے... میں آپ کو اسکول کھلنے سے پہلے بھجوا دوں گی۔''

''ارے نہیں بیٹے ان کو بڑی مشکل سے اجازت دی ہے ان کے ماموں نے اگر ہمارا پیر درمیان میں نہ ہوتا تو یہ آ ہی نہیں سکتے تھے۔'' اور رانی کے بالکل قریب پہنچ گئے: ''ہمارا بیٹا آنکھیں بند کرے اور دونوں ہاتھ کھول دے۔'' رانی نے آنکھیں بند کرلیں ہاتھ کھول دیئے داہنے ہاتھ میں اشرفی رکھ دی: ''اس کے پھل کھائیں گی آپ۔'' دوسرے ہاتھ پر روپے رکھ دیئے: ''یہ آپ کی جان کا صدقہ۔''

''انکل آپ!''

''ان معاملات میں بچے دخل نہیں دیتے۔''

''بھائی صاحب آپ زیر بار کر رہے ہیں۔'' ٹھکرائن نے کھڑے ہو کر کہا۔

''بھابھی صاحب، میں نے آپ کو تو کچھ بھی نہیں دیا۔ یہ تو میری بیٹی بھی ہے اور بہو بھی ہے۔'' چلنے کو کھڑے ہو گئے رانی بھی اٹھ پڑیں: ''بیٹے آپ؟''

''ڈاکٹر نے ٹہلنے کے لیے بتایا ہے۔'' راجہ نے ٹھکرائین کے سامنے کھڑے ہو کر ہتھیلی پر سو کا نوٹ رکھ کر کہا: ''بھابھی صاحب، یہ اپنے ملازموں میں تقسیم کر دیجیے؟''

''بھائی صاحب؟''

''بہت کم ہیں۔ شرمندہ نہ کریں''

پورا جلوس باہر آ گیا۔ راجہ کی سیاہ ڈاج کھڑی چمک رہی تھی۔ رانی چمکی اور پچھلی سیٹ کا بائیں طرف کا دروازہ کھول دیا۔ منیجر اور ڈرائیور دونوں لپک کر رہ گئے۔ راجہ نے مسکرا کر دیکھا، سر پر ہاتھ رکھا۔ رانی نے میری طرف دیکھا۔ تینوں گاڑیوں میں ہینڈل لگنے لگے: ''بھیا کب آئے گا؟''

''نہیں معلوم آپ جب سیتاپور آئیں گی تب ہی۔''

''ہاں بیٹے جب آپ سیتاپور آئیں تو فون ضرور کریں۔ اچھا خدا حافظ۔''

دادوں ہاؤس، سیتاپور کے انچارج ماتا دین نے اطلاع دی کہ ۱۰ جولائی کو چھوٹے مالک [بھانو پرتاپ سنگھ] کے یہاں چاند سا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ زچہ اور بچہ سب بلرام پور ہسپتال میں داخل ہیں۔ میں رانی کو دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا لیکن کوئی صورت نہیں تھی۔ صورت پیدا ہو سکتی اگر میں مچھر ہٹہ جاتا لیکن مچھر ہٹہ نہیں جا سکتا تھا اس لیے کہ میں اپنے اسکول کی فٹ بال ٹیم کا بارھواں کھلاڑی تھا، کبھی فیلڈ کے اندر کبھی باہر، انٹر ڈسٹرکٹ ٹورنامنٹ شروع ہو چکا تھا۔ پورا اگست گزر گیا اللہ اللہ کر کے ستمبر کے وسط میں اماں سیتاپور آ گئیں۔ ان کے پالکی سے اترتے ہی پیچھے پڑ گیا۔ اماں پہلے تو بہلاتی رہیں لیکن جب میں نے ضد کی کہ اگر آپ مجھے لکھنؤ نہیں بھیجیں گی تو میں خود مندر دادی جان کے پاس چلا جاؤں گا تو اماں ڈر گئیں۔ مندر دادی جان ہمارے دادا سرکار قاضی فیاض علی کی منکوحہ تھیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی منیر پھوا یعنی منیر جہاں عرف راجہ پیتم گڑھ کی پابند تھیں۔ دادا سرکار نے ان کے لیے چوک لکھنؤ میں کوٹھی بنوا دی تھی جس پر منیر پھوا کے نام کا پتھر

آج بھی لگا ہوا ہے۔ منیر منزل۔ مندر دادی جان اپنے زمانے کی مشہور طوائف تھیں۔ دادا سرکار ان پر عاشق ہوئے اور نکاح کر لیا۔ یہ دونوں ماں بیٹی مجھ پر جان چھڑکتی تھیں۔ مندر دادی جان بہت امیر کبیر خاتون تھیں۔ اماں نے مندر دادی جان کے نام خط لکھا اور ہم کو استاد صادق اور عبدالرحمان کے ساتھ لکھنؤ بھیج دیا۔ مندر دادی جان تخت پر اپنا جہازی پاندان کھولے خاصدان بنا رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی چلائیں ارے یہ تو مورا لال آ گیا، مورا چاند آ گیا اور اُمس کر میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ دونوں آدمیوں کے سلام قبول کیے کہ صورت شناس تھے۔ ارے فلانی شربت بناؤ۔ نمکین لاؤ۔ شیرینی لاؤ۔ جب حکم احکام دے چکیں تو میں نے خط پیش کیا۔ خط دیکھتے ہی خوش ہوئیں۔ سونے کے فریم کا چشمہ لگایا۔ خط پڑھتے ہی رونے لگیں:

''ہائے میں اماں جان کہن والی کے صدقے۔ میں اماں جان کہن والی کے قربان۔ فلانے فوراً پتن کو بلاؤ۔ حکم دو کہ مچھر ہٹہ سے بھابھی صاحب کا خط آیا ہے بھیا راجہ خود آیا ہے فوراً حاضر ہو''۔

پتن چچا مندر دادی جان کے اکلوتے بیٹے تھے۔ میری دادی سرکار کے بقول قاضی فیاض علی صاحب کے ہم صورت تھے اور اتنے خوبصورت تھے کہ گورنر کی سکریٹریٹ کے کسی انگریز افسر کی بیٹی ان پر عاشق ہو کر مسلمان ہوئی اور ان کے عقد میں آ گئی۔ اب دونوں حضرت گنج کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ منیر منزل میں منیر پھوا رانی کہی جاتی تھیں۔ ان کا کمرہ کھلوایا گیا اور ہماری اٹیچی وہاں پہنچا دی گئی۔ پورا کمرہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا کہ مہاراجہ پتیم گڑھ اسی کمرے میں قیام فرماتے تھے۔ آبنوس کی بیش بہا مسہری کے پاس چھوٹی سی میز پر عبداللہ کا ٹن کھلا رکھا تھا۔ میں نے چپکے سے ایک سگریٹ نکالی تھی کہ چائے کی کشتی آ گئی۔ منیر پھوا کی بہت بڑی تصویر سنہرے فریم میں جگمگا رہی تھی۔ کس قدر خوبصورت تھیں۔ کاردار نے اپنی فلم میں ہیروئن بنانے کے لیے بمبئی بلایا تھا لیکن مہاراجہ پتیم گڑھ کا عشق درمیان میں آ گیا ورنہ وہ ملکہ ترنم نور جہاں سے زیادہ مشہور ہوتیں۔

شام کی چائے کے بعد جب میں نیچے اترا تو معلوم ہوا کہ مندر دادی جان بازار گئی ہیں۔ آج مدتوں کے بعد بازار گئی ہیں۔ ڈرائیور کو حکم ہے کہ میں جب سو کر اٹھوں تو جہاں کہوں مجھے سیر کرانے کے لیے لے جائے۔

رات میں جب واپس آئے تو مندر دادی جان اپنے چھپر کھٹ پر پوری دکان کھولے بیٹھی تھیں۔ بارہ قیمتی کرتے زرکار ٹوپیاں کامدار جوتے ڈھیروں نیکلس اور رب، جب سونا پینتیس روپے تولہ بکتا تھا تب جو مٹھائی پندرہ روپے سیر تھی اس کا ڈبہ۔ میوے کے پیڑے اور پھلوں کا ٹوکرہ دادی جان اتنا سامان؟

میں نے کہا: ''وہ جمال پور کے تعلقدار ہیں۔''

''تو کیا مورا لال گاجر مولی ہے۔''

ایک بڑا سا ڈبہ کھول کر رکھ دیا۔ چھوٹا سا گلاس چھوٹا سا کٹورہ اور جھجھنا۔ کچی چاندی کا۔ گاڑی

دھونے کا حکم دیا گیا۔ ڈرائیور کو ہدایت ہوئی کہ صبح عمدہ کپڑے پہنے بدلو خاں بندوق کے ساتھ جائیں گے۔

جمال پور ہاؤس کے پورٹیکو میں اترے۔ دو تین نوکر لپکے بدلو خاں آگے بڑھے۔

''مجھر بھٹہ کے بھیا..... دادوں راج کے بیٹے کو دیکھنے آئے ہیں۔'' بہت جما کر کہا ڈرائنگ روم کھل گیا۔ رانی آگئی سیاہ ساری میں سونے کی مورت جگمگا رہی تھی۔ پورے بدن پر صرف گھڑی تھی جسے زیور کا نام دیا جا سکتا تھا۔ میرے سلام کے جواب میں مسکراہٹ ہونٹوں پر لگائی اور ہاتھ جوڑ لیے۔ تمام سامان میزوں پر ڈھیر کر دیا گیا۔ رانی کی والدہ آگئیں۔ میرے سلام کا جواب بہت خوش دلی سے دیا اور صوفے پر بیٹھا دیا۔ رانی سامان کھولتی اور اپنی ماں کی طرف بڑھا دیتی اور ہم کو انکھیوں سے دیکھنے لگتی اس کے چہرے پر فخر کی چمک آگئی تھی۔ سارے سامان کو اندر پہنچانے کا حکم دے کر ٹھکرائن صاحبہ ہمارے قریب آئیں:

''بیٹے آپ کی والدہ نے بہت تکلف کیا۔'' میں خاموش رہا۔

ایک عورت بچے کو لیکر آگئی۔ ہم نے اٹھ کر اس کو گود میں لے لیا اور اس کے سینے پر سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ راجہ گود میں آتے ہی مسکرا دیا۔ محض اتفاق لیکن رانی ہنس پڑی۔ ایک مدت کے بعد اس طرح ہنسی کہ آدمی جھن گیا در و دیوار ہنس پڑے۔ اتنے میں ٹھاکر صاحب آگئے۔ ہم نے بچے کو لیے لیے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ گردن کو خم کر کے تسلیم کیا۔ وہ قریب آئے: ''بیٹھیے بیٹھیے۔ جیتے رہیے خوش رہیے۔''

راجہ بیٹا اب بھی ہماری گود میں تھا اور ہنس رہا تھا۔ پھر میز ناشتے سے بھر دی گئی۔ ٹھاکر باہر تشریف لے گئے۔ موٹر کو دیکھا آدمیوں کے سلام قبول کیے۔ اندر آ کر حکم دیا کہ باہر چائے اور ناشتے لے جاؤ۔

رانی ہمارے پاس ہی بیٹھی رہی۔ جب ہنگامہ ذرا کم ہوا تو راجہ بیٹے کو ہماری گود سے لینے کو بڑھیں۔ ہم نے گردن کے خم سے منع کر دیا۔

''بھیا... اتنے دنوں میں پورے ڈھائی مہینے میں کتنے لوگوں نے اسے گود میں لیا۔ لیکن مسکرایا آپکی گود میں آ کر.. کتنی عجیب بات ہے۔''

''بالکل عجیب بات نہیں ہے۔ جس کی گود میں اسے مسکرانا چاہیے تھا۔ اسی کو گود میں مسکرایا۔'' رانی ہم کو گھور رہی تھیں۔ ان کی والدہ آگئیں۔

''آپ ہی نے تو کہا تھا کہ ہم اور آپ پچھلے جنم میں ایک ہی کوکھ سے جنمے ہیں۔ اس رشتے سے ہم اس کے ماموں ہوئے۔ اور بھانو پرتاپ سنگھ کے رشتے سے ہم اس کے چچا ہوئے۔ پورے خاندان میں کوئی ہے جس سے راجہ بیٹے کے دو دو رشتے ہوں اور اتنے قریب کے ہوں۔'' رانی ہم کو دیکھتی رہیں۔ ہم راجہ بیٹے کو گدگداتے رہے ہنساتے رہے اور چومتے رہے۔

''کیا نام رکھا؟'' ہم نے اسے گود میں کھڑا کر کے پوچھا۔

''دھیریندر پرتاپ سنگھ''۔

''خوبصورت نام ہے''۔ ہم اسے جھلاتے رہے۔ وہ جھولتا رہا مسکراتا رہا رانی کا چہرہ بھی مسکراہٹ سے جگمگاتا رہا۔

''بھیا۔ یقین نہیں آتا۔''

''ہاں بہت سی باتیں ہوتی ہیں کہ کہ شروع میں ان پر یقین نہیں آتا۔ آہستہ آہستہ آنے لگتا ہے۔''

''بھیا۔ ایک بات کہیں۔ آج ہمارے ساتھ کھانا کھا لیجئے''

'' رانی صاحبہ ہم بھی آپ سے ایک بات کہیں۔''

''یہ ہم رانی صاحبہ کب سے ہو گئے؟''

''آج سے۔ اب آپ دھیریندر پرتاب سنگھ کی ماں ہیں۔''

''کہنا یہ ہے کہ کھانے پینے کے سلسلے میں ہم جو کچھ کہا کریں۔ آپ اسے مان لیا کیجئے۔''

''اچھا اب آپ ان کو ہمیں دیدیجئے اور قاعدے سے چائے پیجئے۔''

بچے کو گود میں لے لیا۔ بچے نے پہلے منھ بنایا۔ پھر رونے لگا۔ رانی نے ہم کو حیرت سے دیکھا اور بیٹے کو لپٹا لیا۔ اب وہ باقاعدہ رونے لگا۔ اب تمام عورتیں ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئیں۔ ان کے سامنے یہ تماشہ دکھایا گیا۔ راجہ بیٹا اپنی ماں کی گود میں جاتے ہی رونے لگتا اور ہمارے پاس آتے ہی نہ صرف چپ ہو جاتا بلکہ مسکرا بھی دیتا۔ ہم عورتوں کی بھیڑ میں راجہ بیٹے کو لیے بیٹھے تھے اور بہت آہستہ آہستہ چائے بھی پی رہے تھے۔

''ماماں میں نے آپ سے کہا تھا کہ پچھلے جنم میں بھیا اور میں ایک ہی کوکھ سے جنمے ہیں۔''

''ہاں کہا تو تھا تم نے۔''

''پہلے گمان تھا اب راجہ بیٹے نے یقین دلا دیا۔ بھیا مسلمان ہیں۔ پچھلے جنم کو نہیں مانتے جو کچھ ہو رہا ہے وہ تو دیکھ ہی رہے ہیں۔''

ماں بیٹی ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ دھیرے دھیرے سب عورتیں ادھر ادھر کو ہو گئیں۔ رانی شرارت سے مسکرائی: ''بھیا...... آپ سیتاپور کیسے جائیں گے۔''

''جب ہمارا راجہ بیٹا سو جائے گا تب ہم نکل جائیں گے۔''

''اور جب یہ جاگے گا اور آپ کو نہ پا کر روئے گا تو ہم کیا کریں گے؟''

''چپ ہو جائے گا ہر رونے والے کی طرح چپ ہو جائے گا۔''

''اس کے رونے کے خیال سے دکھ نہیں ہوگا؟ آپ کو؟''

''کیوں نہیں ہوگا لیکن دکھ کا زخم بھی مندمل ہو جائے گا وقت کا مرہم یہ کام کر دے گا''۔

راجہ ہماری گود میں سو گیا ہم نے چپکے سے رانی کی گود میں دے دیا۔

ہمارے خلاف شکایتوں کا انبار تھا لیکن ہمارے اسکول کے گیمز انچارج بابو سوامی دیال نے ہم کو ہاکی کی ٹیم کا کپتان نامزد کر دیا۔ اس شام ہم پریکٹس کر کے نکلے تھے کہ داؤوں ہاؤس کے انچارج ماتادین نے اطلاع دی کہ لکھنؤ سے بھورانی آگئی ہیں۔ کل آپ کو یاد کیا ہے۔ رکھشا بندھن ہے نا۔ رکھشا بندھن کا لفظ ہاکی بال کے پورے شاٹ کی طرح کان پر لگا۔ رانی جب راکھی باندھے گی تو ہم اسے کیا دیں گے؟ ہم کو دس روپے ماہوار جیب خرچ ملتا تھا۔ لیکن ہماری جیب میں کل دو روپے اور تین آنے بچ رہے تھے۔

کسی طرح گھر پہنچے۔ لباس تبدیل کر رہے تھے کہ ملازم نے اطلاع دی کہ موممانی جان نے [بیگم قاضی جمیل الدین احمد جو ہمارے مربی اور گارجین تھے] ہم کو یاد کیا ہے۔ موممانی جان دالان کے تخت پر بیٹھی دن بھر کا حساب لکھ رہی تھیں۔ اُن دنوں سیتاپور کی رمپا ٹاکیز میں 'پکار' فلم چل رہی تھی۔ ہم چار پانچ مرتبہ دیکھ چکے تھے اس کے ڈائلاگ یاد بھی ہو گئے تھے۔ ہم موممانی جان کے پاس پہنچے اور گرج کر کہا:

''فریادی۔ تم نے ہم کو پکارا۔ ہم آگئے۔''

موممانی جان نے ہم کو گھور کر دیکھا۔ ماموں صاحب کمرے میں تھے۔

''فریادی.... مابدولت....... جواب کے منتظر ہیں۔''

موممانی جان نے ہنسی کو ضبط کیا اور بہت جما کر کہا:

''اتنے تھپڑ ماروں گی مابدولت صاحب کے کہ دماغ درست ہو جائے گا'' اور ہنس پڑیں۔

''اتنی دیر کیسے ہوگئی۔ رات میں چلے آرہے ہیں۔ مابدولت صاحب ہاکی کھیل کر''۔

''مابدولت کا خزانہ عامرہ خالی ہے مابدولت کو عامرہ کے معنی نہیں معلوم لیکن خزانہ خالی ہے۔ وزیر خزانہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ دس روپے کی خطیر رقم مابدولت کی خدمت عالیہ میں پیش کی جائے۔''

موممانی جان نے پان کی پیک تھوکی اپنا چپل اٹھایا۔ مابدولت بھاگ کر دور کھڑے ہو گئے۔

''اگر مابدولت کے سامنے ایک خاص مہم درپیش نہ ہوتی تو وزیر خزانہ کی گستاخی پر غور فرماتے۔''

موممانی جان کا چپل سر مبارک کے قریب سے گزرا اور دیوار سے ٹکرایا۔ مابدولت نے فوراً مراجعت فرمائی۔ صبح ہم نے نئی قمیض اور نیکر پہنی۔ نئی کیپ لگایا۔ اسنکلٹ شو پہنا اور ماموں صاحب کے دفتر میں جا کر کھڑے ہو گئے۔

''کیا ہے'' سختی سے پوچھا گیا۔

''آج چھٹی ہے ہاکی کی پریکٹس گیارہ بجے سے ہوگی۔ جانے کی اجازت'' گھور کر دیکھا۔

''دن میں آپ ہاکی کھیلتے ہیں رات میں مشاعرے پڑھتے ہیں۔ اسٹڈیز کی کوئی فکر ہے؟ آپ کی کپتانی وغیرہ سب میں دومنٹ میں نکال کر رکھ دوں گا۔ اگر آپ فیل ہو گئے۔ جائیے۔ فیلڈ سے سیدھے گھر آئیے۔''

''جی ماموں صاحب۔''

داود ہاؤس پر سناٹا طاری تھا۔ ہم نے سائیکل کھڑی کی رومال سے منھ پونچھا۔ گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ دروازہ کھل گیا

''ارے یہ تو ہمارا بھیا آ گیا'' رانی نے مسکرا کر کہا۔ وہ گہرے کاہی رنگ کی ساری باندھے کھڑی تھیں۔ ہماری تسلیم کے جواب میں دونوں ہاتھوں میں دونوں جہان سمیٹ کر دے ڈالے۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی ہم نے رانی سے کہا: ''رانی۔ ہم بہت شرمندہ ہیں۔ راکھی بندھوائی پر تمھیں دینے کے لئے ہمارے پاس صرف دس روپے ہی۔''

''ہم نے آپ سے سرکھ کے کیمپ میں کہا تھا کہ آپ کا ایک پیسہ ہمارے لیے سو روپے کے برابر ہوگا۔ آپ ہم سے چھوٹے ہیں۔ چھوٹائی بڑائی چاہے ایک دن کی ہو لیکن اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ راکھی میں پیسہ ایک ٹوکن ہوتا ہے۔ اصل چیز محبت ہوتی ہے۔''

''یہ سب صحیح ہے لیکن آپ راکھی تنہائی میں باندھیں گی کسی کے سامنے نہیں۔''

''ٹھیک ہے آپ تشریف تو رکھیے ہم ابھی آتے ہیں''۔ رانی نے ایک بہت عمدہ راکھی کلائی پر باندھ دی۔ دس روپے کا نوٹ پیشانی سے لگایا اور پرس میں رکھ لیا۔ اندر چلی گئیں راجہ کو گود میں لے کر آئیں ہمارے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہمارے ذرا سے پکارنے پر وہ مسکرا دیا۔ پھر ہنس دیا۔ پھر کیا تھا ہنگامہ ہو گیا۔ رانی کی ماماں جی آ گئیں ہماری تسلیم کا جواب بہت خوش دلی سے دیا۔

''ماماں۔ ہم کو بھیا نے راکھی بندھوائی میں ایک سو ایک روپیہ دیا ہے۔''

''اور تم نے لے لیا'' انھوں نے مصنوعی غصے سے کہا: ''سٹوڈنٹ ہیں اماں سے منگوا لیتے ہوں گے''۔

''نہیں........ بھیا کہہ رہے ہیں کہ اپنی عیدی بقر عیدی سے جوڑ جوڑ کر جمع کیا ہے ہمیں دینے کو''۔

''بیٹے...'' وہ ہمارے قریب آ گئیں۔ ''آپ چھوٹے بھائی ہیں راکھی بندھوائی سیکڑوں میں نہیں دی جاتی۔ رسم ہے دس پانچ روپے کافی ہوتے ہیں اگر آپ ہماری بات نہیں مانیں گے تو ہم پھر ہٹہ جا کر آپ کی اماں سے شکایت کریں گے''۔ وہ بہت پیار سے کہہ رہی تھیں۔ ہم راجہ کو لیے خاموش بیٹھے تھے۔ رانی کے چہرے پر افتخار کا رنگ آ گیا تھا۔ بیٹا ہماری گود میں بیٹھا ٹافی چوس رہا تھا۔ دھیرے دھیرے پورا کمرہ خالی ہو گیا۔ رانی ہماری گود میں بیٹھے راجہ بیٹے پر اتنا جھک آئیں کہ ان کی سانسوں کی آنچ محسوس ہونے لگی۔ رانی نے بچے کے گال تھپتھپائے اور اٹھلا کر بولیں:

''بیٹے اپنے ماموں صاحب سے کہیے کہ آج ہمارے ساتھ کھانا کھالیں۔''

''ہم اپنے راجہ بیٹے کے ساتھ کھانا ضرور کھاتے لیکن ہمارے بھوک نہیں ہے۔''

''اپنے ماموں صاحب سے عرض کیجئے کہ ہماری ماماں نے آج مُرغ پکایا ہے تاکہ آپ۔ اس کا

شور بہ ہم کو چٹا سکیں۔"

"ٹھیک ہے ہم اپنے بیٹے کو ضرور شوربا چٹائیں گے"۔ رانی نے کسی عورت کو حکم دیا کہ ماماں جی کو بلاؤ۔ ماماں آئیں گود میں بیٹھے رلجہ بیٹے کو دیکھا۔

"ماماں۔ بھیا جارہے ہیں"۔ رانی نے افسردگی سے کہا

"کیسے جارہے ہیں۔ تم نے روکا کیوں نہیں۔"

"میں اتنی خوشامد کررہی ہوں لیکن۔"

"بھانو کی طرح ضدی ہیں بھانو کے دوست بھی؟" ہمارے قریب آئیں۔ شانے پر ہاتھ رکھ دیا:

"بیٹے تیج تیوہار کے دن اتنا انکار نہیں کیا جاتا۔ میں آپ کی ماں کے برابر ہوں حکم دیتی ہوں کہ آپ کھانا کھائے بغیر نہیں جاسکتے۔ مسکرائیں۔ سمجھ گئے آپ۔"

"جی ماماں صاحب۔"

"آپکو کتنا جیب خرچ ملتا ہے؟"

"دس روپئے مہینے کے لیے۔"

"ہم جب آپکی طرح دسویں میں تھے تو ایک دوانی ملتی تھی۔ آپ اکلوتے ہیں لاڈلے ہیں اس لئے دس روپئے ملتے ہیں جیسی فضول خرچی آج آپ نے کی آئندہ مت کیجئے گا۔ ہرگز ہرگز۔"

ہائی اسکول کا نتیجہ آتے ہی دادوں ہاؤس میں گولے چھٹنے لگے۔ بندوقیں دغنے لگیں۔ ہم سائیکل سے اترے ہی تھے کہ ماتادین نے لڈوؤں کا تھال پیش کیا۔ ہم نے فوراً فون لگایا: "رانی صاحب۔ جب آپ کو فرسٹ ڈویژن اور پوزیشن مبارک ہو۔"

"بھیا۔ کتنا اچھا ہوتا آپکا ڈویژن بھی فرسٹ ہوتا لیکن آپ نے اتنے شوق پال رکھے ہیں۔ شکار ہے ناچ ہے شاعری ہے افسانہ نگاری ہے ہاکی ہے فٹ بال ہے۔ ہفتے میں ایک دن بچتا ہے پڑھائی کے لیے اور سکنڈ ڈویژن آ گیا کمال ہے۔ بھیا اپنی قسم ہم تو ڈر رہے تھے کہ آپ کہیں فیل نہ ہو جائیں۔ آپ لکھنؤ کب آرہے ہیں؟ نا ئیں۔ ہم فون پر مبارکباد قبول نہیں کرتے۔ آپ کا رلجہ بھیا! آپ کو دیکھنے کے لیے بیقرار ہے اسی کا دل رکھنے آجائیے۔ ہم آپ کا کوئی عذر نہیں سنتے۔ بس۔ ہم کل ہی سے انتظار کرنا شروع کردیں گے"۔

دادوں ہاؤس سے نکلے تو راج ہاؤس پر اتر پڑے۔ رلجہ صاحب آنٹ کی کوٹھی کا نام راج ہاؤس تھا۔ پھاٹک پر پہرہ کھڑا تھا۔ پانچ بج چکا تھا لیکن کوٹھی ہونٹوں پر انگلی رکھے خاموش کھڑی تھی۔ دالان پر پڑے خس کے پردوں پر پانی چھڑکا جارہا تھا۔ ایک ملازم نے پہچان لیا۔ لپک کر آیا، پھسپھسایا: "سرکار آرام فرما رہے ہیں"۔ میں نے اپنے نام کا پرچہ جو میں لکھ کر لایا تھا اس کو پکڑا دیا۔ اس نے گیلری میں کھڑے خدمتگار کو دے دیا۔ اس نے مجھے دیکھا پھر پرچہ پڑھا۔ ذرا سا توقف کیا۔ چپکے سے دروازہ کھولا۔ آہستہ سے اندر گیا۔

فوراً باہر نکلتے ہی اشارہ کیا۔ میں اندر گیا راجہ انکل مہاگنی کی سرخ منقش مسہری پر لیٹے ہوئے تھے۔ دوہرے فرشی پنکھے چل رہے تھے لیمپ روشن تھا۔ سلام کے جواب میں اپنے قریب رکھی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا:

''اتنی لودھوپ میں کیسے نکل پڑے؟''

''ہائی اسکول کا نتیجہ آ گیا ہے آپ کی بہورانی فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی ہیں۔''

''واقعی۔ دادوں والی۔''

''جی۔''

''تو اسے مبارکباد دے دوں........'' اور فون کی طرف دیکھا۔

''ایک بات عرض کروں۔ فون تو کتنے ہی لوگ کریں گے اگر لکھنؤ جانے کی تکلیف۔ سرپرائیز۔''

گھور کر دیکھا...... مسکرائے پھر چھوٹا سا قہقہہ لگایا: ''حسن طلب قابل تعریف ہے۔ کب جانا چاہتے ہو''۔

''جب آپ حکم دیں۔'' ایک خدمتگار کی طرف دیکھا: 'ڈائری...... پرسوں صبح...... لیکن صبح..... دس بجے نہیں۔ سخت گرمی ہے۔ ہرحال میں سات بجے نکل جانا چاہئے...... بھیا کے لیے کچھ لاؤ۔''

ماموں صاحب کو یقین تھا کہ میں فیل ہو جاؤں گا۔ اگر بفرض محال اماں کی دعائیں مقبول ہو گئیں اور میری تقدیر نے یاوری کی اور میں پاس ہی ہو گیا تو وہی شاہی ڈویژن ہو گا ایک سپاہی ادھر ایک خدمتگار ادھر اور بیچ میں میاں صاحبزادے یعنی تھرڈ ڈویژن۔

مومانی جان نے فرمایا کہ دو مرتبہ رول نمبر ملایا گیا کہ کہیں دھوکا تو نہیں ہو رہا ہے لیکن جب یقین کرنا ہی پڑا اب بھی خوشی کا کوئی اظہار نہیں کیا گیا۔ دوسرے دن کھانے کے وقت ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ ''راجہ انکل نے بتایا ہے کہ مندرو دادی سخت بیمار ہیں۔ کل وہ ان کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ اگر آپ اجازت۔'' لقمہ پلیٹ میں رکھ دیا گھور کر دیکھا۔ ''یہ راجہ صاحب آنٹ کو مندرو دادی سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی؟''

''ابو جان نے متعارف کرایا تھا وہ جب لکھنؤ جاتے ہیں تو ملنے جاتے ہی۔''

''واپسی کب ہوگی؟''

''رات تک ہو جائے گی انشاءاللہ۔''

''مسلمان کو جب کوئی کام نہیں کرنا ہوتا ہے تو وہ انشاءاللہ کا سہارا لیتا ہے آپ رات تک یقیناً آ جائیں گے؟''

''جی ماموں صاحب۔''

ہم ٹھیک ساڑھے چھ بجے پہنچ گئے۔ راج ہاؤس پر جو بندوق بردار کھڑے تھے وہ ہم کو نہیں جانتے تھے ان میں سے ایک اندر گیا دوسرے آدمی کو بلا لایا۔ اس نے دیکھتے ہی سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔ گیلری پار کر کے اندرونی دالان میں پہنچے۔ پختہ گول چبوترے کے نیچے دو بہت بڑے بڑے بل ڈاگ ٹہل

رہے تھے۔ دو بندوق بردار مجسموں کی طرح نصب تھے چبوترے کے لوہے کے دو کھمبوں کے اوپر جو کھمبا لیٹا ہوا تھا اس میں بڑا سا فرشی پنکھا جھول رہا تھا۔ پنکھا کھینچنے والا ایک قومی ہیکل آدمی اونچے سے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ بہت مہین مچھر دان کے اندر راجہ سفید کرتا پائجامہ پہنے لیٹے ہوئے تھے۔ مسہری کے نیچے گرگابیاں الٹی رکھی تھی۔ میرے سامنے میز پر اردو اور انگریزی کے اخبار رکھے تھے۔ ہم نے ایک اخبار اٹھا لیا۔ آٹھ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے جب آواز آئی: ''گارڈ''

کئی آدمی لپکے۔ کتنے زنجیر کیے گئے۔ مچھر دان اتارا گیا۔ ایک آدمی آفتابہ [بڑا سا ڈھکن دار لوٹا] اور دوسرا ا تاش [مراد آبادی تسلہ] لے کر حاضر ہوا تیسرا صابن دان اور تو ال لے کر لپکا۔ چوتھے آدمی نے چاندی کے بڑے سے کٹورے میں گرم پانی پیش کیا راجہ نے غرغرہ کیا۔ منہ ہاتھ دھویا تب ہماری آمد کی اطلاع کی گئی۔ فوراً حکم ہوا 'بلاؤ' پہلے چبوترے پر کرسی رکھی گی پھر مجھ سے چلنے کو کہا گیا۔ مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔

''بیٹے... آئی ایم سوری۔ جب بارہ کا گھنٹہ بجا تب بھی ہم بیدار تھے۔ مجبوراً حکم دینا پڑا کہ ہم کو جگایا نہ جائے۔ اب کیا بجا ہے؟''

''آٹھ بجنے میں دس منٹ ہیں۔''

''لاحول ولا قوۃ۔''

چاندی کی کشتی میں چائے پیش ہوئی۔ شرکت کا حکم دیا گیا۔ پیر نیچے اتارے ایک خادم نے گرگابیاں جھاڑ کر سامنے رکھ دیں۔ راجہ واش روم کی طرف چلے گئے۔ باہر نکلے تو حجام حاضر تھا۔ شیو کرایا اور حمام میں چلے گئے۔ باہر نکلے تو دو خدمتگاروں نے ایڑیوں پر کاغذ لگا کر دس منٹ میں چوڑی دار پہنایا۔ نو بجے کے بعد ناشتے کی میز پر تشریف لائے۔ بارہ کرسیوں کی ہاتھی دانت کے کام سے جگمگاتی میز قابوں اور پلیٹوں سے بھری تھی۔ دو انڈوں کی زردی کھائی ایک سنترہ اٹھایا۔ ہر لقمے پر ہم سے اصرار کرتے رہے۔ اپنے ہاتھ سے ہماری طرف قابیں بڑھاتے رہے۔ چائے بنانے کا اشارہ کیا۔ ایک خادم نے سنک پیش کی۔ نہیں۔ سگریٹ۔ ایک کشتی میں دس بارہ ٹن پیش کیے گئے۔ تھری کاسل کی طرف اشارہ ہوا ڈبہ کھولا گیا: ''بیٹے کو کون سا سگریٹ پسند ہے۔''

''اگر ہم آپ کو اطلاع دیں کہ مسرکھ کے کیمپ میں آپ نے عبداللہ کو ٹن کھولنے کا حکم دیا تھا۔''

''وہ یوں ہی مذاق میں آپ کا ایک سگریٹ ضایع کر دیا تھا۔''

دس بجے کے قریب نئی سیاہ ڈاج کی پچھلی بائیں سیٹ پر تشریف فرما ہوئے۔ ہم کو اپنے داہنی طرف بٹھایا۔ دو گاڑیوں پر اسٹاف سوار ہوا۔ لکھنؤ میں داخل ہوتے ہی حکم ہوا: ''حضرت گنج''

ایک اینگلو انڈین عورت کی دکان کے سامنے گاڑیاں روکی گئیں۔ چاکلیٹ اور مٹھائی کے ڈبے خریدے گئے اور ایک بیگ میں رکھ کر ہم کو دیے گئے پھر سو روپے کا نوٹ ہماری جیب میں رکھا گیا۔

''یہ ڈبے آپ اپنی طرف سے پیش کریں گے اور ہمارے پوتے کو آئس کریم کھلائیں گے۔'' ہم کو محسوس ہوا کہ کاغذ کا خنجر کلیجے میں ترازو ہو گیا اور ہم بیٹے کے منصب سے اتر کر مصاحب کے درجے پر تعینات ہو گئے۔

گاڑیوں کے داخل ہوتے ہی جمال پور ہاؤس بیدار ہو گیا دالان پر لگی خس کی ٹٹیوں پر پانی زور زور سے چھڑکا جانے لگا۔ ریاست آنٹ کے مینیجر نے آدمیوں کو مطلع کیا کہ راجہ میرزا مشاق صاحب داود ل راج کی بہو شانتی رانی صاحبہ سے ملنے تشریف لاتے ہیں۔ راجہ کے گاڑی سے نکلتے ہی گیم شحیم ٹھاکر گجراج سنگھ تعلقدار جمال پور نے سیڑھیوں سے اتر کر پیشوائی کی۔ مسکرا کر ہاتھ ملایا خم ہو کر ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کی گزارش کی۔ قدم رکھتے ہی رانی نے اس طرح تسلیم پیش کی جیسے حسن کی پوری سلطنت نذر میں گزار دی ہو۔ ہمارا آداب آنکھوں کے تکلم اور ہونٹوں کے تبسم نے قبول کیا۔

''ہمارے بیٹے کو فرسٹ ڈویژن مبارک ہو بہت بہت مبارک ہو۔ ہم تو اخبار پڑھتے ہی سوار ہو جاتے لیکن آپ کے بھیا نے ہم کو سوار ہی نہیں ہونے دیا۔ جب ہم نے گزارش کی کہ آپ کب تشریف لے چلیں گے تو جواب ملا سوچیں گے۔'' ٹھاکر صاحب نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

''بڑی مشکل سے آج کا دن اور دس بجے کا وقت مقرر ہوا۔'' سب ہنس رہے تھے شیروانی کی جیب سے مخمل کی ڈبیہ نکالی: ''ہمارا بیٹا ہاتھ بڑھائیے۔'' رانی نے بائیں ننگی کلائی پیش کی۔ راجہ نے سونے کی چین میں لگی سونے کی گھڑی پہنا دی، آگے آگے ٹھکرائن صاحبہ پیچھے پیچھے خادمائیں مشروبات لیکر حاضر ہوئیں۔ راجہ نے کھڑے ہو کر ٹھکرائن کا آداب قبول کیا۔ ایک کشتی میں کیسر و دوسری میں گڑ ہل تیسری میں خس کے شربت کے گلاس سجے ہوئے تھے۔ راجہ نے آداب کر کے سفید گلاس اٹھا لیا۔ چند گھونٹ لیکر گلاس میز پر رکھ دیا ٹھکرائن نے خاصدان پیش کیا۔ راجہ کھڑے ہوئے سلام کیا اور گلوری منہ میں رکھ لی۔ راجہ کے بیٹھتے ہی ایک خادم نے ٹھاکر کو سنک پیش کی۔ ٹھاکر نے کھڑے ہو کر سنک راجہ کی خدمت میں گزار دی۔ راجہ نے تسلیم کہہ کر قبول کر لی۔ دو ایک کش لیے تھے کہ ٹھکرائن صاحبہ قریب آئیں:

''لنچ میں جو ڈش مرغوب ہو فرما دیجئے ابھی تیار ہو جائے گی۔''

''نہیں نہیں .... بھابھی صاحب ہمارا لنچ بیرسٹر کے یہاں پہلے سے طے ہے۔'' ٹھاکر صاحب نے گردن آگے بڑھائی: ''راجہ صاحب اگر آپ لنچ قبول نہیں کرتے تو ڈنر بہر حال منظور کرنا پڑے گا۔'' راجہ صاحب نے ذرا سا تامل کیا: ''ڈنر میں آپ کو بہت زحمت ہو گی اس لیے''۔

''زحمت کیسی راجہ صاحب۔ انتہائی مسرت ہو گی۔'' راجہ نے سنک سے دو ایک کش لیے۔ آہستہ سے بولے: ''ہم نو بجے سے پہلے حاضر نہیں ہو سکیں گے۔''

''ڈنر تو راجہ صاحب نو بجے کے بعد ہی جمتا ہے''۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ داسیاں میزیں صاف کرنے لگیں اور چائے کے برتن لگانے لگیں۔
رانی نے راجہ کے بہت قریب آ کر عرض کیا:
''انکل ہماری ماں کو معلوم نہیں تھا کہ آپ شربت شوق سے نہیں پیتے ہم آپ کے لیے چائے بنائیں گے۔''
''بیٹے ہم کو دیر ہو جائے گی۔ گھڑی دیکھی، بیرسٹر انتظار کر رہا ہوگا۔''
''انکل صرف دو منٹ لگیں گے۔ دو گھونٹ پی کر چھوڑ دیجئے گا۔''
رانی جانے کے لیے مڑیں تو ہم نے آہستہ سے کہا: ''ابھی تک ہمارا بھیا نہیں آیا۔''
''وہ سو رہا ہے'' رانی نے جواب دیا۔
ہاں ہم نے بھی ابھی تک اسے نہیں دیکھا راجہ نے کہا۔
''میں جگا کر لاتی ہوں۔''
''نہیں نہیں...... یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔''
''انکل آپ کو معلوم ہے کتنا ہی رو رہا ہو بھیا کی گود میں جاتے ہی چپ ہو جاتا ہے۔ مسکراتا بھی ہے''۔
''کمال ہے''۔ راجہ نے حیرت سے کہا
راجہ انکل کے جانے کے بعد رانی ہم کو اپنی خوابگاہ میں لے گئی۔ خس کی ٹٹیوں پر پانی چھڑکا جا رہا تھا نیم تاریک کمرے میں ان کا حسن دو بالا ہو گیا تھا بلاوز سے نکلے ہوئے ہاتھ پنشاخوں کی طرح روشن تھے چہرہ جیسے گلابی گلوب پہنے دوہری بتیوں کا لیمپ جل رہا ہو۔ مسہری کے ایک طرف کاؤچ کے ساتھ دو آرام کرسیاں پڑیں تھیں دوسری طرف لکڑی کے بڑے جھولے میں بیٹا سو رہا تھا۔ اس کے برابر رکھی ہوئی کرسی پر ہم نیم دراز ہو گے۔
''بھیا۔ آپ ہمارے بستر پر نہیں لیٹنا چاہتے تو کاؤچ پر لیٹ جائیے۔'' رانی نے دلسوزی سے کہا:
''تھک گئے ہوں گے آپ..... کھانا کتنے بجے کھائیں گے۔''
''کھانا۔ چھے بجے صبح بھاری ناشتہ کیا تھا۔ سفر کے خیال سے۔ پھر تقریباً نو بجے راجہ انکل کے ساتھ زبردستی پھر ناشتہ کیا۔ عمدہ۔''
''دو بجنے والا ہے ہضم ہو گئے ہوں گے دونوں ناشتے۔ ٹھیک ہے ایک گھنٹے کے بعد میز لگائی جائے گی۔'' اچانک راجہ بیٹے نے غوں غاں کر کے آنکھیں کھول دیں۔ رانی نے سوئچ آن کیا۔ گود میں اٹھا لیا۔ اسے واش کیا لباس تبدیل کیا اور ہماری گود میں ڈال دیا۔ میں اسے پکارتا رہا گدگداتا رہا آخر آخر وہ ہنس دیا رانی کا چہرہ اور روشن ہو گیا:
''ہمارا راجہ بیٹا ماموں صاحب سے کہیے کہ ہم آپ سے خفا ہیں۔ ہم آپ سے نہیں بولتے۔''
''کیوں بھائی ہم سے آپ کیوں خفا ہیں کیوں نہیں بولتے؟''

"اتنے دنوں سے ہر دستک ہر ڈور بیل ہر ہارن پر ہم سمجھتے تھے کہ ہمارے ماموں صاحب آ گئے لیکن۔"

"ہمارا راجہ بیٹا ہماری طرف دیکھے۔ ہم آپ کے لئے کتنی کہانیاں گھڑتے کتنے جھوٹ بولتے ہیں تب آپ تک رسائی ہوئی ہے ہماری اور آپ ہم سے خفا ہیں یہ تو آپ کی بڑی زیادتی ہے۔"

"ارے شنو......... بھیا کو کھانا نہیں کھلاؤ گی دو بج گئے ہیں۔"

رانی کی ماں دھڑ دھڑاتی ہوئی آئیں۔

"بھیا۔ آپ کو میز پر جانے میں زحمت ہو تو کھانا یہیں لگا دیا جائے؟" رانی نے پوچھا

"جیسی آپ کی مرضی۔"

کافی کی میزیں ملا دی گئیں۔ سلفچی رکھ دی گئی۔ ایک ایک کر کے ہم نے دونوں ہاتھ دھو لیے۔

"بھیا اپنے دلارے کو ہمیں دیدیجئے۔ ورنہ آپ کھائیں گے کیسے؟

"ایک وقت نہ بھی کھائیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔"

"واہ یہ کیا بات ہوئی۔ آپ نہیں کھائیں گے تو ہم کھلائیں گے"۔

"ہمارا بھیا کیا کھائے گا؟"

"تھوڑی سی بریانی اور کباب۔"

"بھیا ہم گوشت کے پارچے کر دیں اور آپ کانٹے سے کھالیں۔"

ہم نے بھرا ہوا کانٹا اٹھایا تھا کہ بیٹے نے ہاتھ مار دیا۔ پارچہ کہیں گرا اور کانٹا کہیں۔ ہمارے ساتھ دائی بھی ہنسنے لگی۔ رانی اٹھ کر کاؤچ پر ہی ہمارے پاس بیٹھ گئی اور ہمیں کانٹے بھر بھر کے کھلانے لگی۔

"بھیا بریانی میں ذرا سی کری ڈال دیں۔ کھلانے میں آسانی ہوگی۔" ہم نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ شیرینی بھی اسی طرح کھلائی گئی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس عرصے میں کوئی ملازمہ اندر نہیں آئی۔

ہر چند کہ چھے بج رہے تھے لیکن لو چل رہی تھی۔ ہم راجہ کو آئس کریم کھلانے کے لیے نکل رہے تھے۔ ٹھکرائن صاحبہ نے کہا بھی کہ وہ کوالٹی سے آئس کریم کی 'برک' منگوا دیں گی۔ مگر ہم لوگ نکل ہی پڑے۔ رانی خود ڈرائیو کر رہی تھی۔ ہم راجہ کو گود میں لیے برابر کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ گیٹ سے نکلتے ہی ہم نے آہستہ سے کہا: "شاہ نجف روڈ" رانی نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا اور شاہ نجف روڈ کے راستے پر چل پڑی۔ پھولوں کی دکان پر ہم راجہ بیٹے کو لے کر اتر پڑے، بہت سے سرخ پھول خرید کر بانس کی ٹوکری میں بھروا دیئے۔ رانی نے پھولوں کی ٹوکری ہاتھ میں لی تو ہاتھ لرز گیا اور چہرے کی روشنی کم ہوگئی۔

کوالٹی میں آئس کریم کا آرڈر ہمیں نے دیا۔ ہم خود بھی کھاتے رہے اور راجہ بیٹے کو بھی کھلاتے رہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ منیجر اور بیرے ہم کو غور سے دیکھ رہے ہیں بعض آنکھوں میں سوالیہ نشان بھی نظر آئے۔ رانی ان تمام باتوں سے بے نیاز آہستہ آہستہ آئس کریم کھاتی رہی راجہ بیٹے سے اور ہم سے مسکرا کر

باتیں کرتی رہیں۔

ساڑھے دس بجے رات کو جب راجہ انکل کے پہلو میں ہم بچّے کو گود میں لیے چھوٹے سے جلوس کے ساتھ پورٹیکو میں آئے تو رانی نے نمناک آواز سے پوچھا: ''انکل اب کب تشریف لائیں گے؟''

انکل نے رانی کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا: ''ہم اپنی بہو رانی کے پاس جلد ہی آئیں گے۔''

اپنے بیٹے کو میری گود سے لیتے ہوئے مجھے غور سے دیکھا: ''بیٹے ماموں صاحب پوچھیے کہ اب وہ کب آئیں گے''۔ ہم نے رانی کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر نظریں چرالیں۔

''ہم بھی راجہ انکل کے ساتھ ہی اپنے بھیا کے پاس آئیں گے''۔ رانی نے ہم کو مخاطب کیا:

''بھیا سیتاپور میں ایسا کوئی کالج ہے نہیں کہ آپ داخلہ لیں''۔

ٹھاکر صاحب نے فوراً فرمایا: ''بیٹے آپ لکھنؤ کے سب سے اچھے کالج کرسچین کالج میں داخلہ لیجیے۔ ہم کو ایک فون کر دیجیے گا آپکا داخلہ ہو جائیگا۔ ہوسٹل میں رکھنے کے بجائے ہم آپکو کوٹھی کا ایک سٹ دیدیں گے۔ آرام سے رہیے۔''

''ہم ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے۔ ماموں صاحب ہم کو علیگڑھ بھیجنا چاہتے ہیں۔''

''علیگڑھ''۔ کئی زبانوں سے ایک ساتھ نکلا۔ رانی نے بیساختہ کہا:

''وہ تو بہت دور ہے۔ انکل آپ بھیا کا داخلہ یہیں کرا دیجیے۔ آپ۔''

''بیٹے یہ مسئلہ اگر محمرہٹہ میں ہونیوالا ہوتا تو ہم فوراً ہامی بھر لیتے۔ لیکن ان کی تعلیم کی تکمیل ان کے ماموں جمیل صاحب (قاضی جمیل الدین احمد) کے ہاتھ میں ہے اور وہ بہت سخت آدمی ہیں۔ ہم کو یقین نہیں ہے کہ وہ ہماری بات مان لیں گے۔ پھر بھی ہم کوشش کریں گے کہ بیٹے کا داخلہ لکھنؤ ہی میں ہو جائے۔''

ہم گاڑی کی پچھلی داہنی سیٹ پر بیٹھنے لگے تو رانی لپک کر اس طرف آ گئی۔ بیٹے کو ہماری طرف خم کیا: ''ماموں صاحب کے پاؤں چھو لیجیے۔ تسلیم کیجیے''۔ ہم نے چوم لیا۔

''ماموں صاحب سے عرض کیجیے کہ جلدی آئیے گا۔ ورنہ ہم خفا ہو جائیں گے۔''

''ہم اپنے بیٹے کے پاس بہت جلد آئیں گے''۔

ہمارا راجہ رگھو بر دیال اسکول ایک زمانے سے کالج ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ جون ۱۹۴۸ء میں یہ کوشش کامیاب ہوئی جس کا ہم کو بہت رنج ہوا۔ لیکن اماں بہت خوش ہوئیں اور فوراً پالکی پر چڑھ کر سیتاپور پہنچ گئیں۔ اور بہت غم زدہ آواز میں ماموں صاحب سے کہا: ''میل (وہ ہمارے ماموں صاحب قاضی جمیل الدین احمد کو میل کہتی تھیں) علی گڑھ بہت دور ہے بھیا کو اتنی دور بھیجنے کے بجائے یہیں سیتاپور میں داخل کرا دیجیے۔ ہماری آپ کی آنکھوں کے سامنے رہے گا۔''

''بھیا.. بہت شریر ہے..... پڑھنے سے جی چراتا ہے..... آپ کی خوف میں پڑھتا رہے گا۔ علی

گڑھ میں تو بہت آزاد ہو جائے گا۔ اس لیے۔''

ماموں صاحب دیر تک خلا میں گھورتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے: ''ٹھیک ہے تمھاری تنہائی کے خیال سے۔'' جملہ مکمل ہونے سے پہلے باہر چلے گئے۔

ہمارے سکنڈ ڈویژن نے ماموں صاحب پر خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ وہ خاصے نرم ہو گئے تھے ہر دوسرے تیسرے مہینے جب ہم لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں شرکت کی اجازت مانگتے یا شام افسانہ میں شریک ہونے کی گزارش کرتے تو وہ بجائے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے محض گھور کر دیکھتے اور آہستہ سے گردن ہلا دیتے۔ لیکن جب ہم نے انٹرمیڈیٹ پاس کر لیا اور امّاں رضا مند ہو گئیں کہ ہم لکھنؤ میں داخلہ لے لیں اور مقدمہ آخری فیصلے کے لئے ماموں صاحب کی خدمت میں پیش ہوا تو وہ بگڑ گئے۔ وہی پرانا حکم علیگڑھ اور صرف علیگڑھ۔ علیگڑھ کی دوری کی وجہ سے اماں مذبذب میں تھیں لیکن بھائی کی محبت سے مجبور تھیں۔ ہم ایک ملازم کے ساتھ علی گڑھ بھیجے گئے۔

پروفیسر فاروق چیئرمن کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کے مہمان ہوئے اور بی۔اے میں داخلے کیلئے اردو انگریزی اور فارسی کا کمبینیشن پیش کیا۔ تو پروفیسر نے اطلاع دی کہ یہ کمبینیشن یہاں نہیں ہے۔ یہ خبر فرحت اثر سنتے ہی ہم سیتاپور کیلئے روانہ ہو گئے۔ اور ماموں صاحب کی اجازت سے ہم کسی طرح لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہو گئے۔

ہمارے ساتھ مچھر بنہ سے جو بستر آیا تھا وہ ظاہر ہے گرمیوں کا تھا۔ ایک دری ایک مخملی قالین سرمائی پرندوں کے پروں کا تکیہ ہوسٹل کے کمرے میں جو پلنگ تھا وہ لوہے کی پتیوں سے بنا ہوا تھا ہم ساری رات سو نہیں سکے۔ صبح ہوتے ہی جمال پور ہاؤس پہنچ گئے۔ رانی نے ٹھکرائن صاحبہ کے سامنے مسلۂ پیش کیا۔ وہ ایک بہت موٹی توشک ایک بستر لیکر رانی کے ساتھ ہوسٹل آ گئیں۔ ٹھکرائن صاحبہ کے ہوسٹل آنے کا یہ فائدہ ہوا کہ رانی بھی راجہ بیٹے کے ساتھ کبھی کبھی ہوسٹل آنے لگیں اور کھانے پینے کی بہت سی چیزیں ساتھ لیکر آنے لگیں۔ رانی نے انٹرمیڈیٹ بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور آئی ٹی کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ راجہ بیٹے پر ایک خوبصورت سی اینگلو انڈین نرس مقرر ہو چکی تھی۔ آئی ٹی کالج یونیورسٹی سے بہت قریب ہے۔ کبھی کبھی ہم ٹھیک چار بجے آئی ٹی کالج کے چوراہے پر کھڑی رانی کی گاڑی کے پاس پہنچ کر اس کا انتظار کرتے۔ وہ متحیر بھی ہوتیں اور خوش بھی ہوتیں اور ہم کو جمال پور ہاؤس لے جاتیں۔ راجہ بیٹا اسی طرح بے محابا ملتا۔ کسی کے پاس ہوتا کچھ بھی کر رہا ہوتا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ہماری گود میں سما جاتا لیٹ جاتا۔ چلتے وقت رونے لگتا اور کبھی کبھی ہوسٹل سے رخصت ہوتا۔

نومبر ۱۹۵۲ء میں ہماری پہلی کتاب 'شکست کی آواز' شایع ہوئی۔ ہم کتابوں کا بنڈل لے کر سیدھے جمال پور ہاؤس پہنچ گئے۔ رانی کتاب دیکھتے ہی اُچھل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نیچوان سے شوق

فرمارہے تھے جب رانی نے انھیں کتاب دکھلائی۔ وہ اسی وقت پڑھنے لگے۔ چلتے وقت ٹھاکر صاحب نے ہم کو سو روپے دیئے اور ٹھکرائن صاحبہ نے ایک بڑی دعوت کا اعلان کر دیا۔ رانی کا چہرہ ہمارے ذکر سے چمکنے لگا۔ مفتخر ہونے لگا۔

۱۹۵۳ء میں جب ہم نے بی۔اے آنرز میں ٹاپ کیا تو کانوکیشن میں رانی نے شرکت کی ہماری تصویر یہ کہہ کر لے لی کہ میں اسے انلارج کراؤں گی۔ انلارج کرائی بھی لیکن مجھے نہیں دی کہ میں نے مانگی نہیں۔

۱۹۵۴ء میں جب ہم نے ایم۔اے میں ٹاپ کیا اور شنکر دیال نگار گولڈ میڈل حاصل کیا تب بھی رانی نے اپنے فوٹو گرافر سے کئی تصویریں لیں لیکن ہم کو ایک بھی نہیں دی۔

۱۹۵۵ء میں جب ہم عارضی لکچرر ہوئے اور ٹیلی فون سے مبارک باد دی تو محسوس ہوا کہ بات کرتے کرتے آواز رندھ گئی دوسرے دن چھٹی تھی میں کرائے کے چھوٹے سے کمرے میں اسٹوو پر چائے بنا رہا تھا گیارہ بجے کا وقت تھا۔ مالک مکان کے ملازم نے اطلاع دی کہ موٹر پر کوئی لیڈی آپ سے ملنے آئی ہیں۔ میں باہر نکلا تو رانی مسکرا رہی تھیں راجہ بیٹا دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ''ارے، اتنے وقت کیسے آ گئیں''۔

''آپکا فون پاتے ہی مبارکباد دینے کا فیصلہ کر لیا۔ فوراً تیاری کی۔ پاپا کے ڈرائیور اور ایک بندوق بردار سپاہی کو ساتھ لیا اور دو بجے رات کو سوار ہو گئے۔ ہمارے انتہائی اصرار پر رات میں رکنے پر رضامند ہوئیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں کہانی سناؤں گا۔ میں فوراً اپنے پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت صرف ایک گیسٹ ہاؤس تھا۔ آج جسے دو نمبر کا گیسٹ ہاؤس کہا جاتا ہے۔ اسٹاف کلب کے پہلو کی سڑک کے دوسری طرف۔ میری خوش نصیبی کہ گیسٹ ہاؤس کے انچارج بھی پروفیسر کی خدمت میں حاضر تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں میں نے ان سے دو کمروں کی اجازت مانگی جو فوراً منظور ہوئی۔ انھوں نے پروفیسر کے گھر سے ہی گیسٹ ہاؤس کے ہیڈ بیئرر کو فون کر دیا کہ کھانا تیار ہو اور خبردار قاضی صاحب کے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔''

ہم لوگ جب گیسٹ ہاؤس پہنچے تو پورا عملہ پیشوائی کو حاضر تھا۔ مرغن کھانا کھلا کر ہم نے رانی کو اور راجہ بیٹے کو بہت اصرار کر کے لٹا دیا۔ میں بھی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا آدھا گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ رات بھر کے تھکے ہوئے ماں بیٹے سو گئے۔ کچھ پڑھتے ہی آنکھ بھی جھپک گئی۔

پانچ بجے کے بعد بیئرر نے آہستہ سے دستک دی۔ میں نے چپکے سے دروازہ کھولا۔ وہ چائے کا آرڈر لینے آیا تھا۔ میں نے منع کر دیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ راجہ بیٹا بیدار ہو گیا۔ میں اس کو بہت خاموشی سے اٹھا کر باہر لے آیا۔ دروازے کے سامنے وارنڈے میں کرسیاں ڈال دی گئیں۔ ہم دونوں گپ کرتے رہے چائے پیتے رہے۔ پھر راجہ بیٹا گیسٹ ہاؤس کے چمن سے بہت سے گلاب توڑ لایا۔

چھ بجے کے بعد رانی نے دروازہ کھولا۔ راجہ بیٹے نے وہ تمام پھول اپنی ماں کے سرہانے رکھ

دیے رانی نے جھک کر پھولوں سے اپنی دونوں مٹھیاں بھر لیں۔ مجھے کنکھیوں سے دیکھا اور پھول سونگھ لیے۔
چائے پی کر رانی نے بیرے کو حکم دیا کہ وہ چائے اور دوسرے کمرے سے ڈرائیور اور گارڈ کو بلا کر لائے معلوم ہوا کہ دونوں غافل سو رہے ہیں۔ رانی نے گاڑی نکالی اور یونیورسٹی دیکھنے کی خواہش کی۔

اس وقت دیکھنے کے لائق صرف سرسید ہال کا کیمپس تھا۔ جنرل ایجوکیشن لائبریری آرٹس فیکلٹی وغیرہ سب بعد میں تعمیر ہوئی۔ وائس چانسلر کرنل بشیر حسن زیدی کا قیام پھوس کے پرانے بنگلے میں تھا۔ آٹھ بجے کے بعد ہم لوگ واپس آ گئے۔ رانی کے ملازم چائے پی کر ٹہلنے نکل گئے تھے۔ ہم تینوں دیر تک چمن میں ٹہلتے رہے۔

گیسٹ ہاؤس کے خانساماں نے بہت پر تکلف کھانا کھلایا۔ ڈرائیور اور گارڈ بھی آ گیا تھا۔

دس بجے کے بعد ہم لوگ کمرے کے اندر آئے۔ میں نے اصرار کر کے رانی اور بیٹے کو لٹا دیا ہم آرام کرسی پر بیٹھے تھے لیکن راجہ بیٹے نے ضد کر کے ہم کو اپنے برابر لٹا لیا۔ ڈبل بڈ پر ایک طرف ہم تھے اور دوسری سمت رانی درمیان میں راجہ بیٹا۔ ہم نے کہانی شروع کی۔ راجہ بیٹا ختم ہونے سے پہلے ہی سو گیا۔ کہانی سناتے سناتے ہمارا سر اور کہانی سنتے سنتے رانی کا سر ایک دوسرے کے قریب آ گیا۔ لیکن ہمارے بدن ایک دوسرے سے دور تھے۔ یعنی ہم دونوں انگریزی حرف V کی طرح لیٹے ہوئے تھے۔ اپنی عادت کے مطابق ہم نے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی تو ہمارے بائیں ہاتھ کا انگوٹھا رانی کے بالوں سے مس ہو گیا۔ ہم نے گردن گھما کر دیکھا۔ تو رانی کی داہنی آنکھ کے گوشۂ چشم سے ایک آنسو......ایک آبدار موتی کان کی طرف سفر کر رہا تھا۔ ہم سوچنے لگے کہ یہ کس اجنبی دیس کا مسافر ہے جو کسی دوسرے اجنبی دیس کی طرف پانی کا لباس پہن کر نکل پڑا ہے۔ یہ کس کا پیامبر ہے جو گوہر شاہوار کا بھیس بنا کر نکلا ہے۔ کیا پیغام ہے۔ کس کا پیغام ہے کہ وہ صدف آنکھ کھل گئی۔ رانی نے ہماری طرف دیکھا اور داہنی کروٹ لے لی۔ بہت آہستہ سے۔ پوری آنکھیں کھول کر اس طرح دیکھا کہ اس کے بیان سے قلم عاجز ہے۔ معلوم نہیں کیسے...کیوں غالب کا ایک شعر یاد آ گیا ۔ بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی ☆ وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے۔
ہم نے اپنے آپ کو بہت سنبھالا لیکن پھسل گئے: ”رانی تم رو رہی ہو؟ ہم نے اٹھ کر اپنے کرتے کے دامن سے دونوں آنکھیں پونچھ دیں“۔

”نہیں۔ یہ خوشی کے موتی ہیں جو ہم لٹا رہے ہیں“۔

”ہمارا بھیا۔ پروفیسر ہو گیا......... پروفیسر اپنی پہلی کہانی ہم کو سنا رہا ہے۔ یہ معمولی خوشی ہے؟ ہم ساری عمر اس خوشی کو یاد رکھیں گے۔ تمام عمر اس عزت پر ناز کرتے رہیں گے۔ بھیا اب آپ تھک گئے ہوں گے۔ آپ دوپہر میں بھی نہیں سوئے۔ آرام کیجیے۔ ہم دوپہر میں سو لئے تھے۔“

”رانی......تم سے ملنا۔ تمہارے پاس بیٹھنا۔ تم سے باتیں کرنا۔ تم کو کہانی سنانا۔ تم کو سنتے

ہوئے دیکھنا ایسی لذت ایسی کیفیت ہے جس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ مسرکھ کے کیمپ میں ہم نے تم کو کتنی راتوں میں کتنی کہانیاں سنائی تھیں؟ ہر رات تم کہانی سنتے سنتے سوگئی تھیں۔ آج کی رات بھی ہم تم کو اُس وقت تک کہانی سناتے رہیں گے جب تک تم سو نہیں جاؤ گی۔''

''بھیا؟''

''ہاں بولو کچھ کہو'' .... کتنے دن ہوگئے ہم سے باتیں کیے ہوئے۔ تم کو سنے ہوئے۔''

[ہم نے بیس دسمبر کی شام میں عارضی لکچر رشپ کا تقرر نامہ وصول کیا۔ ۲۱ر دسمبر کی صبح گیارہ بجے ہماری ریسرچ کے گائیڈ اور شعبہ اردو کے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب نے ہم کو ایم۔اے سال اوّل کا کلاس دے دیا۔ کلاس دوم میں راہی معصوم رضا اور اخلاق محمد خاں شہریار پورے ادب آداب کے ساتھ میرا پہلا لکچر سن رہے تھے۔ میں مومن خان مومن پر بے تکان بول رہا تھا۔ اسٹاف روم میں آیا۔ پروفیسر نے حکم دیا کہ ڈینڈی کو چائے پلاؤ۔ پروفیسر نے پورا لکچر دیوار سے لگ سنا تھا۔ وہ چائے کی پیالی ہماری ٹرافی تھی۔ بائیس دسمبر سے چھٹیاں شروع تھیں۔ لیکن ہم پروفیسر کی اجازت خاص کے بغیر باہر جانا مناسب نہیں سمجھ رہے تھے۔]

''کل معلوم ہو جائے گا۔''

امّاں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو اپنی آرزو کی سولی پر چڑھا دیا۔ یعنی اپنے رشتے کے بھائی راجہ نواب چودھری محمد محمود کی اولاد اکبر شاہدہ بیگم سے شادی طے کر دی۔ ۹ر فروری ۱۹۵۷ء تاریخ نکاح مقرر ہوئی۔ منیر پھوا لکھنؤ آئی ہوئی تھیں دعوت نامہ پاتے ہی امّاں کے نام دستی خط روانہ کیا کہ میں ضرور شرکت کروں گی امّاں نے حامل رقعہ کے ہاتھ حکم نامہ بھیجا کہ پشواز اور گھنگھرو لے کر آنا بھیا کی شادی میں تمھارا رقص ہوگا۔

گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا منیر پھوا تک آچکی تھیں ابا سرکار قاضی فیاض علی مرحوم کی مسہری پر بیٹھی رو رہی تھیں اور ہم ان کی دلداری کر رہے تھے کسی ملازم نے اطلاع دی کہ لکھنؤ سے رانی صاحبہ آئی ہیں ہم فوراً باہر آگئے رانی جیپ سے اتر چکی تھیں راجہ بیٹا ہم کو دیکھتے ہی دوڑا اور پیروں پر جھکنے لگا ہم نے شانوں سے تھام کر سینے سے لگا لیا۔ رانی نے امّاں کے پاؤں چھوئے تو امّاں نے اتنی شفقت سے لپٹایا اور سر چوما کہ رانی کی آنکھیں لمبی ہوگئیں۔ منیر پھوا کے کمرے میں ہی تخت کے دوسری طرف والی مسہری پر رانی کا بستر بچھا دیا گیا اس کے برابر ہی ایک چھوٹی مسہری راجہ بیٹے کیلئے لگا دی گئی۔ امّاں نے منیر پھوا ہی کی طرح رانی کے سامنے بھی تھال[1] لگا کر اس کو حیرت زدہ کیا۔

[1] اودھ کے زمینداروں کے گھر جب بیٹی آتی ہے تو اس کی رسمی پیشوائی میں تھال لگایا جاتا ہے۔

رقص کیلئے پورا آنگن صاف کیا گیا۔ ٹاٹ کے فرش پر درے بچھائے گئے ان پر جازم لگائی گئیں بیچوں بیچ ایک مخملی قالین ڈال دیا گیا۔ امّاں نے کسی تنقید کی پرواہ کیے بغیر سازندوں کو اندر آنے کی

اجازت دے دی عشا کی نماز کے بعد پورا گھر عورتوں سے بھر گیا کئی ہنڈوں اور پیٹرومیکس کی تیز روشنی منیر پھوا کا انتظار کر رہی تھی۔ سارنگی مسکرانے لگی تھی طبلہ ہنسنے لگا تھا۔ منیر پھوا کمرے سے نکلیں۔ سر سے پاؤں تک زیورات میں گندھی ہوئی، سرخ زرکار پشواز پہنے ہوئے جس کے دامنوں میں سچے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ ایک سروِ زریں ایک شمشادِ فروزاں کی طرح قالین پر کھڑی ہوئی جیسے کسی استاد آتش باز نے روشنیوں کا بوٹا کھڑا کر دیا ہو۔ تمام روشنی ان کے سامنے کجلا گئی تھی۔ وہ آہستہ سے سازندوں کے پاس اس طرح بیٹھ گئیں کہ ان کی پشواز مور کے پروں کی طرح پھیل گئی۔ منیر پھوا کی عمر اس وقت تینتیس سال تھی قدرے بھاری ہو گئی تھیں۔ اماں کے دالان کی طرف دیکھا: ''بھابھی صاحب ہم نے پانچ برس بعد پشواز پہنی ہے، گھنگرو باندھے ہیں۔ صرف آپ کے حکم پر۔ اگر کوئی خطا ہو جائے تو معاف کر دیجئے گا۔''

سازندوں سے مشورہ کرنے لگیں۔ گنگنانے لگیں۔ ایک دالان میں صوفہ پڑا تھا۔ ہمارے اور رانی کے درمیان راجہ بیٹا مبہوت بیٹھا منیر پھوا کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک کھڑی ہوئیں ایک تان لی تو حد سماعت تک چراغ جل گئے۔ موسیقی آواز کا رقص ہے۔ رقص بدن کی موسیقی ہے۔ آواز کے رقص کا آغاز ہو چکا تھا۔

ایں مسند شاہانہ مبارک باشد۔

آواز کا طلسم حد سماعت تک طاری تھا۔ آواز کا زیر و بم الفاظ کا پیچ و خم۔ ساز و آواز کا رن پڑ رہا تھا زمین سے آواز کا ایک خط خاموش اٹھا اور آسمان تک چھا گیا۔ ابھی سماعت آواز کے رقص کے سحر میں مبتلا تھی کہ طناز پیر کی ٹھوکر سے وہ زبردست چھناکا ہوا کہ در و دیوار تک کھنک اٹھے۔ اب بدن تانیں لگا تھا۔ جیسے درویش رقص کرتے ہیں جیسے رانیاں رقص کرتی ہیں جیسے بادشاہ رقص کرتے ہیں۔ تجبر سے چور گھمیریاں، ناز و طمطراق کے چاک سے اترے ہوئے بلکورے۔ مغرور جنبشیں، متکبر لرزشیں الفاظ کی گرفت سے بلند ہو گئیں۔ ایک ایک توڑہ ایسا تھا کہ جاں نثار کر دی جائے۔ کتنی ہی دیر تک یہ بے نظیر نظارہ قائم رہا۔ پھر نور و سرور کی آوازیں۔ ساز و آواز کی صدائیں آسمان سے زمین پر اترنے لگیں۔ پشواز جو طاؤس کے پروں کی طرح کمر کے برابر آ گئی تھی۔ دھیرے دھیرے سمٹنے لگی۔ سمٹ گئی۔ وہ بیٹھ بھی چکی تھیں۔ لیکن زمین سے آسمان تک سکوت کا جو خط آسمانی بلند ہوا تھا دیر تک قائم رہا۔

رانی اپنے بیٹے اور ہمارے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھی تھیں۔ آہستہ سے مخاطب ہوئیں:

''بھیا آپ تو جانتے ہیں کہ پاپا کو رقص و سرود سے کیسی دلچسپی ہے بچپن سے مجرے دیکھتی سنتی آئی ہوں لیکن ایسا ناچ اور ایسا گانا پہلی بار دیکھا اور سنا۔ ایسی ہی محفلوں میں راجاؤں اور نوابوں نے اپنی ریاستیں لٹا دی ہوں گی۔ مہاراجہ یتیم گنڈہ کی کوئی خطا نہیں اگر وہ نثار ہو گیا۔''

اماں کے ساتھ چچی جان (بیگم قاضی محمود علی) کی طرح رانی بھی گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئیں۔ ایک بار کسی طرح اماں کے ہاتھ سے رانی کا ہاتھ چھوٹ گیا۔ اماں چونک پڑیں فوراً ہم کو بلوایا گیا:

''ڈاکٹر کو بلاؤ۔ ابھی۔ رانی کے بخار ہے اور تیز ہے''۔
معلوم ہوا کہ بخار ایک سو ایک ہے ہم کو پریشان دیکھ کر رانی ہمارے پاس آئی:
''بھیا بخار تو ہم کو پرسوں سے ہے لیکن ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے''۔
منیر پھوا نے سُن لیا۔ فوراً بولیں:
''بی بی۔ آپ کیلئے کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن ہمارے لئے ہے۔''
صبح جب بارات جانے کا وقت ہوا اور رانی سجنے لگیں تو منیر پھوا اور اماں نے سختی سے روک دیا:
دوسرے دن واپس آئے تو معلوم ہوا کہ منیر پھوا رانی کو لے کر لکھنؤ جا چکی تھیں۔ اماں نے دونوں بیٹیوں کو اکیاون سیر کی کھچڑی[1] اور ایک سو ایک روپیہ مٹھائی کا دے کر رخصت کیا۔
بارہ فروری کو وقت کی جیب سے چند گھنٹے کاٹ کر ہم جمال پور ہاؤس کے لئے تانگے پر سوار ہوئے۔ ڈالی گنج کے پل سے اتر رہے تھے کہ بوندیں پڑنے لگیں۔ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے پتھر گرنے لگے۔ کسی طرح اندر پہنچے تو معلوم ہوا کہ رانی ابھی تک بیمار ہیں۔ سونے کے مجسمے کی طرح مسہری پر پڑی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھیں مسکراہٹ ہونٹوں پر لگائی اور مجھے کسی قدر کانپتے ہوئے دیکھ کر حکم احکام دینے لگیں میرا کوٹ اتارنے میں مدد کی۔ آناً فاناً آتشدان روشن ہو گیا اس کے سامنے فراگ چیئر پر مجھے بٹھا کر ایک شال ڈال دی۔ دیر کے بعد سردی سے نجات ملی۔ اُبلے ہوئے انڈوں کی زردی کھانے پر اصرار کیا۔

[1] کھچڑی کی رسم اودھ میں تھی۔ بیٹی جب مائکے آتی تو اسے ضرور دی جاتی۔

میری شیریں ناگواری کے باوجود کافی خود بنائی اور چلغوزے کی پلیٹ میز پر رکھ دی۔
''پہلے بھیا ہم کو یہ بتایئے کہ ہمارے پاس کتنی دیر''۔
''کیوں؟''
سردی چمک گئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آپ کو کشمیری چائے پلائی جائے۔ زعفران ڈال کر بنائی ہوئی اگر پانی ابھی رک جائے تو بھی کپڑے سوکھنے میں وقت لگے گا۔ یعنی دو گھنٹے بہر حال ہم آپ پر مسلط رہیں گے۔ راجہ بیٹا کب تک آئے گا؟
''مت کیا کیجئے ایسی باتیں۔ راجہ کو لینے گاڑی جا چکی ہے۔ آتا ہی ہوگا۔ آپ کی بیگم صاحبہ ساتھ ہی آئی ہوں گی''۔
''نہیں ہم تو آپ کی علالت کی وجہ سے کسی طرح نکل آئے ہیں وہ شام تک لکھنؤ آئیں گی''۔
''کتنی دور ہے یہاں سے کرسی؟'' اور اپنی کرسی میری کرسی کے برابر کر لی۔
''سولہ میل''۔
جھم جھم جھم پانی برس رہا تھا۔ آتش دان میں سرخ انگارے دہک رہے تھے۔ کشمیری چائے کی

خوشبو سے پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ رلجہ بیٹا ابھی نہیں آیا تھا۔ رانی صاحبہ چلغوزے چھیل چھیل کر دے رہی تھیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے مسرکہ کا کیمپ کھلا پڑا تھا۔

''آپ کو بخار اتنا تیز ہے کہ جب آپ چلغوزے دیتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بھن گئے آپ لیٹ کیوں نہیں جاتیں؟''

''اتنے دنوں سے لیٹی ہی تو ہوں۔ ماماں جمال پور گئی ہیں پاپا کو لینے۔ ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ہوتیں تو آپ کے پاس کرسی پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ فوراً لٹا دیتیں۔'' رلجہ بیٹا آتے ہی لپٹ گیا۔ اپنے ولار کرانے کے بعد کھانا کھلانے پر اصرار کرنے لگا۔ ہماری پلیٹ سے خاطر کرتے ہوئے رانی نے پوچھا:

''آپ کا پروگرام کیا ہے؟''

''اگر موسم نے اجازت دی تو آپ کے پاس سے ہم کارلٹن ہوٹل جائیں گے۔ منیر پھوا مہارلجہ پیتم گڈھ کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں۔ وہاں سے ڈالی گنج۔ بیگم صاحب سے ملاقات اور اپنا سامان لے کر اسٹیشن کہ ہماری گاڑی آٹھ بج کر پچاس منٹ پر ہے۔''

''اور اگر موسم ایسا ہی رہا تو؟''

''تو ہم یہیں سے ڈالی گنج فون کریں گے ملازم سامان لے کر اسٹیشن پہنچ جائے گا۔ اور ہم یہاں سے اسٹیشن۔''

''بیٹے اپنے ماموں صاحب سے پوچھیے کہ اگر ہماری طبیعت خراب ہو جائے اور ہم آپ کے ماموں صاحب کو فون کریں تو وہ آجائیں گے۔''

''ہمارا رلجہ بیٹا اپنی مماں سے کہیے کہ خدا نہ کرے وہ بیمار ہوں۔ وہ جب بھی فون کریں گی ہم پہلی فرصت میں پہلی ٹرین سے لکھنؤ آجائیں گے۔''

شام کے پانچ بجے پانی تھم گیا۔ جمال پور ہاؤس کی گاڑی سے ہم کارلٹن ہوٹل پہنچ گئے آتشدان روشن تھا مہارلجہ کی کرسی کے قریب منیر پھوا جگمگا رہی تھیں اور مہارلجہ کو گزک پیش کر رہی تھیں مہاراج اپنے گلاس سے وائن سپ کر رہے تھے۔ واجبات کے بعد مہاراج لندن اور پیرس کے قصے سنانے لگے۔ ساڑھے چھے بجے ہم کمرے سے برآمدے میں آئے تو دیکھا کہ پانی پھر برسنے لگا ہے۔ ہم نے ڈالی گنج فون کیا تو معلوم ہوا کہ ہماری بیگم صاحبہ یعنی رلجہ نواب چودھری محمد محمود تعلقدار دین پناہ کی اولاد اکبر کرسی ہی میں ہیں اور پانی کے تھمنے کا انتظار فرما رہی ہیں لیکن ہمارا سامان آگیا ہے اور اسٹیشن پہنچ بھی جائے گا۔ ہمارے چہرے کو پڑھ کر منیر پھوا نے بہت جتا کر فرمایا:

''تم کو کیا پریشانی ہے ایک گاڑی جائے گی تمھارا سامان لے کر اسٹیشن پہنچ جائے گی دوسری گاڑی پر تم سوار ہو جاؤ گے۔ تمھارا ڈنر پیکٹ، ابھی تیار ہوتا ہے۔ آرام سے بیٹھو اور نور جہاں کے گانے سنو۔ اور

مہاراج کو لطیفے سناؤ۔"

ہم ٹھیک آٹھ بجے پلیٹ فارم نمبر تین پر پہنچ گئے۔ بنچ پر بیٹھنے کے لئے بڑھے تھے کہ کسی طرف سے راجہ بیٹا آیا اور لپٹ گیا۔ مڑ کر دیکھا تو رانی مسکرا رہی تھیں۔

"اتنے خراب موسم میں آپ کیوں نکلی پڑیں۔ آپ کی طبیعت بھی اچھی نہیں ہے۔"

"آپ کے بھانجے کا شدید اصرار تھا۔ مجبوراً آنا پڑا۔ آپ رات کا کھانا بھی دیر میں کھاتے ہیں۔ تو ہم ڈنر پیکٹ بھی۔۔۔"

"کسی ملازم کے ہاتھ بھی بھیج سکتی تھیں۔ اتنے تیز بخار میں آپ باہر نکل پڑیں۔ آپ کیا جانیں کہ ہم پر کیا گزری؟......... بیٹے آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی مماں کو کتنا تیز بخار ہے؟" ہم نے ہاتھ تھام لیا۔ پوری مدت میں پہلی بار وہ لرز گئیں۔ دیر تک ہم تینوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر گاڑی لگ گئی۔ پرانے سکنڈ کلاس میں ملازموں نے ہمارا بستر لگا دیا۔

"گاڑی علی گڑھ ٹھیک چار پچاس پر پہنچتی ہے ہم اسٹیشن ہی سے آپ کی خیریت معلوم کرنیکے لئے فون کریں گے۔" رانی نے مسکراتی آنکھوں سے ہم کو دیکھا:

"ایک بات کہیں؟"

"آپ کو اجازت کی ضرورت ہے؟"

"آپ فون کیوں نہیں لگوا لیتے۔ گھنٹوں بیٹھے سوچا کرتے ہیں۔ کہاں فون کریں۔ پنڈت جی کے یہاں؟ فیکلٹی؟ کہ اسٹاف کلب؟"

"لگوا لیں گے بہت جلد۔"

گاڑی اپنے وقت سے پہنچی ٹھیک چار پچپن پر ہم نے علیگڑھ کے اسٹیشن ہی سے فون کیا: "ہمارا بھیا خیریت سے پہنچ گیا؟"

"آپ جگ رہی تھیں؟......... بیٹا کہاں ہے؟"

"بیٹا سو رہا ہے۔ ہماری آنکھ اتفاق سے کھل گئی تھی۔ سوچا کہ آپکا فون رسیو کر لیں۔ بھیا.... چوبیس گھنٹوں میں نہ سہی۔ بہتر گھنٹوں ہی میں ایک بار فون کر لیا کریں بہت سکون ملتا ہے۔ بھیا۔ ہولی کی چھٹیوں میں بیگم صاحب سے ملنے لکھنؤ آئیں گے نا۔"

"کوشش کریں گے۔"

"نہیں کوشش نہیں کریں گے۔ ضرور آئیں گے ضرور ضرور آئیں گے۔"

ہولی کی چھٹیوں سے پہلے ہی ملیریا میں مبتلا ہو گئے۔ پوری چھٹیاں برباد ہو گیں۔ مارچ کا آخر تھا امتحانات ہو رہے تھے کہ اودے پور (راجستھان) میں انجمن ترقی اردو کی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ پروفیسر رشید

احمد صدیقی کی صدارت تھی۔ ہم کو ہمرکابی کا حکم دیا گیا۔ رشید صاحب زمینداروں کی طرح سفر کرتے تھے۔ ایک دن پہلے پہنچ گئے۔ تین دن کی کانفرنس تھی۔ اختتام کے دوسرے دن سکنڈ کلاس (پرانے جب فرسٹ سکنڈ۔ انٹر۔ اور تھرڈ کلاس ہوا کرتا تھا) میں بستر کھلا۔ یعنی چھٹے دن علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ رات میں گھر پہنچے نوکر نے اطلاع دی کہ رانی صاحب کے برابر فون آئے ہیں اور وہ لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل ہیں۔ دوسرے دن فیکلٹی آف آرٹس سے فون کیا معلوم ہوا کہ چار دن آئی سی یو میں رہ کر اب پرائیویٹ وارڈ میں ہیں۔ ڈپارٹمنٹ پہنچے تو لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کا دعوت نامہ رکھا تھا۔ جمعے کے دن ریکارڈنگ تھی۔ ہم پروفیسر کی خدمت میں حاضر ہوئے:

''سر اگر آپ اجازت دیں تو ہم سنیچر کے بجائے اتوار کو علیگڑھ آجائیں۔''

''بیگم صاحبہ لکھنؤ میں ہیں؟'' رشید صاحب نے مسکرا کر پوچھا

''اتوار کو آنے کی کیا ضرورت ہے۔ دوشنبے کو آجایئے۔ کسی وقت۔''

ہم ٹھیک آٹھ بجے شب میں لکھنؤ پہنچے بجائے ڈالی گنج جانے کے جہاں پور ہاؤس پر اتر پڑے۔ ڈرائنگ روم روشن تھا۔ ہم دروازے پر ٹھٹک گئے۔ ٹھاکر صاحب فون پر کسی سے کہہ رہے تھے: ''شانتی کو بلڈ کینسر ہے۔ تیسرا اسٹیج ہے۔ اس کی ماں اجمیر (شریف) گئی ہیں منت ماننے۔ دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔ نہیں بیٹی کو ہرگز علم نہیں ہے کہ اس کو کیا مرض ہے۔ ورنہ''

''بلڈ کینسر.........؟'' کانوں پر جیسے کسی نے ہتھوڑا مار دیا۔ چکر سا آگیا۔ اپنے آپ کو سنبھالا۔

وارڈ کے سامنے آدمیوں کا ہجوم تھا لیکن خاموشی ہونٹوں پر انگلی رکھے کھڑی تھی۔ سفید پلنگ اور سفید بستر پر وہ ایک پینٹنگ کی طرح پڑی تھیں۔ مشک کے بال، کاجل کے ابرو، سفید سیاہ الماس کی آنکھیں۔ کندن کا چہرہ مرجان کے ہونٹ۔ مسکرائیں تو موتی چمک گئے بولیں تو جواہر بکھر گئے دونوں ہات جوڑ کر سلام کا جواب دیا تو محسوس ہوا کہ ایک دنیا سمیٹ کر دے ڈالی:

''کتنا انتظار کرایا ہے آپ نے.......رام پیاری، بھیا کی کرسی ہمارے قریب کر دو........اور قریب۔''

طبیعت کیسی ہے؟..........ہم علی گڑھ میں نہیں تھے۔ ورنہ اتنی تاخیر۔''

''ٹھیک ہے۔ سیدھے اسٹیشن سے آرہے ہیں؟''

''نہیں تمھاری کوٹھی سے ہوتے ہوئے.....یہ کیا کر لیا۔''

''سیتا دیکھو تھرمس میں چائے ہے.....نہیں ہے تو کوٹھی فون کر دو۔ دلارے سے کہو فوراً موٹر سائیکل پر لے کر آئے.....باہر کسی آدمی کو بلاؤ۔''

''راجہ بیٹا کہاں ہے؟''

''ابھی ابھی گھر گیا ہے۔ سنے گا تو بیقرار ہو جائے گا۔ کتنے بجے چلے تھے......''

''آج صبح 9 ر بجے گاڑی پر سوار ہو گئے تھے۔''
''تھک کر چور چور ہو گئے ہوں گے۔''
کسی طرح یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ بلڈ کینسر کی مریضہ ہیں۔ وہی آب و تاب، آواز میں وہی کھنک انداز میں وہی للک .... یا اللہ یہ کیا طلسم ہے۔ بہت آہستہ سے ٹھاکر صاحب اندر آ گئے:
''بیٹے ..... آپ نے سوپ نہیں پیا ...... یخنی بھی پوری نہیں پی کتنی بار کہا ہے ہم نے آپ سے۔''
''پاپا بالکل بھی جی نہیں چاہ رہا۔''
''جی چاہنے کا مسئلہ نہیں ہے بیٹے .... پلیز۔''
''انکل آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم پلاتے ہیں۔''
ایک عورت نے گردن کے نیچے تولیہ لگا دیا۔ دوسری عورت نے پیالہ مجھے پکڑا دیا۔
''منھ کھولیے'' ہم نے چمچہ منھ میں ڈال دیا۔
''بیٹے آپ کھڑے کب تک رہیں گے .... بیٹھ جائیے۔''
ہم آہستہ آہستہ ان کو پلاتے رہے۔ پیالہ ختم ہو گیا۔
''دوسرا پیالہ منگوا لیجیے۔'' مسکرائی نظروں اور شیریں ناگواری سے کہا:
''ذرا پاپا کو بلاؤ۔'' ایک عورت کو حکم دیا
''آپ کتنی دیر کیلئے ہمارے پاس آئے ہیں؟''
جب تک ہماری رانی ...... شانتی سنگھ دیو ہم کو حکم نہیں دیں گی ہم نہیں جائیں گے۔''
ٹھاکر صاحب اندر آ گئے۔ ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا:
''بھیا کو ہم نے کسی طرح روک لیا ہے۔ لیکن یہ صوفہ کم بیڈ ہی ان کے لئے تکلیف دہ ہو گا ربر کا تکیہ تو اور بھی۔ ہم ابھی انتظام کرتے ہیں۔''
''کھانا ہم چوک سے منگوا رہے لیکن۔ چائے۔ گولڈن لیچو۔ زعفران کے ساتھ۔''
''ہم ابھی بھجواتے ہیں۔''
ہم اپنے آپ کو بھرے ہوئے پیالے کی طرح سنبھالے ہوئے تھے لیکن سنبھل نہیں پا رہے تھے۔
''ہمارے بھیا کا پروگرام کیا ہے؟''
کل ریڈیو اسٹیشن پہنچنا ہے گیارہ بجے۔ پرسوں شاید کرسی جانا پڑے۔ کوشش کریں گے کہ رات ہی میں آ جائیں اتوار کا پورا دن ہم رجبہ بیٹے کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں۔ پیر کی صبح روانگی۔''
''بیگم صاحبہ آپ کو آنے دیں گی؟ رات میں۔ بہت انکار نہ کیجئے گا۔ آپ جتنا وقت ہم کو دیتے ہیں ہماری بساط سے زیادہ ہے۔ کل ہم گھر پہنچ جائیں گے۔ شاہدہ بیگم آئیں تو لے آئیے گا۔ ہم بھی دیکھ لیں گے۔''

''ہم کو آپ سچ سچ یہ بتایئے کہ تکلیف کیا ہے؟''

''بخار اترتا نہیں۔ کبھی کبھی کم ہو جاتا ہے۔ کمزوری بہت ہے۔ ذرا سوچتے ہیں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے بیٹے کے مستقبل کے علاوہ ہمارے پاس سوچنے کو بچا بھی کیا؟ ہمارے پاپا جی کو اُن کے دادا جی نے پال لیا تھا ہمارے بیٹے کو اُس کے نانا جی پال لیں گے۔''

''کیا فضول باتیں کرنے لگیں آپ۔ بیٹے کو آپ ہی پالیں گی جیسے پال رہی ہیں۔''

''بھیا کے لئے۔ کھانا لگاؤ۔''

''چوک میں اور بھی بہت سی چیزیں ملتی ہیں۔ سب منگوا لیتیں۔ اتنے تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کا پرہیز کیا ہے؟''

''کوئی خاص نہیں۔ ثقیل اور مرغن کھانے بند ہیں۔ جو افسانہ ریکارڈ کرا رہے ہیں ہم کو بھی سنائیں گے؟ بھیا ایک بات کہیں آج آپ بہت تھکے ہوئے ہیں آرام کیجئے۔ کہانی کل سنا دیجئے گا۔''

''آپ کو کہانی سنانے میں جو راحت ہے جو لذت ہے جو کیفیت ہے کاش اس کا علم آپ کو ہوتا۔ ہم کہانی سنا کر صرف آپکو نہیں سلاتے ہیں خود بھی سو جاتے ہیں۔ پوری دنیا میں ہم آپ ہی کو تو کہانی سناتے ہیں۔ ہم آپ ہی کیلئے کہانیاں پڑھتے ہیں کہانیاں انتخاب کرتے ہیں۔ کہانیاں تخلیق کرتے ہیں۔ ہم آپ ہی کے لئے۔ آپ ہی..... آپ۔''

''بھیا، یہ کیا ہو گیا آپ کو........ آپ کے سر کی قسم۔ اگر ایک آنسو بھی ٹپک پڑا تو ہم ڈوب جائیں گے۔ ہم بچیں گے نہیں ڈوب مریں گے۔''

آنکھوں کی طرح رات بھیگ چکی تھی۔ ملازموں نے ہمارا بیڈ ان کے پلنگ کے قریب کر دیا تھا۔ پلنگ کے دوسری طرف ان کی انا سو رہی تھی۔ ڈبل ڈور بند تھے ان کے پیچھے باہر دو مسلح بوڑھے آدمی لیٹے ہوئے تھے۔ وہ ہماری طرف کروٹ لیے بائیں ہاتھ پر چہرہ رکھے سو رہی تھیں۔ لانبی سیاہ خمیدہ پلکیں ہم آغوش تھیں کالے چمکدار بالوں کی ایک لٹ سونے کے رخسار پر پہرہ دے رہی تھی ہم سگریٹ رول کر رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ رانی سو رہی ہیں یا سونے کی اداکاری کر رہی ہیں۔ کمرے میں نیلا بلب جل رہا تھا۔ ہم نے بہت آہستہ سے لائیٹر جلایا۔ ان کو عبداللہ تمباکو کی خوشبو پسند تھی ایک کش لے کر ناک کے قریب دھواں چھوڑ دیا گھڑی دیکھی۔ ''اللہ۔ دو بج گیا'' منھ سے نکل گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو 9 بج رہا تھا۔ نیلے رنگ کی ریشمی ساری میں سونے کی مورت جگمگا رہی تھی۔

''آپ نے ہم کو جگایا کیوں نہیں؟''

''دو بجے کے بعد تو آپ سوئے ہیں۔ پاپا ٹھیک آٹھ بجے آپ کا ناشتہ اور چائے لے کر آ گئے تھے۔ آپ کو سوتا دیکھ کر مسکرائے اور چلے گئے۔ آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں جب پڑھتے تھے اور جو ناشتہ کرتے

تھے۔ ہم نے وہی منگوایا ہے۔ تافتان اور بالائی۔ مماں (والدہ) اور اماں (بھانو کی والدہ) اجمیر (شریف) گئی تھیں منت ماننے رات میں واپس آ گئی ہیں۔"

"بھیا کیلئے دوسری پیالی بناؤ۔"

"بھیا دیکھیے ہم نے آپکے لیے سگریٹ رول کی ہے۔"

"بھیا کیلئے شیو کا پانی رکھ۔"

"چلتے چلتے ایک بات اور سن لیجئے جو گاڑی آپ کو ریڈیو اسٹیشن لے جائے گی نہ دادوں کی ہے نہ جمال پور کی ہے ہماری ہے۔ آپ اپنی سواری میں رکھیے۔ کرسی جانا ہو تو اسی پر جایئے۔ ہم بارہ بجے تک کوٹھی پہنچ جائیں گے۔ ہم نے کوانتی (لکھنؤ کا مشہور ریستوراں) کو آرڈر دے دیا ہے آپ کے لنچ کا۔ کولڈ فش اور انناس کا زردہ آپ کو پسند ہے نا۔ آپکا رلجہ بیٹا ایک بجے تک ضرور آ جائے گا۔ کل آپ کرسی ہاؤس جائیں گے۔ پرسوں کا دن رلجہ بیٹے کے لیے ریزرو ہے ترسوں آپ کی روانگی ہے۔ یعنی صرف آج کا دن ہے جو ہمارا ہو سکتا ہے ہم کو دے ڈالیے۔"

"دے ڈالا۔"

"کتنے دن ہو گئے ہم کو باہر گئے ہوئے۔ آج لنچ اور ڈنر کچھ بھی گھر میں نہیں ہوگا۔"

"تکان سے طبیعت کے مزید خراب ہو جانے کا اندیشہ تو نہیں۔"

"طبیعت تو خراب ہے ہی۔ تھوڑی اور خراب ہو جائے گی۔ ہو جائے۔ ہم اس سے زیادہ جبر نہیں کر سکتے اپنے اوپر منھ کا مزہ خراب ہو گیا یخنی اور سوپ پیتے پیتے۔"

ریڈیو اسٹیشن سے کوٹھی آئے تو دالان میں ٹھاکر صاحب تنہا بیٹھے تھے۔ گاڑی سے اترتے ہی ان کے ملازم نے کہا۔ سرکار آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ہم کو اپنی طرف آتا دیکھ کر کھڑے ہوئے ہمارا ہاتھ تھام کر دالان کے آخری کنارے تک آ گئے۔

"شانتی کے اگر کوئی سگا بھائی ہوتا تو وہ اتنی ہی محبت کرتی جتنی آپ سے کرتی ہے۔ ہم صبح سے اصرار کر رہے تھے اس نے سوپ نہیں پیا لیکن آپ کے ہاتھ سے کھانا بھی کھا لیا۔ آپ کو ہم نے یہ تو بتا دیا تھا کہ اسے بلڈ کینسر ہے لیکن یہ نہیں بتلایا تھا کہ تیسرا اسٹیج ہے...... وہ کسی وقت۔" آواز اس طرح ختم ہو گئی جیسے زخم سے لہو تھمتا ہے۔

"ہماری عمر پچپن برس ہو چکی ہے۔ بیمار رہنے لگے ہیں۔ شانتی کی ماں کو بلڈ پریشر کا مرض ہے۔ شانتی اپنی مرضی سے وارڈ چھوڑ کر آئی ہے۔ ڈاکٹر اجازت نہیں دے رہے تھے۔ وہ آپ کے ساتھ باہر جانے پر مصر ہے۔ کھانے پینے میں بہت احتیاط کیجئے۔ اس کو تھکنا نہیں چاہیے۔ ہم نے اسے پان کی طرح رکھا ہے، پھول کی طرح پالا ہے۔ ہم سے سختی نہیں ہو پاتی۔ کیا کریں۔ کیا کریں آخر۔"

''رانی کو اپنی بیماری کا علم ہے؟''

''نہیں.......... ہرگز نہیں...... وہ صرف یہ جانتی ہے کہ اس کا بخار نہیں ٹوٹ رہا ہے۔ ٹوٹ جائے گا ایک دن۔ وہ اتنی حساس ہے اگر اس کو علم ہو جائے تو۔۔۔ لیجئے آپ کے بھانجے آ گئے''۔ رلجہ بیٹا دوڑ کر ہم سے لپٹ گیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے اندر چلے گئے۔ رلجہ بیٹا ہم کو تقریباً گھسیٹتا ہوا رانی کے کمرے میں لے گیا۔ رانی لپک کر ہمارے پاس آئیں۔

''پاپا۔ آپ سے کیا کہہ رہے تھے۔'' بہت بیقرار ہو کر پوچھا۔

''آپ کی شکایت کر رہے تھے۔ آپ دوا نہیں پیتی ہیں۔ کھانا نہیں کھاتی ہیں۔''

''ایک مرغ کی یخنی دو پیالے سوپ دو گلاس جوس روز پیتے ہیں۔ تھوڑا بہت کھاتے بھی ہیں لیکن پاپا کی نظر میں کچھ آتا ہی نہیں۔''

پھر رانی کی والدہ اور بھانو کی اماں آ گئیں۔ جتنی دیر میں رلجہ بیٹا تیار ہوا ہم خواتین سے رسمی گفتگو کرتے رہے۔ اُن کے پریشان بال ویران آنکھیں اور بے طرح لباس دیکھتے رہے اور سوچتے رہے رانی کے آتے ہی اٹھ پڑے۔ ہمارے ساتھ ٹھاکر صاحب بھی اٹھ پڑے۔ رانی جب ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھیں تو روک دی گئیں: ''بیٹے..... آپ پیچھے بیٹھئے۔ آج ڈرائیور ڈرائیو کرے گا''۔ رانی نے ناگواری سے باپ کو دیکھا اور ہمارے لیے پچھلی بائیں سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔ رلجہ بیٹے کو آگے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کوانٹی کے سامنے اتریں۔ پہلی سیڑھی پر قدم رکھا تو لڑکھڑا گئیں۔ ہم نے سنبھال لیا۔ کوانٹی کا دروازہ کھولا تو اس طرف شاہدہ (ہماری بیگم) اپنے بھائی چودھری حبیب کے ساتھ کھڑی تھیں۔ بھاری بھرکم۔ زیورات سے آراستہ۔ مرصّع، ''بھائی صاحب'' چودھری حبیب نے حیرت سے کہا۔ شاہدہ نے تحیر سے ہم کو دیکھا پھر رانی کو گھورا: ''آپ لکھنؤ کب آئے۔ ہم نے کل علی گڑھ فون کیا تھا۔ تو پنڈت جی (دنیش لال شرما) نے بتایا کہ آپ لکھنؤ گئے ہیں۔ ہم نے گلمرگ (وہ ہوٹل جہاں ہم ٹھہرا کرتے تھے) آدمی بھیجا لیکن۔''

''شاہدہ ان سے ملو۔ یہ رانی ہیں۔ جن کا ذکر میں نے تم سے کیا تھا۔ یہ ہمارا رلجہ بیٹا ہے''۔ شاہدہ کی نظروں پر تلوار کی دھار پیدا ہو گئی۔ ''رانی شاہدہ ہیں اور یہ چودھری حبیب شاہدہ کے بھائی۔'' چودھری حبیب کی نگاہ کی انی زہر میں بجھ چکی تھی۔ ہم نے شاہدہ سے کہا: ''آؤ... بیٹھو.. بات کرتے ہیں''۔ ہم نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ رانی کا چہرہ سفید ہو گیا تھا۔ رلجہ بیٹا مبہوت کھڑا تھا اور ہم لوگ کافی پی چکے ہیں.......

''آپ'' اور حبیب کے ساتھ دروازے کی طرف مڑنے لگیں۔

''کافی پی چکی ہو... تو ہمارے ساتھ آئس کریم کھاؤ۔'' ہم نے حکم دیا۔ آواز میں تلخی تھی۔ لہجے میں تحکم تھا۔ وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی ایک کرسی پر ٹک گئیں۔

حبیب ناگواری سے بیٹھ گئے۔ دونوں، کنکھیوں سے دبلی پتلی رانی کا حسن و جمال دیکھ رہے تھے۔

ہم کل علی گڑھ سے لکھنؤ کے لئے نکلے تھے لیکن دوستوں کے ساتھ کانپور میں اتر لیے۔ایک جلسے میں شریک ہوئے صبح لکھنؤ آئے، ریڈیو اسٹیشن پر کہانی ریکارڈ کرائی۔باہر نکلے تانگے کا انتظار کر رہے تھے کہ رانی نظر آ گئیں۔لامینٹر سے راجہ بیٹے کو لے کر گھر جا رہی تھیں۔ہم نے روک لیا۔سامان کوٹھی پر چھوڑا اور یہاں کھانا کھانے آ گئے۔

تم کرسی سے کب آئیں؟"

"بھائی جان (والد) بیمار ہیں۔ڈاکٹر فریدی کا علاج ہے۔ہم کل حال لے کر آئے تھے رات میں رک گئے۔آج فریدی صاحب سے دوا لے کر نکلے تو کافی پینے چلے آئے۔"

"ماموں جان کیا بیمار ہیں؟"

"دل کی شکایت ہے۔وحشت ہے گھبراہٹ ہے۔کھانا چھوٹ گیا ہے۔اب پہلے سے بہتر ہیں"۔

"ہم تمھارے ساتھ ابھی کرسی چلتے لیکن رات میں ایک شام افسانہ ہے۔اس میں ہم شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ہم وعدہ کر چکے ہیں حبیب تم اچھے ہو۔"

"بیماریاں آزاریاں لگی رہتی ہیں اس عمر میں۔آپ اپنے جلسے جلوس اٹینڈ کیجئے۔آپ کے اصرار پر ہم رک گئے۔اب اٹھیں گے کہ جلد سے جلد کرسی پہنچنا ہے۔بھائی جان انتظار کر رہے ہوں گے۔رانی صاحبہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔"

"شاہدہ بیگم ہم کو بھی آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔"

"ہم نے سنا تھا کہ آپ بیماری کی حالت میں برستے پانی میں قاضی صاحب کو رخصت کرنے چارباغ اسٹیشن آئیں۔بہت حیرت ہوئی کہ آپ قاضی صاحب سے اتنی محبت کرتی ہیں۔کمال ہے۔" اور اس طرح تڑپ کر اٹھیں کہ روکنے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ہم اور رانی دونوں دیکھتے رہ گئے۔

فرمائشی خریدا ر کھانا پوری بدمزگی کے ساتھ کھایا گیا۔رانی کا تو منھ نہیں چل رہا تھا ہمارے سخت اصرار پر کولڈفش کا ایک ٹکڑہ اور زردے کے دو چمچے کسی طرح نگل لیے۔کافی پیتے ہوئے رانی نے افسردگی کے ساتھ کہا:"بھیا آپ کرسی چلے جائیے۔بیگم کا موڈ بہت خراب ہو گیا ہے......ڈر لگ رہا ہے کہ بات کا بتنگڑ نہ بن جائے اس لئے۔"

"احمق رہتے تو کرسی میں ہیں لیکن باتیں آپ احمقانہ کر رہی ہیں۔ہم کہہ چکے کہ ہم کو شام افسانہ میں شرکت کرنا ہے تو کرنا ہے یعنی آپ کو افسانہ سنانا ہے۔بالکل نیا۔اور اس وقت تک سنانا ہے جب تک آپ سو نہیں جاتیں۔"

"بھیا..پلیز.....آپ کو فوراً غصہ آ جاتا ہے۔دن ہی کتنے ہوئے ہیں ابھی شادی کو۔ابھی سے اختلاف..بھیا.........ہماری خاطر سے۔"

''آپ بکواس بند کریں.... ورنہ ہم ابھی چلے جائیں گے اور علی گڑھ چلے جائیں گے۔''

''ماموں صاحب آپ کافی پیجئے.............. ہم نے ڈرائیور کو حکم دیا شاہ نجف روڈ..........

گاڑی میں خاموشی طاری رہی۔ پھولوں کی دکان پر گاڑی روکی۔ بہت سے سرخ پھول خریدے۔ پھول والی نے سیاہ گلاب کی ایک بہت عمدہ کلی پیش کی ہم نے رلجہ بیٹے کو دے دی اور ابرو سے اشارہ کیا۔ وہ مسکراتا ہوا گیا اور رانی کے بائیں طرف بالوں میں لگانے لگا لیکن لگا نہیں پا رہا تھا۔ ہم کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر کلی اس کے ہاتھ سے لے لی اور ان کے بالوں میں پرو دی۔ کان میں جیسے بھانو پرتاپ سنگھ نے کہا: ''یار.....تو....تو .....بڑا کلاکار نکلا۔'' رانی کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ ہم اداس ہو گئے تھے۔ رلجہ بیٹا چہچہا رہا تھا۔

رلجہ بیٹے کے کمرے میں ہمارا بستر لگا تھا رلجہ بیٹا ہمارے پاس بیٹھا اپنے امتحان کی کاپیاں دکھلا رہا تھا کہ رانی آ گئیں۔ سفید ساری پہنے ہوئے۔ سیاہ گلاب کی کلی بائیں طرف سجائے ہوئے۔ تبسم کی سرخی لگائے ہوئے: ''رلجہ بیٹے اب ماموں صاحب کو آرام کرنے دیجئے.....دوپہر میں آرام کرنے کے عادی ہیں آپ کے ماموں صاحب''۔

''ہاں بیٹے اپنا بیگ بند کیجئے۔ لٹاں کے کمرے میں چلیے۔ کہانی سنائیں، دس بج چکا ہے۔''

رانی کے چھپر کھٹ کے برابر لانبی سی آرام کرسی پڑی تھی، گدے لگے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر تمباکو کا پاؤچ اور لائیٹر رکھا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی رانی نے اپنے بیٹے سے کہا:

''بیٹے کچن میں جائیے جو بھی وہاں ہو اس سے کہیے کافی بنا کر لائے ماموں صاحب کے لئے۔''

''اور آپ کے لئے۔'' شرارت سے مسکرایا

''ہاں ہمارے لیے بھی.......لیکن آپ کے لیئے نہیں''۔

''بھیا ایک کہانی آپ نے سنائی تھی۔ خورشید نام تھا.... عورت کا۔ بیوہ تھی۔ اپنے شوہر کے دوست سے کہتی ہے: 'کیا چند ملاقاتوں کے سہارے زندگی نہیں گزاری جاسکتی'؟''

''زندگی تو ایک ملاقات کے سہارے بھی گزاری جاسکتی ہے' دوست نے کہا تھا''۔ ہم نے ٹکڑا لگایا۔

''وہ سنایئے..''

رات کی طرح آواز بھی بھیگنے لگی تھی۔ لیکن رانی کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہم سگریٹ کا کش لے کر دھواں ناک کے پاس چھوڑتے وہ تبسمِ خفی کے ساتھ آنکھیں کھول دیتیں۔ ہم نے گھڑی دیکھی رانی اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''بھیا۔ آج نیند نہیں آ رہی ہے۔ بارہ بج چکا ہے۔ کیسی کیسی کہانیاں سنا چکے ہیں۔ اب ختم کیجئے۔ چلیے آپ کو آپ کے بستر تک پہنچا دیں۔''

ہم نے ایک لمبا کش لیا اور سارا دھواں ناک کے پاس چھوڑ دیا۔

''اب اتنی بھی آپ کے تمبا کو کی خوشبو اچھی نہیں لگتی''۔

''رانی صاحب...... آپ ہماری توہین کر رہی ہیں۔ ہمارا آپ سے معاہدہ ہے کہ ہم آپ کو اسوقت تک کہانی سناتے رہیں گے جب تک آپ سو نہیں جاتیں۔ چپ چاپ لیٹ جایئے۔ نئی کہانی سنا رہے ہیں۔''

''لیجئے..... ہم لیٹ گئے۔ اگر ہمارا بھیا تھک گیا ہو...... تو ہم ایک پیالی کافی بنالائیں چپکے سے۔''

''نہیں''۔

آنکھ کھلی تو خالی کمرے کا دروازہ بند تھا۔ گھڑی میں نو بج رہا تھا۔ ہم آرام کرسی پر نیم دراز تھے سرہانے تکیہ لگا تھا۔ پیروں پر چادر پڑی تھی۔ اپنے اوپر حیرت کر رہے تھے کہ دروازہ اس طرح کھلا جیسے آنکھ کھلتی ہے۔ وہ اس طرح کمرے میں داخل ہوئیں جیسے آواز داخل ہوتی ہے۔ ہم کو مسکراتا دیکھ کر لائیٹ آن کر دی۔ گھنٹی بجائیں۔ عورت کو حکم دیا غرغرے کا پانی لائیے۔

''کب سوئیں آپ؟''

''کیا معلوم ...... بیٹے نے ہم کو بہت آہستہ سے روز کی طرح چھ بجے جگا دیا۔ آپ غافل سو رہے تھے ہم نے آپ کو سونے دیا۔''

گیارہ بجے کے قریب بھانو کی والدہ نے ہم کو آنگن سے رخصت کر دیا۔ رانی اپنی والدہ کے ساتھ گاڑی تک تشریف لائیں: ''بھیا........ اگر آپ ناخوش نہ ہوں تو ایک بات کہیں..... راجہ بیٹے کے ساتھ کوئی اور دن گزار لیجئے گا۔ کرسی میں بہت انکار نہ کیجئے گا....... موقعہ نہ ہو تو ہم کو فون کر دیجئے گا ہم اسٹیشن آ کر آپ کو رخصت کر دیں گے۔ ہم ان کو دیکھتے رہے۔ والدہ کو سلام کیا۔ رانی کی طرف دیکھ کر ہاتھ اٹھایا کہ انھوں نے ہاتھ جوڑ لیے معلوم نہیں کیا کچھ اپنے دونوں ہاتھوں میں سمیٹ کر ہم کو دے ڈالا۔

کرسی کے چاروں پائے برابر نہیں تھے لیکن ہماری طاقتِ لسانی نے سب کچھ ہموار کر دیا۔ بھاری بھرکم شاہدہ بیگم تو چند فقروں ہی میں ہماری بوتل کے اندر آ گئیں۔ چودھری حبیب نے پرندوں کے شکار کے لیے اتوار کی صبح مخصوص کر دی۔ ہم کچھ کہتے کہ رانی نے ہمارے کان میں چپکے سے کہہ دیا۔ 'بھیا بہت انکار نہ کیجئے..... پلیز' ہم اتوار کو رک گئے۔

کرسی میں سب سے زیادہ ہم کو اپنی خوشدامن پسند تھیں۔ رانیوں جیسا حسن و جمال بیگمات جیسا رکھ رکھاؤ........ ماؤں کی شفقت۔ بہنوں کی محبت۔ کیا نہیں تھا ان میں بولیتں تو زعفران کے تختوں پر شفقت ومحبت کے موتی بکھر جاتے۔ دوشنبے کی صبح ہم ان سے رخصت ہونے حاضر ہوئے۔ تو ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ اس طرح کہا کہ ہم سر سے پاؤں تک سماعت بن گئے:

''آج ہمارے کہنے سے رُک جایئے...... تو ہم کو بہت اچھا لگتا۔''

ہمارے منھ سے آواز نہیں نکلی۔ ہم جیسا کافر سکوت پر مجبور تھا۔

''آپ نے ہم کو جواب نہیں دیا۔''

''جی ممانی جان......... ہم آج نہیں جائیں گے..... آپ کے حکم کی تعمیل ہمارا فرض ہے، آپ نے ہم کو سر بلند کر دیا اور پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا''۔

پورا دن چہچہوں اور قہقہوں میں گزر گیا۔ رات میں دیر تک تاش کھیلتے رہے۔

منگل کی صبح آنکھ کھلی تو شاہدہ نہائی دھوئی مکلف بیٹھی تھیں۔ ہماری آنکھوں پر چشمہ چڑھا دیا۔ مسکرا کر اپنا منھ ہمارے اور قریب لا کر آہستہ سے بڑے لاڈ سے کہا:

''ایک بات کہیں.... خفا نہیں ہوں گے''۔

''نہیں ہوں گے''۔

''کل آپا جان (والدہ) کے کہنے پر رک گئے تھے۔ آج ہمارے کہنے سے رک جائیے''۔

''ہمارا خیال تھا کہ کرسی میں احمق پیدا ہونا بند ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ سے مل کر اپنی رائے بدلنا پڑی۔ آپ اپنا مقابلہ ممانی جان سے کر رہی ہیں۔ بیوقوف کہیں کی۔ وہ رانی ہیں آپ ایک مدرس کی بیگم ہیں۔ آپ کا اور ان کا کیا مقابلہ۔ اگر آج ہم آپ کے کہنے سے رک جائیں گے تو کل ان کے حکم پر رک جانا رائیگاں ہو جائے گا''۔

''آپ نے تو کہا تھا کہ خفا نہیں ہوں گے۔ لیکن''۔

''چائے منگوائیے فوراً۔ شیو کا سامان نکال لیے''۔

شاہدہ کی انا چائے کی کشتی لے کر آئی تو شاہدہ نے پوچھا: ''آپا جان اٹھ گئیں؟''

''اٹھ گئیں؟ فجر پڑھکر ذرا سی تلاوت کی اور مدتوں بعد آج باورچی خانے میں داخل ہوئی ہیں، چار پانچ عورتوں کے ساتھ۔ دولھا میاں کا ناشتہ تیار ہو رہا ہے''۔ شاہدہ نے ہم کو گھور کر دیکھا۔ ہم نے نظریں جھکا لیں۔

پورا دسترخوان نعمتوں سے بھرا ہوا تھا۔ جتنی دیر میں ہم نے چائے پی شاہدہ ہم کو رخصت کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ چپکے سے کان میں کہا: ''آپا جان بھی چل رہی ہیں چار باغ تک''۔

''آپا جان..... ایک دن رکنے کا اجر دے رہی ہیں آپ کو''۔

گاڑی لگی تو ہم کو حکم ہوا کہ ہم پیچھے کی سیٹ پر بیٹھیں بیچ میں شاہدہ بٹھائی گئیں۔ آگے ایک بندوق بردار بٹھایا گیا۔ گاڑی لکھنؤ میں داخل ہوئی تو ہم نے ڈرائیور سے کہا کہ 'لال باغ لے چلو'۔ شاہدہ نے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ اور بہت جما کر کہا: ''رخصت کے وقت بیوہ کا منہ دیکھنا نحس ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھ دو سہاگنیں چل رہی ہیں۔ آپ کے آپا جان کے ہمارے علاوہ بھائی جان پر بھی نحوست کا اثر ہو سکتا ہے اس لئے

آپ اسٹیشن چلیئے سید ھے۔''

''کیا فضول اور لغو باتیں کررہی ہو...نحوست......لاحول ولاقوۃ'' ہم نے جھنجھلا کر کہا۔

''بیٹے... مبارک اور منحوس ہوتا ہے.........صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ ہم اور آپ اسے تبدیل نہیں کرسکتے۔ شاہدہ درست کہہ رہی ہے۔ خدا آپ کو اور ہم سب کو ہر قسم کی بلاؤں سے محفوظ رکھے۔ گاڑی اسٹیشن لے چلو''۔

ہم کو اتنا غصہ آیا کہ منہ سے آواز نہیں نکلی.........صرف مومانی جان کی وجہ سے ہم خاموش بیٹھے رہے۔ اور رانی بیمار رانی کی نگاہوں میں اپنے آپ کو سبک ہوتے دیکھتے رہے۔ اسٹیشن پر ہم نے گھڑی دیکھی گیارہ بج چکا تھا۔ قلی نے کہا کہ اب کانپور کے لیے دو بجے گاڑی ملے گی۔ ہم پریشان ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ کان پور سے علی گڑھ کے لیے دو بجے ایک گاڑی جاتی ہے۔ ہم نے مومانی جان سے کہا کہ ہم بس سے کانپور چلے جائیں۔ وہ بگڑ گئیں۔ ''بس سے کیوں جایئے گا ہم آپ کو رخصت کرنے کانپور چلیں گے''۔

تین بجے ہم علی گڑھ کیلئے ٹرین پر بیٹھے۔ راستے بھر رانی سے ملاقات کا پروگرام بناتے رہے۔ کہانیوں کی کتاب پڑھتے رہے۔ کہانیوں کا انتخاب کرتے رہے۔ کہانیوں کی تخلیق کا اہتمام کرتے رہے۔ گاڑی لیٹ ہوتی ہوئی گیارہ بجے رات کو علی گڑھ اسٹیشن پہنچی کھڑے سوچتے رہے کہ رانی کو فون کریں۔ دل نے کہا مت کرو۔ بیمار ہے شاید سوگئی ہو۔ ویسے ہی نیند کم آتی ہے اس کو۔

بہت دیر میں سو کر اٹھے ڈپارٹمنٹ پہنچتے پہنچتے گیارہ بج گیا۔ ہیڈ چپراسی میاں خاں نے بتایا کہ صاحب (پروفیسر رشید احمد صدیقی) نے کئی بار ہم کو پوچھا۔ آج طبیعت کچھ سست تھی اس لئے چلے گئے ہم فوراً در دولت پر حاضر ہوئے۔ استاد محترم گلابوں کے چمن میں فراگ چیئر پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے تھے: فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے ! سلام کے جواب میں سر اٹھا کر دیکھا۔ دیکھتے رہے۔ سخت آواز میں مخاطب ہوئے:

''آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو ڈینڈی کہتا ہوں''۔

''سر''۔

بال پریشان شیو بڑھا ہوا کپڑوں پر کریز نہیں، جوتے پر پالش نہیں۔ میں نے پہلی بار آپکو اس عالم میں دیکھا ہے۔ والدہ کیسی ہیں؟......بیگم کیسی ہیں؟......ادھر بیٹھیے۔'' اپنے قریب کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔

''ٹھیک ہیں سر''۔

''اپنی اولاد کے بعد میں جن نوجوانوں کو عزیز رکھتا ہوں ان میں آپ سرفہرست ہیں۔ یہ کیا ہوا آپ کے ساتھ.........مجھے تفصیل سے بتلایئے.........شائد میں کوئی مدد کرسکوں''۔

ہم نے بھانو کی موت سے اپنی خوشدامن کی ''شفقت'' تک پوری روداد سنادی۔ چپ بیٹھے رہے۔ سکندر (خادم خاص) قاضی صاحب کیلئے بدایوں کے پیڑے لاؤ.........چائے بنواؤ میں بھی پیوں گا بغیر مانگے

ہوئے مشورے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ لیکن میں آپ کو مشورہ دینے کا حق رکھتا ہوں اس لیے غور سے سنئے۔ آپ کی بیتی ایثار کی کہانی ہے۔ "بینک میں کچھ روپیہ ہے؟" میں خاموش رہا۔

ہر مہینے تین سو روپیوں میں سے دس بیس روپے بچانے کی عادت ڈالیے۔ کفایت ایسے ہی موقعوں پر کام آتی ہے......... سکندر بیگ لاؤ........" قریب آئیے۔ سو روپے کا نوٹ ہماری جیب میں رکھا۔ "گھر جائیے........ شیو کیجیے....... غسل فرمائیے۔ کھانا کھائیے۔ سو جائیے......... سکندر... میرے سرہانے انگریزی کی جو کتاب رکھی ہے لے آؤ۔ نیند نہ آئے تو اس کتاب کو پڑھیے۔ نیند آ جائے گی۔ رانی کو فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے شام کو کلب جائیے۔ روز کی طرح بلیرڈ کھیلئے۔ اول وقت میں گھر جائیے کھانا کھا کر سو جائیے صبح چھے بجے اٹھیے۔ آٹھ بچاس کی گاڑی سے کانپور پہونچیے۔ تین بجے کے [! اُس زمانے میں لکچرر کی تنخواہ تین سو روپیہ ماہوار تھی] بعد کئی گاڑیاں لکھنؤ جاتی ہیں۔ سات بجے تک آپ لکھنؤ پہنچ جائیں گے۔ میں آپ کو تین دن کی رخصت دیتا ہوں اتوار آپ کو مل ہی جائے گا۔ کوئی الیہ ہو جائے تو مجھ کو فون کیجیے۔ آپ کا پیپر اکھا ہوا ہے کھائیے۔"

لکھنؤ پہنچ کر ہم نے تھوڑے سے سرخ پھول خریدے۔ جمال پور ہاؤس پر سناٹا طاری تھا۔ تانگہ رکتے ہی تھا کر صاحب آ گئے سلام کے جواب میں فرمایا کہ غفلت، اور غنوگی طاری ہو جاتی ہے۔ ہر آٹھ دس گھنٹے کے بعد۔ آنگن میں قدم رکھا کہ راجہ بیٹا کسی طرف سے نکلا اور لپٹ گیا۔

مہاگنی کے چھپر کھٹ کے سفید بستر پر وہ آنکھیں بند کیے پڑی تھیں۔ ہجر کی راتوں سے زیادہ کالے ڈھیروں بال بکھرے پڑے تھے۔ وصل کی صبحوں سے زیادہ روشن چہرہ چمک رہا تھا مجبور راتوں میں جلتے ہوئے چراغوں کی سیاہی سے بجے ہوئے ابرو سیاہ و سفید ہیرے کی آنکھوں پر سایہ کیے ہوئے تھے لانبی سیاہ خمیدہ پلکیں ہم آغوش تھیں۔

"ماماں...... آنکھیں کھولیے۔ دیکھیے۔ ماموں صاحب آئے ہیں۔ آپ کے بھیا آئے ہیں۔" آنکھیں اس طرح کھلیں جیسے تقدیر کھلتی ہے۔ ہماری نگاہ نے ان کی نظر کو تھام لیا مرجان کی سلونی کے جگر سے تراشے ہوئے ہونٹ ذرا سے دراز ہوئے۔ سونے کے ہاتھ ہم وصل ہوئے۔ برف پوش پہاڑوں پر سورج کی پہلی کرن کی طرح پاک آواز صبح نشاط کی طرح طلوع ہوئی:

"بھیا"۔

جی چاہا اپنا آپ اپنے ہاتھوں پر رکھ کر نذر میں گزار دیں۔

"ہمارے پاس ہمارے بیڈ پر بیٹھیے۔ ہم زور سے بول نہیں پائیں گے۔ کرسی میں سب خیریت ہے۔ شاہدہ بیگم"۔ لعل و گوہر بکھرنے لگے۔

"کرسی کے چاروں پائے اپنی جگہ پر ہیں۔ شاہدہ ہماری جیب میں ہیں۔ رانی کچھ ایسے حالات

ہوئے کہ ہم آپ سے ملے بغیر مجبوراً علی گڑھ چلے گئے۔ ہم پرسوں آدھی رات کو علیگڑھ پہونچے تھے۔ آج اسوقت آپ کے پاس ہیں۔" کرسی پر خاموش بیٹھی ہوئی ان کی والدہ نے ہم کو مخاطب کیا:

"بھیا۔ دوپہر سے کہہ رہے ہیں۔ یخنی نہیں پی رہی ہے۔ برابر ٹال مٹول کررہی ہے"۔ اتنے میں ٹھاکر صاحب آ گئے۔ ہمارے بہت قریب آ گئے: "بیٹے۔ اس کے منہ پر ہم آپ سے کہہ رہے ہیں۔ کسی کا کہنا نہیں مانتی ہے۔ غصہ کرنے لگتی ہے۔ دوا یخنی سوپ جوس پلانا ذرا بہت کھانا کھلانا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ آپ اسے ذرا سمجھا دیجئے کہ دوا کے ساتھ غذا کتنی ضروری ہے"۔

خلا میں گھورتے ہوئے تبسم خفی کے ساتھ سنتی رہیں۔ ہم نے بہت زور دے کر کہا: "آپ یخنی اور سوپ منگوایئے ہم پلائیں گے"۔

"بھیا.........آپ کتنی دیر کیلئے ہمارے پاس آئے ہیں؟"

"ہماری رانی صاحب جب تک ہم کو اجازت نہیں دیں گی ہم کہیں نہیں جائیں گے"۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں؟"

"اپنے سر کی قسم ہم آپ کو سنانے کے لیے نئی کہانی لے کر آئے ہیں۔ بہت عمدہ۔"

"تب تو ہم آپ کے ہاتھ سے یخنی بھی پئیں گے اور کھانا بھی کھائیں گے......لیکن پہلے چینج کر لیجئے چائے پی لیجئے........" اور آنکھیں بند کر لیں۔

سفید بستر پر خون کبوتر کی طرح سرخ ریشمی ایپرن باندھے، بہت اونچے تکیے کے سہارے اس طرح نیم دراز تھیں کوئی نئی نویلی دلھن کوئی شیریں خواب دیکھ رہی ہو لانبی سیاہ پلکیں ہم آغوش تھیں۔ اُن کی سانسوں سے ایپرن لرز رہا تھا۔ ہم اپنی کرسی سے اٹھے اتنا جھک گئے کہ ان کی سانسوں کی آنچ محسوس ہونے لگی ان کی خوشبو میں شرابور ہو کر ہم نے آواز دی: "رانی.......رانی صاحب"۔ اُن کی والدہ اور خوشدامن جو دوسری کرسیوں پر ڈھیر تھی اُن کا جواب سننے کو بیقرار تھیں وہ دونوں ان کو بیدار کرنے کی کوشش کر چکی تھیں۔

"رانی......آپ نہیں بولیں گی تو ہم چلے جائیں گے.....اسی وقت علیگڑھ چلے جائیں گے"۔ آنکھ اس طرح کھلی جیسے باب قبول کھلتا ہے۔ احمریں ہونٹوں کی لکیر ذرا لمبی ہوئی تو درودیوار مسکرانے لگے۔ ہم نے یخنی لانے کا اشارہ کیا اور مسہری کی پٹی پر بیٹھ گئے۔ رانی نے دونوں ہاتھ اس طرح جوڑے جیسے دونوں جہان سمیٹ کر دے ڈالے ہوں: "بھیا......" آواز اس طرح طلوع ہوئی جیسے ہجر کی لمبی کالی رات میں خود محبوب نے پکارا ہو۔ اس طرح دیکھا جیسے نگاہِ کرم نے توجہ کی پوری خلعت پہنادی ہو۔ یخنی کا چمچ قبول ہوا جیسے دعا قبول ہوتی ہے۔ پیالہ ختم ہوا تو ہم نے خوب جما کر کہا: "رانی ایک سرپرائز ہے۔"

"کیا......بتایئے.....جلدی سے بتایئے نا۔"

"جب آپ تھوڑا سا کھانا کھالیں گی.........تب بتائیں گے۔"

''اچھا کھانا ہم کھالیں گے''......اپنی ماں کی طرف دیکھا:

''ماماں بھیا کے لئے' کھانا لگوایئے یہیں''۔

''رانی صاحب آپ کیا کھائیں گی۔ہم آپ کو خود کھلائیں گے۔''

''ہم کھانا کہاں کھاتے ہیں۔زہر مار کرتے ہیں۔اُبالی پتلی کھچڑی پھیکی سیٹھی دلیا۔یہ بھی کوئی کھانا ہے جو ہم کھائیں''۔

''کیا کھانے کو جی چاہتا ہے۔ہم کو بتایئے۔''

''کھلائیں گے آپ ہم کو......کھلا پائیں گے۔''

''بتلایئے تو ہم کو''۔

''کباب۔بریانی؛اشتو......شیرمال......مزعفر۔''

''یعنی آپ کھانا نہیں دعوت کھانا چاہتی ہیں''۔ مسکراتی رہیں: ''کل ہم آپ کو کوالٹی لے چلیں گے۔آپ جو کھانا چاہیں گی کھلائیں گے...لیکن اس وقت آپ کیا کھائیں گی''۔

''آپ کیا کھلائیں گے؟'' ہم نے سوالیہ نظروں سے ان کے والدہ کو دیکھا۔

''بھیا۔اتنے وخت کھچڑی ہے مونگ کی....رات کا وخت ہے۔سیرے ڈاکٹر سے پوچھ کر''۔

''سن لیا آپ نے؟'' بہت ناگواری سے کہا: ''کھچڑی اگر بہت گیلی ہو۔تو اسے خشک کرادیجئے۔دیسی گھی کا بگھار دید یجئے۔تھوڑا سا رایتہ بنوالیجئے۔''ہم نے رانی کو دیکھا :''اب تو آپ کھالیں گی ذرا سی؟''

''ہاں اپنے ہاتھ سے زہر مار کرتے ہیں......آپ کے ہاتھ سے نگل لیں گے''۔

دونوں چھوٹی میزیں ہمارے پسندیدہ کھانوں سے بھری ہوئی تھیں۔ہم ان کی کھچڑی میں غیر پرہیزی کھانے ملا کر کھلاتے رہے اور اُن کی آنکھیں تبسم سے جگمگاتی رہیں۔شیرینی بھی ہم نے ذرا سی کھلادی۔وہ سر سے پاؤں تک مسکرا رہی تھیں۔

نیبو پڑا ہوا گرم پانی کا پیالہ منہ صاف کرنے کے لئے سامنے آیا تو ہٹادیا:

''آپ کھانا لیجئے۔ساتھ ہی منہ صاف کریں گے''۔کمرے میں صرف ملازمائیں رہ گئیں تھیں۔ہم سگریٹ رول کررہے تھے۔کہ ذرا سا اُبھر کر ٹھیک سے بیٹھ گئیں:''سرپرائز کیا ہے جلدی سے بتایئے''۔

''ہماری ڈاکٹریٹ منظور ہوگئی''۔

''سچ....واقعی۔۔۔ڈگری کب ملے گی...کانوکیشن کب ہوگا؟''

''ستمبر،اکتوبر میں ہونے کی خبر ہے''۔

''آپ نے ریسرچ میں داخلہ کب لیا تھا؟''

''بھول گئیں...... جولائی ۵۴-۱۹۵۴ء لکھنؤ یونیورسٹی میں جولائی ۵۵-۱۹۵۵ء میں علیگڑھ یونیورسٹی میں یعنی آپ دو برس آٹھ مہینے میں ڈاکٹر ہو گئے...... بھیا یہ بھی ریکارڈ ہوگا..... ایک بات سُن لیجئے کان کھول کر.... کانووکیشن میں شرکت کروں گی........ اور بہت عمدہ ڈنر لوں گی''۔

''منظور'' سب۔ جو کچھ آپ کہیں سب منظور''۔

''اب آپ آرام سے لیٹ جائیے۔ تو ہم آپ کو بہت اچھی سی کہانی سنائیں''۔ ہماری کرسی مسہری سے ملا دی گئی تھی۔ سگریٹ ختم کر کے ہم نے کہانی شروع کرنا چاہی۔ ''بھیا ایک بات کہیں آپ ناخوش تو نہیں ہوں گے....''

''نہیں........... بالکل نہیں ہوں گے۔''

پرسوں بہت صبح کرسی میں اٹھے ہوں گے۔ بھاگم بھاگ علی گڑھ کے لئے روانہ ہوئے ہوں گے۔ آدھی رات کے قریب علی گڑھ پہنچے ہوں گے۔ کل کا سارا دن مصروفیت اور سفر کی تیاری میں گزر گیا ہوگا آپ آٹھ بجے سو کر اٹھنے کے عادی ہیں۔ آج بھی بہت سویرے اٹھنا ہوگا۔ اس وقت رات کے دس بجے ہیں آپ کو آرام کرنے کی فرصت نہیں ملی۔ آپ کے روئیں روئیں سے تھکن ٹپک رہی ہے اس لیے اگر آپ آج کہانی نہ سنائیں تو۔''

''رانی۔ مسرکھ کے کیمپ سے آج تک کوئی رات ایسی نہیں گزری کہ ہم آپ کی چھت کے نیچے ہوں اور آپ کو کہانی نہ سنائی ہو کہانی سناتے سناتے آپ کو سلا نہ دیا ہو۔ تو پھر آج یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم۔۔۔۔ میں نے تو Request (گزارش) کی تھی۔ آپ کی جو مرضی''۔ ہم نے محسوس کیا کہ آج کہانی سنتے ہوئے وہ ہوں ہاں نہیں کر رہی تھیں۔ ہم نے گھوم کر دیکھا پلکیں آنسوؤں سے وضو کر کے نماز فجر پڑھ رہی تھیں۔ ''رانی'' ہم خود اپنی آواز کے شور سے ڈر گئے۔ آنسوؤں سے غسل کر کے نکلی ہوئی نظریں اس طرح ہماری نگاہوں سے ملیں کہ ہم سر سے پاؤں تک بھیگ گئے: ''رانی........ آپ رو رہی ہیں''۔

''بھیا۔ آج بھائی زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ ایک پروفیسر جو اب ڈاکٹر بھی ہو گیا ہے اپنی زندگی کی پہلی کہانی ہم کو سنا رہا ہے تو کتنا خوش ہوتے۔'' آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے اور سسکنے لگیں۔ راجہ بیٹے کے مسہری کے برابر ہمارا بستر لگا ہوا تھا۔ ہم کٹے ہوئے درخت کی طرح گرے اور سو گئے۔

آوازوں کا ایک کہرام تھا جس نے ہم کو جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ ہم ننگے پاؤں رانی کے کمرے میں پہنچے۔ پورا کمرہ چیخوں سے لرز رہا تھا۔ سیاہ اور سفید الماس کی پوری کھلی ہوئی آنکھوں کی شمعیں کسی کے انتظار میں فروزاں تھیں دو بوڑھے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے شمعیں بجھا دیں اور ان کو چادر پوش کر دیا۔ ہم راجہ بیٹے کو لپٹائے کھڑے رہے۔ معلوم نہیں کب تک.........!!

☆☆☆

'شریف زادہ': زبیر رضوی !

● محمد آصف زہری

یونیورسٹی کے ایک طالب علم اور ایک طالبہ، جو شاید کبھی ایک دوسرے کے دوست تھے، کے درمیان کسی بات پر نا اتفاقی ہو گئی۔ پہلے یہ نا اتفاقی بحث و تکرار میں تبدیل ہوئی، پھر یونیورسٹی کے طلباء و طالبات کے درمیان موضوع بحث بن کر تانیثی احتجاج کی شکل اختیار کر گئی اور بیشتر طلباء و طالبات واضح طور پر دو علیحدہ علیحدہ خیموں میں تقسیم ہو گئے۔ یہ بات 1992ء یا 1993ء کی ہے جب میں جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ اس تناؤ بھرے ماحول میں کیمپس کے ایک کلچرل پروگرام میں زبیر رضوی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ مذکورہ پروگرام میں وہ اپنی نظم "شریف زادہ" سنا رہے تھے، جس کا ایک مصرع تھا: "وہ سب لڑکیاں بد چلن تھیں جنھیں تم"۔ مجھے خوف تھا کہ یہ نظم کشیدگی میں مزید اضافہ نہ کر دے لیکن زبیر رضوی، صورت حال سے بے خبر، اپنے مخصوص انداز میں نظموں پر نظمیں سناتے رہے۔ یہاں، نظم "شریف زادہ" کو نقل کر دینا برمحل ہوگا تا کہ صورت حال کا کچھ اندازہ ہو سکے:

سنو، کل تمھیں ہم نے مدراس کیفے میں / اوباش لوگوں کے ہمراہ دیکھا /
وہ سب لڑکیاں بد چلن تھیں جنھیں تم / سلیقے سے کافی کے کپ دے رہے تھے /
بہت خوش اور مطمئن ناچ تھا وہ / کہ جس کے ریکارڈوں کی گھٹیا دھنوں پر /
تھرکتی تھرکتی ہوئی لڑکیوں نے / تمھیں اپنی بانہوں کی جنت میں رکھا / بہت دکھ ہوا

تم نے ہوٹل میں کمرہ کرایے پہ لے کر ان اوباش لوگوں اور ان لڑکیوں کے ہجوم طرب میں ر
گئی رات تک جشنِ صہبا منایا ر بہت دکھ ہوا خاندانی شرافت ر
بزرگوں کی بانکی سجیلی وجاہت کو ر تم نے سرِ عام یوں روند ڈالا ر

سلیقہ جو ہوتا تمھیں لغزشوں کا ر تو اپنے بزرگوں کے مانند تم بھی ر
گھروں میں کنیزوں سے پہلو سجاتے ر پئے عشرتِ دل، حویلی میں ہر شب ر
کبھی رقص ہوتا، کبھی جام چلتے ر کسی ماہ رخ پر دل و جاں لٹاتے ر
سلیقہ جو ہوتا تمھیں لغزشوں کا ر تو یوں خاندانی شرافت وجاہت ر
نہ مٹی میں ملتی نہ بدنام ہوتی!!!

واضح رہے کہ اس نظم سے تانیثیت کی نفی کرنے والے معنی بھی اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ مذکورہ مخصوص ماحول نے تعبیر و تفہیم کے اس رخ کے لیے نہ صرف راستہ ہموار کر دیا بلکہ ہموار راستے کو ایک طرح کا نشیب بھی عطا کر دیا تھا کہ فکر کا پہیہ بڑی ہی سرعت کے ساتھ لڑھکتا چلا جائے۔ بہر حال پروگرام ختم ہوا اور حسب روایت طلباء اور طالبات نے رواداری کا ثبوت پیش کیا۔ پروگرام کے بعد چائے پیتے ہوئے میں نے ان سے کہا کہ: 'آپ کی نظم "شریف زادہ" کے پہلے حصے میں جن حرکتوں کو قابل اعتراض قرار دیا گیا ہے، دوسرے حصے میں ان ہی قابل اعتراض حرکتوں کو سراہا گیا ہے؟' تو ان کا جواب تھا: 'مصرع "سلیقہ جو ہوتا تمھیں لغزشوں کا" پر آپ نے غور نہیں کیا'۔ نظم کی دوبارہ قراءت نے "باسلیقہ لغزشوں" کے لیے نہ صرف راہ ہموار کر دی بلکہ صداقت اور اقدار کے تضادات کو بھی عریاں کر دیا۔

بیس فروری کو بذریعہ فون اطلاع ملی کہ "سلیقے کے ساتھ لغزشیں کرنے والا وہ شریف زادہ" دہلی اردو اکاڈمی کے ایک سمینار میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ یہ خبر سنتے ہی "وفاتیہ" کے زیر عنوان رقم کی گئی ان کی تحریر کی یاد تازہ ہو گئی کہ: "اگر موت ایک مرتبہ اپنے نشانے میں چوک جائے تو پھر وہ ایسا بے ساختہ نشانہ لگاتی ہے کہ پل بھر میں آپ کا دھڑ بے جان ہو کر لڑھک جاتا ہے۔ مجھے موت نے کیسے شکار کیا یہ تو آپ زندہ رہنے والوں کو پتہ ہی ہوگا۔" [زبیر رضوی۔ وفاتیہ۔ ذہن جدید، نئی دہلی۔ مارچ تا مئی 2009ء۔ صفحہ 89] واقعی ان کے ساتھ ایسا ہی ہوا کہ تقریر کے بعد کرسی پر بیٹھے اور دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ تعزیتی الفاظ رقم کرنے سے قصداً اس لیے گریز کر رہا ہوں کہ وہ جانے سے پہلے ہی اپنی موت پر ماتم نہ کرنے کی وصیت کر گئے ہیں۔ ان کے لفظوں میں:

"اس ساری صورت حال پر مجھے جنوبی ہند کی بطور پیشہ نوحہ گری کرنے والی ان عورتوں کی ٹولی یاد آجاتی تھی جو پرسوز نوحہ گری کرتے ہوئے مرنے والے کے کفن سے اپنے آنسو بھی پونچھتی جاتی تھیں اور کئی

گھنٹے کی نوحہ گری کا معاوضہ گرہ میں باندھ کر کسی دوسری میت پر نوحہ کرنے چلی جاتی تھیں۔ اردو کے پیشہ گر نوحہ گروں کے ایسے موقعوں پر کاتا لے دوڑی والے رویے دیکھ کر مجھے ذہن جدید میں 'رفتگاں' والی اپنی متوازن سی تحریر یاد آجاتی تھی۔ میری موت کا ماتم نہ کرانے کی وصیت کرنا میں مرتے وقت بھول گیا۔ مجھے صحیح صحیح نہیں معلوم ہوسکا کہ میری موت پر اردو والوں کا کیا ردعمل تھا؟"

[زبیر رضوی۔ وفاتیہ، ذہن جدید، نئی دہلی۔ مارچ تا مئی ۲۰۰۹ء صفحہ: ۹۳]

مزید برآں، ان کی وفات اور ماتم سے یاد آیا کہ ماتم کرتے ہوئے، احباب تو احباب، دشمن بھی مرنے والے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں یہاں تک کہ سخت نفرت کرنے والا بھی بچتے بچاتے اتنا تو ضرور کہہ جاتا ہے کہ ساری خوبیاں اس سے منسوب کی جاسکتی ہیں بشرطیکہ وہ یقیناً مر گیا ہو۔ دراصل تعزیتی پروگرام اور محفلوں میں مرحومین کی جتنی تعریفیں کی جاتی ہیں اور جیسی تصویر پیش کی جاتی ہے اس پر زبیر رضوی کی ایک نظم کی جانب اشارہ کر دینا ہی کافی ہے:

سنو پھر آج ہم میں سے کسی کو موت نے تاکا / اچانک مر گیا کوئی /
چلو دارو چیں دیوار سے سر پھوڑ کے روئیں / نشہ اترے تو اس کی یاد میں اک مرثیہ لکھیں /
پرانے تذکروں میں اس کے خدوخال کو ڈھونڈیں / کتابوں کے ورق الٹیں /
رسالوں اور اخباروں کی پچھلی فائلیں کھولیں / دماغ و دل کے گوشے میں چھپی یادیں کریدیں /
تلخیاں بھولیں / فراموشی کی ساری گرد جھاڑیں / رنجشیں بھولیں /
ہر اک خوبی ہم اس کے نام سے منسوب کر دیں / اور اک ایسے شخص کا پیکر تراشیں /
کل جو اپنے درمیان زندہ نہیں تھا!

[دوسرا آدمی]

تعزیتی الفاظ سے قصداً پہلو تہی کرتے ہوئے، ایک ملاقات کا ذکر بھی کرتا چلوں کہ ابھی پندرہ بیس روز قبل ہی ان کے گھر پر، ان کی نظموں کے حوالے سے، بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے شاید یہ کہا تھا کہ: آپ کی متعدد نظموں میں زماں اور مکاں کا تعین قاری از خود کر سکتا ہے۔ مثلاً کن نظموں کے پس منظر میں حیدرآباد، دہلی اور کشمیر ہے۔ اور کون کون سی نظمیں زندگی کے کس پڑاؤ یعنی نوجوانی، پختہ عمر، اور ریٹائرمنٹ کے بعد کی ہیں یا ہندوستان کی اہم سماجی اور سیاسی تبدیلیاں کن نظموں کا کینوس ہیں، حتیٰ کہ نظموں میں چند شناسا چہروں کے کیا نام ہیں؟ ایک ذہین قاری بآسانی ان کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ تاہم آپ کے پسندیدہ موضوعات عہد حاضر کا شہر [مثلاً نظم: ردعمل، شہر کی صبح، رقیب شوق، گم ہوتا شہر] تہذیب کا سفر اور تاریخ کا تسلسل [آخری راوی، زوال کا منظر، پرانی بات ہے، صادقہ] ہجرت کا کرب [زمیں تقسیم ہو چکی ہے] کے علاوہ الفاظ، علوم اور اعتقادات کی حرمت کا زوال، ان کا منفی استعمال بلکہ ان کی تباہ کاری [حاجی بابا، علی بن متقی رویا، اصحاب گریہ] وغیرہ ہیں۔ تاہم آپ کی چند نظمیں آپ ہی کی اصطلاح "بانوے بے ردا" کی طرح سے عریاں نظر

آتی ہیں۔ نظم مکمل ہونے کے بعد بھی، کاغذ قلم اور لفظوں سے دستبردار ہونا نہیں چاہتی، کہیں کہیں تو آخر کے چند مصرعے نظم کی تشریح کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ سن کر پہلے تو مسکرائے پھر کہا کہ: بلراج کومل نے بھی ایک بار کچھ ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ آنے والا عہد یہ طے کرے گا کہ مذکورہ مصرعے زائد ہیں یا ضروری لیکن میرے خیال میں یہ نظم کے تئیں ہر ایک کا جداگانہ ٹریٹمنٹ ہے۔ پھر بہت دیر تک ان کی تخلیقات بالخصوص نظموں کے حوالے سے گفتگو ہوتی رہی۔ گھر واپس آ کر از سرِ نو، ان کی تمام نظموں کا جستہ جستہ مطالعہ کیا، پھر لکھنا شروع کیا اور اندازہ تھا کہ وہ چار روز میں اس کو مکمل کر لوں گا لیکن مضمون کے مکمل ہونے سے قبل ہی ان کا سفر حیات مکمل ہو گیا۔ مضمون شاید اگلے کسی شمارے میں جگہ پا سکے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ آنے والا زمانہ طے کرے گا کہ ادیبوں اور شاعروں کی فہرست میں ان کا نام رہے گا یا نہیں۔ بقول رضوی:

"جب تک آدمی اپنے حلقے اور شناساؤں کے درمیان بے ضرر ہو کر رہتا ہے وہ اسے جینے دیتے ہیں لیکن کچھ دنوں کے بعد اس کے تعزیتی جلسے جلوسوں سے فارغ ہونے کے بعد اپنی ادبی فہرست سے اس کا نام کاٹنے میں دیر نہیں لگاتے۔ میں تو اب زندہ نہیں ہوں مگر یہ بات عالم بالا میں آ جانے کے بعد بھی لکھ رہا ہوں کہ اول تو زیادہ تر ادبی فہرستوں میں میرا نام رہا ہی نہیں لیکن جب بھی ادبی حوالوں میں اب اگر میرا نام آئے گا تو وہ کاٹے جانے کے لیے نہیں آئے گا یہ گمان مجھے اس لیے بھی ہے کہ بقول فراق:- "ادیب کی زندگی میں ہونے والے ادبی فیصلے ان فیصلوں کے مقابلے زیادہ ناپائیدار اور غیر معتبر ہوتے ہیں جو ادیب کے مرنے کے بعد کے زمانوں میں کیے جاتے ہیں۔"

[زبیر رضوی۔ وفاتیہ، ذہن جدید، نئی دہلی۔ مارچ تا مئی ۲۰۰۹ء، صفحہ: ۹۱]

☆☆☆

☆☆☆

سہ ماہی 'آمد' کا شمارہ : ۱۳ - ۱۴

● محمد حامد سراج [پاکستان]

پٹنہ [ہند] سے نکلنے والے وقیع ادبی جریدے "آمد" کا شمارہ نمبر 14-13 اب کی بار کراچی سے صبا اکرام صاحب کی وساطت سے موصول ہوا۔ میں اپنے محبی خورشید اکبر اور محترم صبا اکرام کا شکر گزار ہوں۔ لازوال نیکی ہے حرف کی سوغات بھیجنا۔ جریدے کے ورق پلٹتے ہوئے فکر مندی، تشویش اور درد کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ خورشید اکبر کے "آمدم برسر مطلب۔۔۔۔؟؟ کی پیشانی پر باقی] کا یہ شعر کندہ تھا:

تمام شہر کو مسمار کر رہی ہے ہوا
میں دیکھتا ہوں وہ محفوظ کس مکاں میں ہے

دھڑکتے دل کے ساتھ مطالعہ شروع کیا اور وہ جو تشویش کی کونپلیں تھیں ان میں سے درد رسنے لگا۔ مدیر نے بات چھیڑی" کہنے کی مراد یہ ہے کہ: " 'آمد' نکل ضرور رہا ہے لیکن اس کی سانسیں رک رک کر چل رہی ہیں۔ اسے مزید آکسیجن کی ضرورت ہے ورنہ اس کی بچی کھچی سانسوں کی پونجی کسی وقت بھی دم توڑ سکتی ہے [گویا جو حال 'آمد' کا ہے کم وبیش وہی حال ہماری فکر ودانش کا بھی ہے] اس ضمن میں لکھنؤ سے نکلنے والے مشہور زمانہ ادبی رسالے "کتاب" کے اشاعتی سلسلہ کے بند ہونے پر ممتاز ترقی پسند نقاد سید محمد عقیل کی ایک پرانی تحریر جو حسب حال ہے شہر ثقافت میں شامل ہے تا کہ 'آمد' کے چاہنے والے اسے موت کے منہ میں جانے سے پہلے دائے درمے سخنے اور قدمے کچھ مثبت اقدامات یا مشترکہ لائحہ عمل تیار کر سکیں۔"

خورشید اکبر صاحب! ادبی بے حسی سے تو انکار ممکن نہیں ہے۔ ایک میرے سب اچھا کہہ دینے سے تو یہ ممکن ہونے سے رہا کہ راتوں رات ہُن برسے اور 'آمد' کبھی بند نہ ہو۔ بات عمل کی ہے کہ سوچنے کے بعد ایک نتیجہ پر پہنچا جائے اور پھر استقامت ہمارا عمل ٹھہرے۔ ہم مستجاب الدعوات بھی نہیں کہ صرف دعا سے یہ چراغ جلتا رہے۔ دعا کی اہمیت اپنی جگہ لیکن میرے نبی مکرم ﷺ نے بدو کو کلہاڑی اور رسی لے کر دی کہ: جاؤ جنگل سے لکڑیاں کاٹو، بازار میں فروخت کرو، محنت کرو۔ اللہ برکت ڈال دے گا۔ پہلی تجویز عرض ہے کہ

ہمارے یہاں ہر تخلیق کار [قد آور ہو یا نو آموز] اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے پرچہ اعزازی بھیجا جائے۔ اس شمارے میں کم و بیش ستر سے پچھتر قلم کار موجود ہیں۔ کیا ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اور کوئی خریدار ہو نہ ہو ہم 'آمد' خرید کر پڑھیں گے۔

آپ آمد" کے لئے جو کاغذ استعمال کر رہے ہیں یہ بہت مہنگا ہے۔ آپ 80 گرام کی بجائے 40 سے 55 گرام کے کاغذ پر آ جائیں۔ ہمیں قبول ہے۔ یہ بھی فیصلہ کر لیجئے کہ کہ ضخامت 225 سے 250 صفحات سے بالکل تجاوز نہ کرنے پائے۔ سرورق Four Colour کی بجائے سادہ کر دیجیے۔ میرے اللہ نے کرم کیا تو 'آمد' بند نہیں ہوگا۔ ہم آج سے میانہ روی کا رستہ اختیا کرتے ہیں۔

640 صفحات پر محیط اس جریدے میں مختلف اصناف سخن اپنی تخلیقی توانائی' اہمیت و افادیت کے ساتھ اپنی چھب دکھا رہی ہیں۔ پروفیسر علی احمد فاطمی اور صبا اکرام نے کرشن چندر کے فکری ارتقا اور کثیر الجہات فنکار ہونے پر اپنے بات کو دلیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ میں ان دنوں کرشن پر کتابیں اور مضامین جمع کر رہا ہوں۔ کالج لائف میں تو کرشن چندر کو میں حرف حرف گھول کے پی گیا اب اپنے کتب خانہ میں "گوشہ منٹو" کے ساتھ "گوشہ کرشن چندر" پر محنت جاری ہے۔ ان دو مضامین کی فراہمی پر میں آپ کا شکر گزار ہوں ۔اللہ اللہ۔۔۔ ایم کاویانی صاحب! اک ذرا ٹھہر جائیے، آپ ایسے صاحب علم کے قدموں میں بیٹھ کر مشتاق احمد یوسفی کے "شہر شعر یاراں" پر آپ کے مضمون کی بابت شکریہ ادا کرتا ہے کہ ادھر پاکستان میں اس کتاب کی اشاعت پر وہ ہاہا کار مچی کہ الاماں الحفیظ۔۔۔ شکر ہے رب کریم کا کہ یوسفی صاحب سلامت ہیں انھیں دل کا عارضہ لاحق نہیں ہوا اور وہ ہر طرح کی دماغی چوٹ سے محفوظ رہے۔ الحمد للہ۔ کتاب میں نے بھی ہاتھوں ہاتھ لی۔ ہم ایسے عشاق کتب کو کتاب خرید کیے بن چین کہاں پڑتا ہے۔ "شہر شعر یاراں" کے ورق پلٹتے ہوئے "قائد اعظم فوجی عدالت میں" اور "کیس ہسٹری کے مطالعے کے بعد" مجھے لگا میں عہد یوسفی میں سانس لے رہا ہوں اور یہ میری خوش نصیبی ہے۔ "قصہ خوانی بازار سے کوچہ ماضی گیراں" تک میں نے جو مطالعاتی سفر طے کیا وہ خوش گوار رہا۔ میرے دل کی بات آپ نے من و عن اپنے مضمون میں بیان کی۔ اور کمال کی۔ میں نے آپ کا مضمون جم کے پڑھا ہے مکمل سکوت میں اور انہماک کے ساتھ۔ علم کا سمندر باندھ کے رکھ دیا آپ نے۔ پروفیسرانہ وائرس سے اَٹے ہوئے نصابی مضامین کے دور میں یہ مضمون الگ کھڑا اپنی اہمیت دکھا رہا ہے۔ کاش، ہمارے پروفیسر صاحبان نصابی کتب کی کال کوٹھری سے نکل کر ایسے مضامین رقم کیا کریں۔ لیکن اس پر محنت بہت ہے۔ مطالعہ، مشاہدہ، سوچ، وقت، گہرائی، گیرائی، فکر انگیزی، موضوع پر عبور اور پھر موضوع کو نبھانے کا قرینہ، قلم کی حرمت کی پاسداری، شوق ناموری سے کنارہ گیری، ایسی خوبیوں سے قلم کار متصف ہو تو وہ "شہر شعر یاراں" پر اپنے قلم کی جولانیاں دکھا سکتا ہے، داد سمیٹ سکتا ہے۔ خورشید اکبر صاحب، اُردو ادب کا قاری آپ کا شکر گزار ہے۔

شہر امکانات میں عبدالرحمٰن کے قلم سے ''اقبال کا نظریہ، پاکستان: تنقید ورد تنقید'' شامل ہے۔ دس خاص غزلیں کے زیر عنوان ضیا فاروقی' سہیل اختر اور احمد کمال حشمی کی دس دس غزلیں شامل ہیں۔ شہر افسانہ میں اب کی بار 13 ایسے نمائندہ افسانے چن کر 'آمد' کو تاب دار کیا گیا ہے جن پر ''کائناتِ آمد'' میں مدیر نے شرح وبسط کے ساتھ اپنے خیالات کو زبان دی ہے۔ اقبال مجید اور صدیق عالم کا نام اردو افسانے میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کا نام، کام، معیار خود ان کے وقار پر دال ہے۔ ''اپنے اپنے طوطے'' خوب بولتے ہیں۔ انھیں چپ آتی ہی کہاں ہے۔ طوطا اور مینا کا اپنا دماغ ہوتا کہاں ہے ان کو جو سبق رٹا دیا جائے وہ ویسی زبان بولتے ہیں۔ ہمارے سیاست دان کمال کے طوطے ہیں۔ بل کہ طوطا چشم۔ افسانے میں طوطا اور مینا کی علامت سے کہانی کو ساتھ باندھ کر اقبال مجید نے قاری کو کہیں اکتانے نہیں دیا۔ صدیق عالم سے میرا پہلا تخلیقی اور افسانوی تعارف ''شب خون'' سے ہوا تھا۔ وہ اپنی راہ اپنی الگ پگڈنڈی کا افسانہ نگار ہے۔ وہ پٹی پٹائی روش پر چلنے کا عادی نہیں۔ اردو افسانے میں اس نے اپنا رستہ الگ چنا ہے۔ اکثر صدیق عالم کا افسانہ پہلی قراءت میں سمجھ دانی میں نہیں بیٹھتا۔ لیکن جب وہ اپنے باطن کے بھید بھاو کھولتا ہے تو اردو افسانے کا سنجیدہ قاری عش عش کر اٹھتا ہے۔ ''مرے ہوئے آدمی کی لالٹین'' کا شمار ان کے یاد رہ جانے والے نمائندہ افسانوں میں کیا جائے گا۔ میں افسانے کے ماحول، سحر اور کرداروں سے ابھی تک باہر نہیں نکل سکا۔ میں لالٹین میں سانس لے رہا ہوں۔ 'آمد' کے معیار اور وقار کے لیے ایسے ہی افسانوں کی ضرورت ہے۔ [صدیق عالم صاحب! ہمارا سلام قبول کیجیے]۔ احمد زین الدین کا افسانہ ''آنکھوں نے کہا آنکھوں نے سنا'' میں ابھی نہیں پڑھ سکا۔ ''قافلہ'' افسانہ شبیر اظہیر عباس کا، جو آمد میں رحمٰن عباس کی وساطت سے پہنچا۔ تحریر کمال رواں ہے۔ مکمل علامتی افسانے کو پڑھتے ہوئے اکتاہٹ اور الجھن تو نہیں ہوئی اور نہ مطالعے میں ڑک آئی لیکن اے میرے افسانہ نگارو۔ سانحہ کی دہائی گزر گئی۔ نصف صدی بیت چلی۔ اب یہ صف لپیٹ بھی دو۔ کیوں چار نوکیلے دانت سر کے پچھلے حصے میں گاڑ رہے ہو۔ کیوں کھٹاک کھٹاک کر کے ہمارے جبڑے توڑنے پر تلے بیٹھے ہو۔ ہمارا دماغ کیوں توڑ کر کھایا جا رہا ہے۔ چہرہ پانی میں کیوں الٹا سیدھا ہو رہا ہے۔ یہ خواب لپیٹ دو اور اردو افسانے کے قاری پر رحم کرو۔ ''قافلہ'' کی بے جا طوالت کھٹکتی ہے۔ اسے آپ افسانے کا سقم کہہ لیجیے۔ خورشید حیات نے ''پہاڑ ندی عورت'' میں بات نبھا دکھائی ہے لیکن علامتی پیچ وخم نے اتنے شاندار اور عمدہ موضوع کو اختتام پر گہنا دیا ہے۔ اب ذرا بات ہو جائے ''آئینہ شکن'' پر جو فن پارہ 'بے راوی' کے مدیر ڈاکٹر اختر آزاد کا ایک مکمل تراشیدہ افسانہ 'گل بدن کے کردار کو افسانہ نگار نے روشن کر دکھایا ہے۔ گل بدن کی کیفیات کو اپنے فن کی کٹھالی میں سے گزار کر اختر آزاد نے جی خوش کر دیا۔ ایک بہت عمدہ خوبصورت اور تراشیدہ افسانہ ''مالکن اللہ کے نام پر کچھ ملے گا۔۔۔؟!'' ایسے وقت میں جب گل بدن کے جسم پر ایک بھی کپڑا نہیں تھا کوئی اس سے خیرات طلب کر رہا تھا اور سامنے ایک قد آدم آئینہ چکنا چور ہو کر فرش پر بکھرا پڑا

تھا!!'' ہائے ہائے۔۔واہ اختر آزاد کمال کر دکھایا آپ نے' ایسے افسانے لازوال عمر پاتے ہیں۔فرحت جہاں کا'' دیوار'' انسان کے باطنی خوف پر ایک ایسا افسانہ ہے جسے افسانے نگار نے سنبھل کر لکھا ہے اور خوف کی کیفیات کو آئینہ کرتے ہوئے کامیاب رہی ہیں۔شبیر احمد آپ کیسے ہیں۔آپ کا افسانوی مجموعہ ''چوتھا فنکار'' مجھے رانچی سے غالب نشتر نے بھجوایا تھا۔ ''میں اور میرا باس'' پڑھ کر جی خوش ہوا کہ آپ نے ایک اور بہت اچھا افسانہ اردو زبان وادب کو دیا ہے۔انسانی دماغ کی نسوں سے پھوٹنے والے جبر کے درد کو آپ نے قرینے سے بیان کر کے افسانے کو سمیٹتے ہوئے افسانویت سے مملو کر دیا ہے۔''چھومنتر'' میں پیپل ،غلیل ،بلغز''' تکونے پتھر گاڑ کر ان پر سواریوں کی چتر کاری' بانی منڈا' یہ سب ناصر راہی ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا۔یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔اب آپ اس کی شرح لکھیں تو ہمیں بھی اس افسانے کا بھید بھاؤ پتہ چلے۔اسلم جمشید پوری کی ''ایک ادھوری کہانی'' دراصل ایک مکمل کہانی ہے۔ عہد رفتہ کی متروک سمعی روایات کے انداز میں افسانہ لکھ کر انھوں نے جی خوش کر دیا۔اب تو کہانی کی سمعی روایت قصہ ء پارینہ ہوئی۔اس عہد میں ہماری نانی اماں اور دادی اماں کہاں جن سے کہانی سننے کا لطف ہم آج تک نہیں بھولے۔خورشید اکبر صاحب۔۔۔!ایک بات۔اردو ادب میں اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ' اسے لگانا کیا ضروری ہے۔۔۔؟ کیا اردو ادب میں پی ایچ ڈی کرنے والے جتنے بھی مہرباں ہیں، انھوں نے ادب کا کلینک کھول کے باہر ڈاکٹر کی تختی آویزاں کرنی ہے کیا۔ہمارے یہاں بھی بس ڈاکٹریٹ کی ڈگری آخری مراحل میں ہوتی ہے کہ نام کے ساتھ ''ڈاکٹر'' جڑ جاتا ہے۔اسلم جمشید پوری کیا مکمل اور خوبصورت نام ہے۔اس نام میں ایک مٹھاس ہے۔پکارتے ہوئے بھی اپنائیت اور اپنے پن کا احساس ہوتا ہے۔لیکن ڈاکٹر کے ساتھ ''رعب'' سر نکالتا ہے اور قاری مرعوب ہو نہ ہو، بلاوجہ سہم ضرور جاتا ہے۔اردو ادب کے تمام ڈاکٹر صاحبان اس پر غور فرمائیں۔منیرہ سورتی آپ کا افسانہ ''پری'' پسند آیا۔کیا ملائم افسانہ ہے ریشم ایسا۔۔۔''صدف اقبال'' کے افسانے باندھ'' نے تو ہمیں باندھ کے رکھ دیا۔کیا یہ افسانہ ہے۔۔۔؟ کیا اسے موضوع کے حوالے سے ہم صنف افسانہ میں شامل کر سکتے ہیں؟ افسانے کی بنت کاری سے انکار نہیں لیکن کیا کہانی جس طرح کروٹ لیتی ہے اس کے بطون میں اتر کر پرکھا جائے تو یہ افسانہ ہے۔۔۔؟ سوالیہ نشان۔۔؟ بات فحاشی اور عریانی کی نہیں ہے۔وہ اس میں عنقا سہی' تو حد کی بابت افسانہ خود کیا بولتا ہے۔۔؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ میری صدف اقبال سے فون پر بات ہوئی۔مختصر گفتگو میں ایک متنازع موضوع پر ان سے کھل کر بات نہ کر سکا۔افسانے کی اس حوالے سے تحسین کی کہ موضوع سے ہٹ کر کہانی کی ابتدا میں ایک ماں کی پاگل بیٹے کے جنسی پاگل پن پر تشویش کو انھوں نے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔لیکن سوال کا پھن سر اٹھائے کھڑا ہے کہ کیا ایک بیٹی اور گھر میں آنے والی خواتین کی عزت پاگل بیٹے کے ہاتھوں بچانے کے لئے ایک ماں اپنا بدن اس کے سامنے ڈال سکتی ہے کہ وہ اسے جی بھر کے بھنبھوڑتا رہے۔کیا اس کے سامنے اور کوئی رستہ نہیں تھا۔جنسی پاگل پن کے سامنے بند باندھنے کے ہزار اور طریقے ہیں۔میں نے افسانہ افسانوی آنکھ سے پرکھا ۔میں عورت ہوں نہیں' سو اردو ادب کی چند معتبر خواتین قلم کاروں سے اس پر رائے مانگی کہ تخلیقی اور کہانی کی سطح پر

اس افسانے کے رمز کو سمجھنے میں اپنی رائے کا کھل کے اظہار کریں کیوں کہ جب تخلیق شائع ہو جاتی ہے تو وہ پبلک پراپرٹی ہو جاتی ہے اس پر رائے دینے کا حق سب کو ہے۔ مجموعی طور پر خواتین قلم کاروں نے کہا کہ اس افسانے کا انجام غیر فطری ہے۔ افسانہ نگار کیا قاری کو چونکانا چاہتی تھی ۔۔۔؟ کیا قاری کی توجہ حاصل کرنے کے لئے اس نے ایسا انجام چنا و کیا جو ذہن کی چولیں ہلا دے۔ مذہب سے ہٹ کر بھی لادینیت کے چوکھٹے میں اس کو پرکھا جائے تو اس کا انجام غیر منطقی اور تکلیف دہ ہے۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ افسانہ نگار نے اس میں "ماں" کی مرضی کو شامل دکھایا ہے کہ وہ قصداً گری۔۔ جملے پرکھ لیتے ہیں" کیا ہوا کیوں چلا رہے ہو۔۔؟ انھوں نے کمرے کی لائٹ جلائی اور بیٹے کی طرف دیکھا :

بلال کی آنکھوں میں ابولہوسی جھانک رہی تھی

وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئیں۔ پھر کچھ سوچ کر وہ لرزتے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھیں اور بے ہوش ہو کر ایک لاش کی مانند گر گئیں۔ بلال اپنی ماں کے جسم سے بے تحاشا لپٹ کر کبھی زوردار قہقہے لگا رہا تھا اور کبھی زار و قطار رو رہا تھا۔"

جی ۔۔۔! پھر کچھ سوچ کر وہ لرزتے قدموں سے دروازے کی سمت بڑھیں۔" اسی سوچ نے افسانے کو مردہ کر دیا ہے اور افسانہ افسانہ نہیں رہا۔ سوالات کا پھن کئی سوال پھنکار رہا ہے۔ اس عورت نے اپنے خاوند سے رابطہ کر کے کوئی راستہ کیوں نہیں نکالا۔۔؟ بیٹے کو ہمیشہ کے لئے ایک کمرے میں بند کر کے دروازے پر تالا کیوں نہیں ڈال دیا۔۔؟ پاگل خانے بھجوانے میں کیا قباحت تھی ۔۔۔؟ جناب مدیر محترم ۔۔۔! میں اپنے قریباً پنتالیس سالہ افسانوی مطالعے کی روشنی میں "باندھ" کو افسانہ تسلیم نہیں کرتا۔ ماں کا ذکر چھوڑیے۔ یہ ایک عورت کی نسوانیت کی تذلیل ہے۔ مجھے یہ نہیں کہنا کہ "توبۃ النصوح" لکھی جائے۔ لیکن عورت کو ننگا نچانا' یہ کیسا ادب ہے؟ کیا استعارے کی زبان میں بات نہیں ہو سکتی۔ عریانی اور فحاشی سے فن پارہ' فن پارہ نہیں رہتا' تعفن کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ٹرولیاں کی کہانیاں پڑھ کر" وہی وہانوی" کے وہ عریاں ناول یاد آتے ہیں۔ جو ایک آنہ لائبریری سے لوگ چھپا کر لے جاتے تھے اور رات کی تاریکی میں بستر میں چھپ کر پڑھتے تھے۔ یہی صورت حال طاہر اسلم گورا کے ناول "رنگ محل" کی ہے۔ اے میرے عہد کے قلم کارو۔۔۔۔! کچھ تو قلم کی آبرو کا خیال کرو۔۔۔ کچھ۔۔۔ کچھ۔۔۔! افسانوں پر اپنا تبصرہ سمیٹتا ہوں۔۔۔ اللہ حافظ!

☆☆☆

شخصی رباعیاں

[خورشید اکبر کے نام]

● سلطان اختر

صد رشکِ ہنر جادو بیانی خورشید
غزلیں ہیں کہ موجوں کی روانی خورشید
اب تیری طرح کوئی نظر آتا نہیں
میں لاؤں کہاں سے ترا ثانی خورشید

شائستۂ الفاظ و معانی خورشید
غزلوں میں جھلکتی ہے جوانی خورشید
ترکیب نئی ہے تو تر و تازہ خیال
کرتا ہی نہیں بات پرانی خورشید

طاؤسِ تمنائے حسیں کو بھی سمیٹ
نظارۂ خوش خوابِ یقیں کو بھی سمیٹ
جب آ ہی گیا ہے یہ "فلک پہلو میں"
بکھری ہوئی اب اپنی زمیں کو بھی سمیٹ

گزریں گے شب و روز سکندر کی طرح
جی کر تو کبھی دیکھ قلندر کی طرح
بکھرے ہیں ترے دل میں جو افکارِ جمیل
چمکیں گے وہ ذرّاتِ منور کی طرح

دیتی ہی نہیں ہے تجھے فرصت خورشید
سیماب صفت تیری طبیعت خورشید
تھکتے ہی نہیں ہیں کبھی شہپر تیرے
صد رشکِ بلندی تری عظمت خورشید

〈۱〉

'آنکھیں آہن پوش' : ایک جائزہ

● صبا اکرام [پاکستان]

ناہید سلطان مرزا نے جس طرح اپنے پہلے ناول ''دشت ندا کے مسافر'' میں بغداد کے ماضی میں دور گہرائیوں تک سفر کیا ہے اور اک مرکزی کردار شہزاد کے وسیلے سے گزرے وقتوں کی ثقافتی فضا کو زندہ کرنے کی کوشش کی ہے، ٹھیک اسی طرح زیرِ نظر ناول ''آنکھیں آہن پوش'' میں انھوں نے مرکزی کردار زرّیں تاج، اس کی ماں مہر تاج اور نانی تہمینہ کے کرداروں کے ذریعے ایران کی تین نسلوں کے ادوار کی تہذیبی اور سیاسی تصاویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ تہمینہ کا کردار اپنے ساتھ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ ساتھ لے کر آیا ہے، مہر تاج بادشاہت کے دور اور اسلامی انقلاب کے آغاز کے زمانے کی علامت ہے۔ جب کہ زرین تاج انقلاب کے فوراً بعد کے ایران کا تاریخی اور سیاسی پس منظر ساتھ لے کر آتی ہے۔ اور جب وہ کہتی ہے: ''میں زرین تاج، آج کی زرین تاج ہوں جو کسی اندھے کنویں میں نہیں لٹکائی جاؤں گی، یہ زرین تاج اپنی تاریخ خود رقم کرے گی۔'' تو یہ ناول تینوں زمانوں پر محیط محسوس ہوتا ہے۔

ناول کے آغاز ہی میں زرین تاج کو زندان کی ایک کوٹھری میں دکھایا گیا ہے۔ وہاں ایک کونے میں لگے ایک چوہے دان میں پھنسا ایک چوہا نظر آتا ہے۔ یہ چوہا کافکا کے کاکروچ یا احمد ہمیش کی مکھی جیسی علامت کے طور پر سامنے نہیں آتا ہے۔ وہ تو ایسا چوہا ہے جو زرین سے مکالمہ بھی کرتا ہے۔ وہ بھی اس سے باتیں کرتی ہے، اس کی باتیں سن کر وہ کہتی ہے:

''تم چوہے ہو یا دانشور؟''

زرین کی ایک طنزیہ نظم ''مُتّقی دنیا کے کتوں کے نام'' سننے کے بعد وہ بھی ایک نظم پیش کرتا ہے، جس کی چند سطور یہاں نقل کر رہا ہوں، آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ بہت سی باتوں کو براہ راست بیان کرنے کی بجائے ایک اشاراتی اسلوب کی اپنایا گیا ہے:

کیا صرف وہی دہشت گرد ہیں
جو بازاروں میں بم پھاڑتے ہیں
کچھ گھروں اور مسندِ اقتدار کی۔
پناہ گاہوں میں روپوش ہیں
جن کی سوچیں ٹائم بم ہیں
جن کے خیالات بارودی سرنگیں ہیں

....

....

مذہب ان کی ڈھال ہے
جنت ان کی باندی ہے
اور وہ دوزخ کے چوکیدار ہیں۔
جس کو چاہیں دہکتی آگ کے کھڈ میں ڈھکیل دیں۔

یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ خود کلامی یا Soliloqui کے ذریعے شاید یہ ساری باتیں سامنے نہیں آسکتی تھیں، لہٰذا چوہے کو Create کیا گیا، یہی اس کا جواز بھی ہے۔

قید خانے میں کپڑوں کے ساتھ اس کے نانا کی ڈائری بھی آگئی تھی، جسے پڑھ کر اس کو پتہ چلا کہ اس کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟ کس طرح اس کا نانا نوشیرواں ہندوستان سے برٹش آرمی کے ایک فوجی ٹولے کے ساتھ ایران آیا تھا جہاں ایک ایرانی عورت تہمینہ نے اس کی زندگی بدل دی، اور جس سے زرین کی ماں مہر تاج نے جنم لیا یہ زمانہ دوسری جنگِ عظیم کا ہے۔ کرنل جیمز انڈین رائل آرمی کے سو (۱۰۰) سپاہیوں کے ساتھ، جو پٹھان اور پنجابی تھے اور چار کپتان جن میں نوشیرواں، شہباز، دلیر سنگھ اور ویر سنگھ، شامل تھے لے کر، ایران پہنچتا ہے۔ انھیں تبریز جانا ہے تاکہ وہ نازیوں اور ترکوں کو ایران میں داخل ہونے سے روک سکیں۔ کرنل جیمز کا خیال ہے کہ کیسپین سی کے کنارے چلتے ہوئے تبریز پہنچنا محفوظ ہوگا۔ یہاں سے آگے بڑھتے ہوئے قاری کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ناول کی کہانی کے ساتھ سفرنامے سے بھی گزر رہا ہے۔ دشت لوشہر یزد، دشتِ کادیر، خراسان، مشہد، اصفہان اور شہر حافظ وسعدی شیراز وغیرہ سے گزرتے ہوئے کرنل جیمز وہاں کے تاریخی، ثقافتی اور معاشرتی پس

منظر سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کرتا جاتا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں اس نے ایک عرصہ گزارا ہے۔ اس حوالے سے چند سطور مثال کے طور پر نقل کرنا چاہوں گا، ملاحظہ فرمائیں:

''آج یہ بے ضرر جگہ ہے لیکن کسی زمانے میں خوف و دہشت کی آماجگاہ تھی، اسلامی دنیا اس جگہ سے خوف زدہ تھی یہاں پہنچنا مشکل تھا اور جو پہنچ جاتا وہ واپس نہ آتا یہاں جنت بنائی گئی تھی، حسن بن صباح کی جنت، اس علاقے کو وادی الموت بھی کہتے ہیں۔''

ایک اور مختصر سا اقتباس:

''راستے میں پھر ایک خانہ بدوش پڑاو ملا۔ جمیز نے اپنی معلومات کا دریا بہاتے ہوئے کہا: ''یہ قشقئی قبیلہ ایران کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ وہ سنٹر ایشیا سے فارس آئے، یہ گھوڑوں کی تربیت بہت اچھی طرح کرتے ہیں۔ عورتیں قالین بُننے میں ماہر ہیں۔''

اس ناول میں شہر یزد میں مٹی کے گھر اور ان کے قریب بُرج خموشاں اور زرتشتوں کے سب سے بڑے مرکز کا بیان بھی ہے، اور ادھر سے مارکو پولو اور ابن بطوطہ کے گزرنے کے بارے میں بھی قاری کو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ شاہ عباس صفوی کی بنائی ہوئی سرائے زین الدین سے بھی اس کا گزر ہوتا ہے۔ اور کیسپہ کی خوبصورتی کا نظارہ بھی کرتا ہے۔

تبریز جس کی خوبصورتی کو باغ عدن سے تشبیہ دی جاتی ہے، وہاں اس فوجی ٹولے کا قیام کچھ طویل ہوتا ہے، کیوں کہ فوجی تربیتی اداروں میں ایرانی فوجیوں کی تربیت کرانی تھی۔ یہیں ایرانی کرنل سہراب اور اس کی بیٹی تہمینہ کے کردار سامنے آتے ہیں۔ نوشیر کی تہمینہ میں دلچسپی اور میل جول میں اضافہ ہوتا رہا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب آتے رہے۔ ایک دن کرنل سہراب نے مشہد جانے کی خبر سنائی تو نوشیر بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ وہاں امام رضا کے روضے کی عقیدت اور احترام وہ بچپن سے سنتا آیا تھا۔ اس کے آباو اجداد ہمایوں کی فوج کے ساتھ یہیں سے ہندستان آئے تھے۔ چونکہ کرنل سہراب اور اس کی بیوی شیبے بھی نوشیرواں کو پسند کرنے لگے تھے، لہٰذا وہیں روضے کے اندر دونوں کی شادی انجام پاتی ہے۔

جنگ کے ختم ہونے کے بعد جیمز لندن چلا جاتا ہے، دلیر سنگھ اور ویر سنگھ اداس تھے، کیوں کہ وہ گئے تو لاہور سے تھے، مگر واپسی پر پتہ چلا کہ ہندستان کی تقسیم کے بعد ان کا شہر پاکستان میں شامل ہو گیا ہے، لہٰذا دونوں کو ہندستان جانا پڑا۔ نوشیر تہمینہ کو لے کر اپنے گھر پاکستان کے صوبہ میں پہنچتا ہے تو ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے، باپ نے ملنے سے انکار کر دیا اور ماں بہو کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ تہمینہ کو نوشیر کے قدامت پسند خاندانی ماحول میں گھٹن ہونے لگی تھی۔ دس (۱۰) سال بعد اس کو بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام مہر تاج رکھا، تہمینہ اُسے نوشیر کی گود میں ڈال کر واپس ایران چلی گئی اور ایک بے حد دولت مند ایرانی بہروز پیروز سے شادی کر لی۔ مگر جب سنہ پینسٹھ کی جنگ میں نوشیر شہید ہو گیا تو وہ پاکستان آ کر بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ جاتے وقت اس کے سسر نے کچھ کاغذات

دیئے جو نوشیر نے اپنی بیٹی مہرتاج کے لیے چھوڑے تھے۔

اب وہ ایک الگ ہی دنیا میں آگئی تھی اس گھر میں کافی عیش و آرام تھا، مگر سارے لوگ الگ مزاج الگ رویوں کے تھے۔ اس کے سوتیلے بھائی بہن اُسے غیر ضروری شئے سمجھتے تھے۔ تہمینہ اُسے ایک مہنگے اسکول میں داخل کرا دیتی ہے جہاں اس کی فیروزہ سے ملاقات ہوتی ہے، جو اس سے کہتی ہے: 'دنیا کا مقابلہ کرنا سیکھو'۔ فیروزہ ایک غریب لڑکی تھی جس کی ماں قالین بُننے کا کام کرتی تھی اُسے ایک امیر شخص، جس نے اس کی بڑی بہن سے منع کیا ہوا تھا، اس کی ذہانت اور تعلیم سے لگاو دیکھ کر اس کا داخلہ اس مہنگے اسکول میں کرا دیا تھا، بعد میں اُسے اسکالرشپ مل گیا۔ مہرتاج یونیورسٹی میں پہنچتی ہے تو نئے دوستوں سے ملاقات ہوتی ہے جو انقلاب کا پرچار کرتے ہیں۔ اس کی دوست فیروزہ اشتراکی انقلاب کی بات کرتی ہے، جبکہ مہرتاج اسلامی انقلاب کی پرچارک ہے۔ ایک دن یونیورسیٹی ڈے کی تقریب میں انقلاب کے پمفلٹ بانٹتے ہوئے پولیس اُسے گرفتار کر لیتی ہے۔ اس کا سوتیلا باپ جس کے شاہی خاندان سے مراسم تھے، چاہتا ہے کہ تہمینہ اُسے عاق کر دے۔ مگر اس کے کافی سمجھانے پر اس کو پولیس کی حراست سے چھڑوا لیتا ہے۔ اس کے انقلابی دوستوں مین ایک فریدوں بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں، چونکہ مہرتاج سوتیلے باپ کا گھر چھوڑ کر فریدوں کے یہاں آگئی تھی لہٰذا فریدوں کی ماں کے اصرار پر دونوں کا نکاح ہو گیا۔ ان کے یہاں جو بچی پیدا ہوئی اس کا نام زرین تاج رکھا گیا۔

مہرتاج ایران، عراق جنگ کے دوران فریدوں کی شہادت کے بعد ایک ایرانی، امریکی بزنس مین سے نکاح کر لیتی ہے اور زرین تاج کا داخلہ ایک امریکی اسکول میں کرا دیتی ہے۔

ناہید سلطان مرزا کے یہاں علامتی پیرایہ ویسا نہیں جیسا کہ خالدہ حسین، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ اور زاہدہ حنا کے یہاں استعمال ہوا ہے، مگر بدلتی ہوئی دنیا کی جھلک پیش کرنے کے لیے انھوں نے کرداروں کو بڑی ہنرمندی سے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ناول میں کچھ اور آگے جا کر دیکھیں گے کہ فرہاد جسے زرین تاج چاہنے لگتی تھی، وہ سوچ کی پستی اور بزدلی کی علامت بن کر سامنے آیا ہے جب کہ ایران میں مقیم دوست، جس سے اُس کی دوستی فیس بک پر ہوتی ہے، وہ دانش اور وسیع الذہنی کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

Anthony Trollope نے اپنے Autobiography میں ناول میں کردار نگاری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "He (novelist) Desires to make his readers so intimately acquainted with his characters that the creatures of his brain should be to them speaking, moving, living, human creatures. This he can never do unless he knows those fictitious personages himself, and he can never know than unless he can live with them in full reality of established intimacy. They must be with him as he lies down to sleep, and as he wakes from his

dream. He must to argue with them, quarrel with them, forgive them, and even submit to them."

ناہید سلطان مرزا نے دو ایک دن نہیں، دو ایک ماہ نہیں بلکہ پورے پانچ برس سوتے جاگتے اِن کرداروں کے ساتھ گزارے ہیں۔ انھوں نے دیباچے میں ایک جگہ کہا ہے:

"پانچ سال میں نے تاریخ پڑھنے، ناول لکھنے اور پھاڑنے میں گزارے ہیں۔"

امریکہ پہنچ کر مہر تاج اپنی ماں کی طرح سوشل اور ایکٹیو ہوگئی۔ وہ وہاں ریستوران چلاتی تھی، جہاں ایرانی کھانوں سے لطف اندوز ہونے زرین کے اسکول کا ساتھی فرہاد بھی اکثر آجاتا تھا۔ اس کا باپ ایک ایرانی صنعت کار تھا جو انقلاب کے بعد امریکہ آ کر بس گیا۔ فرہاد اور وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ انھی دنوں فیس بک پر زرین کی دوستی جمشید سے ہو جاتی ہے جو ایران میں قانون کا طالب علم ہے۔ وہ ایران کی خوبصورتی کی تعریفیں کرتا اور اُسے اپنی شاعری لکھ کر بھیجتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ زرین تاج پر اثر انداز ہوتا گیا۔ اسی دوران اس کی چچازاد، بہن ہدا سے اس کی ملاقات ہوتی ہے جو ایران سے یہاں پڑھنے آتی ہے۔ دوسری ملاقات اس سے ایرانی سنٹر میں ہوتی ہے جہاں کسی عالم دینی کا درس تھا۔ اس کے بعد وہ اکثر وہاں جانے لگی، اس میں تبدیلی آنے لگی تھی، جس کا احساس اس کی ماں مہر تاج کو اس وقت ہوا جب اس نے پہلی بار اپنے سر پر حجاب لیا۔ پردے کے بارے میں احکامات کی وہ باتیں کرنے لگتی ہے۔ ندا اسے روکتی ہے، مگر وہ نہیں مانتی، کہتی ہے:

"یہ امریکہ ہے یہاں ہر شخص کو بولنے اور کچھ بھی کہنے کی آزادی ہے، اپنی مرضی سے جو چاہو کہو۔ آزادیِ اظہار سب کو یکساں حاصل ہے۔"

اپنے والد کے خوف سے ان تبدیلیوں کے باعث فرہاد اس سے دور ہوتا گیا زرین اس سے علیحدگی کی بات جمشید کو بتاتی ہے تو وہ کہتا ہے:

"جو مرد کمزور ہو اور اپنے فیصلے خود نہ کر سکتا ہو وہ کسی لڑکی کا مستقبل کیسے محفوظ بنا سکتا ہے؟"

وہ ایران جانے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس کے اصرار پر مہر تاج بھی اس کے ساتھ ایران جاتی ہے۔ دونوں کا استقبال امام خمینی ایئرپورٹ پر جمشید کرتا ہے، جو اب وہاں کا ایک کامیاب وکیل ہے، دانشوری اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ زرین اُسے پسند کرنے لگتی ہے۔ یہاں اس پر ہر گھڑی انٹیلی جنس والوں کی نظر ہوتی ہے لہٰذا وہ امریکہ میں اپنی ماں اور ملنے والوں سے رابطے منقطع کر دیتی ہے۔ جمشید اُسے جب ایک روز اپنی محبت کا یقین دلانا چاہتا ہے تو وہ کہتی ہے:

"تم جو سب کہہ رہے ہو سب اچھا لگتا ہے مجھے بھی، لیکن اب میں ان سب چیزوں کے پیچھے جا لگی ہیں، جو زندگیوں کو بدصورت بناتے ہیں، انھیں خوبصورت بنانا چاہتی ہوں۔ میرا مقصد زندگی کو اپنی نہیں، دوسروں کی خوبصورت بنانا ہے۔"

ایک روز اسے بیماری کی حالت میں کچھ لوگ، جن کے چہروں پر لمبی داڑھی، اور سر پر عمامہ تھا، اسے

اُٹھا کر لے جاتے ہیں، اس سے سوال کرتے ہیں کہ وہ کس کے لیے کام کرتی ہے کیا کیا معلومات باہر بھیجی ہے؟ ایران کی پولیس کو شک تھا کہ امریکہ کی اتنی اچھی زندگی چھوڑ کر یہاں کی خاک چھاننے کیوں آگئی ہے؟۔ وہ چھ مہینے سے جیل میں تھی۔ ندا نے باہر عورتوں کو اکٹھا کیا اور کیمپن چلائی، مظاہرے کیے اور پمفلٹ تقسیم کیے، اور وزراء سے ملاقاتیں کیں۔ اور آخر کار زندان سے اُسے رہائی نصیب ہوئی۔ اس ملاپ کے بعد جب جمشید مہر تاج سے پوچھتا ہے: ''آپ خوش ہیں خانم مہر تاج؟ تو وہ کہتی ہے: ''ہاں، اپنی بیٹی کی طرح مجھے دوسری زندگی ملی ہے۔'' یہ سوال جب وہ زرین سے کرتا ہے، تو وہ کہتی ہے:

> ''خوش اور خوشی بہت چھوٹا لفظ ہے، آج میں ہواؤں میں اُڑ رہی ہوں۔ میں نے اپنے خوف کو شکست دے دی ہے، آج میری فتح کا دن ہے۔ آج ایران کی اس گمشدہ نسل کا دن ہے جو مایوس ہو کر گم کردہ راہوں کی مسافر بن چکی تھی یہ میری ماں اور میری نسل کے ملاپ کا دن ہے۔ آج ہم نے اپنے گمشدہ ایران کو پالیا ہے۔''

یوں تو اس ناول کا آغاز دوسری جنگِ عظیم کے زمانے سے ہوتا ہے، مگر ماضی میں بہت دور زرتشت کے زمانے کی پرچھائیوں کو بھی یہ اپنے دامن میں سمیٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ناہید سلطان مرزا نے اس کی جزئیات ایران کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ سیاسی پس منظر سے بھی تلاش کی ہیں، اور بڑے فنکارانہ انداز میں ان کا استعمال کیا ہے۔ انھیں اسلامی انقلاب کا ادراک بھی ہے، اور اس کے بارے میں ان کے تجزیاتی COMMENTS بھی سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے زرین تاج کے کردار کے حوالے سے ایران کے تغیر آشنا حال کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ''آنکھیں آہن پوش'' کو ایک تاریخی اور تہذیبی ناول کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ویسے اس میں جا بجا Feminist رویّے کی جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں، مگر یہ غالب رجحان نہیں۔

نوٹ: [ہندی کے معروف ناول نگار وبھوتی نرائن رائے کی صدارت میں کراچی میں منعقد ''آنکھیں آہن پوش'' کی تقریبِ رونمائی میں جولائی ۲۰۱۵ء میں پیش کیا گیا مضمون۔]

☆☆☆

صبا اکرام کا نیا پتہ:

Saba Ekram [Najmul Haque] ,
A-201- C , Grey Garden, 3rd Floor ,
Block-16 , Gulistan-e-Jauhar ,
KARACHI- 75290 [Pakistan].

☆☆☆

〈۲〉

انشائیہ کی روایت

● عبدالقیوم، اٹک [پاکستان]

ہندوستان میں بالآخر صنف انشائیہ پر بھرپور اور صحیح سمت میں رہنمائی کرنے والی کتاب بعنوان ''انشائیہ کی روایت: مشرق و مغرب کے تناظر میں'' تصنیف کر کے مشہور مزاح نگار، انشائیہ نگار، مترجم اور نقاد محمد اسداللہ چار بہترین انشائیہ نگاروں کی صف میں شامل ہوگئے ہیں۔ جن میں سے تین کا تعلق پاکستان سے ہے:

۱۔ انشائیہ کے خدوخال (وزیر آغا مرحوم)

۲۔ انشائیہ۔ اردو ادب میں (انور سدید)

۳۔ اردو میں انشائیہ نگاری (بشیر سیفی مرحوم)

(۴) انشائیہ کی روایت۔ مشرق و مغرب کے تناظر میں (محمد اسداللہ)

یوں محمد اسداللہ کو یہ اعزاز حاصل ہوگیا کہ وہ واحد انشائیہ نگار ہیں جنھوں نے انشائیہ کے مدلل اور آسان لب و لہجے میں صحیح خدوخال واضح کر کے ہندوستان میں کسی بھی زبان میں انشائیہ لکھنے کے لئے منارہ نور کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔

محمد اسداللہ بھارت کے صوبہ مہاراشٹر کے قصبہ ورود ضلع امراوتی، میں ۱۶ر جون ۱۹۵۸ء کو پیدا ہوئے۔ یعنی ان کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی جب صنف انشائیہ کا باقاعدہ آغاز اردو ادب میں نہیں ہوا تھا۔ البتہ وزیر آغا انشائیے تخلیق کر رہے تھے۔ اسی لئے ۱۹۶۱ء میں انشائیوں کا پہلا مجموعہ 'خیال پارے' منظر عام پر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ یوں صنف انشائیہ محمد اسداللہ کے ہوش سنبھالنے سے بہت پہلے پاکستان میں پھلنے پھولنے لگا تھا۔ ہندوستان کے مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشا پہلے ادیب تھے جنھوں نے اس صنف کو اختیار کر کے کئی انشائیے تخلیق کیے۔ ان کے علاوہ رام لعل نابھوی مزاح کی راہ سے انشائیہ کی طرف آئے اور پھر محمد اسداللہ جو طنز و مزاح لکھتے تھے اس صنف کی طرف متوجہ ہوئے۔ اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے مذکورہ تینوں انشائیہ نگار طنز و مزاح کی راہ سے اس طرف آئے۔ افسوس کہ احمد جمال پاشا اور رام لعل نابھوی اس دنیائے فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ یقیناً ہندوستان کے کچھ اہل قلم معیار سے قطع نظر اپنی دانست میں انشائیے لکھ رہے ہوں

گے۔ لیکن چونکہ 'اوراق، لاہور' کی اشاعت بند ہونے کے بعد نئے انشائیہ نگاروں کی رہنمائی کرنے والا موجود نہیں اس لئے صورت حال اتنی ہمت افزا نہیں۔

بہر حال امید رکھنی چاہئے کہ محمد اسد اللہ کی گراں قدر تصنیف ' انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں' منظرِ عام پر آنے سے ہندوستان کے ذہین اور انشائیہ سے محبت کرنے والے اہلِ قلم اس کی روشنی میں اس صنف کو نئی زندگی دینے میں کامیاب و ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ یہ کتاب انشائیہ کے جتنے اسرار و رموز کھولتی ہے۔ اس سے نئے انشائیہ نگار مستفید ہو کر کامیاب انشائیہ تصنیف کرنے میں سرخ رو ہوں گے۔

انشائیہ پر پہلی قابلِ قدر کتاب 'انشائیہ۔ اردو ادب میں' ڈاکٹر انور سدید کی منظرِ عام پر آئی۔ ڈاکٹر بشیر سیفی کا پی ایچ ڈی کا مقالہ، 'اردو میں انشائیہ نگاری' شائع ہوا۔ اول الذکر کتاب کا سالِ اشاعت ۱۹۸۵ء ہے جب کہ ثانی الذکر کا ۱۹۸۹ء۔ یوں تو ڈاکٹر سید حسنین کی کتاب 'صنف انشائیہ اور انشائیے' بھی اولیت کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس صنف کی جزئیات کو کچھ نہ کچھ اجاگر کیا گیا ہے۔ اسی طرح 'اردو کا بہترین انشائی ادب' ڈاکٹر وحید قریشی کا مرتب کردہ مجموعہ بھی اس صنف کے بارے میں پرانی اور نئی معلومات رکھتا ہے۔ تاہم انشائیہ کے بارے میں وحید قریشی مرحوم کی وسیع النظری اس صنف کے حقیقی اجزا سے متصادم ضرور ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے سید ظہیر مدنی کی مرتبہ کتاب 'اردو ایسیز' میں ان کا مقدمہ اس صنف کے بارے میں متوجہ کرتا ہے۔ مشکور حسین یاد کی کتاب 'ممکنات انشائیہ' میں اس صنف کے بارے میں کچھ اجزا متوجہ کرتے ہیں۔ البتہ وہ جوش خطابت میں اصل انشائی روپ کا چہرہ بگاڑ دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف انشائیہ نگار نہ ہونے کے باوجود ڈاکٹر سلیم اختر کی انشائیہ پر کتاب 'انشائیہ کی بنیاد' اس لئے قابلِ توجہ ہے کہ انھوں نے اہم غیر ملکی نقادوں سے استفادہ کیا ہے اور اس صنف کے بارے میں کافی حد تک صحیح سوچ سے کام لیا ہے۔ بہر حال مشکور حسین یاد سے زیادہ سلیم اختر کی کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

بلاشبہ ڈاکٹر انور سدید کی تصنیف 'انشائیہ۔ اردو ادب میں' اب تک اس صنف پر شائع ہونے والی کتابوں میں زیادہ مواد کے علاوہ اس میں انشائیہ نگاروں کا تذکرہ بھی مفصل سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ انگریزی انشائیہ اور انشائیہ نگاروں پر ان کا اظہارِ خیال قاری کے ذہن میں وسعت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر بشیر سیفی مرحوم کی کتاب 'اردو میں انشائیہ نگاری' کافی اہمیت کی حامل ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کہیں کہیں مذکورہ دونوں کتابوں میں پرانے انشائیہ نگاروں کے بارے میں تفاوت کا حامل مطالعہ دلچسپ ہے۔ اس سلسلے میں ایک مثال میں مذکورہ دونوں ناقدین ہی نہیں بلکہ تیسرا محمد اسد اللہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ تینوں اہل قلم کی عبدالحلیم شرر کے بارے میں رائے درج ذیل ہے:

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر انور سدید 'انشائیہ اردو ادب میں' میں عبدالحلیم شرر کے بارے میں لکھتے ہیں:

عبدالحلیم شرر کے مضامین میں لٹے ہوئے ماضی کی خیالی سطح پر باز آفرینی کا رجحان نمایاں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی جو نعمتیں ان سے بر سر عام چھین لی گئی تھیں شرر نے انھیں تاسف کے بعد اپنے مضامین میں دوبارہ حاصل کرنے کی کاوش کی۔ مثال کے طور پر ان کے مضمون عمرِ رفتہ (اس کے بعد آٹھ سطور کا اقتباس نقل کیا گیا ہے) شرر کے مضامین کی کیفیت داخلی ہے۔ ان میں احساسِ ملال زیادہ ہے اور مسرت کی کرن پیدا نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان مضامین کا انشائیہ سے واسطہ بہت کم نظر آتا ہے۔[صفحہ ۱۲۹]

محمد اسد اللہ

محمد اسد اللہ کی کتاب 'انشائیہ کی روایت۔ مشرق و مغرب میں کے تناظر میں' شرر کے متعلق متوازن اور قابلِ قبول اظہارِ خیال مسرت آمیز حیرت سے نوازتا ہے:

'شرر کے مضامین میں صالح اقدار کی جستجو فطرت پسندی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ شگفتگی اور بے ساختگی شرر کی تحریر کی اہم خصوصیات ہیں۔ فطرت کے مظاہر کی منظر کشی اور جزئیات نگاری میں مصروفِ ہیں سے لطف اندوز ہونے کا رویہ ان کے مضامین میں لذت اور سرور پیدا کر دیتے ہیں۔ لالہ خودرو اور نسیم سحر میں نفسِ مضمون کو مختلف پس منظر میں رکھ کر اس کی مختلف جہتوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان کے مضامین میں اس قسم کے خالص انشائی جملے بھی پائے جاتے ہیں۔ نسیم سحر کے متعلق لکھتے ہیں:

'' تو کیسی اچھی اچھی جگہ تیرا گزر ہوتا ہے اور تو کیسی کیسی لطف کی صحبتوں میں پہنچ جاتی ہے۔ تو آزادی کا نمونہ، محبتوں کا بے باک ہاتھ یا ہماری تمنا ہے۔''

شرر کا اسلوب تشبیہات اور استعاروں سے گندھا ہوا ہے موضوع کو مضمون کے پس منظر Kaleidoscope میں رکھ کر اس کی مختلف سطحوں سے ایک دلکش ڈیزائن بنانے کا رویہ شرر کے مضامین اور لالہ خودرو میں نمایاں ہے۔ شرر کے مضامین میں سوگواری فضا کے پہلو بہ پہلو شوخی بھی ہے اور اصلاحی رنگ بھی مگر اس میں ایذ دہندگی کا خطرہ نہیں بلکہ نرمی اور احساس کی نفاست موجود ہے۔ عبدالحلیم شرر اپنے مضمون 'نمیں' میں ایک انوکھے موضوع کو الٹ پلٹ کر روز مرہ زندگی میں استعمال ہونے والے اس لفظ

'نہیں' کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اسے پڑھ کر ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ ہم نے کبھی اس طرح اس پر غور نہیں کیا۔ غور تو اس بات پر کرنا ہے کہ یہ لفظ آسانی سے بلاؤں کو ٹال دیتا ہے۔[صفحہ ۱۵۹-۱۶۰]

بشیر سیفی

نیاز فتح پوری نے میر ناصر کے مضامین میں انشائیہ کے اوصاف کی بہ نسبت سب سے زیادہ موجودگی کی وجہ سے انھیں اردو کا پہلا انشائیہ نگار قرار دیا تھا۔ لیکن بشیر سیفی نے اپنی کتاب 'اردو میں انشائیہ نگاری' میں ثبوت اور دلائل سے نیاز فتح پوری کے فیصلہ کو احسن طریقے سے رد کیا ہے وہ کہتے ہیں:

'میر ناصر علی کے جن مضامین میں انشائیہ کے اوصاف نمایاں ہیں وہ سب ۱۹۰۸ء کے بعد لکھے گئے اور صلائے عام میں شائع ہوئے۔ جب کہ عبدالحلیم شرر کے ایسے مضامین جن میں انشائیہ کے اوصاف موجود ہیں ۱۹۰۸ء سے بہت پہلے ۱۸۸۷ء اور ۱۸۸۹ء کے دوران دلگداز میں شائع ہوئے اس لحاظ سے شرر کو میر ناصر پر فوقیت حاصل ہے۔'

ثبوت کے طور پر انھوں نے انشائیہ کی خصوصیات والے متعدد مضامین مثلاً کل، انتظار، لالہ خودرو ،اوخیال یار جاتا ہے کہاں، اور آسمان کی نشاندہی کی ہے۔ شرر کے مضامین کے متعلق لکھتے ہیں:

ان مضامین میں آزادہ روی سے کام لینے کے علاوہ موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ نیز یہ انشائیے تخلیقی تازگی کا نمونہ بھی ہیں ۔اہم بات یہ ہے کہ شرر نے بات سے بات پیدا کرنے کی خصوصیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے معمولی موضوعات کے حوالے سے اہم قومی معاملات کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ یوں ان کے انشائیے براہِ راست وعظ و تبلیغ کے الزام سے بچ گئے ہیں۔ شخصی زاویہ نگاہ ان کے انشائیوں میں نمایاں ہے۔ اسی لئے شرر کو اردو کا پہلا کامیاب انشائیہ نگار کہنا غلط نہ ہوگا۔ آخر میں ان کے انشائیہ 'او خیال یار جاتا ہے کہاں' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

'خیال ایک وہمی پیکر کا نام ہے۔ جس کو واقعیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ واقعیت بھی خیال کے طابع ہے۔ تجربہ خیال کی گود میں پلتا ہے اور کل واقعات خیال کے قائم کیے ہوئے مسودہ اور خاکہ کی پابندیوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یہی خیال ایک طرف آسمان کے تارے توڑنے کو خیال

کیا جاتا ہے اور دوسری طرف سمندر کی تہہ میں پہنچتا ہے کہ اس کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور قیمتی سے قیمتی خزانے نکال لائے [صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۷]

'انشائیہ کی روایت' کے پیش لفظ میں محمد اسد اللہ نے مختصر انداز میں متضاد خیالات کو بڑی ہنرمندی سے سمویا ہے۔ چند قاشیں پیش لفظ سے حاضر ہیں:

۱۔ اردو ادب میں انشائیہ کا ظہور اور تاریخی اعتبار سے اردو میں مضمون نگاری کے فارم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا سلسلہ نئے انشائیہ نگاروں تک پہنچتے پہنچتے جن نشیب و فراز سے دوچار ہوا اس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انگریزی انشائیہ کے برعکس شخصی اور ذاتی اظہار کا رواج اردو میں بہت تاخیر سے شروع ہوا۔

۲۔ انشائیہ یورپ کے نشاۃ الثانیہ کی پیداوار ہے اسی لئے اسے فکری آزادی اور ندرت اظہار کا علمبردار خیال کیا جاتا ہے۔

۳۔ انگریزی ایسے ہی کی طرح مضمون نگاری کے فارم کو بھی اردو میں صحافت نے اپنا کر پیش قدمی کی اردو کے برعکس انگریزی صحافت کے میدان میں موجود ادیبوں مثلاً اسٹیل، ایڈیسن، ہزلٹ، چیسٹرٹن اور رابرٹ لنڈ وغیرہ ادیبوں کی ایک نسل نے روزمرہ کی خبروں سے آگے بڑھ کر انشائیہ کو دشت امکان میں تمنا کا دوسرا قدم بنا دیا۔ اس کے برعکس اردو میں اودھ پنچ کے دور میں مخصوص صحافیانہ مزاج نے اسے ضلع جگت، پھبتی اور طنز و تعریض کا خوگر بنایا۔

۴۔ اردو انشائیہ سے متعلق نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کے نظریات اپنی انفرادیت کا احساس دلانے کے باوجود انشائیہ کا واضح تصور پیش کرنے سے قاصر رہے۔ ڈاکٹر اختر اورینوی نے اکبر علی قاصد کی کتاب ترنگ کے دیباچہ میں انشائیہ کو پہلی مرتبہ صحیح طور پر اردو میں متعارف کروانے کی کوشش کی لیکن تخلیقی مواد کی پرکھ میں وہ بھی پوری طرح کامیاب نہ ہو پائے۔

۵۔ راقم الحروف کے نزدیک انشائیہ مغرب سے درآمد شدہ صنف ہے البتہ ہماری تہذیبی روایات اور زبان و ادب نے اس پر اپنے تاثرات مرتسم کر کے انشائیہ کو اپنانے کی کوشش کی اس لئے اس

میں ہماری مٹی کی بو باس بھی در آئی ہے۔

'مغرب میں انشائیہ کی روایت' میں مصنف نے سولہ انشائیہ نگاروں میں سے آٹھ انشائیہ نگاروں کا ذکر اور انشائیوں کے اقتباس تو دیئے ہیں لیکن باقی آٹھ انشائیہ نگاروں کو اس سلسلے میں نظر انداز کر کے مختصر بیان پر اکتفا کیا۔ یوں یہ حصہ بجھا بجھا سا لگتا ہے۔ 'حاصل مطالعہ' میں ان سب کے متعلق اظہار خیال بھی اس کمی کی وجہ سے متاثر نہیں کرتا۔

عہد سرسید میں انشائیہ نگاری میں کل نو اہل قلم شامل ہیں۔ انسے متعلق 'حاصل مطالعہ' میں محمد اسد اللہ نے درست اظہار خیال کیا ہے:

'عمومی طور پر ان ادیبوں نے انشائیہ کی ان بنیادی خصوصیات کو اپنی تحریروں میں مستحکم کر کے اردو میں انشائیہ کی جڑیں مضبوط کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ چنانچہ کسی ایک مخصوص انشائیہ نگار کو انشائیہ کا نمائندہ قرار دینے کے بجائے انیسویں صدی میں تخلیق ہونے والی مذکورہ انشا پردازوں کی تحریروں کو انشائیہ کا اولین نقش قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔'

'بیسویں صدی میں انشائیہ نگاری' میں تیس اہل قلم شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔۔جن کی تحریروں میں انشائیے کی اا کثر واضح جھلکیاں ملتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی مکمل انشائیہ نگار نہیں تھا۔

'عصری انشائیہ' میں بتیس انشائیہ نگاروں کا تذکرہ ہے جن میں سے پانچ ایسے انشائیہ نگار ہیں جو انشائیہ کی اصل روح سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ محمد اسد اللہ کی کتاب 'انشائیہ کی روایت' کا یہی حصہ سب سے زیادہ قابل توجہ، معتبر اور کتاب کی روح کا درجہ رکھتا ہے۔

'انشائیہ کی روایت'، کے بعد اس سلسلے میں ایک اور کتاب ہندوستان کے انشائیہ نگار لکھیں تو انشائیہ کی جڑیں مظبوط ہو سکتی ہیں اور یہ کام فی الحال ہندوستان کے واحد انشائیہ نگار محمد اسد اللہ ہی انجام دے سکتے ہیں۔ مصنف کو اس سلسلے میں اپنی محنت و مشقت کے علاوہ دیگر اہل قلم کی مدد سے اس کام کا آغاز کر دینا چاہئے۔ میرے خیال میں اکادمیاں اس پراجکٹ میں مدد ضرور کریں گی کہ ہندوستان کی اکادمیاں اور کرتا دھرتا دلچسپی ضرور لیں گے جبکہ ہمارے ہاں کا معاملہ دیگر ہے۔ یہاں پر ادب کو فروغ دینے والی قوم جلد از جلد سیمناروں اور دیگر ممالک کے اہل قلم کو مدعو کر کے رقوم ڈکار لیتی ہے اور بغیر حساب کتاب برابر کر دیتی ہے۔ جس طرح اس کتاب کی اشاعت میں اکادمیوں نے مدد کی ہے، اگلی کتاب کے سلسلے میں بھی تعاون کیا جا ئے گا۔ اس کا مجھے یقین ہے۔

☆☆☆

﴿۳﴾

رئیس الدین رئیس کا 'بے خواب شہر'

• **فرزانہ خان نیناں**، نوٹنگھم [انگلینڈ]

رئیس الدین رئیس اُردو شاعری کے حوالے سے انڈیا میں مقیم ایک معتبر و معروف نام کے حامل شاعر ہیں، اس وقت میرے زیرِ نظر ان کا مجموعۂ کلام ''شہرِ بے خواب ہے'' کی نظمیں، غزلیں اور رُباعیات ہیں جو احساس کے چراغوں کی روشنی میرے اردگرد پھیلا رہی ہیں، سادہ کاغذوں پر تصویریں بنا رہی ہیں، پرندوں کو پیڑوں سے ہجرت پر آمادہ ہوتے دیکھ رہی ہوں۔ اس شہرِ بے خواب میں تعبیروں کی آس ہے، چہرے آئینوں سے لگے ہوئے ہیں، جذبوں کا سمندر اُمڈ رہا ہے، لکھنے والا کبھی سکندر تو کبھی قلندر کا روپ دکھا رہا ہے۔

میں نے عمر کی سب سانسوں میں تیرا ہی اک نام لیا ☆ غافل تو حو سے بھی نہیں تھا بھولا تجھ کو کب اللہ
تیری عنایت سے کہتے ہیں مجھ کو رئیس الدین رئیس ☆ تیری عطا سے ہوا ہے روشن میرا نام و نسب اللہ

یہ الفاظ حمد و ثنا کے حسن سے معمور ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کے عکاس ہیں کہ رئیس الدین کی شخصیت میں عاجزی گندھی ہوئی ہے، جذبہ، شوق اور ریاضت کے بغیر تخلیق ممکن نہیں ہوتی اور تخلیق کار اس ضمن میں سب سے پہلے اپنے خالق کے آگے سربسجود ہوتا ہے۔ جس کے صلے میں اس کو بھی فن کی دولت ودیعت ہوتی ہے۔ اس دولت کے ملنے پر اس کا استعمال سلیقے اور ہنر سے مزید نکھرتا ہے، رئیس الدین رئیس کی تمام شاعری میں خوب سے خوب تر کی جست صاف نظر آتی ہے، ان کا رنگِ سخن جا بجا مفہوم کے پینترے بدل بدل کر جاگزیں ہو رہا ہے۔ اس طرح کے نقش الفاظ کے ذریعہ ابھارنا کوئی آسان کام نہیں، اس پر موضوعات کی وسعت اور تنوع ہم سے بیساختہ داد طلب ہے:

رہے ہیں روح کی مانند میرے ساتھ رئیس ☆ مشاہدات قلم اور ورق قرینِ خیال

کتاب کا مطالعہ قافیوں اور ردیف کے منفرد استعمال اور جدید لہجے میں ڈھلتا گیا جو کہ کم ہی شعرا کا خاصہ ہے، برتے ہوئے الفاظ کو نیا جامہ پہنا کر خوبصورت و عمیق موضوع سمیت شعر کہنا مذاق نہیں، سپنوں اور آدرشوں کی پرورش کرتی ہوئی شاعری آپ کو اپنے اندر جذب کرنے لگتی ہے، ان کے اشعار فقط شعری فضا نہیں تخلیق کر رہے بلکہ زندگی کی سچائیوں کی جانب رُخ موڑنے پر مجبور کرتے ہیں:

میں پڑھ رہا ہوں نئے وقت کی نئی تہذیب ☆ ادب ہو پیشِ نظر کیوں مری نگاہ جھکے

وہ جس سے زخم ملے ہیں رئیس اسی کی طرف	نہ جانے کیوں یہ مسلسل دل تباہ جھکے

☆

میں سنگ و خشت ہوا ہوں جسے بنانے میں	وہی مکان گرائیں گے یہ مکیں اک روز

☆

رئیس الدین رئیس کے فن میں آفاق گیری کی صفت بھی خوب ہے، ستارے گننے کا عمل انسان کی تنہائیوں میں غالباً فطری ہے جسے شعر میں طرح طرح سے باندھا گیا ہے لیکن یہاں درج ذیل اشعار ذرا دیکھیے کہ سائنس جیسا ٹھوس موضوع کس حسن و خوبی سے مصرعوں میں آتر آیا ہے:

شروع ہونے کو ہے کوئی سلسلہ امروز	کہ محوِ خواب ہوا خود ہی شاہ زادہ شب

سکوتِ دشت کی تنہائیوں کو گنتے رہو	سیاہیوں میں ستارے ہوئے زیادہ شب

دنیائے شعر میں استاد شعرا کے اشعار کی بے نظیر مثالیں موجود ہیں، اس کے باوجود اپنی باتوں کو کہنا اور رموز و نکات سمیت نئے انداز سے کہنا اعلیٰ درجے کی شاعری ہے۔

مولانا روم جس دور میں ایک بزرگ شمس تبریز سے ملے اس وقت وہ قونیہ میں استاد تھے، بزرگ سے ملتے ہی ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ ان کے مرید بن گئے کیونکہ بزرگ شمس تبریز نے ان پر باطنی علوم کا دروازہ کھول دیا تھا۔ جب وہ چلے گئے تو مولانا روم سے خود بخود اشعار موزوں ہونے لگے، ان کی جدائی میں سوز و گداز کی کیفیت ایک عالم وارفتگی میں شعر کہلوانے لگی جو کہ عرصہ دراز تک جاری رہی جس کے نتیجے میں ان کی مثنویات دنیا کے سامنے آئیں۔

سو شاعری کرنے والا جب تک جوش و سرمستی کے عالم سے واقف نہ ہو تب تک اچھا شعر موزوں نہیں کر سکتا، رئیس الدین رئیس کی شاعری پوری جامعیت کے ہمراہ، زندگی، عشق اور خواب و خیال میں موجزن ہے:

درد اٹھا ہے میرے سینے میں	تم بھی محسوس کر رہی ہو کیا

آئنہ رکھ کے اپنے آنگن میں	چاند معکوس کر رہی ہو کیا

رنگ بکھرے پڑے ہیں منظر میں	رقصِ طاؤس کر رہی ہو کیا

☆

کیا سوچ کر بھر آئیں بتا دے تری آنکھیں	برسات میں لگتا ہے دھنک بھیگ رہی ہے

☆

نظر اٹھاؤ ذرا چاند پارہ پارہ کرو	اور اپنی آنکھ میں روشن کوئی ستارہ کرو

☆

ہوا میں کیسی یہ نغمگی ہے فضا میں بکھری ہیں خوشبوئیں سی ☆ کہ شاخِ دل پر غریب غنچہ نجانے کیسے چٹک گیا ہے

☆

رئیس روح کے رشتے بھلا وہ کیا جانیں | جو صرف صنفِ مخالف کو جسم جانتے ہیں

☆

دل میں محبتوں کے اُجالے نہ تھے صفر | یہ میرے سچے پیار کے قصے نہ تھے صفر
کرتا تھا جو میں تیری عبادت نہ تھی صفر | اے میرے ہمنشیں مری الفت نہ تھی صفر

☆

دعائے موسمِ گُل خیمہ زن تھی ہونٹوں پر | مگر یہ دشتِ خزاں ہی مرا مقدر تھا

☆

رُخِ جمیل پہ زلفیں بکھیرنے والے | کچھ امتیاز تو شام و سحر میں رہنا تھا

☆

عشق بے گانۂ آداب نہیں ہو سکتا | یہ سمندر کبھی بے آب نہیں ہو سکتا

☆

رئیس الدین رئیس کا شمار دورِ حاضر کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے، اس شاعری کو بلا شبہ ادب کے بلند پایہ مقام پر رکھا جا سکتا ہے، فصاحت، بلاغت اور ادبی روایات کا بہاؤ کلام میں جا بجا نمایاں ہے، حقائق کی نئی توجیہہ پیش کی گئی ہے، آپ کا کلام انگوٹھی میں نگینے کے مترادف کئی الفاظ و اشعار سے مزین ہے، اس مجموعے میں شامل بیشتر اشعار ہمیں وجدان کی جانب لے جاتے ہیں، شعور و آگہی کو اجاگر کرنے میں صاحب کتاب کی شخصیت سے روشناس ہونے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، مشاہدۂ فطرت، اور علم سے ان کا سینہ کشادہ ہے، تمام شاعری مزاج، رویے اور کیفیت سے بھرپور ہے، موضوعات کا دائرہ وسیع ہے۔

شاعر اگر غیر مجسم کی تجسیم الفاظ کے ذریعے کرلے تو یہ اس کے کمالِ فن کا انمٹ ثبوت ہوتا ہے۔ ان کی بیانیہ قوت انتہائی اعلیٰ درجے کی ہے، استعارات، تشبیہات، علامات کا استعمال منطق کے ہمراہ کیا گیا ہے، قاری کا تخیل کئی بار معاشرتی سطح کی بہتری پر غور کرنے نکل جاتا ہے، جدید اور عہد حاضر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ادب کے ذریعے سماجی رویوں تک تبدیلی کی ترسیل کی جائے:

پکار و تو یہ دریا چلو بھر ہے | سمندر بھی ابھی تسخیر ہو جائے

☆

لوٹ کر آتے نہیں ہیں کبھی دریا واپس | کون بتلائے سمندر میں نمک کیسے ہے
تو نہ تاجر نہ مہاجن تو بتا مجھ کو رئیس | تیرے اطراف میں سکوں کی کھنک کیسے ہے

☆

اک عرصہ چھپایا ہے بدن پتوں سے ہم نے　　　اب جاکے کہیں صاحب پوشاک ہوئے ہیں

☆

یہ ارتقا ہے کہ دورِ زوال ہے کیا ہے　　　ہر ایک چہرے پہ گردِ ملال ہے کیا ہے

☆

یہ فکر و شعور کا میل ہی انسان کو ادراک کی جانب دھکیلتا ہے، ایک اچھا شاعر انسانی کیفیات تک دسترس حاصل کرلے تو اس کا کلام ادبی حوالے سے آئندہ نسلوں کے لیے بھی مثالی و تدریسی روپ اختیار کر جاتا ہے، شاعر ذہنی گتھیوں کو کھولتا ہے اور لکھتا ہے، اگر وہ اس میں کامیاب ہو جائے تو پڑھنے والے اسے خود بخود قابل قدر اور امر کر دیتے ہیں، وقتی طور پر داد و تحسین کے ڈونگرے سمیٹنا قطعی مشکل نہیں ہے لیکن جو کام نسلوں تک قائم رہے وہ دیانت اور محنت کا طلبگار ہوتا ہے:

اگر یہ مہر و وفا جھوٹ ہے تو بول رئیس　　　ردائے عشق شکاری کا جال ہے کیا ہے

☆

تمام عمر ہی شیشہ گری میں گزری ہے　　　میں سنگ زاد نہیں تھا جو چور ہو جاتا

☆

ہر ایک صنعت و معنی کی قسم جانتے ہیں　　　وہ ہم ہی ہیں جو غزل کا طلسم جانتے ہیں

☆

عبادت فقط گھٹنوں کے بل بیٹھ کر سجدوں یا ہاتھ اُٹھانے سے دعا کی قبولیت میں نہیں تبدیل ہو جاتی، یہ تو جب پوری ہوتی ہے جب آپ میں کوئی احساس ہو، بدن میں اس کی تھرتھراہٹ دوڑے، شاعری بھی عبادت و دعا کے بین ایک کیفیت ہے، محبت سے بھرپور ایک آواز ہے۔ بہترین دوست ہے، رب کی بندگی ہے:

کیے تو سجدے اس آستاں پر رئیس تو نے　　　مگر یہ کیا ہے جبیں سے تیری ہے داغ غائب

تو شاعری کا سچائی سے رشتہ ہے، انسان اپنے آپ کو ہی کھوج لے، اس کے اپنے اندر پوری کائنات ہے، حقیقت ہے تو کبھی خواب، انسان کے اپنے اندر منظر ہیں، سرسبز زمیں ہیں، دشت و صحرا ہیں، پیاس بھی ہے اور سیرابی بھی، سکوت ہے تو کبھی شور، پارہ ہے تو کبھی جامد، تعلق ہے تو کبھی لاتعلقی:

باندھ رکھا ہے مصروفیت نے رئیس　　　کس سے ہو رابطہ شہر بے خواب ہے

☆

اسے مطالعہ کرنے کو ہے صدی درکار　　　پڑھے گا کون یہاں میرا گوشوارۂ آگہی

☆

مری ہی کرب رتوں نے کیا شکار مجھے — بہا کے لے گیا اشکوں کا آبشار مجھے

☆

"مشورہ"

بہت دنوں سے خموش ہو تم / غزل کہی ہے نہ نظم ہی کوئی لکھی ہے تم نے /
خود اپنے اندر ہی گھٹ رہے ہو / یہ آبشار اور بہتے دریا /
لپکتے جھرنے ہمکتے بادل / بہت سے چہروں کے کچھ تاثر /
بہت سے لہجوں کی گھن گرج اور / گل ریز کچھ لبوں کی صدائیں تم سے /
شکوہ کناں ہیں / یہ کہہ رہی ہیں /
چلو ذرا زندگی کے سچے مناظر / ہمیں دکھاؤ
قلم اٹھاؤ، قلم اٹھاؤ۔!!!

☆

رئیس الدین رئیس کا کلام بلا تخصیص پختگی و علمیت کا مظہر ہے۔ ان کی شاعری تخلیق کے سنہرے ناظر سے سجی ہے، الفاظ کے رنگ پڑھنے والوں کی بینائی کو خوشگواریت عطا کرتے ہیں، اس کے خواب گردش کرتے نظر آتے ہیں، امیدوں کے سائبان ملتے ہیں۔ کہیں کہیں مایوسی کے رستے بھی موڑ کاٹتے ہیں، من بنجارہ تا ہے تو ماضی کی زنجیر پیروں میں الجھ جاتی ہے۔ چھلیت پر خواہش کا تالاب بھر جائے تو گھر پھوٹ کر آنکھوں سے یہ نکلتا ہے، محبت کے چراغ روشن ہو کر کسی نام کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ احساس کے پردوں سے زلیخائیں جھانکتی ہیں، اس عہد کے یوسف اگر بکنے لگیں تو خون کا سیلاب آجاتا ہے، دور فضاؤں میں کوئی لکیر روشن ہوتی ہے تو کوئی تارہ آکاش سے ٹوٹ بھی جاتا ہے، سادھو صفت فقیروں کے چنگل میں پھنسی قوم کی بیماری پر فکر انگیزیت بھی عود کر تی ہے۔ اس مجموعے میں شامل کئی نظمیں دعوت مطالعہ دیتی ہیں، مجھے قوی امید ہے کہ اُردو ادب میں شعری والوں سے رئیس الدین رئیس کا نام زندہ و تابندہ رہے گا۔

☆

"بدن کہانی"

بدن کہانی کو لکھنے والو / بدن کہانی کو کیا لکھو گے / زمیں پہ جب تک ہے اُگتا گندم /
بدن کہانی ابھی ہے ادھوری / کئی مورخ بھی جا چھپے ہیں / اسی زمیں میں /
جہاں سے گندم اُگا رہے ہو / یہی بدن ہے، یہی مورخ / یہی کہانی ہے بس بدن کی...!!!

[رئیس الدین رئیس]

☆☆☆

〈۴〉

'تفہیم وتقلیب' : تنقیدی شعور کے تناظر میں

● ڈاکٹر معصوم شرقی

ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی اکیسویں صدی کے ایک جواں فکر شاعر، ادیب، محقق اور ناقد کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ شاعری اور تنقید دونوں کے ساتھ ان کا نیاز مندانہ رویہ انھیں معتبر بناتا ہے۔ ان کے تنقیدی قلم کی اٹھان اور انتقادی کاوشیں بڑی سرعت سے منزل کی طرف رواں ہیں۔ ان کی شعری تخلیقات کم اور تحقیقی وتنقیدی مضامین زیادہ شائع ہوئے۔ تجزیہ، تحقیق اور تنقید پر مشتمل اب تک چار کتابیں شائع ہوکر شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ''نقوش وآثار'' ان کا اہم ادبی کارنامہ ہے۔ ظفر اوگانوی کے فن وشخصیت پر مختلف مکاتب فکر کے تحریر کردہ مقالے کو انہوں نے کتابی شکل دی اور ایک مبسوط مقدمہ سپرد قلم کیا جو ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ اس مقدمے میں انہوں نے بہترین نثر اور فصیح اردو استعمال کر کے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ان کی نثر تازگی اور روانی کا خوبصورت نمونہ بن گئی۔ اس کتاب کی تکمیل میں انھوں نے خوش اسلوبی، ہمت اور دیانت داری سے جو کام انجام دیا ہے وہ انھی کا حصہ ہے۔ تنقید کی دنیا میں ان کے بے شمار تنقیدی مضامین اخبارات ورسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔ لیکن ان کے تنقیدی رویے کا مکمل اظہار ''تفہیم وتقلیب'' سے ہوا جو ان کی تنقیدی بصیرت بلکہ علمیت کا واضح ثبوت ہے۔ انھوں نے عملی تنقید کے ذریعہ ایک قابل قدر مثال قائم کی ہے۔ متذکرہ کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں شامل تمام مضامین میں شاید ہی کوئی مضمون ایسا ہو جس کو عاصم شہنواز نے گہرے غور وفکر، انہماک اور خلوص سے تحریر نہ کیا ہو۔ کتاب کے مشمولات نفیس ہیں جو چھ ابواب میں منقسم ہیں۔

والٹر پیٹر نے تنقید کے متعلق تین امور بیان کیے ہیں: ''پہلے تو نقاد کو شاعر وادیب اور اس کے فن پارے کی خوبیوں پر غائر نظر سے کام لینا چاہیے۔ دوسرے اس کا بھرپور تجزیاتی مطالعہ کرنا چاہیے۔ تیسرے ان اوصاف کو منظر عام پر لانا چاہیے''۔

تنقید کے دو جز ہیں: پہلے کو موضوع یعنی کیا اور کیسا بیان کیا گیا اور دوسرے کو ہیئت یا اسلوب کہتے ہیں۔ تنقید میں ہیئت کی اہمیت زیادہ ہے کیونکہ ہیئت ہی موضوع کو قاری تک پہنچاتی ہے۔ عاصم شہنواز ہیئت کے قائل ہیں:

''عملی تنقید کا کام یہ ہے کہ شاعر اور ادیب کی ان کوششوں کو جنھیں انھوں نے دانشورانہ بلندی پر لے جا کر کہیں اشاروں کنایوں میں اور کہیں مفکرانہ طور پر پیچیدہ طرز بیان کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کی اس طرح وضاحت کردے کہ فکر وفن کے تمام گوشے منور ہوجائیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی انفرادی فنکاری اور بصیرت کے راز بھی عیاں ہوسکیں۔'' ['سماجی تنقید اور تنقیدی عمل' : سید محمد عقیل رضوی، ص ۱۶۸]

مذکورہ بالا قول عاصم شہنواز کی ناقدانہ بصیرت پر منطبق ہوتا ہے۔ تنقید اور تحقیق کا رشتہ بڑا گہرا ہے۔ تخلیق کے بطن سے تنقید کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ تنقید کی دنیا میں ناقد کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ عاصم شہنواز نے اپنے تنقیدی طریقہ کار سے پورا انصاف کیا ہے۔ وہ ایک کھلے ذہن کے نقاد ہیں۔ ادب اور تنقید کے بارے میں ان کا ایک نقطہ نظر ہے جسے وہ پورے اعتماد کے ساتھ پیش کرتے ہیں لیکن دوسرے نقطہ ہائے نظر کو بھی خندہ دلی سے قبول کرتے ہیں۔ ان کا اردو ادبیات کا مطالعہ عمیق ہے اسی لئے وہ ہر رجحان اور رویے کو ادب کی صحت مند اقدار کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ عاصم شہنواز کسی فن پارے کو صرف کھلی آنکھوں ہی سے نہیں دیکھتے بلکہ اس کے رگ و ریشے میں اترنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، اپنا نظریہ خود پیش کرتے ہیں، نظریوں سے سچ کو نکالتے ہیں، تجزیہ کرتے ہیں پھر آزادانہ اظہار کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے مضامین ہم عصر مسائل، ادب اور ادیب، اردو افسانہ اور عصمت چغتائی کا شعور، آل احمد سرور کی انتقادی بصیرت، وہاب اشرفی ادب سے دانشوری تک، کلیم حاذق: اردو تنقید کا نیا باب، اور ہمایوں اشرف کے تنقیدی جہات وغیرہ۔

اس مجموعے کا پہلا مضمون 'ہم عصر مسائل': 'ادب اور ادیب' ایک اہم مضمون ہے جس میں معاصر ادب پر خیال انگیز بحث کی گئی ہے۔ عاصم شہنواز رقمطراز ہیں:

''اگر ادب زندگی کا آئینہ ہے تو ادب کو ہمیشہ معاشرے کی تہذیبی، فکری، سیاسی اور اقتصادی رویوں کا ہم نوا ہونا چاہیے لیکن آج مصلحت، مفاد اور ترجیحات ہم پر اس قدر غالب ہیں کہ ہم نے ادب کا رخ اس جانب موڑ دیا ہے۔ جس سے ادب بے اثر اور بے جان ہو گیا ہے اور اس کا سماجی رشتہ کمزور اور ضعیف ہو گیا ہے۔ جس نے ہماری تہذیبی و تمدنی روایات و اقدار کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے''۔

شاعری کے ذیل میں انھوں نے 'نئی غزل: اشارات و امکانات' اور 'مغربی بنگال میں اردو غزل: آزادی کے بعد' میں غزلوں کی اہمیت اور مضامین غزل کے تعلق سے جو انھوں نے سیر حاصل بحث کی ہے، وہ ان کی علمیت اور انتقادی صلاحیتوں کی غماز ہے۔

'شہر کی جمالیات اور میر' ایک کامیاب مقالہ ہے۔ میر کسی معمولی بات کو فنکارانہ صلاحیت سے غیر معمولی بنا دیتے ہیں۔ شہر کے تعلق سے شہر فہمی میں اس مقالے کو ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ عاصم شہنواز نے بہادر شاہ ظفر، میراجی، وفا ملک پوری اور احسان دربھنگوی کی غزل گوئی کا بہت ہی مفصل جائزہ پیش کیا ہے۔ جو ان کی ناقدانہ ژرف نگاہی کا پتہ دیتا ہے۔

جمیل مظہری جدید مرثیہ نگاری میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں ان کے شعری وجدان بالخصوص ''آب و سراب'' پر عاصم شہنواز نے شرح و بسط کے ساتھ مقالہ پیش کیا ہے اور مثنوی کی تفہیم و خصوصیات کو محنت اور سلیقہ سے اجاگر کرنے کی خاص کامیاب کوشش کی ہے۔ عصری حسیت و مسائل، واقعۂ کربلا کا علامتی اور استعاراتی استعمال، مکالماتی اسلوب اور اپنے عہد کی ناہمواریوں کو واقعۂ کربلا کا سیاق و سباق عطا کر کے نیز اپنے عہد کو کربلا سے منسلک کر

کے جمیل مظہری نے جدید مرثیے کو نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ عاصم شہنواز نے جمیل مظہری کی مرثیہ نگاری کا جائزہ دور جدید کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نئی شاعری کے حوالے سے شہریار کی غزلیہ شاعری کا محاسبہ بڑے خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔ شہریار ہمارے عہد کے معتبر شاعر تھے۔ ان کی شاعری نئے شعور اور نئے مزاج کی مصوری کا حق ادا کرتی ہے۔ ان کی غزلیں شگفتگی، خوش آہنگی اور بے ساختگی کا عمدہ نمونہ ہیں۔

سلطان اختر ہمارے عہد کے برگزیدہ شاعروں میں ہیں۔ ان کی غزلیں اپنی لفظیات، اپنے طرز بیان اور اپنے رموز وعلائم کے اعتبار سے موجودہ غزل گوئی کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ ف۔ س۔ اعجاز موجودہ اردو غزل کی ایک معتبر آواز ہیں۔ ان کے یہاں تازگی اور ندرت کے ساتھ احساس کی سچائی بھی ہے اور اس کے پس پردہ فکر وشعور بھی ہے۔ شہریار، سلطان اختر اور ف۔ س۔ اعجاز کی فن شناسی اور تعین قدر کے سلسلے میں عاصم شہنواز شبلی نے بڑی دقیقہ سنجی کے ساتھ خامہ فرسائی کی ہے۔

عرفان صدیقی نئی غزل کے معماروں میں تھے لیکن انھیں ہماری تنقید نے قبول نہیں کیا، کیونکہ وہ کسی تحریک یا لابی سے وابستہ نہیں رہے۔ ان کی شعری خصوصیات میں، ڈکشن کی نفاست، شعور حیات کی رعنائی اور تصور عشق کی تہذیب ان کے اشعار سے مترشح ہے۔ کسی زمانے میں عرفان صدیقی کا یہ شعر زبان زد خاص و عام تھا:

رات کو جیت تو سکتا نہیں لیکن یہ چراغ
کم سے کم رات کا نقصان بہت کرتا ہے

عاصم شہنواز شبلی نے عرفان صدیقی کے فن وشخصیت کو اپنی تحریر کی قلمرو میں شامل رکھا، میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

عاصم شہنواز نے اردو فکشن کا مطالعہ نہایت سنجیدگی اور دل جمعی سے کیا ہے۔ وہ کسی بھی ادب پارے کے تعلق سے اپنی رائے پیش کرنے کے لئے مناسب دلیلیں اور ٹھوس حوالے پیش کرتے ہیں۔ وہ کوئی دعویٰ بے دلیل نہیں کرتے بلکہ اپنے بیان کی تصدیق کے لئے اپنے پیش رووں کے مستند اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ ان کی پیش کش کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ اپنی تنقید کو عالمانہ مزعومات سے گراں بار نہیں کرتے۔

عاصم شہنواز معاملہ 'ادب' میں کسی سے مرعوب ہوئے بغیر بے لاگ اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہیں۔ ضمناً چند مثالیں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

''لحاف'' عصمت چغتائی کا مشہور افسانہ ہے جسے اردو کے ناقدین نے شاہکار کا درجہ حاصل دیا۔ مشہور ترقی پسند ناقد عزیز احمد نے عصمت کے دیگر افسانوں کے ساتھ 'لحاف' پر بھی انگشت نمائی کی جسے عاصم کے نقطہ نظر نے گوارہ نہیں کیا اور وہ یوں گویا ہوئے:

''عصمت چغتائی کے بارے میں عزیز احمد کی رائے حقیقت پر مبنی نہیں ہے کیونکہ عصمت کے یہاں جو

عریانی اور فحاشی ملتی ہے، وہ سستی یا بازاری عریانی نہیں ہے بلکہ حیرت انگیز فنی پختگی اور حقیقت نگاری کے اعجاز کے دلیل ہے۔عصمت کی افسانہ نگاری کی مخالفت غلط ہے۔عریانی کے باوجود عصمت کا شمار اردو کی بہترین افسانہ نویسوں میں ہے۔جو لوگ ان کے اس رجحان کی وجہ سے تمام خوبیوں سے انحراف کرنے لگتے ہیں، دراصل ان کا ادبی شعور خوابیدہ ہے اور ان کا ذہن حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا"۔[ص:۱۶۰]

مشہور ناقد خلیل الرحمن اعظمی اور مشہور ادیب پطرس بخاری کے بھی اعتراضات سے عاصم کو اختلاف ہے۔لہٰذا وہ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں:

"لیکن صحیح معنوں میں ایسی کوئی بات نہیں "لحاف" پر ان دونوں حضرات کی رائیں غلط ہیں۔دونوں محترم حضرات نے اس افسانے کا ڈوب کر مطالعہ نہیں کیا اور اس افسانے کی اوپری سطح تک ہی محدود ہو کر رہ گئے۔اسی لئے وہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔دراصل 'لحاف' میں ہمارے سماج میں ہونے والے ایک ایسے المیے کو پیش کیا گیا ہے جو ایک بے جوڑ شادی کا نتیجہ ہے۔پختہ عمر اور جنسی کمزوریوں کے نواب صاحب جنسی لحاظ سے ناکارہ تو نہیں ہیں لیکن اپنی جنسی تسکین کے لئے وہ ایک غیر مہذب طریقہ اپناتے ہیں۔وہ اپنی بیوی سے شاید زیادہ تسکین نہیں پا سکتے ہوں اس لئے وہ اپنی بیوی کے بجائے نوجوان لڑکوں کے ساتھ رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور ان کے ساتھ زیادہ خوش رہتے ہیں۔مجبوراً نواب صاحب کی بیوی بیگم جان بھی اپنی جنسی تسکین کے لئے اپنے شوہر کی طرح غیر مہذب اور غیر فطری طریقہ اپناتی ہیں۔وہ اپنی گھریلو ملازمہ کے ساتھ جنس پرستی کا رشتہ بنا لیتی ہیں"۔ [ص: ۱۶۴]

عاصم شہنواز کی یہ ادبی دیانت داری ہے کہ اپنے پیش رووں کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے عہد کے معروف قلمکاروں کو بھی احاطہ تحریر میں رکھا اور نہایت سنجیدگی سے ان کے فن کا جائزہ پیش کیا۔انھوں نے مشتاق اعظمی ،شائستہ فاخری اور عشرت بیتاب کے افسانوں کے غائرانہ مطالعے کے بعد ان کا مقام متعین کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔

عاصم شہنواز کے تنقیدی افکار کو سمجھنے کے لئے "باب تنقید" کا مطالعہ ناگزیر ہے۔اس باب کے سارے مضامین ان کی عملی تنقید کا عمدہ نمونہ ہیں۔عاصم کی تنقید میں توازن ہے۔بے لاگ محاسبہ، نپے تلے انداز اور تنقیدی زبان کی رواں دواں عبارت کی شگفتگی ہے، جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔جس طرح فنکار لاشعوری طور پر ہمیشہ اپنے فن کی تخلیق و تزئین میں مصروف رہتا ہے عاصم شہنواز بھی دم تحریر تنقید کے تقاضوں کی تکمیل میں منہمک رہتے ہیں۔مولانا آزادؒ، آل احمد سرور، وہاب اشرفی، علی احمد فاطمی، مظفر حنفی، کلیم حاذق اور ہمایوں اشرف کے فن و شخصیت اور تنقیدی جہات کو خوب پرکھا اور جانچا ہے نیز ادبی تفہیم اور ادب کے تعین قدر کو اپنے دامن میں سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔انھوں نے ایک صاحب طرز ادیب کا فرض نبھایا ہے اور محنت و جستجو کے بعد ہی قلم اٹھایا ہے۔

باب شخصیات میں عاصم شہنواز نے وی شانتا رام، ادریس سنسبار وی، سلیمان خورشید، ناز قادری اور شان بھارتی کا شخصی خاکہ بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔پڑھتے وقت متذکرہ شخصیات کے خد و خال اور نقوش فن نظروں کے سامنے آجاتے ہیں۔یہ خاکہ نگاری کا کمال ہے۔

باب تجزیہ میں چار مشہور ادب پارے: 'بے چہرگی' 'سمندر کا بلاوا' 'سوا سیر گیہوں' اور 'پہاڑ پر ایک حادثہ' ہیں، جن کا عاصم نے اپنے مشاہدات، تجربات اور وسیع معلومات کی روشنی میں عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ یہ تجزیے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں خاصا کامیاب ہیں۔ 'سمندر کا بلاوا' کے پس منظر سے پہلے عاصم نے میراجی کے کوائف، داخلی کرب، انسانی نفسیات، حزن اور درماندگی کو ورطۂ تحریر میں لایا ہے پھر نظم پر عمیق نگاہ ڈالی ہے۔ عاصم اندھیرے میں تیر نہیں چلاتے بلکہ ادب پارے کے بطون میں پہنچ کر اسے صحیح تناظر میں پرکھتے اور داخلی خوبیوں کو آشکار کرتے ہیں۔ وہ تنقید کے منصب سے واقف ہیں اس لئے ان کے یہاں سطحیت کا گزر نہیں ہے۔ ان کے فرمودات میں شروع سے آخر تک ایک صلابت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں صاف صاف کہتے ہیں اور بغیر لاگ لپیٹ کے کہتے ہیں۔

انگریزی کے کسی مشہور دانشور کا یہ قول عاصم کی نذر کروں تو بیجا نہ ہوگا A GREYHEAD ON A YOUNG SHOULDER [جوان کاندھوں پہ سن رسیدہ سر]

بحیثیت مجموعی ''تفہیم وتقلیب'' ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی کا ایک اہم اور غیر معمولی کارنامہ ہے۔ اردو کے شعری وتنقیدی حلقوں میں اس کا خیر مقدم ہونا چاہیے۔

☆☆☆

﴿۵﴾

'نمائق' : ایک تنقیدی جائزہ

• پروفیسر منظر اعجاز

آفاق عالم صدیقی بساط ادب پر سرعت رفتار کے ساتھ نمایاں ہو رہے ہیں انھوں نے شاعری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ کچھ دنوں تک اسی راہ پر گامزن رہے۔ پھر افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے اور چند افسانے تحریر کیے اثنائے راہ مضمون نویسی کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی کے ہو کر رہ گئے۔ ایسے ہی ادبی مضامین کا مجموعہ ہے ''نمائق'' جس کا تعارف ''حرف چند'' کے تحت یوں پیش کیا گیا ہے:

''میری یہ کتاب وقتاً فوقتاً لکھے گئے میرے مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں کئی مضامین ایسے ہیں جو سالوں پہلے لکھے گئے تھے۔ مگر کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جو بالکل تازہ ہیں۔ میں نے مضامین میں کانٹ چھانٹ اور ردوبدل سے جان بوجھ کر گریز کیا ہے تاکہ اصلیت برقرار رہے''۔

آفاق عالم صدیقی نے اس کتاب میں شامل مضامین کی نوعیت اور کیفیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ: ''اس کتاب میں شامل مضامین کو اس معنی میں تنقیدی مضامین نہیں کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اپنا تنقیدی موقف واضح نہیں کیا ہے اور نہ میں نے کوئی تنقیدی مقدمہ قائم کیا ہے جس سے میرے تنقیدی

نظریات کی وضاحت ہو سکے۔ظاہر ہے کہ یہ ممکن بھی نہیں تھا کیونکہ یہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ایسے مضامین ہیں جنہیں صرف ایک قاری کا ردعمل کہا جا سکتا ہے۔''

آفاق عالم صدیقی کے اس انداز نظر سے ان کی معصومیت مترشح ہے ورنہ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے، یہ ادب پارے یا فن پارے کی پرکھ کا نام ہے۔لیکن پرکھ کا مطلب تنقیص کبھی نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق خوبیوں اور خامیوں کے تعین سے ہے، اسی تعین کو passing of judgement یا تعین قدر کہا جاتا ہے اور قدر کا تعین کرنے والا ناقد کہلاتا ہے لیکن یہ ناقد نہ تو سونے کے کھرے کھوٹے کی جانچ پڑتال کرنے والی بے جان کسوٹی ہوتا ہے اور نہ مقدار و اوزان کی جانچ کرنے والا باٹ کھرا۔نہ ہی Equation کی تحلیل اور جانچ کرنے والا Computer وہ ایک نامی سیال داخلی خارجی واقعہ ہوتا ہے جو ہر شے کی جانچ اپنے نقطۂ نظر سے کرتا ہے۔

آفاق عالم صدیقی نے بھی اپنے نقطۂ نظر سے مختلف شاعروں کے دوہوں، رباعیوں، غزلوں اور افسانوں کی جانچ پڑتال کی ہے اور اپنے تاثرات رقم کیے ہیں، جنھیں خود انھی کی زبان میں صرف ایک قاری کا ردعمل کہا جا سکتا ہے۔لیکن اس پہلو کو یہاں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایک نقاد بھی سب سے پہلے اور بنیادی طور پر ایک قاری ہی ہوتا ہے البتہ وہ عام قاریوں سے مختلف ایک ذہین قاری ہوتا ہے جس کی قرأت کا انداز بھی مختلف ہوتا ہے اور تاثرات کے اظہار کا اسلوب بھی منفرد ہوتا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ آفاق عالم صدیقی ایسے قاریوں میں اپنی الگ پہچان بنانے کی طرف مائل ہیں جیسا کہ ''نمائق'' کے مضامین کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے۔

''نمائق'' مختلف اوقات میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں مختلف شاعروں کی مختلف اصناف کے متعلق فنی کارگزاریوں کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک خاتون افسانہ نگار سلمیٰ صنم کے تین افسانوں پر بھی تجزیاتی طریق کار کو بروئے کار لایا گیا ہے۔

سلمیٰ صنم کے جن تین افسانوں کا تجزیہ آفاق عالم صدیقی نے کیا ہے ان کے عنوانات ہیں'' میری'' ''پگلہ'' اور ''مٹھی میں بند چڑیا'' پہلے اور تیسرے افسانے کے تجزیے میں تجزیہ نگار نے جس تفہیمی صلاحیت، تشریحی لیاقت اور تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا ہے، اس کے مقابلے میں دوسرے افسانے ''پگلہ'' کا تجزیہ تشنگی کا احساس دلاتا ہے، تاویل پر زور قلم صرف کرنے سے یہاں تجزیہ نگار نے گریز کیوں کیا؟ یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے اور گھٹ کر رہ جاتا ہے۔حالانکہ اس تجزیے کا آغاز جو ''میری'' سے ہوا ہے، وہ قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں نہایت ہی کامیاب نظر آتا ہے۔

''نمائق'' میں حافظ کرناٹکی سے متعلق مضمون میں فاضل مضمون نگار نے امجد حسین حافظ کرناٹکی کو ادب اطفال کے لئے وقف فنکاروں میں شمار کیا ہے۔اس سلسلے میں یہ عبارت قابل لحاظ ہے:

''اردو زبان ادب کی تاریخ پر سرسری نظر بھی ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہر عہد کے بڑے سے بڑے

فنکاروں نے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے، لیکن ایسے لوگ بہت کم ہوئے ہیں جنھوں نے خود کو ادب اطفال کے لیے وقف کر دیا ہے۔ امجد حسین حافظ کرناٹکی ایسے ہی معدودے چند فنکاروں میں سے ایک ہیں، انھوں نے اپنی زندگی ادب اطفال کے نام وقف کر دی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی ہی بچوں کی تعلیم و تربیت اور ان کے روشن مستقبل کی فکر سے عبارت ہے، یہی وہ چیز ہے جو ان کے وجود کو استحکام بخشتی ہے۔

''نمائق کے بیشتر مضامین مختلف رنگ و آہنگ کے غزل گو شاعروں کے تجزیہ اور تحلیل سے متعلق ہیں لیکن شروع ہی میں دو مضامین دوہا نگاروں کے سرمایۂ سخن پر قلم فرسائی کا نتیجہ ہیں۔ سب سے پہلے ''دھنک رنگ'' کے حوالے سے ساغر کرناٹکی کے دوہوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد شاد باگل کوٹی کے دوہوں پر انتقادی زاویے سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

کچھ سال پہلے ہائیکو، ماہیے اور ترائلے جیسی مغربی شعری اصناف کا اردو میں سیلاب سا آیا ہوا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وہ تھم سا گیا ہے اور ہندی الاصل دوہا اور فارسی الاصل رباعیات کی طرف پرانے اور نئے شاعروں کی توجہ خصوصی طور پر مبذول ہوئی ہے۔

'نمائق' میں ایک مضمون ابراہیم اشک کی رباعیوں کے متعلق بھی ہے۔ یہ مضمون قدرے مختصر ہے لیکن دوسرے بیشتر مضامین کے مقابلے میں زیادہ جامع ہے، چنانچہ اختصار میں جامعیت کا حسن بھی رکھتا ہے اور اثر بھی۔ ابراہیم اشک موجودہ نسل کے شاعروں میں بہت نمایاں ہیں، ان کی نثر بالخصوص تنقیدی نثر بھی جذب و کشش کی حامل ہوتی ہے۔ جہاں تک رباعیوں کا تعلق ہے یقیناً ان کی انفرادیت بھی نمایاں ہے۔ انھوں نے بعض روایتی مضامین کو بھی ایسی دلپذیر ندرت کے ساتھ پیش کیا ہے جس سے ان کی فنکاری ممتاز و منفرد نظر آتی ہے۔ مثلاً یہ رباعیاں:

افسوس زمانے میں نہ جینا آیا ہنسنے کا نہ رونے کا قرینہ آیا
احساس ہوا دل کو محبت کا جب اک سانس بھی لینے میں پسینہ آیا

اک ابر گہر بن کے برس جاتے ہیں ہر دل میں دھڑک جاتے ہیں بس جاتے ہیں
ایسا بھی کئی بار ہوا ہے لیکن اک سانس بھی لینے کو ترس جاتے ہیں

آفاق عالم صدیقی بڑی متانت و سنجیدگی اور دیانت کے ساتھ اپنے ناقدانہ تاثرات پیش کرتے ہیں اور اپنے مضامین کے ذریعے تاثراتی تنقید سے اپنا علمی رشتہ قائم کر لیتے ہیں۔ انکساری اور عجز کے سائے میں ان کا قلم سبک روی سے اپنا سفر طے کرتا ہے اور گرد راہ پر اپنے قدموں کے نشان ثبت کرتا چلا جاتا ہے۔

''نمائق'' کے بیشتر مضامین نئی نسل کے شاعروں اور ان کی شاعری سے متعلق ہیں یہاں آفاق عالم صدیقی کا وطیرۂ نقد و نظر اس طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس شاعر اور اس کے کلام کو موضوع نقد و نظر بناتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی امتیازی پہلو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اسے دوسرے ہم عصر سے ممتاز کرتا

ہے۔ پھر وہ اس محورِ فکر اور مرکزِ نگاہ سے اپنے طائرِ خیال کو ادھر اُدھر بھٹکنے کی آزادی عطا نہیں کرتے اس طرح وہ اپنے ایک مخصوص دائرے کا تعین کر لیتے ہیں۔ اور انتشار کی کیفیت سے اپنے تاثرات کو محفوظ رکھتے ہیں۔

اسی وطیرۂ خاص کے تحت انھوں نے انور مینائی، جاوید ندیم، خالد عبادی، افضل عباس، فیاض شکیب اور مشتاق صدف وغیرہ کی فکری وفنی خصوصیات کو نمایاں اور ان کے امتیازات کو روشن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

آفاق عالم صدیقی نے شاہ مدار عقیل کے نالۂ نیم شب کے مطالعے میں ہر چند کہ لمبی تمہید باندھی ہے اور انھیں تازہ کار شاعر قرار دیا ہے۔ باوجود اس کے ان کی فنی کمزوریوں پر مجمل سا اشارہ بھی کیا ہے۔ لیکن چند اشعار کے حوالے سے ان کے اعلیٰ معیار یا معیاری شاعری کی بھی نشاندہی کی ہے۔

''نشاطِ غم'' کے حوالے سے خلیل مامون کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے آفاق عالم صدیقی نے لکھا ہے:

> ''خلیل مامون کی تخلیقیت خیزی کے خمیر میں روایت آمیزی کے ساتھ ساتھ جدت خیزی کی بھی آویزش ہے۔ وہ متقدمین سے فیض حاصل کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اپنی تخلیقی مواجی سے اپنی انفرادی شناخت کا جواز قائم کرتے نظر آتے ہیں۔
>
> دلِ حزیں بھی کوئی تازہ قبر تھی جس پر
> شکستہ یادوں کے بکھرے ہوئے گلاب ملے
>
> کہیں کہیں پر خلیل مامون کی تخلیقیت خیزی کی زیریں لہر قنوطیت سے ہمکنار ہوگئی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خلیل مامون کی شاعری کی کیفیت یہی ہے تو پھر ''نشاطِ غم'' کا شاعر کہنے کا کیا جواز ہے؟ لیکن تاثراتی مضامین میں ایسی باتوں کی گرفت کوئی مستحسن تنقیدی عمل نہیں، اس میں تو قطعی استدلال اور قطعیت پسندی سے زیادہ جذباتیت ہی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ محولہ بالا عبارت میں تو انشاپردازی کے خاص رنگ کی جھلک بھی موجود ہے۔ ایسے ہی کئی رنگوں میں آفاق عالم صدیقی کے مضامین رنگے ہوئے ہیں جو انھوں نے معاصر غزل گویوں کی شاعری پر قلم بند کیے ہیں۔

آفاق عالم صدیقی نے شمیم قاسمی کے مجموعہ کلام ''اذان کے موسم'' کو جرأت اظہار کی ایک مثال سے عبارت کیا ہے۔ اور شاعروں کے حلقے میں ان کی قسم اور ان کی شاعری کی نوعیت کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

"شمیم قاسمی ایسے بے باک شاعر ہیں جو
اخلاقی اقدار کی دہائی دیتے ہوئے بدفعلی کی مرتکب
معاشرتی زندگی کو قبول کرنے اور اس کے عیوب پر پردہ
ڈالنے سے زیادہ اسے بیان کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔
انھیں اس جرأت اظہار کے لئے یقیناً داد دینی چاہئے۔"

آفاق عالم صدیقی نے "خوش اجاڑ" کے حوالے سے خالد عبادی کی شناخت قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالاں کہ خالد عبادی کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی بظاہر سلیس و سادہ لیکن بباطن نہایت ہی سنجیدہ اور تہہ دار ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی مکمل شناخت کا فی الحال کوئی امکان نہیں۔ البتہ قیاس آرائی ایک بات ہے۔ ویسے آفاق عالم صدیقی عبادی کے اشعار کو منطقی جواز کے طور پر پیش نظر رکھتے ہیں اور انھی کے حوالے سے عبادی کی شناخت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کوشش سر دست غیر مستحسن نہیں۔

خالد عبادی کا زور خود افکاریت پر ضرور رہا ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ اپنی منفرد شناخت یا نشان امتیاز قائم کرنے کے متمنی رہے ہیں لیکن یہ ایک مبہم سی اصطلاح ہے کیوں کہ کسی کے بھی افکار خالصتاً اپنے نہیں ہوتے۔ یہ وہ ساز ہے جس میں ماضی کا سوزِ نفس اور جذب دروں شامل رہتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ مایہ دار فنکار انھیں اپنی فنکارانہ ہنرمندی سے اس طرح اپنے فن میں جذب کر لیتا ہے اور اپنے احساس و جذبات کا رنگ ان پر اس طرح چڑھا دیتا ہے کہ وہ اس کے اپنے رنگ میں ڈھل کر ایک نئی چمک دمک حاصل کر لیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ خالد عبادی اپنے رنگ کو مقدم تصور کرتے ہیں اور اس کی چمک دمک کو کسی بھی طور زائل نہیں ہونے دیتے۔ یہی چیز ان کی فنکارانہ شخصیت کو امتیاز اور ان کے فن کو انفرادیت عطا کرتی ہے۔

آفاق عالم صدیقی نے ساجد حمید کو ان کی نظموں کے حوالے سے "زمین سے محبت اور مزاحمت کی ایک مثال" بنا کر پیش کیا ہے۔ ساجد حمید بھی ۸۰ء کے بعد ابھرنے والے شاعروں کی صف میں ہیں۔ اس دور کو عموماً مابعد جدید دور سے عبارت کیا جاتا ہے لیکن ساجد حمید کسی ازم یا آئیڈیالوجی کے قائل نہیں۔ اور جہاں تک ان کی شاعری کا تعلق ہے۔

جواں سال شاعروں میں نہایت ہی سنجیدہ و متین اور خوش فکر و خوش خیال شاعر عطا عابدی بھی ہیں جن کی کاوش قلم اور متاع سخن یقیناً لائق داد و تحسین ہیں۔ عطا عابدی فن اور زندگی دونوں کے رموز و اسرار سے واقف اور تنقیدی شعور سے بھی بہرہ مند ہیں۔ آفاق عالم صدیقی نے عطا عابدی کی شاعری کے حوالے سے

اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔ اوران کی شاعری کو زندگی کے خارجی مظاہر سے متعلق قرار دیا ہے۔

آفاق عالم صدیقی نے اسی سلسلے میں جاوید ندیم کے فکروفن کے چند پہلو پر اپنی نظر ڈالی ہے۔ جاوید ندیم شاعر کے علاوہ معاصر تنقید نگاروں کی صف میں نمایاں ہورہے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے بطور خاص اپنی نسل کے شاعروں کو متعارف کرانے اوران کے تعین اقدار کی بھی کاوش کی ہے۔ آفاق عالم صدیقی نے انھیں ہمہ جہت قسم کے فنکاروں میں شمار کیا ہے۔

آفاق عالم صدیقی نے جاوید ندیم کی تازہ کتاب ''خیال موسم'' پر بطور خاص اظہار خیال کیا ہے، جب کہ پس منظر کے طور پر جاوید ندیم کی سابقہ تصنیف ''موج خیال'' کی کیفیت وکمیت کا بھی تعارف کرایا ہے۔ آفاق عالم صدیقی کی اس تحریر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ''موج خیال'' پر قاریوں اور ناقدوں کے عمومی تاثر نے جاوید ندیم کو باور کرادیا کہ ''بنتی نہیں ہے بادہ وساغر کہے بغیر'' یعنی صنف غزل تمام تر کہنگی اور فرسودگی کے باوجود آج بھی اتنی کشش رکھتی ہے کہ اس کے سامنے آزاد نظم یا نثری نظم مقبولیت حاصل کرسکتی ہے نہ اپنا مقام بنا سکتی ہے۔

آفاق عالم صدیقی نے مشتاق صدف کو ایسا شاعر قرار دیا ہے جسے شاعری عزیز ہے، یہاں بھی تمہید طویل دکھائی دیتی ہے اور اس تمہید کے آیات وآثار سے یہ تاثر وضع ہوتا ہے کہ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے! بہر حال مشتاق صدف کو تازہ واردان بساط ادب کا جانا پہچانا نام قرار دیتے ہوئے ان کی شاعری کو گوناگوں مسائل کے اظہار کی شاعری قرار دیا گیا ہے، باوجود اس کے مشتاق صدف کے بارے میں ایک اہم بات یہ لکھی گئی ہے کہ:

''ان کا مشاہدہ وسیع تو ہے مگر یہ مشاہدہ تجربہ کبھی کبھی ہی بن پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں واقعات کا احساس تو خوب پایا جاتا ہے مگر واردات کی کسک کم کم محسوس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری ایک خاص طرح کی اپنائیت رکھتی ہے۔''

آفاق عالم صدیقی نے ''لوحِ برف'' کے حوالے سے افضل عباس کو ''برف سرا کا مغنی'' قرار دیا ہے اور اسی حوالے سے ان کے شعری امتیازات کے تعین کی کوشش کی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی جبلیات کی فطری شاعری برف کی طرح سرد اور یخ ہوتی ہے؟ آفاق عالم صدیقی نے عبارت آرائی کی ایسی ہی مثال'' کہیے شکیب جس کو'' کے عنوان سے فیاض شکیب کی شاعری کے متعلق پیش کی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ فیاض شکیب کی غزلوں کا بنیادی میدان عشقیہ نہیں ہے نہ ہی ان کے یہاں حسن وعشق کا کوئی الوہی اور افلاطونی تصور پایا جاتا ہے، بعض اشعار میں عشقیہ جذبات کا اظہار ضرور ہوا ہے، جو آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی وجہ سے آج عشقیہ شاعری بالخصوص عشقیہ غزل کو فرسودہ قرار دے

کہ اس سے مجرمانہ چشم پوشی کی جا رہی ہے اور گرد و پیش کے حالات کی نقالی کو فن شاعری کی معراج تسلیم کیا جا رہا ہے۔

بہر حال آفاق عالم صدیقی نے تمام شاعروں کا نہایت ہی تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے اور ہر شاعر کے سلسلے میں اپنے خاص زاویۂ نگاہ سے ایسے تاثرات اخذ کیے ہیں جن سے متعلق شعرا کے امتیاز و اختصاص بے کم و کاست روشن ہو گئے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں تمہید بے جا طوالت کی حامل ہو گئی ہے اور بعض مقامات پر تکرار کی کیفیت بھی ابھر آئی ہے جس کا احساس خود آفاق عالم صدیقی کو بھی ہے اور انھوں نے کھلے دل سے اس کا اقرار و اعتراف بھی کیا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے نہایت خلوص و انہماک کے ساتھ اپنے موضوعات کا مطالعہ کیا ہے اور تحفظات کی تنگنائے سے آزاد و بلند ہو کر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ ادبی کاوش ادبی حلقے میں نظر انداز نہیں کی جائے گی۔

☆☆☆

﴿۶﴾

'کویت میں ادبی پیش رفت' : ایک روشن دستاویز

• ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

دیار غیر میں اردو کی شمع فروزاں کرنے والے چند ناموں میں ایک نمایاں نام افروز عالم کا ہے جو بحیثیت شاعر نہ صرف کویت میں مشہور ہیں بلکہ ہند و پاک کے موقر رسائل کے ذریعہ ہم عصر اردو شاعری میں بھی اپنا مقام محفوظ کرا چکے ہیں۔ جس طرح دنیا کے بیشتر ممالک میں اردو سے محبت کرنے والے اصحاب نے بغیر کسی سرکاری سرپرستی یا امداد کے اردو کی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں اور ان انجمنوں کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں کوشاں رہتے ہیں، ویسے ہی اردو کی ایک نئی مگر بڑی بستی کویت بھی ہے۔ عربی زبان والا یہ معروف خطہ "کویت" اردو ادبا اور شائقین کے حوالے سے کتنا زرخیز رہا ہے اس کا اندازہ افروز عالم کی زیر نظر کتاب "کویت میں ادبی پیش رفت" سے ہوتا ہے۔ تقریباً ۴۰۰ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کویت کی ریڈیو اردو سروس، کویت کے اخبارات و رسائل، کویت کی ادبی انجمنوں سے حیرت انگیز طور پر واقفیت ہوتی ہے۔ ساتھ ہی بڑی تعداد میں کویت کے ادیبوں کی نثری نگارشات مثلاً مضامین، افسانے، خاکے، کالم اور طنز و مزاح وغیرہ سے بھی محظوظ ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں شاعری سے دلچسپی کے شواہد وقتاً فوقتاً ملتے رہتے ہیں مگر نثر نگاروں کی اتنی بڑی تعداد بمشکل ہی ملتی ہے۔ افروز عالم صاحب قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے نہ صرف کویت کی ادبی تاریخ جمع کر دی بلکہ بڑی تعداد میں نثری تحریروں کو یکجا کر کے کویت کی نثری تاریخ بھی مکمل کر دی۔ یہ کام انتہائی محنت کا ہے۔ افروز عالم کی محنت، عرق ریزی اور لگن کو دیکھ کر ان کی اردو سے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس ضخیم کتاب کو افروز عالم نے سات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ مضامین، افسانے، خاکہ، کالم، مزاح اور رفتگان کویت کے عنوانات کے تحت کویت کے معروف ادیبوں کی چیدہ تحریروں کو جمع کرنے سے قبل انھوں نے خود اپنے قلم سے کویت کی ادبی نثری تاریخ کے مختلف گوشوں پر پانچ وقیع مضامین تحریر کیے ہیں۔ عرض مرتب اور دیباچہ کے بعد مذکورہ پانچ مضامین میں افروز عالم نے کویت کی نثری تاریخ، ریڈیو کویت کی اردو سروس، ریاست کویت کے اخبارات ورسائل اور ادبی انجمن کے تعلق سے ایسی گفتگو کی ہے کہ کویت میں اردو کی لسانی اور ادبی صورت حال سے کماحقہ واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ مضامین بالخصوص ان حضرات کے لئے بہت مفید ہیں جو دیار غیر میں اردو کی صورت حال پر تحقیقی نگاہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں کویت کی اردو ریڈیو سروس اور انجمنوں سے زیادہ وہاں سے شائع ہونے والے اخبارات ورسائل کی فہرست متحیر کرتی ہے کہ جہاں ہندو پاک میں اردو رسائل واخبارات کی اشاعت میں تنزل اور عدم دلچسپی کا رونا رویا جاتا ہے، وہیں کویت جیسے چھوٹے سے ملک میں اتنے سارے ادبی رسائل وجرائد کی پابندی سے اشاعت قابل داد ہے۔

افسانوں کے حصے میں سات افسانہ نگاروں کے نو افسانے شامل ہیں۔ یہاں تمام افسانہ نگاروں کی شخصیت اور ادبی خدمات پر مختلف اہم قلم نے تعارفی کلمات بھی تحریر کیے ہیں، جو افسانہ نگاروں سے واقفیت بہم پہنچانے میں معاون ہیں۔ زیبا صدیقی، شاہجہاں جعفری، شاہین رضوی، مرزا عمر بیگ، نظر بریلوی، وسیم صدیقی اور شاہد حنائی کویت کے وہ افسانہ نگار ہیں جن کی تحریریں تقاضا کرتی ہیں کہ انھیں عالمی سطح پر پیش کر کے اردو افسانے کے مین اسٹریم میں شامل کیا جائے۔

خاکہ، مزاح اور کالم کے حصے میں محمد عمر، منیر فراز اور شاہد حنائی کے پانچ کالم، شاہد حنائی کا ایک خاکہ اور خالد اکبر کے دو مزاحیہ مضامین زیب کتاب ہیں۔ آخری حصہ ''رفتگان کویت'' کے عنوان سے ہے جس میں افروز عالم، سعید روشن، شاہد حنائی، مسرت جبیں زیبا اور نور پرکار نے اُن نثر نگاروں کی ادبی خدمات سے متعارف کرایا ہے جو کویت چھوڑ کر چلے گئے۔ افروز عالم کی تحریریں اس ضمن میں زیادہ کارآمد ہیں کہ انھوں نے تفصیل سے کویت کی نثری تصانیف، کویت کے شعرا وادبا کی تصانیف اور کویت کی شاعرات پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ تحریریں بلاشبہ اس کتاب کو کویت کی ادبی تاریخ کا مرقع بناتی ہیں۔

کتاب کے آخر میں کویت کے اخبارات سے منتخب کر کے چند ادبی خبروں کو پیش کیا گیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کویت میں اردو سے تعلق رکھنے والے ادارے، انجمنیں اور اہل قلم وقتاً فوقتاً ایسی تقریبات منعقد کرتے رہے ہیں جو زبان اردو کو مضبوط بنیاد فراہم کر سکیں۔ ان تقریبات میں زیادہ تعداد شعری نشستوں اور اعزازیہ جلسوں کی ہوتی ہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کویت کے اہل قلم نہ صرف مہمان نواز واقع ہوئے ہیں بلکہ مہمانوں کی نگارشات پر بے باک رائے اور تنقیدی گفتگو فرمانے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ ان تقریبات کی عمدہ جھلک آپ اس کتاب کے آخر میں شامل متعدد رنگین تصاویر میں دیکھ سکتے ہیں۔

پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ افروز عالم صاحب کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے، جنھوں نے کویت میں اردو ادب کی سمت ورفتار پر یہ گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اجنبی دیار میں اردو کے فروغ کے

لئے جو لوگ کوششیں کر رہے ہیں وہ حوصلہ افزائی، داد اور تعریف و تحسین کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ نامساعد حالات اور ناشناسا چمن میں اردو کی کونپلیں پروان چڑھا رہے ہیں۔ ایسی کتابیں پڑھ کر اس حقیقت اور یقین میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے کہ ہمارا اردو ادب صرف برصغیر تک محدود نہیں ہے بلکہ دیارِ غیر میں افروز عالم جیسی شخصیات کی بدولت جو اردو زبان و ادب کے فروغ میں ہمہ وقت کوشاں ہیں اردو کی شمع اپنی روشنی چہار سو پھیلا رہی ہے۔

افروز عالم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اس گراں قدر تاریخ کے ذریعہ خود بھی معتبر قلم کار ہو گئے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کا قلم یوں ہی رواں دواں رہے اور وہ اپنے نئے نئے کارناموں سے ہمیں متحیر کرتے رہیں۔

☆☆☆

﴿۷﴾

ایم۔ نصر اللہ نصر کا 'انتقاد و استبصار'

● **فہیم انور**

''انتقاد و استبصار'' جناب نصر اللہ نصر کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آ چکا ہے۔ ہر چند کہ یہ کتاب ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے لیکن ایم۔ آر پبلیکیشنز، کوچہ چیلان، دریا گنج، دہلی، سے شائع ہونے کی وجہ سے بہ اعتبار ضخامت اس کے کاغذ کا وزن ہلکا ہے اگر یہ کتاب کسی دوسرے پبلیکیشن سے چھپتی تو شاید یہ ضخیم کتاب اتنی ہلکی نہ ہوتی۔

''انتقاد و استبصار'' کے مضامین میرے یا دیگر اردو قارئین کے لئے نئے نہیں ہیں۔ نصر اللہ صاحب کے یہ مضامین ملک کے معیاری جرائد و اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے اب انھیں ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر کے عام قارئین کے حوالے کر دیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس کا کاغذ اور گرد پوش عمدہ ہیں۔ طباعت، مشینی کتابت، ترتیب و تہذیب، گیٹ اپ، سیٹ اپ کے اعتبار سے اس میں ایک نوع کی نفاست جھلکتی ہے۔ سرورق سادہ مگر عمدہ ہے۔ بیک کور Back-Cover پر مصنف کی بولتی تصویر اور پروفیسر علیم اللہ حالی کی صائب رائے ہے۔ کتاب ہاتھ میں آتے ہی قاری اسے جلد پڑھنے کی للک روک نہیں پاتا۔ اندرون گرد پوش ڈاکٹر کوثر مظہری اور ڈاکٹر مشتاق انجم کی آرا مصنف کی نثری ہنرمندی اور مطالعے پر دلالت کرتی ہیں۔ ''نیا مضموں کتاب زیست کا ہے'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید الابرار کا مضمون بہت متوازن اور مصنف کی صحیح رہنمائی کرنے والا ہے۔ ابرار صاحب نے مصنف کے مطالعہ، لفظوں کے انتخاب، سیاق و سباق اور پیشکش کی بجا ستائش کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ''وہ

ایک منظم شخصیت کے مالک ہیں۔[کتاب میں یہ لفظ 'ہیں' کی جگہ ''ہے'' چھپا ہے جو غلط ہے] جس کے سوچنے اور پرکھنے کے انداز میں کہیں جھول نہیں ہے۔''وہ یہ مشورہ دینے سے بھی نہیں چوکتے کہ''ہاں وسعت اور گہرائی کی اور ضرورت ہے۔''اس میں یقیناً کوئی شک یا دورائے نہیں کہ نصر اللہ صاحب ان کے نیک مشورے پر عمل پیرا ہوکر بحرِ ادب کی پہنائیاں ناپنے کی مستقبل قریب میں بے باک جرأت کر سکتے ہیں۔

نصر اللہ نصر ایک ایسے قلمکار ہیں جو شعر گوئی سے نثر کی طرف آئے ہیں اس لئے بڑی شگفتہ رواں دواں اور شستہ زبان لکھتے ہیں۔ بقول سید الابرار ان کی سوچ اور طرز ادا میں جھول بھی نہیں ہے۔ جس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اس کا حق بخوبی ادا کرتے ہیں۔ مطالعے کا نچوڑ پیش کرتے ہیں لیکن اسے ذہن کی بھٹی میں گھلانے کی مزید ضرورت ہے تاکہ مواد من وعن پیش نہ کیا جائے بلکہ اس میں ہلکا سا تخلیقی رنگ گھلتا ہوا محسوس ہو۔ تحریر میں Reproduction کی خاصیت پیدا ہو جائے۔

نصر اللہ صاحب کو مختلف علاقوں کی ممتاز ادبی شخصیتوں سے نہ صرف ملنے ان سے استفادہ کرنے ،انھیں مستفید کرنے اور ان سے ادبی لین دین کا بڑا شوق ہے اور وہ اس شوق کی تکمیل میں متعدد وسائل سے شد و مد کے ساتھ لگے ہوئے بھی ہیں جس کے نتیجے میں ان کے یہاں جو دانائی بینائی اور سوجھ بوجھ پیدا ہوئی ہے نیز ادب عالیہ کی پرکھ اور نقد و تبصرہ کا جو انداز اجاگر ہوا ہے،''انتقاد و استبصار'' اسی کا ماحصل ہے۔

نصر اللہ صاحب سے اپنے تعلق خاطر کے سبب یہ بات لکھنے پر مجبور ہوں کہ کتاب میں انھوں نے اپنے استاد کی حیثیت سے خلد آشیانی حضرت حامی گورکھپوری کا نام تو ضرور لکھ دیا ہے لیکن ان پر کوئی مضمون کتاب میں شامل نہیں کیا ہے جبکہ مغربی بنگال اور باہر کے لکھنے والوں پر ان کی تحریریں شامل کتاب ہیں ۔جب نصر اللہ صاحب رباعی جیسی صنف پر انتہائی معلوماتی مضمون سپرد قلم کرتے ہیں تو رباعی گو کی حیثیت سے فہیم انور اور جاوید مجیدی جیسے نو واردان بساط ادب کے نام شامل کرتے ہیں لیکن حیرت انگیز طور پر ان کی مذکورہ کتاب اساتذہ کرام حامی گورکھپوری، شکیل بن نگری، عزیز غواصی اور ازلی غواصی وغیرہ جیسے اہم شاعروں کے اذکار سے خالی نظر آتی ہے۔ حامی صاحب رباعی کے اچھے شاعر تھے۔ انھوں نے بہت سی رباعیاں کہی ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ان کی ایک رباعی پیش کر رہا ہوں:

جذبات سے خالی نہ سمجھنا ہم کو　　محروم سوالی نہ سمجھنا ہم کو
ہم وقت پہ تلوار بھی بن سکتے ہیں　　تم پھول کی ڈالی نہ سمجھنا ہم کو

نصر اللہ نصر کے پہلے شعری مجموعے ''امکان سے آگے'' کا دوسرا اڈیشن شائع ہو چکا ہے جو اس کی مقبولیت پر دال ہے۔''افہام ادب'' منظر عام پر آ چکا ہے۔اب ''حمدیہ شعری مجموعہ ''ثنائے رب'' بھی قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ان کی ادبی فتوحات کا سلسلہ جاری ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ العزیز آئندہ بھی جاری رہنے کے امکانات خیر سے معدوم نہیں ہیں۔ بس انھیں فکری اور تاثراتی نقد و تبصرہ کے دائرے سے نکل کر اب عملی

تنقید، استدلالی تحریر، فنی وعروضی مسائل اور لسانی گرفت کی جولانگاہ میں بھی قدم جمانے کی ضرورت ہے۔

''ایک شاعر ایک غزل۔۔۔۔مرزا غالب'' کے عنوان سے نصر اللہ نصر نے جو مضمون لکھا ہے اس میں صنعتوں کے نام ظاہر کرنے نیز فنی وعروضی مسائل پر اظہار خیال کرنے کی ان کی کوشش لائق صد ستائش ہے لیکن عروضی مسائل کی نشاندہی میں وہ دیگر قلمکاروں کے حوالوں کے محتاج نظر آتے ہیں یہاں خود انھیں اپنے علم اور مطالعہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

اس کتاب میں چند فروگزاشتیں رہ گئیں ہیں جن کی جانب اشارہ کردینا ضروری خیال کرتا ہوں:

(۱) شہر شخصیات کے تحت فراق گورکھپوری: کی رباعیوں کے سلسلے سے جو مضمون ہے اس کا عنوان اگر 'فراق گورکھپوری کی رباعیات میں رسوں کے رنگ' کی جگہ 'فراق گورکھپوری کی رباعیات میں رس رنگ' ہوتا تو صوتی آہنگ مزید خوبصورت ہوجاتا اور مفہوم وہی ادا ہوتا جو موجودہ عنوان سے ہوا ہے۔

(۲) کلیم حاذق پر جو مضمون ہے۔فہرست میں اس کا عنوان 'کلیم حاذق: کی تنقیدی بصارت ہے' جبکہ اندرون صفحات اس کا عنوان :'کلیم حاذق: کی بصیرت' ہے۔ دونوں عنوانات کو Synchronised ہونا چاہیے۔

(۳) صفحہ نمبر ۵۳ پر دوم اور سوم کی جگہ دوئم اور سوئم لکھا ہوا ہے۔ یہ اور اس قبیل کی دوسری باتیں مصنف کے حق میں بہتر نہیں ہیں۔ادبی سفر میں انھیں اس طرح کی کوتاہیوں سے یکسر گریزاں رہنا چاہیے۔

مصنف جب کسی کا قول نقل کریں تو تنقیدی عمل سے گزرتے ہوئے اقتباسات کی غلطیوں کی جانب نشاندہی بھی ضرور کریں اور اسے من وعن نقل کرنے سے ممکنہ حد تک گریز کریں۔''انتقاد واستبصار'' کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے قیمتی صفحات موضوع کے اعتبار سے اشعار، اقوال اور اقتباسات سے بھرے پڑے ہیں بریں بنا یہ کتاب شائقین ادب کے مطالعے کی میز پر حوالے کے طور پر بھی دیر تک رہے گی لیکن حوالہ جات، اقتباسات، اقوال اور اشعار کی بہتات نہیں ہونی چاہئے کیوں کہ:

Excess of everything is bad.

بہر نوع! نصر اللہ نصر کی اس کتاب کا بالاستعاب مطالعہ قارئین کو یہ بات باور کرانے کے لئے کافی ہے کہ اس کے مصنف کی شکل میں مغربی بنگال کے ادبی افق پر ایک سنجیدہ مبصر و ناقد کے نقوش جلد ظاہر ہونے والے ہیں۔

☆☆☆

شہر خیر و خبر

مکتوبات

• رتن سنگھ، اے۔۲۰۴، گریٹر نوئیڈا [اتر پردیش] : جناب خورشید اکبر صاحب، ایڈیٹر آمد۔ مکرمی، آداب۔ آٹھ روز پہلے اس نظم کے بارے میں بات کی تھی۔ یہ میری پنجابی کی نظم کا آزاد ترجمہ ہے۔ پہلے آپ کا شاعر اسے پسند کرے تو اس کے بعد ہی ایڈیٹر اسے شایع کرنے کا فیصلہ لے۔ مجھے آپ کی رائے اور فیصلے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس میں چند ایک پنجابی الفاظ ہیں، اس لیے اُن کے معنی ساتھ ہی لکھ دیئے ہیں۔ دیر یوں ہوئی کہ گھر میں لفافہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ اور بازار آنا جانا آسان نہیں، چلنے میں سانس پھولتی ہے۔ آج لفافہ مل گیا تو بھیج رہا ہوں۔ حالانکہ ابھی پوسٹ آفس جانے کا مرحلہ باقی رہے گا۔

آپ کا رتن سنگھ۔ Mob. : 9911146994

• ایم کاویانی، ممبئی [مہاراشٹر] : خورشید اکبر صاحب۔ 'آمد' نمبر: 14-13 میں اپنے مضمون 'شام شعر یاراں' کی اشاعت، آپ کی قدر افزائی کے کلمات اور ہندستان کے نامی گرامی ادیبوں کی طرف سے اس مضمون کی پذیرائی اور اُن کی قیمتی رایوں کے لیے میں انتہائی ممنون ہوں۔ محترمی وقار ناصری صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے مضمون کی ایک غلطی کی طرف توجہ دلائی۔ رفقانِ آمد بھی نوٹ کرلیں تو بہتر ہے کہ مضمون میں متذکرہ 'بخشی' نامی طوائف خواجہ حسن چشتی دہلوی سے وابستہ تھی نہ کہ خواجہ حسن نظامی سے، جیسا کہ میں لکھ گیا تھا۔ ناصری صاحب نے معلومات بہم پہنچائی ہے کہ خواجہ حسن چشتی، دہلی کے رہنے والے تھے لیکن نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ میں بود و باش رکھتے تھے اور وہ اکثر مقطع میں 'بخشی' کا نام داخل کر دیتے تھے ۔

اگر جاں کنی میں وہ جاں بخش آئے   تو ہو نزع سے جان بخشی حسن کی

اردو کے دو تین سربرآوردہ مزاح نگاروں نے اگرچہ مضمون کے کرافٹ اور ڈرافٹ کو سراہا ہے لیکن یہ شکایت بھی کی ہے کہ یوسفی کی یہ کتاب اتنی تعریف کی مستحق نہیں تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ جب 'شام شعر یاراں' کے بازار میں آتے ہی انتہائی ناروا تبصرے آرہے تھے تو اُس طوفانِ بدتمیزی پر انھوں نے غیر ستایشی جنبشِ لب کی زحمت بھی گوارا نہ کی تھی۔ دوسری طرف وہ اس چیلنج کا جواب دینے سے بھی قاصر نظر آئے کہ 'شام شعر یاراں' یوسفی کے سابقہ معیار سے لاکھ فروتر سہی، اردو کے گذشتہ ربع صدی کے طنزیہ و مزاحیہ ادب سے وہ اس کے مقابل ہی کوئی کتاب پیش کردیں! 'آمد' میں مضمون کی setting میں ایک جگہ گڑبڑی نظر آئی: 'ظرودوز' ایک ضمنی سُرخی تھی، جو ص: 145 کی پہلی سطر کے متن میں شامل ہوگئی ہے۔ ویسے اس شمارے کا حاصل 'لغات روز مرّہ' پر کافی ژرف نگاہی سے لکھا ہوا پروفیسر منصور عالم کا مقالہ ہے۔ اسے ایک طرح سے فاروقی صاحب کی کتاب کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ اپنے مقالے کی تمہید میں انھوں نے فاروقی صاحب کی علمی و ادبی قابلیت کی بھی دل کھول کر داد دی ہے، لیکن جیسا کہ فاروقی صاحب کا مزاج مشہور ہے : وہ دل تنگ ہوئے اور تنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے

مقالے کو چھپوایا نہ ہی اُنھیں لوٹایا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ 'نیا ورق' میں 1998ء میں آپ نے اُن کے شعری مجموعے 'آسمان محراب' پر انتہائی متوازن تبصرہ لکھا تھا اور اُن کے ادبی مشاغل اور عزائم پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی لکھا تھا کہ کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی اگر وہ 'خاتم النا قدین' کے زعم میں مبتلا ہو جائیں۔ وہ بھی اُن کی ناراضی کا باعث بنا تھا، کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہمارے ادبی دیوتاؤں کو اُن کے مٹی کے پانو دکھا دیے جائیں!

کرشن چندر کو پڑھ پڑھ کر جن کے ادبی ذوق کی نشو و نما ہوئی ہو، بھلا وہ اُنھیں بھلا سکتے ہیں! لیکن جیسا کہ اُنھیں گزرے زمانہ ہو گیا ہے اور ادیبانِ عصر کی توفیقِ نقد کو ابن صفی زیادہ راس آ رہے ہیں، علی احمد فاطمی کا کرشن چندر کو موضوعِ قلم بنانا پسند آیا، اُنھوں نے کرشن چندر کے فکر و فن کو جس سلیقے سے پیش کیا وہ بھی داد کا مستحق ہے۔ 'شہر افسانہ' میں صدیق عالم کی پہچان، اُن کا چونکانے والا اُسلوب اُسی طرح موجود ہے اور اقبال مجید کی اپنے بیانیے پر گرفت برقرار ہے۔ شبیر احمد کے 'افسانے' میں اور 'میرا باس' میں ہمارے آس پاس کے ماحول کا کرب گھلا ملا ہے۔ 'شہر غزل' میں رؤف خیر [آندھرا پردیش]، بنگال [کمال احمد ہشمی] اور اُڑیسہ [سہیل اختر] کے اثاثے میں کافی اچھا مال موجود ہے لیکن زیادہ دُرِ شہوار بہار کے تفصیل احمد کے یہاں نظر آئے۔ صوفیہ انجم تاج کی غزل مسلسل میں 'وہ ایک لڑکی جو خندہ لب تھی'۔ واقعی چشم تر کر گئی اور سلیمان خمار نے اپنی غزل مسلسل میں کتنی ہی کیفیتوں کے مقدمات کو سلیقے سے ارتقا پر پہنچا دیا ہے۔ ظفر کمالی حسب معمول اپنے طنز و مزاح میں بے پناہ ہیں [آپ کا ظرف ہے کہ سب جھیل گئے۔☺]۔ آفاق عالم صدیقی نے اختر الایمان کی نظم 'کل کی بات' کو تقسیم وطن کی نظموں میں خاص اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ [اُن کے ہم نوا اور نقاد بھی ہو سکتے ہیں۔] بقول اُن کے 'اتنے اہم اور غیر معمولی واقعے کو اس طرح بیان کر دیا [گیا] ہے کہ واقعے کی سنگینی پوری طرح واضح ہو گئی ہے' [ص: 164] اور آخری مصرعے کا طنز نظم کی جان ہے۔ مکمل شعر یوں ہے۔

تقویت ذہن نے دی ٹھہرو، نہیں خون نہیں   پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی

اس نظم کے ابتدائی سات شعروں میں بول چال کے انداز میں درونِ خانہ کی چھوٹی موٹی باتوں، کیفیتوں کا جو منظر کھینچا گیا ہے وہ دل چسپی کا حامل ہے۔ آخری دو شعروں میں تقسیم کے 'اتنے اہم اور غیر معمولی واقعے' کا صرف اشارہ بھر ہے۔ ان دو شعروں سے نہ ہی آخری مصرعے سے تقسیم کے [واقعے نہیں] سانحے کی سنگینی اور الم ناکی کا کوئی احساس ہوتا ہے۔ آخری مصرع طنز کا نہیں استہزا کا نمونہ ہے، جس نے اس المیے کی تحقیر و تصغیر کا کام کیا ہے۔ طنز کا ہدف تو اس سیاسی تقسیم کے عوامل کو ہونا چاہیے تھا جو اس منظر نامے میں کہیں نہیں ہیں۔ یہ کیسا طنز ہے جو مظلوموں کے خون کو پان کی تھوکی ہوئی پیک قرار دے کر داد بٹور رہا ہے! پتا نہیں ہمارے نقاد، اپنے ہیرو فن کار کی فکر کی متابعت میں اپنا ذہن استعمال کرنا کیوں بھول جاتے ہیں۔

● خان حسنین عاقب، علامہ اقبال ٹیچرس کالونی، مومن پورہ، واشم روڈ، پوسد۔445215 [مہاراشٹر] جناب خورشید اکبر صاحب، اسلام علیکم۔ ایک عرصے سے شور تھا کہ 'آمد' کی آمد ہے۔ میں منتظر تھا کہ جس ہنگامے کے

ساتھ آمد کا اعلان کیا گیا ہے، پتا نہیں، جب اس کی آمد ہوگی، تو وہ کیسا ہوگا۔ لیکن ماشاء اللہ، آمد نے آتے ہی ادبا، شعرا، نقاد، محققین اور قارئین کا اپنا ایک حلقہ تیار کرلیا ہے۔ اور اس کا ہر شمارہ خوب سے خوب تر ہے۔ اکتوبر تا مارچ ۲۰۱۵ء کا شمارہ، یعنی ششماہی شمارہ موصول ہوا۔ تمام تر مشمولات نہایت معیاری ہیں، چاہے وہ شعری حصہ ہو یا نثری، بحیثیت مدیر، آپ کی اور آپ کے رفقائے کار کی محنتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ ایک معروضہ یہ ہے کہ محولہ بالا شمارے میں ایک مضمون کسی عبدالرحمٰن صاحب کا ہے، جو میرے علاوہ بھی بہت سے اہلِ ادب کے لئے غیر معروف یا زیادہ محتاط ہوکر کہوں، تو کم معروف ہیں۔ اس مضمون کا عنوان ہے 'اقبال کا نظریۂ پاکستان۔۔ تنقید اور ردِ تنقید۔۔۔ یہ مضمون آپ کے رسالے میں اکتوبر تا مارچ 2015 کی ڈیٹ لائن کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ رسالہ مارچ ۲۰۱۵ تک زیرِ اشاعت تھا جب کہ میرا تحریر کردہ مضمون بعنوان 'چہ نسبت اقبال را بہ نظریۂ پاکستان' کے بارے میں ایوانِ اردو، بابت مارچ ۲۰۱۴ء میں میرے طویل تاثرات شائع ہو چکے تھے جس میں میرے تحریر کردہ مضمون کا مکمل لب لباب شامل تھا۔ مارچ ۲۰۱۴ء کے ایوانِ اردو میں میرے طویل تاثرات کو پڑھا جاسکتا ہے، جس میں میں نے نہایت تفصیل سے اپنے مکمل مضمون کی آؤٹ لائن تحریر کی تھی۔ دراصل میرے مذکورہ بالا تاثرات اور میرا مضمون 'چہ نسبت اقبال را بہ نظریۂ پاکستان'، فروری ۲۰۱۴ء کے ایوانِ اردو میں جناب رام پرکاش کپور صاحب کے اقبال پر تحریر کردہ ایک مختصر مضمون بعنوان 'اقبال اور پاکستان' [ایوانِ اردو۔ فروری ۲۰۱۴، صفحہ ۲۷ تا ۲۹] کے ردِعمل کے طور پر تحریر کردہ تھا۔ میں نے ایک سرکاری رسالے کو یہ مضمون ای میل کے ذریعے ارسال کیا تھا جس نے اس مضمون کے نیم سیاسی ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے معذرت طلب کرلی تھی۔ ایک نجی رسالے کو میں نے وہ مضمون ای میل کیا لیکن پھر انھیں منع کردیا کہ فی الحال اسے شائع نہ کریں کیونکہ اس سے کچھ سیاسی مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں کیونکہ تب تک مرکز میں بھگوا سرکار اقتدار میں آچکی تھی۔ اس لئے میں نے اس کے بعد مصلحتاً اس مضمون کو کہیں اور نہیں بھجوایا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی مناسب وقت اور کسی موقع کی مناسبت سے اس مضمون کو اس کی تمام تر اہمیت کے ساتھ اشاعت کے لئے بھیجوں۔ اب اسی مواد پر مبنی مضمون مجھے 'آمد' کے مذکورہ شمارے میں عبدالرحمٰن صاحب کے نام سے شائع شدہ نظر آیا۔ سب سے پہلے مجھے اس کی اطلاع ایک مشہور افسانہ نگار دوست نے دی جن سے کچھ عرصہ قبل میری اپنے اسی مضمون سے متعلق طویل گفتگو ہوچکی تھی۔ انھوں نے حیرت اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اطلاع دی کہ آپ کا مضمون شائع تو ہوچکا ہے لیکن نام آپ کا نہیں ہے۔ میں نے یہ مضمون ۲۸ رمارچ ۲۰۱۵ کو 'استفسار' کے مدیر جناب عادل رضا منصوری کو بھی ای میل کیا تھا اور ظاہر ہے کہ ۲۸ رمارچ تک 'آمد' کا یہ شمارہ شائع نہیں ہوا تھا۔ پھر ۲۹ راپریل ۲۰۱۵ کو میں نے خصوصی ملاحظے کے لئے یہ مضمون جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو ای میل کیا تھا۔ اور آخرِ کار، ۲ مئی ۲۰۱۵ کو میں نے ایک انڈو پاک میگزین 'خرمن انٹرنیشنل' کے افتتاحی شماروں میں سے کسی شمارے میں اشاعت کے لئے ارسال کردیا لیکن 'آمد' میں اس عنوان کے مضمون کی اشاعت کی اطلاع کے ساتھ ہی خرمن والوں نے اس مضمون کی فوری

اشاعت کو ملتوی کرنے کی اطلاع دی۔ اوپر مذکور تمام تاریخیں مع ثبوت میرے ای میل آئی ڈی پر موجود ہیں۔ اور متعلقین سے دریافت بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں 'ایوانِ اردو' میں شائع شدہ اپنے طویل تاثرات کی فائل بھی اس خط کے ساتھ منسلک کر رہا ہوں جو میرے اس مضمون کی تخلیق کا سبب بنا۔ ان تاثرات کو ایوانِ اردو کے شمارہ مارچ ۲۰۱۴ء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ آپ کو اطمینان ہو جائے اور ساتھ ہی اپنا اوریجنل مضمون بھی ارسال کر رہا ہوں جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہی ہے۔ امید ہے آپ اس استفسار کے ساتھ میرے مضمون کے ساتھ انصاف کریں گے تاکہ آمد کے قارئین فیصلہ کر سکیں۔ والسلام آپ کا اپنا خان حسنین عاقب 9423541874 ::11

hasnainaaqib1@gmail.com

نوٹ : محترمی خان حسنین عاقب صاحب! آپ کا یہ شکایت نامہ قارئینِ آمد اور جناب عبدالرحمن صاحب کے ملاحظے کی غرض سے من و عن شائع کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی پوزیشن واضح کر سکیں! [خورشید اکبر]۔

● حفیظ انجم کریم نگری، کشمیر گنڈہ، کریم نگر [تلنگانہ]: ۲؍جون؍۲۰۱۵۔ محترم خورشید اکبر صاحب مدیر 'آمد' سلام مسنون: ۔ آمد کا نیا شمارہ ۱۳۔۱۴ بے حد ضخیم نظر نواز ہوا۔ نثر اور نظم کا ایک حسین آبشار ہے جو بہہ رہا ہے۔ آجکل ہر رسالے کے جو قلم کار ہیں وہی خریدار بھی ہیں۔ ہو سکے تو ضخامت کو کم کر دیجئے، 250 صفحات کر دیجئے۔ سہ ماہی کے بجائے ششماہی کر دیجئے تاکہ آپ کو کچھ سانس لینے کی فرصت ملے۔ اس طرح آپ تھک جائیں گے۔ بھاگتے بھاگتے دودھ پینے کے بجائے پیڑ تلے بیٹھ کر پانی پینا اچھا ہے۔ آپ نثر نظم ایک ہی قسم کی [؟] اپنی پسند کی شائع کرتے ہیں یہ بھی اچھا ہے لیکن الگ الگ قسم کے پھولوں سے سجایئے شاید اس طرح بھی حسن اور بڑھ جائے گا، یہ میرا خیال ہے۔ رسالہ آپ کا ہے آپ کی مرضی ہے صاحب۔ ہو سکا تو مختلف پھولوں کا گلدستہ بنایئے۔ کچھ غیر مطبوعہ کلام ارسال کر رہا ہوں مجھے اُمید ہے کہ آپ کو پسند نہیں آئے گا Dustbin کی نذر کر دیجئے۔ پھر بھی اُمید پر دنیا قائم ہے۔ مایوسی کفر ہے۔ پھر ایک بار پل صراط سے گزرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اچھا تو اجازت چاہتا ہوں۔ اُمید کہ خیریت سے ہوں گے۔ حفیظ انجم کریم نگری۔ Mob: 9247479488

● راشد جمال فاروقی، دہرادون [اتراکھنڈ]: ۸؍جون، ۲۰۱۵۔ خورشید بھائی سلام و رحمت، خدا کرے آپ مزے میں ہوں۔ 'آمد' شمارہ ۱۴؍۱۳ موصول ہوا، شکریہ! جیسا کہ میں نے فون پر عرض کیا تھا کہ رشی کیش آنے سے قبل دہلی میں 'آمد' کی آمد کی گونج سن چکا تھا۔ وہاں خورشید اکرم، غضنفر اور شکیل جمالی وغیرہ اس کے مشمولات پر صحت مند تذکرے کرتے ہوئے پائے گئے تھے۔ یوں بھی رسائل کے قحط میں 'آمد' کا دم غنیمت ہے۔ آپ نے حماد انجم ایڈوکیٹ جیسے قادر الکلام شاعر کے ارتحال کی خبر دی تو ان کی شعری تخلیقات خصوصاً حمد و نعت مزید پُر تاثیر لگیں اللہ انھیں غریق رحمت کرے آمین۔ 'آمد' کو زندہ رکھنے میں آپ کو جو دشواریاں درپیش ہیں اور ہر دم پرچے کے بند ہو جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے تو سید محمد عقیل کا مضمون ایک جریدے کی موت واقعی حسب حال ہے۔ آپ 'آمد' کو ششماہی کر دیں۔ آرام سے ایڈٹ کریں کس کو اعتراض ہوگا۔ یوں بھی ضخامت کو دیکھ کر مری تو حالت پتلی ہو جاتی

ہے مجھے خوف یہ رہتا ہے کہ ضرور کچھ نہ کچھ پڑھنے میں چھوٹ جائیگا اور اس دوران کچھ اور ایسی کتاب آ گئی جسے پڑھنے لگ گئے تو 'آمد' شاید پورا نہ پڑھ سکیں۔ پروفیسر منصور عالم کا مضمون "نعاتِ روز مرّہ" مجھ جیسے کم علم طلبا کی رہنمائی کے لئے سوغات سے کم نہیں۔ ایم کا دیانی کو میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتا ہوں۔ اس بار بھی انھوں نے اپنی تحریر کی تازگی، اعتبار اور وقار کو برقرار رکھا ہے بلکہ شگفتگی کی لطیف گدگدی بھی قاری کو محظوظ کرتی ہے۔ شگفتگی یونی پر لکھنے کی وجہ سے فطری طور پر در آئی ہے ورنہ ایم کی تحریریں خشک، عالمانہ، محققانہ اور منطقی ہوتی ہیں۔ اس بیش قیمت مضمون کو پورا آمد پڑھ لینے کے بعد پھر پڑھنے کی خواہش ہے۔ غزلیں دھنک رنگ۔ میں جسے سمیٹ کے بیٹھا ہوں، جانے کیا شے ہے: جھٹک کے پھینک دیا تھا جسے وہ دنیا تھی [ضیا فاروقی]۔ ضیا فاروقی یا ہمیشہ سے منفرد لب و لہجے کی پرورش کرتے آرہے ہیں یا پھر میں نے ہی انھیں اب جا کر سنجیدگی سے پڑھا ہے۔ بہر حال۔ 'خیالی دوستوں کے عکس سے کھیلو گے کب تک ار رے بچّے کبھی مل لو بھرے گھر میں کسی سے' [نعمان شوق]۔ تفصیل احمد بھی متوجہ کرتے ہیں۔ سہیل اختر ہمیشہ کی طرح گہری فکر سے شعر سناتے ہیں: 'کل اس سے ملے جس کا مکاں ہے لب دریا رہم نے تو یہ سمجھا تھا وہ پیاسا نہیں ہوگا'۔ 'میری میز پہ نقشہ ہے مستقبل کا رالماری میں یاد کے البم رہتے ہیں' [مصداق اعظمی]۔ نظمیں بھی ایک ایک بار تو پڑھی ہی جائیں گی۔ اس بار بھی آمد کا شہر افسانہ گونا گوں کہانیوں سے جھلملا رہا ہے۔ 'اپنے اپنے طوطے' [اقبال مجید] ماڈرن ٹکنالوجی، صارفیت کے مکڑ جال اور ماڈرن کمینگی کے عبرتناک مرقعوں کا کاک ٹیل ہے۔ بقول آپ کے اقبال مجید میرے لئے تبرک سے کم نہیں تا کہ ہم عصر اردو کہانی کاران سے کچھ سیکھ سکیں۔ صدیق عالم، نکسلی تحریک سے متاثرہ علاقوں کی پسماندگی، غریبی، استحصال، محرومی اور وہاں کے باشندوں کی بے بس سادگی کو پُر اسرار پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔ 'ایک ادھوری کہانی' [اسلم جمشید پوری] گھریلو ماحول۔ مغربی یوپی کے روز مرّہ دلکش اور برجستہ فطری مکالموں کی رو سے خود کو پڑھوا لیتی ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے میں ناسٹلجیا کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنے بچپن کے اس قصباتی ماحول میں خود کو پایا، جہاں ڈوبتے ہوئے جاگیردارانہ نظام کا رکھ رکھاؤ، پاکیزہ شوق اور بزرگوں یا بچوں سے مشفقانہ رویہ زندہ تھا۔ قاریوں و ادیبوں کا پر وقار رہن سہن، مہذب اطوار سب کچھ اب افسانوں سا لگتا ہے جب کہ ہم اس کا حصہ تھے۔ اسلم جمشید پوری نے اس شاندار ماضی کو زندہ کر کے بڑا احسان کیا ہے ہم پر۔ رات کو بچوں سے گھر کر کہانیاں سنانے کی روایت بھی اب کہاں رہ گئی ہے۔ شادمانی بیگم جو خود کہانی کا مرکزی کردار ہیں اور خود ہی راوی بھی وہی کہانی میں شدید involvement کی وجہ سے آخر کار رخصت ہو گئیں لیکن کہانی سنانے کا سلسلہ تو بے بی سمیہ سے دادی سمیہ تک جاری تھا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ اب تھما چاہتا ہے۔ ماڈرن دادیاں نانیاں بچوں اور بہوؤں بیٹیوں کے ہمراہ ساس بہو کے Soap opera میں مست ہیں۔ یو کھر میں سنگھاڑے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بعد اب اشعر نجمی نے بھی مثبت رائے کا اظہار کیا ہے۔ شکیل اعظمی میں Potential تو ہے ہی۔ گذشتہ دنوں دو ایک مشاعروں میں شکیل اپنی یہ کتاب میری موجودگی میں کئی لوگوں نذر کرتے نظر آئے کاش میں بھی انھیں نظر آجاتا تو بتوں سے چھن چھن کر جو روشنی مجھ تک آرہی ہے بس اسی پر اکتفا

کرنے پر مجبور نہ ہوتا باقی چیزیں ابھی پڑھ نہیں سکا ہوں۔ تازہ شمارہ آنے سے قبل بھی اور اب فون پر بھی آپ کے احکامات موصول ہوئے ہیں کہ دس بارہ غزلیں بھیجی جائیں۔ لہٰذا حکم کی تعمیل کی جارہی ہے۔ غالباً یہ مرسلہ غزلیں دس سے زیادہ ہی ہیں۔ انتخاب آپ کا ، قسمت میری۔ راشد جمال فاروقی

Mob.:09456753096

● ظفر اقبال ظفر، ۷۰۱، کھیدار، فتح پور [یو۔پی] : ۱۰ر جون، ۲۰۱۵۔ برادر گرامی محترم خورشید اکبر صاحب! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکا تہہٗ۔ کافی عرصہ بعد آپ کو چند سطریں تحریر کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ تقریباً ۸ر ماہ سے میری اہلیہ بستر علالت پر پڑی ہیں۔ اٹھ بیٹھ نہیں پا رہی ہیں، کئی امراض اور متعدد تکالیف میں مبتلا ہیں۔ جس کے باعث سارا گھر متاثر ہے۔ ان ہی الجھنوں کے سبب 'آمد' سے قلمی رابطہ قائم کرنے میں تاخیر ہوئی۔ اس عرصہ میں 'آمد' کے کئی اہم و خصوصی شمارے منظر عام پر آ کر قارئین کی توجہ کے مرکز بنے۔ اس میں شامل نہ ہونے کا افسوس رہا۔ 'آمد' نے جس تیزی کے ساتھ جرائد کی صف میں اپنی شناخت بنائی ہے، اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہر شمارے میں گرانقدر تخالیق کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے ذہن و فکر۔۔۔ اپنی حمد و نعت اور چند غزلوں کے ساتھ درج ذیل احباب کی تخالیق بھی ارسال کر رہا ہوں۔ امید کہ اپنی پُر خلوص توجہ سے نوازیں گے: (۱) اختر کاظمی ایک حمد، چھ غزلیں (۲) سید نور الحسن، چار غزلیں (۳) ڈاکٹر وارث انصاری، دو غزلیں (۴) زاہد کونچوی، تین غزلیں و رباعیات (۵) ڈاکٹر خان حفیظ، ہندی کہانی کا ترجمہ۔ اختر کاظمی، ڈاکٹر وارث انصاری اور سید نور احسن نور (قاضی پور شریف) وغیرہ سالانہ خریدار ہیں۔ نور صاحب کا پرچہ قاری اخلاق کی معرفت آتا ہے۔ زاہد کونچوی کا تعلق جھانسی سے ہے، اُن کا زر سالانہ آپ کو بھجوادوں گا۔ ان کا رسالہ راست ان کے پتہ پر بھجوا دیجئے گا۔ ڈاکٹر خان حفیظ کا وطنی تعلق فتح پور سے ہے۔ ان کا قیام کان پور میں ہے، ان کا ترجمہ جس شمارہ میں شائع ہو وہ رسالہ میرے ہی پیکٹ کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ اس شمارے کی قیمت میں M.O. کرادوں گا۔ امید کہ ان حضرات کی تخالیق کم و بیش جو مناسب سمجھیں شامل کر کے ممنون فرمائیں۔ بقیہ فضل ربی ہے۔ اہلیہ کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔ بھابھی محترمہ کو سلام عرض کریں۔ متعلقین کو واجبات! ڈاکٹر زیبا محمود نے زر سالانہ بھیجنے کے لئے کہا ہے۔ ملنے پر اطلاع کیجئے گا۔ خدا کرے آپ سب متعلقین بخیریت ہوں۔ رسید سے نوازیں۔ والسلام۔ آپ کا ظفر اقبال ظفر۔

● عبدالاحد ساز، ۱۴۹ یوسف مہر علی روڈ، زکریا مینور، چوتھی منزل، بمبئی۔ ۴۰۰۰۰۳ [مہاراشٹر]: برادرم خورشید اکبر صاحب! سلام و آداب۔ 'آمد' (بابت اکتوبر ۲۰۱۴ء تا مارچ ۲۰۱۵ء) آیا اور نظر کے سامنے ایک جہانِ معنی وا کر گیا۔ ظاہر ہے اس جہان کی مسافت اور اتنے وافر سامانِ نشاطِ مطالعہ کو سمیٹنے میں بہت وقت لگے گا۔ آپ کا اداریہ آمدم بر سر مطلب/ کائناتِ آمد اور ادب برائے نجات۔۔۔۔۔۔۔ ''پڑھ لینے کے بعد اب نظر شہر نقد و نظر پر مرکوز ہے۔ کرشن چندر کا فکری ارتقا (پروفیسر علی احمد فاطمی) اور کرشن چند ایک کثیر الجہات فن کار (صبا اکرام) پڑھ چکا ہوں۔ اختر الایمان پر دونوں مضامین اور ن م راشد پر مضمون جاذب توجہ ہیں۔ ہاں ایم کا دیانی کا مضمون 'شام شہر یاراں' بھی پڑھ لیا

ہے۔ برسبیلِ تذکرہ عرض کرتا چلوں کہ نومبر ۲۰۱۱ء میں فیض صدی کے اختتامی سیمینار اور مشاعرے میں کراچی میں مشتاق احمد یوسفی سے بہ نفسِ نفیس فیض پر مضمون سننے کا شرف حاصل ہوا۔ اور صبا اکرام صاحب سے ذاتی طور پر نیاز حاصل رہا۔ شہرِ امکانات کے تحت 'اقبال نظریہ پاکستان: تنقید ورد تنقید' غور سے پڑھنے پر اُکسا رہا ہے۔ اُس کے بعد افسانے، نظمیں، غزلیں ــــ صفحات پر موتی رول دیئے ہیں آپ نے۔ شہرِ آئینہ کے تحت تبصرے اس پر مستزاد ہیں۔ دیکھئے، یہ لعل و گہر کب تک چُن پاؤں۔ بس دلی مبارک باد اور حروفِ تحسین قبول کیجئے۔ خداوند کریم آپ کو صحت و استقامت سے ہم کنار رکھے اور آپ کے قلم کو اور بھی توانائی عطا کرے۔

آپ کا عبدالاحد ساز Mob. : 09833710207

● زبیر رضوی، مدیر "ذہن جدید" [دہلی] : ۲۶ جون، ۲۰۱۵۔ برادرم جناب خورشید اکبر صاحب تسلیم! آپ کی ادارت میں نکلنے والے سہ ماہی آمد کا مشترکہ شمارہ ۱۲۔۱۳ ملا۔ اس نوازش کے لیے شکریہ۔ آپ کے مطالعے کے لیے میں نے اپنا نیا شعری مجموعہ رجسٹرڈ پوسٹ کیا ہے، ملنے پر رسید سے نوازیں۔ 'ذہن جدید' بھی آپ کو شائع ہونے پر مل رہا ہوگا۔ ہم نے پچھلے ۲۵ ربرسوں سے ذہن جدید کو اپنے ہی صحافتی Concept کے ساتھ شائع کرنے کا سلسلہ جاری رکھا ہے کیونکہ ہم نے اپنے معاصر رسالوں کی ترتیب واشاعت کے سلسلے میں بھی ہمیشہ ان کے مدیران کے اختیار اور نقطہ نظر کو اہم جانا ہے۔ 'آمد' ادبی اُمور اور ادبی صحافت کے سلسلہ میں آپ کی فکر و سوچ کا آئینہ دار ہے۔ بطور قاری میں اس کا احترام کرتا ہوں اور 'آمد' کو اسی زاویے سے اپنے مطالعے میں رکھتا ہوں۔ امید آپ بہ عافیت ہوں گے۔

زبیر رضوی

● ڈاکٹر افضال عاقل، شعبۂ اردو، بھیرب گنگولی کالج، بلگھریا، کلکتہ [پچھم بنگال] : ۵ رجون، ۲۰۱۵۔ 'آمد' ۱۲۔۱۳، سراپا سپاس ہوں کہ "آمد" کا شمارہ پابندی کے ساتھ موصول ہو رہا ہے۔ ہر شمارہ ایک نئی تحریک دیتا ہے۔ ملک کے مختلف گوشے کے سرکاری اور نیم سرکاری اداروں سے رسالے شائع ہو رہے ہیں لیکن 'آمد' کی اپنی شان اور آن ہے اور آپ کی صلاحیتِ فکری کی نمایاں دلیل پیش کرتا ہے۔ شعری باب اختراعی واجتہادی کیفیت کا حامل ہے۔ 'آمد' کا ہر شمارہ نئی تخلیقیت سے روشناس کراتا ہے۔ کچھ غزلیں سادہ سلیس اور عام فہم زبان میں ہونے کے باوجود شعریت سے خالی نہیں۔ منظومات میں رباعیات اور قطعات روحانی اور اخلاقی عمل ورد عمل کے مظہر ہیں۔ نثری باب نئے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ 'لغاتِ روز مرۂ ذہن کے دروازے وا کرتا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی کا مضمون کرشن چندر کا فکری ارتقا، اختر الایمان کی نظم "مسجد" کا تجزیہ، ن۔ م۔ راشد کی روحانی کیفیات اور "اقبال کا نظریۂ پاکستان" جیسے مضامین یقیناً عملی تنقید کے نئے نئے احوال پیش کرتے ہیں۔ 'شہر آمد' کا حصہ تجزیہ وتنقید کا حقیقی باب روشن کرتا ہے۔ بہر کیفیت "آمد" کا یہ شمارہ سابقہ شماروں کی طرح قابلِ اعتبار ہے اور خصوصیت رکھتا ہے۔ خدا 'آمد' کو مزید استحکام عطا کرے اور آپ کے قلم کو توانائی وتابنا کی دے۔ آمین! Mob. : 9831364521, 9331931356

● فیاض احسن، روبیلی پورا، اومرکھید، یاراتھمل [ایم۔ ایس] : جناب ایڈیٹر صاحب، میں آج بہت خوش ہوں وہ

اس لیے کہ میں نے جو چنگاری کئی برس پہلے اپنے اندر جلائی تھی وہ اب بھڑک اٹھی ہے۔ رسالوں سے میرا رشتہ عنفوانِ شباب ہی سے ہے۔ لیکن صرف اور صرف پڑھنے کی حد تک۔ چھپنے چھپانے کے لیے یوں سمجھئے آپ سے ابتدا کر رہا ہوں۔ میری آپ سے گزارش سب سے پہلی یہ ہے کہ مجھے اپنے اہم رسالے کا خریدار بنانا نہ بھولیں اور دوسری گزارش یہ ہے کہ اگر آپ کو میری غزلیں پسند آئیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر اسے اگلے شمارے کے لیے جگہ مل گئی تو۔ دو غزلیں آپ کے لیے میں نے منتخب کی ہیں۔ پسند آئیں تو چھاپئے گا۔

آپ کا چھوٹا بھائی

فیاض احسن Mob. : 7057585661

● **تفضیل احمد، موتیہاری [بہار]** :۳۰رجون ۲۰۱۵ء۔ مدیرانِ محترم، سلام مسنون، آمد کا مشترکہ شمارہ (۱۴۔۱۳) پیش نظر ہے۔ ڈھیر ساری جاندار، متاثر کن اور قابلِ مطالعہ مشمولات کے درمیان ''غزل کے رنگ: ایک تاثراتی مطالعہ'' (اسلم مرزا) بھی نظر سے گزرا، جسے آپ نے تبصرے کے نام نہاد خانے میں جگہ دی ہے۔ فاضل تاثر نگار، (جو خود کو کم سواد بھی کہتے ہیں) نے ایک ہی سانس میں غزل گویوں کا شخصی تعارف، غیر منضبط ذاتی تاثرات، اشعار پر عمومی تبصرے اور چلتی پھرتی تنقید کا لاجواب نمونہ پیش کیا ہے۔ اور اردو غزل سے اپنی عالمانہ واقفیت کے اظہار کی کوشش میں اکثر فنکاروں پر مضحکہ خیز تبصرے کیے ہیں۔ میری غزلوں کے متعلق لکھتے ہیں: ''یہ زبان کی شکست وریخت کی اچھی مثال قائم کرتی ہیں۔'' اہلِ علم انھیں زبان کی شکست وریخت اور تخلیقیت کا فرق سمجھانے کے لیے کافی ہوں گے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے تمام پندرہ غزلوں کو جدیدیت کی چیستانی ''سورج کو چونچ میں'' اور ''لام نون'' والی شاعری کے خانے میں ڈال دیا ہے۔ انھیں غالباً یہ علم ہوگا کہ ''مابعد جدیدیت'' کسی متن کی قرأت کی محض ایک لسانی تھیوری ہے۔ حد تو تب ہوئی جب انھوں نے لکھا: ''انکے چند اشعار دوستوں کے درمیان سنانے کے لئے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔'' یہ ذاتیات پر سیدھا حملہ ہے اور نہایت قابلِ گرفت ہے۔ ادارے سے گذارش ہے کہ ایسی تحریروں کو شامل کر کے رسالے کے مزاج، معیار اور اخلاقیات کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔ (رسالے نے ان کا پتہ اور موبائل نمبر بھی شائع کرنے سے گریز کیا ہے۔) آخر میں زیب غوری مرحوم کے شعر پر اکتفا کرتا ہوں:

بے دماغی پر مری اس نے مجھے سولی نہ دی ۔۔۔ رکھ کے نا جنسوں میں عز و فضل منبر دے دیا

● **سلطان اختر، مولانا آزاد نگر، ایف۔ سی۔ آئی۔ روڈ کے پچھم، پھلواری شریف، پٹنہ [بہار]**: ۵رجولائی ۲۰۱۵ء۔ پیارے خورشید اکبر، سلام وخلوص۔ آمد کا شمارہ ۱۴۔۱۳ ملا۔ شکریہ۔ پرچہ دیکھ کر قلبی آسودگی اور ذہنی سکون ملا۔ تمھاری محنت قابلِ ستائش ہے۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ تم دفتری اوقات سے اتنی فرصت کب نکال لیتے ہو کہ آمد کو اتنا وقت دے سکو۔ موصولہ تمام تخلیقات کو پڑھنا اس میں حسب ضرورت ترمیم و تنسیخ (غالباً) ترتیب، پروف ریڈنگ وغیرہ یہ تمام کام ایک آدمی کے بس کا نظر نہیں آتا لیکن تم بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہو۔ خدا تمھیں مزید استقامت بخشے تاکہ اس کا معیار مستقبل میں بھی برقرار رہے اور آمد اسی شان وشوکت کے ساتھ شائع ہوتا رہے۔ آمین! 'آمد' کی آمد میرے لئے یوں سکوں بخش ہے کہ

شب خواں اور شعر و حکمت کا احساس کم ستاتا ہے۔ وعدے کے مطابق میں نے چھ سو روپے شاہینہ صاحبہ کو بھیجوا دیا تھا۔ حسب وعدہ چار غزلیں آمد کے لئے منسلک ہیں۔ میں نے جو رباعیاں تمہارے نام بھی تھیں وہ بھی منسلک ہیں تم انہیں آمد یا کسی اور پرچہ میں شائع کرا دو تو کرم ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ 'مباحثہ' میں کیوں شائع نہیں کی گئیں۔ خدا کرے تم بخیر ہو۔ Mob. : 9835843286, 9097450586

● **وسیم فرحت کارنجوی، 'اردستان' نزد وحید خان، اردو ڈی۔ ایڈ۔ کالج، والگاؤں روڈ، امراوتی۔ ۴۴۴۶۰۱ [ایم۔ ایس]:** مورخہ ۲۰ر جولائی ۲۰۱۵ء، برادرم! آداب۔ عید کی پر خلوص مبارک باد۔ امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ سہ ماہی 'اردو' کا ۴۰۰ صفحاتی 'جاں نثار اختر نمبر' پیش خدمت ہے، قبول فرمائیں۔ ساتھ ہی دہلی کے ایک صاحب کا تحریر کردہ تبصرہ بھی ملفوف ہے۔ آپ سے مودبانہ التجا ہے کہ متذکرہ تبصرہ اپنے موقر جریدہ میں جلد از جلد شائع فرما کر مجھ دور افتادہ پر احسان فرمائیں۔ تبصرہ کی اشاعت سے، بہت بڑے صرفے سے وجود میں آئے اس خاص نمبر کی نکاسی میں مدد پہنچے گی۔ امید کہ ہمیشہ کی طرح آپ اس بار بھی مجھے ممنون فرمائیں گے۔ بقول صائب تبریزی:

اگرچہ وعدہ خوبان وفا نمی داند　　خوش آں حیات کہ در انتظار می گزرد

زحمت کے لیے پیشگی معافی کا خواستگار۔ والسلام۔ Mob.: 09370222321

شارق عدیل، ایٹہ، [یو۔ پی]: محترم بھائی! خورشید اکبر صاحب سلام مسنون، 'آمد' کا مشترکہ شمارہ: ۱۲-۱۳ خاصی دوڑ دھوپ کے بعد آخر پڑھنے کو مل ہی گیا۔ اس بار تو آپ نے خاکسار کی نظم و نثر کو بھی کئی صفحات عطا کیے ہیں جن کے لیے خاکسار آپ کا دل سے شکرگزار ہے۔ اداریہ، رسالے کے مشمولات کا مکمل احاطہ کرتا ہے اور ہر اہم تخلیق پر روشنی ڈالتا ہے جس سے قاری اور قلم کار دونوں کو ہی فائدہ ہوتا ہے۔ جہاں تک آپ کی ملازمت سے جزی ذمہ داریوں کا سوال ہے سو اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ آپ جس محکمے میں ملازمت کرتے ہیں وہاں کی مصروفیات رات و دن کی معنوی تقسیم کو بھی نظر انداز کر دیتی ہیں، اور بندہ اپنے مشین ہونے کے احساسات سے دوچار رہتا ہے۔ لیکن تعجب ہے آپ ایسے مشکل حالات میں بھی کئی برسوں سے ادبی سڑکوں پر ادارت اور اپنی تخلیقی موٹر کو دوڑا رہے ہیں اور متواتر 'آمد' کے قارئین سے مکالمہ بھی کر رہے ہیں۔ اسی کیفیت کو ہی جنوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ جنون ہی آپ کی شخصیت کا ضروری حصہ ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو 'آمد' ایسے اہم کتابی سلسلے کا اجرا ہی عمل میں نہیں آتا۔ 'آمد' میں اشاعت کی غرض سے دو غزلیں اور دو نظمیں بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ کی پسند تک سفر کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ضرور شائع فرمائیں۔ فقط شارق عدیل۔ موبائل نمبر : 09368747886

● **شاہد عزیز، بھوپال پورا، اودے پور [راجستھان]:** خورشید صاحب، آداب، 'آمد' کا تازہ شمارہ نمبر: ۱۳-۱۴ مشترکہ طور پر ملا۔ جو ۶۴۰ر صفحوں پر مشتمل ہے جو اپنے آپ میں ایک ضخیم شمارہ کہا جا سکتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس قدر ضخیم شمارے کے پیٹ کو بھرنے کے لئے معیار سے بھی سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے اور اس لیے کہا جا سکتا ہے آپکو اپنی فراست کے باوجود یہ سمجھوتہ کرنا پڑا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ مشاعروں میں پڑھی جانے والی چیزیں بھی شامل

اشاعت ہیں۔ میں 'آمد' کو جتنا پڑھ رہا ہوں بڑے اعتراف وانحراف سے گزر رہا ہوں اور چاہتا ہوں جو کچھ محسوس ہو رہا ہے آپ کو لکھتا رہوں۔ آپ نے اداریے میں اپنی مجبوریوں کا ذکر کیا ہے خاص طور پر خسارے کا۔ میں سمجھتا ہوں اردو رسالوں سے کمانے کا کام افتخار امام ضرور کر سکتے ہیں۔ اور یہ بھی بڑے حوصلے کی بات ہے۔ ہر کسی مدیر کے بس کی بات نہیں ہے لیکن اب امام صاحب کی دیکھا دیکھی دیگر مدیران بھی یہ کام کر رہے ہیں اور ایسے رسالوں کو بھرپور گوشوں کے ساتھ پابندی سے نکال رہے ہیں اور خوبصورت گیٹ اپ کے ساتھ منظر عام پر آ رہے ہیں۔ مگر یہ سب، سب کے حصے میں نہیں آتا۔ آپ خسارے کے باوجود اب تک ہمت سے کام لے رہے ہیں۔ خدا آپ کے حوصلے برقرار رکھے۔ دیکھئے نثری نظم کبھی نظم نہیں ہو سکتی۔ کتنا ہی عمیق موضوع کیوں نہ ہو اگر شاعری میں شعریت نہ ہو تو شاعری پھس پھسی ہو کر رہ جاتی ہے۔ شاملِ اشاعت نظمیں اسی کمی کا شکار ہیں۔ اور یہ کس زمانے کی شاعری ہے :

ہاتھوں میں جھلکتا جام لیے ر — ہونٹوں پہ تمہارا نام لیے ر — بہکے ہیں تو خود کو تھام لیے ر

ایسی شاعری 'آمد' میں پڑھ کر بڑا دکھ ہوا۔ حالی اور آزاد کی روح بھی تکلیف میں آ گئی ہوں گی اختر الایمان کو قنوطیت پسند کہنا شاعر کے درجے کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ میر تو رونے کے لئے ہی پیدا ہوئے تھے۔ ان کی شاعری میں تو آنسوؤں کے سوا کچھ اور ہے ہی نہیں۔ ویسے شاعری تو زندگی کا مرثیہ ہی ہے۔ اور اس کا اظہار ہی ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے۔ پھر اختر الایمان کی وضاحت بھی مجھے بے معنی لگتی ہے۔ ویسے اختر الایمان پر دونوں مضمون بہت محنت سے لکھے گئے ہیں۔ یہ سچ ہے اختر الایمان کی شاعری کا اسلوب خود ان کی اپنی ایجاد ہے۔ اور ان کا یہ اسلوب ان کے ساتھ ہی ختم بھی ہو گیا۔ مگر فیض نے جو راہ اختیار کی اس پر تمام ترقی پسند متواتر چلتے رہے۔ جدیدیت پر اختر الایمان سے زیادہ اثر ن م راشد اور میراجی کا رہا۔ ظفر اقبال ایک تجربے کار شاعر ہیں اور پچھلے ساٹھ ستر سالوں سے شاعری کا کام کر رہے ہیں۔ غزل ان کی جان ہے اور اسے کئی ناچ نچا چکے ہیں۔ موصوف اپنے آپ کو غالب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ اور اس بات پر بہ ضد ہیں کہ شمس الرحمٰن صاحب بھی کسی طرح یہ تسلیم کر لیں کہ وہ (ظفر اقبال) غالب سے بڑے شاعر ہیں۔ مگر یہ ان کا خواب ہے اور خواب ہی رہے گا۔ خطوں میں ایک خط اسماء پروین کا پڑھا۔ خط بڑا چونکانے والا لگا مگر میں ان کی باتوں سے متفق نہیں ہوں۔ کسی چیز کا دوبارہ چھپنا اتنا کچھ غلط نہیں ہوتا کہ آپ لٹھ لے کر مدیر کے پیچھے پڑ جاؤ کہ اس نے کوئی تخلیق دوبارہ اپنے رسالے میں کیوں چھاپ دی۔ اول تو کوئی ادبی چیز دوبارہ اس لیے شائع کی جاتی ہے کہ اس ادب پارے سے زیادہ سے زیادہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔ ''شعر نامہ شب خون'' میں تو زیادہ سے زیادہ ادب پارے دیگر رسالوں سے لے کر شکریے کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں اور ان تمام چیزوں کا بڑا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ ہر بڑی اور اچھی چیز کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا کوئی بری بات نہیں۔ ویسے آپ کا نوٹ بہت خوب ہے۔ دعا گو ہوں کہ آپ بعافیت ہوں۔

آپ کا — شاہد عزیز — موبائل نمبر: 0925255234

● **ظفر کمالی، سیوان [بہار]:** ۲۰۱۵/۸/۲۷۔ برادر محترم! سلام مسنون۔ مزاج گرامی؟ توقع ہے کہ میرا مقالہ

”محقق، تدریس اور تحقیق“ بذریعہ ای۔میل آپ تک پہنچ گیا ہوگا۔ استاذی قمر سیوانی کی دو غزلیں ارسالِ خدمت ہیں۔ انھیں کہیں ٹانک دیں تو کرم ہوگا۔ اب وہ کافی کمزور ہو گئے ہیں۔ اپنی طنزیہ غزلیں بھی بھیج رہا ہوں۔ ”شہرِ ظرافت“ میں اس طرح کی چیزیں ابھی آپ نے شائع نہیں کی ہیں۔ بیٹھے بیٹھے خیال آیا تو انھیں نقل کیا۔ بہتر سمجھیں تو انھیں بھی استعمال کر لیں۔ راج بھاشا کی صورتِ حال سن کر افسوس ہوا۔ مردے کو زندہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ اپنی حکمتِ عملی سے کام لے کر اسے آپ اپنے پیروں پر ضرور کھڑا کر سکیں گے۔ متعلقین کی خدمت میں سلام علیک۔

آپ کا
ظفر کمالی ، سیوان۔

● مناظر عاشق ہرگانوی، بھیکن پور، بھاگلپور [بہار] :۲۰۱۵/۱۰/۱۲۔ برادرم خورشید اکبر صاحب، سلام مسنون۔ ”آمد“ کی ضخامت آپ بڑھاتے جا رہے ہیں۔ ضخیم شمارہ شائع کرنے کا بہار کی حد تک ایک ریکارڈ آپ نے قائم کر ہی لیا ہے۔ پھر اتنے شمارے تواتر سے آ گئے۔ آپ کے عزم بالجزم پر حیران ہوں۔ آپ ڈپٹی ڈائرکٹر کی حیثیت سے راج بھاشا، پٹنہ آ گئے۔ یہ خوشی کی خبر ہے۔ ’آمد‘ کی صحت پر بھی اچھا اثر پڑے گا۔ مضمون حاضر ہے۔ دو تین نئی کتابیں بھی بھیج رہا ہوں۔ اس سال ۲۰۱۵ء میں ۲۱ کتابیں آ گئیں۔ اب ۲۰۱۶ء کے لئے تیاری کروں گا۔ حج سے واپسی کے بعد کمزوری اور تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔ امید ہے نغمہ بار ہوں گے!

آپ کا ۔ مناظر عاشق ہرگانوی، موبائل نمبر: 09430966156

● شرجیل احمد خاں، امرپالی، ایڈن پارک، ایف :۲۷، ڈی :۱۲۰۳، نوئیڈا: ۲۰۱۳۰۱ [اتر پردیش] : ۱۶/اکتوبر ۲۰۱۵ء محترم خورشید اکبر صاحب، سلام مسنون! آپ سے فون پر بات ہوئی۔ یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ ”آمد“ کا شمارہ نمبر: ۱۵ بہت جلد منظر عام پر آ رہا ہے۔ بہت خوب۔ آپ کے کام کرنے کی لگن دوافزا توانائی پر حیرت ہوتی ہے۔ اگرچہ زبان و ادب کی خدمت میں آپ سرگرم ہیں یہ بہت بڑی بات ہے۔ خدارا! ’آمد‘ کو قائم رکھیے۔ ’آمد‘ سے بڑی تقویت ملتی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ تعاون دیتا رہوں گا۔ ’آمد‘ کا شمارہ ۱۲۔۱۳ موصول ہو گیا تھا۔ سبھی مشمولات قابلِ ستائش ہیں۔ شہرِ تحقیق میں منصور عالم صاحب کا تحریر کردہ مضمون: ’لغاتِ روزمرّہ‘ پسند آیا۔

آپ کا
شرجیل احمد خاں۔

● عقیل گیاوی، پرانا بازار، دھنباد، [جھارکھنڈ] : ۷/اگست ۲۰۱۵ء۔ محترم خورشید اکبر صاحب، نذرانۂ خلوص! ’آمد‘ کا مشترکہ شمارہ ۱۳۔۱۲ نظر افروز ہوا۔ شکریہ! غزلوں کی اشاعت کے لئے مزید شکر گزار ہوں۔ رسالہ کے تعلق سے آپ کا اداریہ تشویش ناک ہے۔ بلا شبہ قارئین کے عدم تعاون کی وجہ سے اکثر ادبی رسالے بند ہو جاتے ہیں۔ ظاہری بات ہے کہ اردو ادب کے قارئین اور قلم کار مالی تعاون سے گریز کرتے رہیں گے تو ’آمد‘ کو بھی مجبوراً بند کرنا پڑے گا۔ کوئی کب تک گھاٹے کا سودا کرتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اردو زبان و ادب کے قارئین کو رسالے خرید کر پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے آمین! چار غزلیں حاضرِ خدمت ہیں امید ہے ان غزلوں کو آپ شرفِ قبولیت عطا فرمائیں گے۔ زیادہ کیا خامہ فرسائی کروں۔

فقط۔ احقر العباد عقیل گیاوی

● محمد مختار وفا، بتیا، [بہار]: ۱۰/اکتوبر ۲۰۱۵ء۔ میرے بھائی! سلام و نیاز۔ خدا کرے آپ بخیر ہوں! تین غزلیں بیاد منظر سلطان بھیج رہا ہوں۔ کسی قابل ہوں تو شریک اشاعت کرلیں۔ شکریہ! منظر سلطان کے تعلق سے اگر چاہیں تو مختصر نوٹ لگادیں آپ کے تعلقات دیرینہ کا حق ادا ہوجائے گا۔ والسلام۔ خیر طلب محمد مختار وفا۔

● بابر شریف، مومن پورہ، ناگ پور [مہاراشٹر]: ۵/ستمبر ۲۰۱۵ء، منگل۔ بخدمت محترمہ عظیمہ فردوسی صاحبہ، مدیرہ سہ ماہی 'آمد'، سلام ورحمت۔ 'آمد' میں اشاعت کی غرض سے چار غیر مطبوعہ غزلیں ارسال کررہا ہوں۔ میں اپنی کوئی بھی تخلیق محترم عبدالرحیم نشتر کو دکھائے بغیر کہیں نہیں بھیجتا۔ تو مشق ہوں۔ اصلاح و ترمیم کی پوری گنجائش ہے۔ ہر چند کہ فن مصوری میری professional field ہے اور ایک فائن آرٹس کالج میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہوں۔ ہندی اور مراٹھی تھیئٹر سے جڑا ہوا ہوں۔ شعر و ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ والد مرحوم شریف احمد شریف کا شعری مجموعہ ''دستخط'' ابھی ابھی اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ہر خالص ادبی رسالے کے کچھ اصول وضوابط بھی ہوتے ہیں۔ میری غزلیں اگر رسالے کے معیار پر پوری اُترتی ہوں گی تو یقیناً شائع ہوں گی۔ ورنہ آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر۔ 'آمد' کا قاری ہوں۔ مدحت الاختر اور نشتر صاحب سے اکثر 'آمد' کے متعلق گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اور آپ خیریت سے ہیں....؟ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو عرض کیجئے۔ والسلام۔

بابر شریف　　　موبائل نمبر: 09890448379

● سعید رحمانی، دیوان بازار، کٹک، [اوڈیشا]: ۲۶/اکتوبر ۲۰۱۵ء۔ برادر محترم جناب خورشید اکبر صاحب، سلام مسنون۔ 'آمد' سلسلہ نمبر: ۱۳-۱۴ کی پانچ کاپیاں ملیں تھیں۔ اس بار انھیں تقسیم کرکے رقم وصول کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی۔ پروفیسر کرامت علی کرامت نے یہ کہہ کر 'آمد' لینے سے منع کردیا کہ اس میں اڑیسہ کی نمائندگی نہیں ہوتی ہے اس لیے 'آمد' اب وہ نہیں لیں گے۔ دو تین نئے آدمیوں کو بڑی مشکل سے اس کی کاپیاں دیں اور بڑی مشکل سے رقم بھی وصول کیں۔ ابھی تک ایک صاحب نے آمد کی قیمت نہیں دی ہے۔ بار بار اصرار بھی مجھے اچھا نہیں لگتا ہے۔ بہر حال کسی صورت سے ۹ رسو روپے وصول کرپایا ہوں اور منی آرڈر سے بھیج رہا ہوں۔ ابھی بھی ایک کاپی میرے پاس بچی ہوئی ہے۔ آئندہ آپ صرف دو کاپیاں ہی بھیجیں کیوں کہ یہاں لوگ 'آمد' خریدنے پر تیار نہیں ہیں۔ ان دو کاپیوں میں ایک میری اور دوسری نورالہدیٰ ناطق صاحب کی ہوگی۔ اس سے زیادہ کاپیاں بھیجیں گے تو میرے پاس ویسے ہی پڑی رہ جائیں گی۔ امید ہے اس بات پر توجہ دیں گے۔ اپنی دو چار غزلیں بھی ساتھ میں منسلک ہیں۔ پسند آئیں تو شامل کرلیں ورنہ کوئی بات نہیں۔ خیر طلب سعید رحمانی

● مناظر حسن شاہین، لکشمی پور، گیا [بہار]: مورخہ ۱۹/اکتوبر ۲۰۱۵ء۔ محب مکرم خورشید اکبر! سلام ورحمت۔ سہ ماہی 'آمد' ۱۴-۱۳ باصرہ نواز ہوا۔ مشترکہ شمارے نے اسے ہر دو اعتبار سے بھاری بھرکم بنادیا ہے۔ شہر افسانہ کے تحت 'مرے ہوئے آدمی کی لالٹین' [صدیق عالم]، 'آئینہ شکن' [ڈاکٹر اختر آزاد]، 'پری' [منیرہ سورتی] اور 'اپنے اپنے طوطے' [اقبال مجید] نے بالترتیب متاثر کیا۔ لیکن سچ پوچھا جائے تو اس بار سندھی کہانی 'گونگے، بہرے، اندھے لوگ'

[ڈاکٹر رسول میمن] سب پر سبقت لے گئی۔ مدتوں بعد کسی کہانی نے دردل پر دستک دی اور اس قدر متاثر کیا کہ آنکھیں چھلک پڑیں۔ موجودہ عہد کی کربنا کی کی کیا عمدہ عکاسی ہوئی ہے۔ تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ شاہد حنائی نے اس کا ترجمہ بھی بڑی محنت اور عرق ریزی سے کیا ہے۔ امید ہے آئندہ بھی دیگر زبانوں کی بہت سی کہانیوں کے تراجم شائع فرمائیں گے۔ حماد انجم [مرحوم] کی حمد اور نعتیں شگفتگی اور تازہ کاری کی بہترین مثالیں ہیں۔ مرحوم کو واقعی ان دو صنفوں میں مہارت حاصل تھی۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔ تخلیقات کے ضمن میں اگر صغیر رحمانی کے غیر مطبوعہ ناول 'تخم خوں' کے باب اول کا ذکر نہ کیا جائے تو ادبی بددیانتی ہوگی۔ دیہی ماحول کے پس منظر میں لکھا گیا مذکورہ ناول ایک اہم موضوع کو بڑی ہی خوش سلیقگی اور دل کش انداز میں پیش کرتا ہے۔ مبارک باد!
آپ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ حسب حکم اپنی چار غزلیں 'آمد' کے لیے بھیج رہا ہوں، کسی قریبی شمارے میں شامل کرلیں۔ امید ہے کہ مزاج گرامی شگفتہ ہوگا۔ خلوص آگیں مناظر حسن شاہین، گیا۔

● **محمد اسد اللہ، ناگپور [مہاراشٹر]:** بخدمت، مدیر، سہ ماہی آمد، پٹنہ۔ امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔ عبدالرحیم نشتر صاحب کے توسط سے آمد کا شمارہ ملا تھا۔ گزشتہ دنوں مجھے بہت تاخیر سے یہی آپ کی ایک اہم عہدہ پر تقرری کی خبر ملی۔ بے انتہا خوشی ہوئی۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ میری کتاب 'انشائیہ کی روایت۔ مشرق و مغرب کے تناظر میں' آپ کی خدمت میں ارسال کی جاچکی ہے۔ امید کہ مل گئی ہوگی۔ اس کتاب پر پاکستان کے چند ادیبوں نے مضامین سپرد قلم کیے ہیں۔ میرے نزدیک ان میں سے سب سے اہم مضمون عبدالقیوم صاحب نے لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے اس موضوع پر لکھی گئی چار کتابوں کا موازنہ بھی کیا ہے۔ یہ مضمون 'آمد' میں اشاعت کے لیے ارسال کررہا ہوں۔ اگر آپ اسے اشاعت کے لیے منتخب کریں تو ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔

نیاز مند محمد اسد اللہ

رئیس الدین رئیس، دہلی گیٹ، علی گڑھ [یوپی]: ۲۰/۹/۲۰۱۴، مکرمی محترمی خورشید بھائی السلام علیکم۔ SMS کے ذریعہ آپ سے ملاقات ہوئی، خوشی ہوئی۔ براہِ کرم اسی طرح قبل از وقت زرسالانہ کی اطلاع عنایت کردیا کریں تاکہ میں کسی شمارہ سے محروم نہ رہوں۔ اگر خدانخواستہ تاخیر ہوجائے تو رسالہ بند نہ کریں زرسالانہ ضرور حاضر کروں گا۔ جو خدمت ہو بلاتکلف لکھیے۔ انشاءاللہ جلد اپنی کتابوں کا اشتہار بنوا کر بھیجوں گا۔ اس کی اشاعت کا جو معاوضہ ہوگا حاضر کردوں گا۔ آپ کی اجازت سے ایک تبصرہ فرزانہ خان نیناں [نوٹنگھم، انگلینڈ] کا "شہر بے خواب ہے" پر حاضر ہے، ساتھ ہی چار غزلیں چار رباعیات ایک ہی سلسلہ کی چار نظمیں بعنوان "بدن کہانیاں" حاضر کررہا ہوں۔ ایک طویل مدت سے 'آمد' کی بزم میں شامل نہ ہوا۔ یقین ہے اگلے شمارہ میں ضرور شامل فرمائیں گے۔ قمر نقوی نقشبندی صاحب نے اپنی کتاب 'آمد' کے لئے بھیجی تھی وہ بھی پیش خدمت ہے۔ رسید، رائے اور فیصلے سے ضرور مطلع فرمائیے گا۔ متعلقین کی خدمت میں درجہ بدرجہ سلام و دعائیں۔ کار لائقہ؟

● **مصداق اعظمی، اعظم گڑھ [یوپی]:** ۲۳/۱۰/۲۰۱۵ء، محترم خورشید اکبر صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

بخیر ہوں اور رب الکریم سے دعا گو ہوں کہ آپ مع اہل وعیال خیر وعافیت سے ہوں۔ آپ کا تبادلہ پٹنہ ہو گیا ہے۔ یہ خبر اہلِ 'آمد' کیلئے بڑی خوشخبری ہے۔ اب 'آمد' پٹنہ اور مدھے پورہ کے بٹوارے میں نہیں ہے۔ وہ اک کڑا وقت تھا آمد کا جاری رکھنا اور ایسے حالات میں جاری رکھنا۔ یہ آپ کی ادبی ذمہ داریوں کے احساس کی سچی ترجمانی ہے۔ میرے لئے بھی یہ بڑی خوشی کا موقع ہے کہ اس بار میری دس خاص غزلیں انشاء اللہ آمد میں شائع ہونگی۔ دعا گو ہوں کہ غزلیں پسند آجائیں۔ ویسے کوشش تو آمد کے معیار کے مطابق ہے۔ آمد کو یاد کرتا ہوں تو یاد آتا ہے کہ آمد نے مجھے بہت کچھ دیا اور سچائی تو یہ ہے کہ اگر آپ نے مجھے دریافت نہ کیا ہوتا تو میں ضائع ہو گیا ہوتا۔ اہل خانہ کو میرا اسلام عرض کیجئے گا۔ اور صحت کا خاص خیال رکھیے کیوں کہ 'آمد' اور دنیائے ادب کو آپ کی ضرورت ہے۔ فقط و السلام۔ خیر اندیش مصداق اعظمی Mob:+91-9451431700, 91+97930981

● **ناز قادری، چرچ روڈ، چنڈوارا، مظفر پور [بہار]**: برادرم! اسلام ورحمت۔ بفضل ربی صحت یاب ہوں۔ دیرینہ ذاتی تعلق کی بنا پر کبھی کبھی یاد کر لیتا ہوں، مجھے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ میں بھی اپنے پیشے میں بلند مرتبت رہا، میں اس بلندی تک گیا جو صوبہ بہار کے اردو اساتذہ [پروفیسر وہاب اشرفی کے سوا] میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یعنی نہ صرف ایمرٹس فیلوشپ سے نوازا گیا بلکہ یو جی سی کی دو سب کمیٹیوں کی ممبر شپ بھی میرے حصے میں آئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ تین سال کی علالت کے دوران بستر پر پڑے پڑے یو جی سی کا پروجکٹ بھی مکمل ہوا اور دو خطرناک مقدمے سے بھی نجات ملی۔ اس اذیت ناک ایام میں، میں نے بہت بار فون کیا۔ ہر بات فون پر کرنے کی نہیں ہوتی۔ سمستی پور، دلہن بازار اور پٹنہ کے زمانے میں بھی فون پر اپنے ہونے نہ ہونے کی اطلاع دی اور حسرتِ دید سے بھی آگاہ کیا لیکن وعدۂ فردا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ 'آمد' کی خبر ہوئی تو میں نے خود اسد رضوی کے یہاں جاکر دو شمارے حاصل کیے لیکن ڈاک سے ایک بھی شمارہ نہیں ملا۔ سنا ہے مظفر پور کی راہ سے مدھے پورہ جانا ہوتا ہے، کبھی تو تاک جھانک کر لیتے۔ اب تک الکشن کا بہانہ ہے۔ میرا کلام تمھارے معیار و میزان پر نہیں اترتا پھر بھی ہر مجموعہ کلام پیش کرتا رہا بلکہ دوسری کتاب بھی۔ مجموعہ اول طباعت کے اعتبار سے تیسرا ہے، جواب سامنے آیا ہے اور تیسرے دور کا مجموعہ اول اشاعت ہے۔ 'لمحوں کی صدا' [۱۹۹۷ء] اور 'صحرا میں ایک بوند' [۲۰۱۱ء] پہلے دے چکا ہوں، ''رنگِ شکستہ'' [۲۰۱۴ء] پیش نظر ہے اس میں ۱۹۶۲ء تا ۱۹۷۵ء کی غزلیں اور ۱۹۶۲ء تا ۲۰۱۴ء کی نظمیں شامل ہیں۔ عاصم شہنواز شبلی نے ''ناز قادری، نقش و عکس'' ترتیب دے کر شائع کیا ہے جس میں میرے کلام کے حوالے سے مضامین شامل ہیں، یہ مضامین ۲۰۰۵ء تک رسائل میں مطبوعہ ہیں، اس کے بعد سے اب تک کے مضامین نظام الدین احمد ترتیب دے رہے ہیں۔ کچھ نہیں تو بھاگل پور کی یادیں ہی سلاسل تحریر میں لاکر بھیج دیتے تو زیر ترتیب کتاب میں شامل ہو جاتیں اور یہ کتاب ۷۵ ویں سالگرہ کے موقع کی یادگار ثابت ہوتی۔ اگر میں سفر کے لائق ہوتا تو کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ اللہ تمھیں مع اہل وعیال خوش و خرم رکھے اور ترقی درجات سے نوازے [آمین!]۔

فقط ناز قادری۔

نوٹ : برادرِ معظم مناظر عاشق ہرگانوی صاحب! اخلاقی طور پر میں آپ کا مجرم ہوں اور میرے لیے آپ کی شفقتوں سے محرومی ہی اس کی سب سے بڑی سزا ہے۔ گذشتہ ۱۲/اپریل، ۲۰۱۶ء کو پٹنہ کے اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ کے کانفرنس ہال میں ایک شاندار بین الاقوامی سے می ناز آپ کے چند عزیزان خاص نے منعقد کی تھی جس کے تیسرے خصوصی اجلاس میں آپ کی شخصیت اور فن پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں اس خاکسار کے نام کی شمولیت شاید غیر ضروری نہیں سمجھی گئی ورنہ کم از کم بھاگل پور کی چند خوش گوار یادوں کے حوالے سے تو یہ ناچیز بھی لب کشائی کی جسارت کر ہی سکتا تھا، البتہ آپ کی شاعری اور تنقید و تحقیق پر مقالہ قلم بند کرنے کا اہل نہ کل تھا اور نہ آج ہی خود کو پاتا ہے۔

بہ صد معذرت! حدِ ادب! [خورشید اکبر]

● قوس صدیقی، پھلواری شریف، پٹنہ [بہار]: باسمہ تعالیٰ۔ برادرم خورشید اکبر صاحب، سلام مسنون! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ضروری عرض خدمت ہے کہ رسالہ 'آمد' پابندی سے مل رہا ہے۔ بڑے اشتیاق سے مطالعہ کرتا ہوں۔ ایک ہوشمند قاری کی تسکین کے لئے بہت اعلیٰ و معیاری مشمولات سے بھرپور مواد لائق تحسین ہوتے ہیں۔ میں آپ کی مشکلات کو محسوس کرتا ہوں کہ اس دور میں کسی اعلیٰ معیاری رسالہ کو پابندی سے جاری رکھنا کتنا دشوار کن مرحلہ ہے۔ مگر فخر ہے آپ کے حوصلے پر، آپ کی ادبی دلچسپی اور صلاحیت پر۔ آپ کی شعری، نثری صلاحیت کے پیش نظر مجھے ذاتی طور پر بہت امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ انشاء اللہ ضرور ہم لوگوں کی آبرو میں چار چاند لگائیں گے۔ اپنی تخلیقات میں ایک حمد پاک، ایک نعت شریف اور دو تازہ وغیرہ مطبوعہ غزلیں اور ایک تبصراتی مضمون پیش خدمت کر رہا ہوں۔ امید ہے عزت افزائی فرمائیں گے۔ اپنی محترمہ اور بچوں کو بہت بہت دعائیں پیش کر دیں گے۔ خیر اندیش قوس صدیقی۔

Mob. : 09931713567

● ضیاء فاروقی، احمد آباد پیلیس، کوہ فضا، بھوپال [مدھیہ پردیش]: مکرمی خورشید اکبر صاحب، سلام و نیاز۔ ادھر عرصہ سے آپ سے کوئی رابطہ قائم نہ کر سکا اس کی وجہ کچھ تو میں بھی مکروہات زمانہ کا شکار رہا اور کچھ آپ کی منصبی مصروفیات کا احساس بھی تھا۔ امید ہے کہ آمد کے نئے شمارے کی ترتیب چل رہی ہوگی۔ میں ایک ہزار روپیہ کی حقیر سی رقم بینک ڈرافٹ کی صورت روانہ کر رہا ہوں اسے 'آمد' کے لئے قبول فرمائیں۔ پچھلے شمارہ میں آپ نے میری دس غزلیں شائع کیں، ممنون ہوں کہ اس کے توسط سے بہت سے کرم فرماؤں نے بذریعہ فون حوصلہ افزائی کی۔ اس لفافہ میں بھی دو تازہ غزلیں رکھ دی ہیں۔ امید ہے آپ کی توجہ حاصل ہوگی۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

فقط۔ ضیاء فاروقی۔ Mob. : 09406541986

● راشد طراز، مونگیر [بہار]: مکرمی تسلیمات۔ نیا سال مبارک ہو! گزشتہ سال ۲۰۱۵ء میں آمد کا اب تک کا آخری شمارہ اردو ادب کا حاصل شمارہ قرار دیا جا سکتا ہے، اور اس شمارہ کی آبرو یقیناً صدیق عالم کی کہانی ہے جسے شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ دو غزلیں مزید 'آمد' کے لئے ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ جواب سے نوازیں گے۔

خیر اندیش راشد طراز

☆☆☆

اس شمارے میں شریک قلم کاروں کے پتے:

- Akhtar Kazmi, 349, Arabpur, Near Basant Talkies,Fatehpur-212601 [UP] Mob. : 9793529755.
- Zafar Iqbal Zafar, 170 Kheldar, Fatahpur-212601, (U.P.) Mob. : 09236692111
- Qaus Siddiqui, Mahatwana, Phulwari Sharif, Patna - 801505, Bihar (India) Mob. : 9931713567
- Dr. Afaque Alam Siddiqi ,Zubaidah Degree College,Jai Nagar, PO Box No.6,Shikari Pur, Shimoga- 577427 [Karnataka]. Mob. : 09945462187. Email:afaquealamsiddiqui@yahoo
- Sharjeel Ahmad Khan , Gumti No.3,Bhikhan Pur, Bhagalpur,PIN Code: 812001 , [Bihar]. Mob. 08800584357
- Syed Khalid Qadri, 201, Golden Crest, Income Tax Colony, Mehdipatnam, Hydrabad-28
- Aseem Kavyani, Flat No 702, Ketan Apartment,Belvedre Road,Mazgaon,Mumbai - 400 010.Mob.09322154702.
- Akhlaq Ahmad Ahan, Department of Persian and Central Asia, JNU, New Delhi-110067. Mob:09911311417. akhlaq.ahan@gmail.com
- Dr. Shahab Zafar Azmi, Department of Urdu, Patna University, Patna-800006 [Bihar]Mob: 09431152912 / 08863968168/shahabzafar.azmi@gmail.com
- Dr.Naseem Ahmad Naseem, Bettiah, West Champaran [Bihar] Mob:09931004295
- Sajid Zaki Fahmi , Project Fellow,Department of Urdu,Jamia Millia Islamia, Mob: +91 9990121625 / Email: sajidzakifahmi@gmail.com
- Prof. Sagheer Afrahim, Department of Urdu, Aligarh Muslim University, ALIGARH. [U.P.] Mob: 09358257696 / s.afraheim@yahoo.in
- Izhar Khizar, Near Uma Petrol Pump, City Court, Patna-800008 [Bihar] Mob : 09771954313.
- Rubina Tabassum, Research Scholar, Department Of Urdu, Aligarh Muslim University, ALIGARH_ [U.P.] Mob. 8791403752

- Salman Abdus Samad, Room No. 29, Mahi Hostel, JNU, New Delhi-110067.Mob:09891233492 salmansamadsalman@gmail.com
- Sultan Akhtar, Maulana Azad Nagar, West F.C.I. Road, Phulwarisharif, Patna-801505, Mob. : 9835843256, 9097450586
- Abdur Raheem Nashtar, Nagpur [M.S.] Mob: 09272908151.
- Qamar Siwani, Moh.- Purana Qila, Siwan - 841226 (Bihar), Mob. : +917250161317
- Zia Farooqui,Industrial Training Centre,Rafiquia School Road, Bhopal PIN:462001 [M.P.] Mob.:09406541986, E-mail:ziafarooqui@ymail.com
- Rashid Jamal Farooqui,C-1452- IDPL Township,Virbhadra [Rishikesh], Dehradun- 249202 . (UTTRAKHAND).Mob:09456753096.
- Abdul Ahad 'Saaz', 149, Yusuf Meherali Road, Zakaria Manor, 4th Floor, Mumbai - 400 003, Mob. : 09833710207
- Kahkashan Tabassum C/O Prof. Z I Rizvi,Dept. Of Urdu,Sabour College, Sabour , Dist.- Bhagalpur -813210 [Bihar] Mob:08651449489.
- (Late) Raeesuddin Raees, Aligarh-813210 [U.P.]
- Dr. Rounaque Shahri Ashrafi Urdu Library,Chauthai Kulhi,Jharia-826001 Dhanbad [JHARKHAND]. Mob:09905185658.
- Dr. Ali Abbas "Ummaid" Qalamkar Parishad, Central Office : 01, Star Residency, Idgah Hills, Bhopal, 462 001 (M.P.)
- Dr. Safdar, 18-B, Koh e Noor Colony, Post:VMV, Amravati-444604
- Rashid Taraaz, Dilawar Pur, Munger [Bihar].
- Sardar Asif, Kakul House, Near Tube Well No. 12 Bijlipura, Shahjahanpur, (U.P.)-242001, Mob. : 09412678897
- Shakeel Azmi, A-201, Malwani Ramkrishna, Plot No. 52, Mahada Complex, Malwani, Malad (W) Mumbai - 400 095
- Md. Abid Ali Abid, Aligarh [U.P.] Mob : 09219401945.
- Aqueel Gayawe, C/O Shreeman Tailors, Dari Mohallah, Purana Bazar, Dhanbad - 826001 (Jharkhand)
- Manazir Hasan Shaheen Midle School, Laxmipur, Vill- Chakand, Gaya - 804404, Mob. : 9661214111
- Tarique Mateen, At&P.O. Lakhminia, via: Balia, Dist. Begu Sarai [Bihar].
- Dr. Naushad Ahmad Karimi, Ganj No. - 1, Bettiah - 845438 (Bihar)
- Dr. Waris Ansari, P.O.- Patti Shah, Fatehpur (U.P.) 212652, Mob. 09935005032, 9452748884
- Zahid Konchvi, 521/1, Isai Tola, Premnagar,Jhansi(U.P.) Mob:08924962850

- Nurul Hassan Noor C/o Zafar Iqbal Zafar, Kheldar, Fatehpur [U.P.]
- Nisar Jairajpuri, 67, Jalandhari, Azamgarh - 276001
  Mob. : 09198558492, 0896037886
- Misdaque Azmi, Jawma, Mejwa, Phoolpur, Azamgarh U.P. Pin-276304,
  Mob. : +91-9451431700, +91-9793098128
- Subodh Saqi, Delhi. Mob : 09811535422.
- Ahmad Ata, Pakistan
- Md. Mukhtar Wafa, Ganj No. - 2, Bettiah (Bihar) 845 438,
  Ph. : 06254-248149, Mob. : 9006402251
- Faiyaz Ahsan, Roheli Pura, Umarkhed, Dist. Yaratmal-445206 (M.S.)
- Babar Shareef, Ghazal Art Gallery, Qidwai Road Mominpura,
  Nagpur-440018 (M.S.), Email - dont4get30@gmail.com,
  Mob. : 09890448379, 8308871543
- Shahid Azeez, 277 - Math Bhopalpura, Udaipur-313001
- Anwar Shamim, Editor : 'Kasauti Jadeed' C/o Book Emporium, Sabzi Bagh, Patna-800004 [Bihar].
- Sharique Adeel, P.O.- Marehra, Dist. - Etah (U.P.), PIN-207401,
  Mob. : 09368747886
- Ayub Khawer, Lahor, Pakistan
- (Late) Hafeez Anjum, Jamal Basera, H.No. 7-2-1005, Kashmeergadda, Karimnagar-505 001, (Telangana) India, Mob. : 9247479488.
- Iqbal Majeed, House No. 2, Air Port Road, New Bhaskar Enclave, Bhopal- 462031 [M.P.]. Mob :09893764746.
- Hassan Manzar, Pakistan
- A. Khayyam, A-997, Sector : 11-A, North Karachi-75850 [Pakistan] Ph : 0333-3738607
- Rajiv Prakash 'Sahir' , 20/84, Ring Road, Indira Nagar, Lucknow- [U.P.]
  Mob.:9839463095
- Balraj Bakhshi, 13/3, Eidgaholony, Udhampur-182101 [J&K],
  Mob: 09419339303.email:balrajbakshi1@gmail.com
- Zaheer Abbas [Pakistan]
- Farooq Rahib, Shantipuri, Motihari-845401[Bihar] Mob : 09430593522.
- Dr. Shahida Dilawar Shah [Pakistan]
- Ratan Singh, A-402, Beta, Greater Noida, 011-2320906, Mob. : 9911146994
- M. A. Karimi (Advocate), Senapath Colony, Darbhanga-846004,
  Mob. : 08877439188

- Anwar Imam, Holding No. 89, Road No. 10, Jawahar Nagar, P.O.: Azad Nagar ,Mango, Jamshedpur-832110 (Jharkhand),Mob: 09931163152
- Qazi Abdus Sattar, Aligarh. Mob : 07417780295.
- Dr. Md. Asif Zahri,CIL, JNU New Delhi - 110067 Mob : 09971185463.
- Mohammad Hamid Siraj, Chashma Barrage, Dist. Mianwali [Pakistan] email: hamidtaloker@gmail.com Contact : +92459805125.
- Saba Ekram,A-201-C,GreyGarden,3rdFloor,Block-16,Gulistan-e-Jauhar, Karachi-75290,(Pakistan).Contact : 00923002164282 / 0092213203206.
- Abdul Qayyum Raoon, House No.R-856, Mohalla: Eidgaah, Near Makki Masjid, Atak City [Pakistan], Mobile 057-2612019.
- Farzana Khan Nainaan, [England]
- Masoom Sharqui, Kanki Nara, Dist. 24 Parganas [W.B.]
- Prof. Manzar Ejaz ,HOD Post graduate Dept of A.N.College, Patna-13. Mob : 09431840245.
- Faheem Anwar (T.V.Journalist),11,Seal Bustee 2nd By Lane, Shibpur, , Howrah-711102 (W.B.).Mob:9339258895 / fanwar.tvjournalist@gmail.com

وفیات[Obituary]:

گذشتہ چودہ مہینوں [اپریل، ۲۰۱۵ء تا مئی، ۲۰۱۶ء] میں ادب اور شعبۂ علم و دانش کی کئی نامور، مقتدر اور مایۂ ناز ہستیاں ہمارے درمیان سے اُٹھ گئیں جن کے لیے ہم جتنا بھی ماتم کریں وہ کم ہے: پاکستان میں مقیم اردو کے بلند مرتبت ادیب اور عدیم المثال ناول نگار 'اُداس نسلیں' کے خالق عبداللہ حسین؛ شاعرِ مفکر علامہ اقبال کے فرزند، لاہور ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور سپریم کورٹ آف پاکستان کے ریٹائرڈ سنیئر جج جاوید اقبال؛ مشہور ترقی پسند افسانہ نگار، سماجی و سیاسی کارکن اور ڈرامہ کے اداکار سعید پریمی [کولکاتہ]؛ ممتاز شاعر و نقاد بشر نواز [اورنگ آباد، مہاراشٹر]؛ معروف شاعر اور ادبی صحافی سرور عثمانی جن کی ادارت میں شاندار ادبی جریدے "اب" اور "مفاہیم" کے کئی یادگار اور ضخیم خصوصی نمبر شائع کیے گئے؛ اردو کے مشہور شاعر منظر سلطان جو گذشتہ دس بارہ برسوں سے اردو کے بڑے چھوٹے مشاعروں میں کثرت سے شریک ہوتے تھے۔ خاکسار [خورشید اکبر] کو ان کے یارِ دیرینہ ہونے کا شرف حاصل رہا ہے؛ شاعر و ادیب نثار احمد کلیم [کرناٹک، ضلع بیدر]؛ روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' سے برسوں تک وابستہ رہے صحافی عتیق مظفر پوری؛ شہرۂ آفاق اردو روزنامہ 'آزاد ھند' [کولکاتہ] سے طویل عرصے تک منسلک رہنے والے اس اخبار کے سربراہ صحافی منیر نیازی جن کا آبائی تعلق غازی پور [یوپی] سے تھا؛ دہلی اردو اکادمی کے بانی سکریٹری، تعلیمی و انتظامی شعبے کی اہم شخصیت شریف الحسن نقوی؛ ماہنامہ 'آجکل' [دہلی] کے سابق مدیر اور ممتاز ادیب محبوب الرحمٰن فاروقی؛ مشہور و منفرد شاعر، ادیب اور دانشور جمیل الدین عالی [پاکستان]، جو ہمہ رنگ دوہا نگار کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے؛ فاتحِ انٹارکٹیکا مایۂ ناز سائنسداں پدم بھوشن پروفیسر سید ظہور قاسم؛ سینئر صحافی عبدالقدوس قادری [لکھنؤ]؛ بین الاقوامی شہرت یافتہ عظیم مصور مقبول فدا حسین [مرحوم] کے فرزند مشہور پینٹر شمشاد حسین؛ مغربی بنگال قانون ساز اسمبلی کے سابق اسپیکر ہاشم عبدالحلیم؛ معروف شاعر اشفاق الرحمٰن مظہر [تمل ناڈ]؛ ہندی کے مایۂ ناز ادیب اور کہانی نویس، گیان پیٹھ کے ڈائرکٹر، ہندی جریدہ 'گیانودے' کے مدیر اور مشہور ہندی رسالہ 'واگرتھ' کے سابق مدیر، ہندی کی معروف مصنفہ ممتا کالیہ کے رفیقِ حیات رویندر کالیہ، جنھوں نے ۶۰ء کی دہائی میں 'دھرم یُگ' میگزین میں بلند قامت ہندی مصنف دھرم ویر بھارتی کے معاون کی حیثیت سے بھی کام کیا؛ معروف افسانہ نگار اقبال متین [حیدر آباد]، جن کا شمار مخدوم محی الدین، راج بہادر گوڑ، سلیمان اریب، سید محمد جواد رضوی اور ڈاکٹر حسینی شاہد کے رفقائے خاص میں ہوتا تھا؛ پروفیسر مجیب رضوی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر شعبۂ ہندی؛ م ق خاں، اردو اور انگریزی کے نہایت مقبول اور مشہور افسانہ نگار جن کا تعلق گیا [بہار] سے تھا؛ 'قومی آواز' [دہلی] کے سب ایڈیٹر اشفاق اعظمی؛ بالی ووڈ

اور برٹش سنیما کے بے مثال اداکار سعید جعفری؛ ممتاز بزرگ صحافی سید عبدالرافع [پٹنہ]؛ مشہور شاعر انجم عرفانی؛ معروف صحافی ظفر زاہدی [اعظم گڑھ]؛ صفِ اوّل کے پاکستانی صحافی، ادیب، شاعر، نقاد انور سدید؛ عالمی شہرت یافتہ بلند قامت افسانہ نگار، ناول نویس، ادیب اور کالم نگار انتظار حسین [پاکستان]؛ سابق مرکزی وزیر، ریاست جموں و کشمیر کے وزیر اعلیٰ اور صفِ اوّل کے قومی سیاست داں مفتی محمد سعید؛ اردو کے کثیر الجہات ادیب، افسانہ نگار، ناقد، صحافی اور شہرۂ آفاق ادبی رسالہ 'کتاب' لکھنؤ کے مدیر عابد سہیل، جو روزِ اوّل سے 'آمد' کے محسن و کرم فرما رہے۔ ان کی رحلت ادارہ 'آمد' کے لیے ذاتی صدمہ اور بڑا خسارہ ہے؛ عالمگیر شہرت کے حامل افسانہ نویس و ناول نگار محی الدین نواب [پاکستان]؛ مستند و معتبر شاعر، ادیب اور صحافی زبیر رضوی جن کی ادارت میں موقر ادبی رسالہ 'ذہنِ جدید' مسلسل تین دہائیوں سے زائد عرصے تک اردو شعر و ادب کی آبیاری کرتا رہا۔ اردو کا یہ واحد ایسا رسالہ تھا جو ادب کے علاوہ فنونِ لطیفہ اور ہندستانی فلم، سنیما اور ڈرامہ اسٹیج کی گونا گوں سرگرمیوں سے ہمیں باخبر رکھتا تھا؛ آٹھویں دہائی کے معروف شاعر و ادیب رئیس الدین رئیسؔ؛ مقبول شاعر حفیظ انجم کریم نگری؛ ممتاز صحافی اور ماہنامہ 'ہدیٰ' [ڈائجسٹ] کے مدیر اعلیٰ احمد مصطفیٰ صدیقی راہیؔ؛ اردو اور ہندی کے مقبول و معروف ڈرامہ نویس، ہدایت کار، نقاد اور اسٹیج آرٹسٹ شاہد انور [سہسرام، بہار] کی بے لوث ادب دوستی اور جواں مرگی کا صدمہ ہمارے دلوں کو کچوکتا رہے گا؛ انسان اسکول، گلشن گنج [بہار] کے بانی، ماہر تعلیم سید حسن؛ مشہور افسانہ نگار نعیم کوثر [مظفر پور، بہار]؛ کرناٹک اردو اکادمی کی چیئر پرسن ڈاکٹر فوزیہ چودھری؛ اردو کے عظیم المرتبت شاعر، ادیب، صاحب طرز انشا پرداز، گنگا جمنی تہذیب اور صوفی سنتوں کی وسیع المشربی کے سچے وارث و امین ندا فاضلی، جن کی محبتوں، شفقتوں اور معصومانہ چہل بازیوں سے اردو ہندی کے ہر عمر کے چاہنے والے اچانک محروم ہو گئے۔ خاکسار انھیں پیار سے 'بابا' کہتا تھا اور وہ اس اندازِ تخاطب پر شفقت سے مسکرا دیتے تھے۔ ان کی موت 'آمد' کے مدیر اعزازی کے لیے صدمۂ عظیم ہے؛ نہایت مقبول و معروف افسانہ ساز اور ناول نگار جوگندر پال؛ اردو کے ممتاز اور منفرد نقاد، شارح اور انگریزی ادب کے مثالی استاذ [مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ] پروفیسر اسلوب احمد انصاری؛ اردو کے سربرآوردہ نقاد، ماہر جمالیات، سابق مرکزی وزیر اور 'بابا سائیں' کے لقب سے مقبول پروفیسر شکیل الرحمٰن وغیرہ۔ ان تمام اہم اور قابلِ قدر شخصیتوں کی رحلتیں دنیائے علم و ادب اور سچی انسانیت کا عظیم خسارہ ہیں، جن کی تلافی شاید ممکن نہیں۔ اللہ ان سب کے پسماندگان کو صبر کی طاقت عطا کرے اور مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین ثم آمین!!

[خورشید اکبر]

☆☆☆

خورشید اکبر

کی غزلوں کا چوتھا مجموعہ

آسماں پسار آئے!

Aasmab Pasaar Aye

by Knursheid Akbar

عنقریب

منظرِ عام

پر آ رہا ہے!

رابطہ : دفتر سہ ماہی 'آمد'، آرزو منزل، شیش محل کالونی، عالم گنج، پوسٹ آفس، گلزار باغ

پٹنہ - 800007 [بہار]

Mob : 09631629952 / 07677266932

☆☆☆

Editor, Printer, Publisher and Proprietor Azeema Firdausi printed at Pakeeza Offset, Shahganj. Patna-6 and published from Arzoo Manzil, Sheesh Mahal Colony, Alam Ganj, P.O. Gulzar Bagh, Patna- 800007, Bihar [INDIA].

۱۶؍اپریل ۲۰۱۶ء کو بہار اردو اکادمی، پٹنہ کی جانب سے منعقدہ آل انڈیا مشاعرے میں
دائیں سے: طارق متین، حنیف ترین اور خورشید اکبر

Annual Joint Issues

April-2015-June 2016 Vol: 4-5, Issues : 11-15 RNI: BIHBIL 00337/04/1/2012-TC

Sehmaahi Aamad

सेहमाही आमद

A document of liberation against ideological dogmatism

Editor : Azeema Firdausi Honorary Editor : Khursheid Akbar
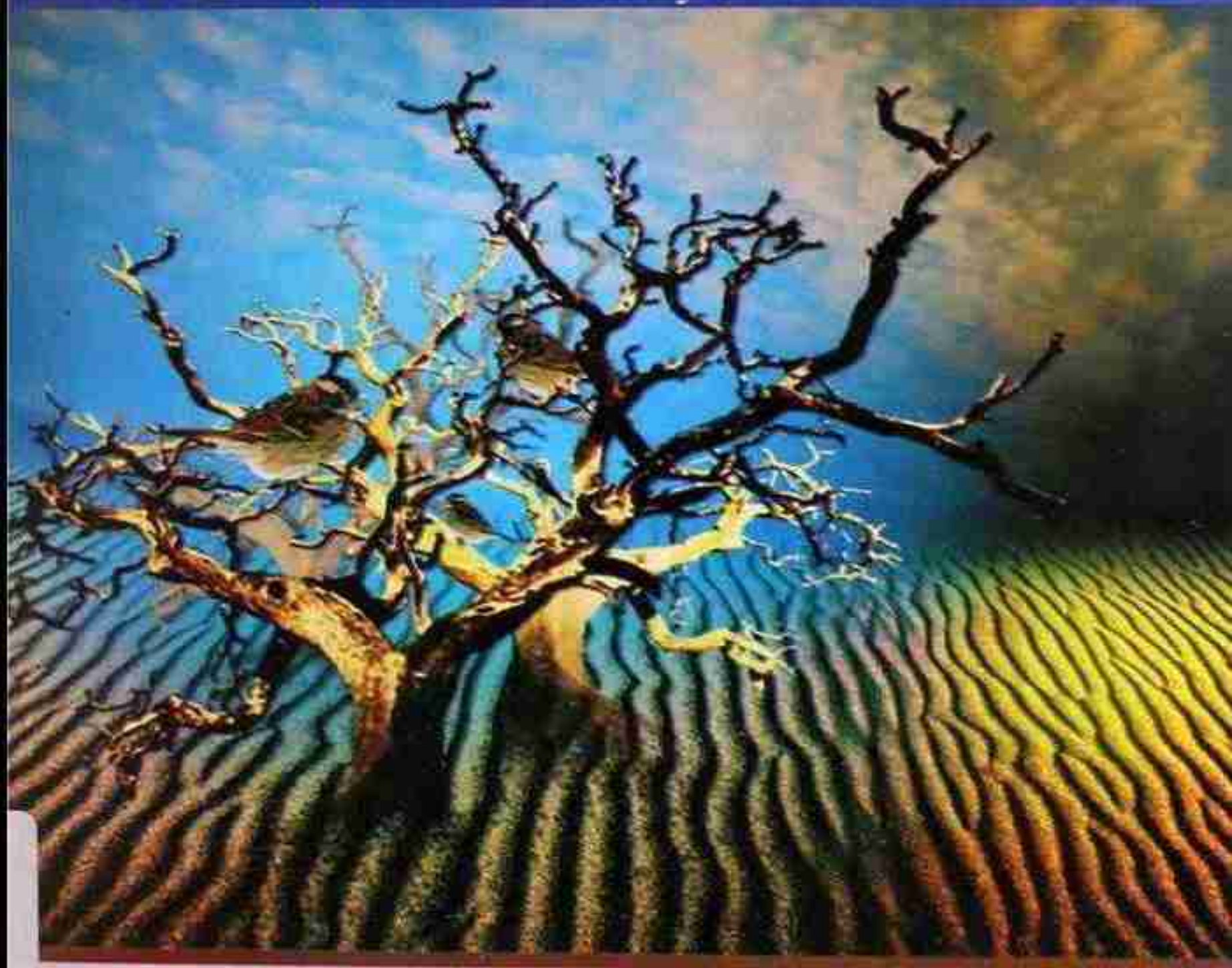
Printer, Publisher, Editor and Proprietor Azeema Firdausi printed at Pakeeza Offset, Shahganj, Patna - 800 006 and published from Arzoo Manzil, Sheesh Mahal Colony, Alamganj, P. O. Gulzarbagh, Patna - 800 007 [Bihar] INDIA